UNIVERSAL
LIBRARY

فہرستِ مضامین

جلد ۲۵

"ہمایوں" بابت ماہ فروری سنہ ۱۹۳۴ء

نمبر ۲

تصویر:- ایچ - جی - ویلز

چندہ سالانہ ۵؍ ششماہی ۳؍ (مع محصول)

قیمت فی پرچہ ۸؍

طلسم زندگی

یعنی

جناب میاں بشیر احمد صاحب بی اے (آکسن) مدیر ہمایوں کی تازہ تصنیف

کے متعلق

اخبارات و اکابر کی آرا

جناب مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی بی اے ایل ایل بی کی رائے

یقین فرمائیے گا۔ تصنع قطعی نہیں۔ لاہور میں شرف قدمبوسی حاصل ہوا۔ لیکن وہ بیکار تھا۔ آج طلسم زندگی کے ذریعہ سے گویا از سر نو نیاز حاصل ہوا۔ بخدا میں نے آپ کے مضامین میں ورڈزورتھ کے فلسفہ کے ساتھ پہلی مرتبہ عمر میں کیٹس کی جوشیلی حیات دیکھیں کس قدر گرمی کے ساتھ کوئی فقرہ آتا ہے۔ ایکدم سے عبارت جگمگا اٹھتی ہے۔ ایک دم سے دل اچھل پڑتا ہے۔ ایک چٹکی سی کوئی لیتا ہے۔ دوسری سطر میں گدگدی ہونے لگتی ہے۔ کیا آپ یقین کریں گے۔ کہ عمر میں پہلی مرتبہ میں نے اردو میں ادب لطیف دیکھا۔ آج میں نے اردو میں کامیاب ترین چیز دیکھی ہے۔ مجھے حیرت ہے۔ کہ اتنے دنوں سے کیوں ان مضامین کو چھپائے رکھا گیا؟

میں نے آج تک اس قدر غیر دلچسپ عنوانات کے تحت میں اس قدر دلچسپ مضامین نہیں دیکھے۔ مضمون دیکھتے جاؤ۔ وہ حالت ہوتی ہے کہ جیسے دریا کنارے خوبصورت سنگریزے ہیں۔ ایک سے ایک اچھا ملتا ہے۔ چلنے والا آگے بڑھتا جاتا ہے! اور بوجھ سے تنگ آکر اس سے اچھا سنگریزہ پاتا ہے اسے چھوڑ دیتا ہے۔ مگر افسوس کیا تھا اور دوسرا اٹھاتا ہے۔ وہی مضمون یہاں ہے۔ کتنے مشکل اور معمولی عنوانات آپ نے چنے ہیں۔ کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیونکر ان پر کچھ لکھنا ممکن ہے؟ پھر "انجمن زندہ دلان ہند"۔ "ضرورت ہے" "چند پند" وغیرہ ایسے مضمون ہیں۔ کہ لطافت نگاری اور مزاحیہ حق نے جان ڈالدی ہے۔ خاص طور پر بلڈو کس قدر دلچسپ مضمون ہے۔ آپ کا کوئی مضمون حقائق سے خالی نہیں ہے۔ اور خاص لطف یہ ہے۔ کہ اردو ایسی کم مایہ زبان میں آپ نے چند لفظوں کے ہیر پھیر سے غضب کر دیا ہے۔ مثلاً "چند پند" کی پہلی سطر کہ اس میں فلسفہ ظرافت اور حقیقت سبھی کچھ ہے۔

یقین کیجیے میں نے طلسم زندگی کو اچھی طرح دیکھا کہ گویا گھول کر پی گیا ہوں اور دیکھے جا رہا ہوں۔ کیا تعجب کہ پھر لکھوں۔

کتاب کی ظاہری شان! میں بھولا ہی جاتا تھا۔ اس کے معنی یہ تھے۔ کہ آپ نے جو کچھ اس طرف توجہ کی اس کو قومی خسارے میں ڈالے دیتا تھا۔ ایک دو لفظ ہیں۔ کتاب کی ظاہری خوبیاں کچھ بھی نہیں محض ایک مضمون دوست کی اصلی خوبیوں پر سے تمام عمدہ جلد اور رنگین پلیٹ تصدق کیے جا سکتے ہیں۔

ہماری پہلی کتاب اور کتاب کا آخری مضمون یہ دونوں جواہر پارے اس قدر دلچسپ اور پھڑکتے ہوئے ہیں۔ کہ بیساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

زمیندار لاہور۔ اردو زبان میں اس اہتمام سے شاید ہی کوئی کتاب شائع ہوئی ہو۔
مدینہ بجنور۔ اس کتاب کو یورپ کی حسین ترین کتاب کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے۔
سیاست لاہور۔ طلسم زندگی صوری و معنوی لحاظ سے عدیم النظیر ہے۔
بندے ماترم لاہور۔ اس سے قبل ہماری نظر سے ایسی خوبصورت کتاب نہیں گذری۔
نگار بھوپال۔ اس کتاب کی قیمت پانچ روپیہ مسلمانوں کی اقتصادی پستی کے لحاظ سے ممکن ہے زیادہ ہو لیکن دل پرشوق "رونمائی" میں اس سے زیادہ قربانیاں کر سکتا ہے
عصمت دہلی۔ طلسم زندگی ادبی مضامین کا ایسا مجموعہ ہے جسے لڑکیاں بھی پڑھ سکتی ہیں۔
ایسٹرن ٹائمز لاہور۔ طلسم زندگی بلاشبہ ان کتابوں میں سے ہے جو انسان کی دلی رفیق بھی جا سکتی ہیں۔
آنریبل جسٹس سر عبدالقادر جج ہائی کورٹ لاہور۔ طلسم زندگی ظاہری اہتمام کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے۔ اور بہ لحاظ مضامین نہایت فلا دیز ہے۔
علامہ عبداللہ یوسف علی او بی۔ ای۔ آئی سی۔ ایس (ریٹائرڈ) اردو کا کوئی ایسا زندہ انشا پرداز میرے علم میں نہیں جس کا قلم ادب کے اس قدر بوقلموں راستوں پر اس روانی، صفائی اور نزاکت سے چلتا ہو۔
مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب اسسٹنٹ ہوم سیکرٹری حیدرآباد (دکن) ایسی کتاب صرف وہی شخص لکھ سکتا ہے جس کو اردو ادب کے علاوہ انگریزی ادب پر بھی کامل عبور ہو۔
مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی۔ بی۔ اے۔ ایل۔ ایل بی۔ وکیل چیف کورٹ مارواڑ۔ عمر میں پہلی مرتبہ میں نے اردو میں ادب لطیف دیکھا۔ آج میں نے اردو میں کامیاب ترین چیز دیکھی ہے۔
سر تیج بہادر سپرو۔ بیرسٹر ایٹ لا۔ الہ آباد۔ طلسم زندگی کے مطالعہ سے نہایت لطف حاصل ہوا۔ واقعی خدا نے آپ کے تخیل کو وسعت عطا کی ہے اور زبان پر قدرت۔ آپ کے مضامین قابل قدر ہیں۔
خان بہادر مولانا سید رضا علی وحشت (کلکتہ) اس کتاب نے مجھے ایسا محو بنایا، جیسا کہ اس سے پہلے کسی اور کتاب نے نہیں بنایا تھا۔
سید سجاد حیدر صاحب یلدرم ڈپٹی کلکٹر۔ کتاب کی طباعت اور آرائش حسب دلخواہ دیدہ زیب ہے۔ اس سے زیادہ اس کے مضامین دلفریب ہیں۔
سید مقبول حسین صاحب مقبول بی۔ اے۔ احمد پوری۔ اس کتاب کی وہ قوت جو اس کیلئے بقائے دوام کا باعث ہوگی۔ دراصل اس کا پیام ہے۔ جو ناامیدی سے امید اور جذبۂ عمل کو اکساتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔
مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے سیکرٹری انجمن ترقی اردو پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد (دکن) آپ کی کتاب طلسم زندگی وصول ہوئی۔ اس کا حسن و خوبی دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔
خان بہادر میاں عبدالعزیز صاحب کمشنر انبالہ۔ کتابوں کتابوں میں اگر عشق ہوتا۔ تو میری الماری کی تمام کتابیں اس کتاب کی پیاری سی صورت پر جان دے دیتیں۔
مرزا محمد سعید صاحب ایم۔ اے۔ آئی۔ ای۔ ایس (ریٹائرڈ) بلاشبہ یہ کتاب ظاہری و معنوی خوبیوں کا بے نظیر مجموعہ ہے۔ اور ہر لحاظ سے اردو ادبیات کیلئے باعث افتخار ہے۔
جناب شوکت تھانوی ایڈیٹر سرپنچ لکھنؤ یہ کتاب یقیناً ہندوستان کی ایک یادگار تصنیف ہے۔ اور اردو لٹریچر کی ایک تاریخی کڑی۔
میر سعادت حسین صاحب نجیب مہتمم کندہ حیدرآباد (دکن) کتاب کو دیکھ کر طبیعت پھڑک گئی۔ اور جی باغ باغ ہو گیا۔

قیمت فی جلد (مجلد سنہری) پانچ روپے (علاوہ محصول)

پتہ ملنے کا: سید عبداللطیف مینجر رسالہ ہمایوں ۲۲۔ لارنس روڈ لاہور

جہاں نما

چینی مدبر کی خونیں پیشین گوئی

ڈاکٹر سی ٹی وینگ، چین کے سابق وزیر خارجہ اُس گروہ میں شامل ہوگئے ہیں جن کا عقیدہ ہے کہ ۱۹۳۵ء یا ۱۹۳۶ء میں دنیا کے موجودہ مسائل کا نہایت شدید طریق پر فیصلہ کیا جائے گا اور اس کی ابتدا مشرقِ اقصیٰ میں ایک خونریز جنگ سے ہوگی۔

جب جاپان نے ۱۹۳۱ء میں منچوریا پر حملہ کیا تو ڈاکٹر وینگ جو ممکن ہے کہ جلد ہی پھر وزیر امورِ خارجہ بن جائیں اپنے عہدے پر فائز تھے لیکن اُن کا عہد وزارت زیادہ تر اُن کوششوں کے لئے مشہور ہے جو انہوں نے چین میں زائد مقبوضات رکھنے کے خلاف کیں۔

چینی اخبارات ملک کو کئی ماہ سے مشرق میں ایک عظیم الشان جنگ کے لئے تیار کر رہے ہیں اور ڈاکٹر وینگ نے اپنی پیشین گوئی سے ان کی رائے کو بڑی تقویت دی ہے۔ اُن کا قول ہے کہ چین جس کی حیثیت اس جنگ میں نہایت کمزور ہے صرف اس صورت میں اپنی ہستی کو قائم رکھ سکتا ہے کہ اس کی عسکری اور اقتصادی حالت درست ہو جائے۔

ہانگ چاؤ میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ "چینی لوگوں کی قسمت ان کے اپنے ہاتھوں میں ہے اور ایک اور بات بھی یقینی ہے۔ وہ یہ کہ جو طاقت بھی دنیا کی رائے کے خلاف اپنی الگ حکمت عملی پر کاربند ہوگی اسے تمام دنیا مل کر تباہ کر دے گی؟"

جن لوگوں کو ۱۹۳۵ء یا ۱۹۳۶ء میں مشرقِ اقصیٰ میں جنگ کا خطرہ نظر آتا ہے وہ اس کے متعدد وجوہ پیش کرتے ہیں۔ وہ ایسی پیشین گوئیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں جیسی جاپانی وزیر جنگ جنرل اراکی نے کیں۔ وہ اس طرف توجہ دلاتے ہیں کہ جاپانی افواج کی عظیم الشان تنظیم اسی زمانے میں مکمل ہونے والی ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ واشنگٹن اور لندن کی بحری تحدید اسلحہ کے معاہدوں کی ترمیم، توسیع یا توثیق کی کوششوں میں مشکلات بلکہ غالباً ناکامی کا سامنا ہوگا۔

اصلاح دیہات کی تحریک

مسٹر برائن کا نظامِ عمل

ہندوستان کے دیہات کی اصلاح اور زمینداروں کی ترقی کی کوششوں کے سلسلے میں مسٹر برائن کا نام خاص شہرت حاصل کر چکا ہے۔ مسٹر برائن نہایت ہی ہمدرد اور مستعد انگریز ہیں اور ان کی ہمدردانہ مساعی نے انہیں دیہات میں نہایت ہی ہر دلعزیز بنا دیا ہے۔ گزشتہ دنوں وائی ایم سی اے ہال میں سر سکندر حیات خاں کے زیر صدارت ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں مسٹر برائن نے تقریر کی۔ اس تقریر میں انہوں نے اصلاح دیہات

کے متعلق اپنا نظامِ عمل پیش کیا جو ہر ایسے شخص کے لئے شمع ہدایت کا کام دے سکتا ہے جسے دیہات کی ترقی سے دلچسپی ہو۔

مسٹر برائن کا خیال ہے کہ دہاتیوں کی استعدادِ عمل میں اضافہ کرنے کی کوشش ضروری ہے اور اس کا واحد ذریعہ عوام کی تعلیم ہے۔ اس کے ساتھ ہی اُن کی آمدنی میں اضافہ کرنا اور انہیں ترقی کے دیگر ذرائع مہیا کرنا بھی ضروری ہے۔ دیہات کے لوگوں کی صحت کی طرف توجہ کرنا بھی نہایت ضروری ہے۔ انہیں ایسی تفریحات سے محظوظ ہونے کا موقع دینا چاہیئے جو اُن کی جسمانی اور دماغی ترقی کا باعث ہوں۔ گاؤں کے لوگوں کے رہنے کے مکانات ہوادار اور دلکشا ہونے چاہئیں۔ چیچک کے ٹیکے کا رواج عام کرنا چاہیئے اور لوگوں کو بتانا چاہیئے کہ مچھر کس قدر خوفناک چیز ہیں تاکہ ملیریا کی تباہ کاریوں میں کمی ہو سکے۔ دیہات میں ملیریا بخار ہی سب سے زیادہ عام بیماری ہے۔

ان باتوں کے علاوہ مسٹر برائن نے یہ بھی کہا کہ گاؤں والوں کو بہتر قسم کے بیج استعمال کرنے چاہئیں۔ یہ خیال کہ جتنے زیادہ مویشی کسی زمیندار کے پاس ہوں وہ اتنا ہی خوشحال ہوتا ہے قطعاً غلط ہے۔ مقرر کی رائے میں مناسب یہ ہے کہ مویشی کم ہوں لیکن بہتر قسم کے ہوں۔ بیمار جانوروں سے قطعی احتراز لازم ہے۔

مسٹر برائن نے دہاتیوں کی مقدمہ بازی کا ذکر بھی کیا اور کہا کہ اس کی وجہ محض دہاتیوں کی کم عقلی ہے۔ اگر دیہات کی لڑکیوں کو ایسی تعلیم دی جائے جس سے وہ اپنے گھروں کا انتظام اچھی طرح کر سکیں اور شوہروں کو بھی صحیح طریقے پر چلا سکیں تو یہ مسئلہ خود بخود حل ہو جاتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے دیہات میں آلاتِ نشرِ صوت اور میجک لالٹین کے لیکچروں کا انتظام ہونا بہت مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ دیہات میں مجالسِ امدادِ باہمی کا قیام اور دوسرے علمی ادارات قائم ہونے ضروری ہیں جو گاؤں والوں کو اپنے شہری بھائیوں کے دوش بدوش ترقی کی راہ پر چلا سکیں۔

آخر میں سر سکندر حیات خاں نے ان مسائل کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی اور کہا کہ دہاتیوں کی جہالت کو دُور کرنا اشد ضروری ہے اس کے علاوہ موجودہ کساد بازاری کے مقابلے کے لئے زمیندار ہر قسم کی مدد کے مستحق ہیں۔

"ممالکِ متحدۂ عالم"

نیو یارک کی "نیو ہسٹری سوسائٹی" نے یورپ کی یونیورسٹیوں کے طلبہ کو دعوتِ مقابلہ دی جس میں یہ سوال پیش ہوا:-

"یونیورسٹی اور سکولوں کے طلبہ "ممالکِ متحدۂ عالم" کے خیال کو جامۂ عمل پہنانے میں کیوں کر مدد کر سکتے ہیں؟"

اس کے جواب میں چار سو مضامین موصول ہوئے۔

۱۹۱ یونیورسٹیاں مقابلے میں شامل ہوئیں۔

۲۶ یورپین ممالک نے اس میں حصہ لیا۔

انعامات سوربان یونیورسٹی (پیرس) کے گرینڈ امیفی تھیٹر میں تقسیم ہوئے۔

ذیل میں ہم مختلف ممالک کے مضامین کا اقتباس دیتے ہیں:

آسٹریا

"امن کی خواہش کو دل میں زندہ رکھو اور امن کے لئے ایثار اور قربانی کے جذبے کو بیدار رہنے دو"

بلجیم

"اقوام عالم کو دوسرے ممالک پر قبضہ کر کے نوآبادیاں بنانے کا خیال ترک کر دینا چاہیئے کیونکہ اس کا مطلب دوسروں کا خون چوس کر اپنی حالت بہتر بنانا ہے جو انسانیت کے خلاف ہے"۔

بلغاریہ

"ہم سب کو آہنی عزم کے ساتھ فوجی خدمات انجام دینے سے انکار کر دینا چاہیئے"

ڈنمارک

"یونیورسٹی کے طلبہ کی ہمت اور امرا کے عطایا کی مدد سے "ممالک متحدہ عالم" کا خواب چند سال میں پورا ہو سکتا ہے"۔

ایسٹونیا

"ممالک متحدہ عالم" کا خواب باہمی سمجھوتے سے پورا ہو سکتا ہے اور یہ سمجھوتا اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ دنیا کی ایک متحدہ زبان ہو"۔

فن لینڈ

"نوجوانوں کے دل میں یہ احساس پیدا ہو جانا چاہیئے کہ اُن کی قوم بھی صرف حسن، صداقت، حق اور انصاف کا حصول چاہتی ہے"۔

فرانس

"قومیت کو مٹا دینا چاہیئے تاکہ 'انسانیت' زندہ ہو"۔

جرمنی

"ہمارا مقصد امن کا حصول اور "ممالک متحدہ عالم" کا قیام ہے۔ ہم اس مطمح نظر کو پورا کرنے کے لئے سپاہیوں کی طرح بھرتی ہونے کو تیار ہیں۔ تاکہ ہم امن کے جانباز بہادر کہلا سکیں"۔

برطانیہ

"جنگ و جدال اس وقت تک جاری رہیگا جب تک رائے عامہ کو اس پر اعتراض نہ ہو"۔

یونان

"نوجوان اگر کامیاب ہونا چاہتے ہیں تو انہیں متحد ہو جانا چاہیئے"۔

ہالینڈ

"نوجوانوں میں ایسے اوصاف پیدا کرنے چاہئیں جو انہیں "ممالک متحدہ عالم" کا باشندہ بنا سکیں"۔

اٹلی

"ایسے پروفیسروں کے لیکچر سننے سے انکار کرو جو عسکریت سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ جنگ کے خلاف ایک وسیع پراپگنڈا کرنے کی ضرورت ہے"

ہنگری

"جب تک استبداد اور حکومتِ خود اختیاری کا دور دورہ ہے یہ خواب پورا نہیں ہو سکتا۔"

یوگوسلافیہ

"اگر نوجوان آج اپنی زندگی کے مقصد کو سمجھ جائیں تو کل دنیا کو متحد کر سکتے ہیں۔"

لیٹویا

"نوجوانوں کے ہاتھ ہی بس "ممالک متحدۂ عالم" کی کنجیاں ہیں۔"

لتھونیا

"کالجوں اور سکولوں کے طلبہ کو ایک بین الاقوامی انجمن طلبہ میں متحد ہو جانا چاہیئے۔"

لکسمبرگ

"ہمیں نئے استادوں کی ضرورت ہے ورنہ طلبہ ہمیشہ پرانا راگ ہی الاپتے رہیں گے۔"

ناروے

"ہمارا پہلا فرض یہ ہے کہ ہم دوسروں کی رضا جوئی کو اپنا ایمان بنالیں۔"

پولینڈ

"اے انسان "ممالک متحدہ عالم" کا باشندہ بن جا"

پرتگال

"فرانس اور جرمنی کا عقدہ سب سے زیادہ اہم ہے۔ اگر اس کا تصفیہ ہو جائے تو دنیا میں دوبارہ اعتماد قائم ہو سکتا ہے۔"

رومانیا

"نوجوانوں کو موجودہ ناکام اور تباہ حال سوسائٹی کے اوہام و عقائد سے آزادی حاصل کرنی چاہیئے۔"

ہسپانیہ

"ہم طلبہ ایک بین الاقوامی یونیورسٹی کے قیام کا مطالبہ کرتے ہیں!"

سویڈن

"مدارس اور یونیورسٹی کے طلبہ میں اس بات کا احساس پیدا ہونا چاہیئے کہ اُن کے ملک کی خوشحالی کا دارومدار دنیا کی خوشحالی پر ہے۔"

سوئٹزرلینڈ

"ہمیں دوسروں کو راہ دکھانے اور تکلیفیں جھیلنے کا عادی بننا چاہیئے۔"

پتھر کی سرگزشت

شہر میں پتھر کی ایک سڑک تھی۔

گزرتی ہوئی گاڑی کے پہیے نے ایک پتھر کو دوسرے پتھروں سے جدا کر دیا۔ اُس پتھر نے دل میں سوچا "مجھے اپنے ہمجنسوں کے ساتھ موجودہ حالت میں نہیں رہنا چاہیئے۔ بہتر یہی ہے کہ میں کسی اور جگہ جا کر رہوں"۔

ایک لڑکا آیا اور اُس پتھر کو اُٹھا کر لے گیا۔

پتھر نے دل میں خیال کیا "میں نے سفر کرنا چاہا تو سفر بھی نصیب ہو گیا —— صرف آہنی ارادہ کی ضرورت تھی"۔

لڑکے نے پتھر کو ایک گھر کی طرف پھینک دیا۔

پتھر نے خیال کیا "میں نے ہوا میں اڑنا چاہا تھا۔ یہ خواہش بھی پوری ہو گئی —— صرف ارادہ کی دیر تھی"۔

پتھر کھٹ سے کھڑکی کے شیشہ پر لگا۔

شیشہ یہ کہہ کر چکنا چور ہو گیا "بدمعاش —— ایسا کرنے سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

"تم نے بہت اچھا کیا جو میرے راستے سے ہٹ گئے۔ میں نہیں چاہتا کہ لوگ میرے راستے میں حائل ہوں" ہر ایک چیز میری مرضی کے مطابق ہونی چاہیئے —— یہ میرا اصول ہے"۔

یہ کہہ کر پتھر ایک نرم بستر پر جا پڑا۔

پتھر نے بستر پر پڑے ہوئے خیال کیا "میں نے کافی سفر کیا ہے اب ذرا دو گھڑی آرام تو کر لوں"۔

ایک نوکر آیا اور اس نے پتھر کو بستر پر سے اٹھا کر باہر سڑک پر پھینک دیا۔

سڑک پر گرتے ہی پتھر نے اپنے ہمجنسوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "بھائیو! خدا تمہیں سلامت رکھے —— میں ابھی ابھی ایک عالیشان عمارت سے ہو کر آ رہا ہوں لیکن اس کی شان و شوکت مجھے بالکل متاثر نہ کر سکی۔ میرا دل عام لوگوں کی ملاقات کے لئے بیتاب تھا چنانچہ اب میں واپس آ گیا ہوں"۔

(روسی)

سعادت حسن منٹو

باقی نہیں رہیں۔ انسان غصب کرنا اور قبضہ کر لینا بھول چکا ہے بلکہ اب تو بچے بھی آپس میں نہیں لڑتے بھڑتے۔ اختلاف رائے میں ملاطفت ہماری فطرت ثانی بن گئی ہے۔ نوعِ انسان اب اڑھائی ارب .... ۵ ۲ نفوس کی ایک متحد جماعت ہے جس کا نصب العین مشترک شعور اور مشترک ارادہ ہے۔ اس نصب العین کے پا لینے کے بعد ہم وہ شاندار منظر دیکھیں گے جسے آنکھ نے نہیں دیکھا نہ کان نے اُن کی بابت کچھ سُنا ہے نہ وہ انسان کے دل میں خیال بن کر کبھی گزرا ہے! ...... کیونکہ اس وقت تو ہم گویا ایک شیشے میں دھندلا سا عکس دیکھ رہے ہیں ......

یہاں ڈاکٹر ٹریون کا مسوّدہ یک لخت ختم ہو جاتا ہے (اس کے بعد مدیر کتاب یعنی ایچ جی ویلز نے تتمے کے طور پر چند سطور قلم بند کی ہیں اور یوں خیال آرائی کی یہ فکر انگیز تصنیف ختم ہوتی ہے)۔

ا ب



میں اس کا مستحق ہو کے دم لوں گا

کوئی فکر نہیں اگر میں ان بلندیوں تک نہیں پہنچا جن کی میں تلاش میں ہوں۔ میری ناآزمودہ طاقت بیشک مجھ کو جواب دے دے۔ یا پہاڑ کی چوٹیوں تک پہنچنے سے پہلے میرے راستے میں بیشک تند طوفان حائل ہو جائے۔ اگرچہ وہ مقام مجھے کسی طرح ہاتھ نہ لگے لیکن میری تمام جدوجہد اور مصائب کا لطف اسی خیال میں پوشیدہ ہے کہ

میں اس کا مستحق ہو کے دم لوں گا

باوجود میری محنت شاقہ کے کامیابی کی مسرت بے شک مجھے کبھی نصیب نہ ہو۔ کچھ مضائقہ نہیں اگر مجھے وہ پھل حاصل نہ ہوں جو میرے پڑوسی کو جدوجہد کے بعد ملے ہیں۔ اگرچہ اپنی منزل مقصود مجھے نظر تک نہیں آتی تاہم یہ خیال مدام میرے دماغ میں موجود رہے گا کہ

میں اس کا مستحق ہو کے دم لوں گا

میرے محبوب کا پاکیزہ نور مجھ سے اگر دوچار نہیں ہوا تو نہ سہی۔ کوئی اندیشہ نہیں اگر میرا راستہ کسی گمنام پگڈنڈی کے مانند اندھیری رات میں سے ہو کر گیا ہے۔ اگرچہ میں زندگی کی محبوب ترین خوشی سے محروم ہوں تاہم میرے لئے اس خیال میں بے اندازہ تسکین کا سامان ہے کہ

میں اس کا مستحق ہو کے دم لوں گا

سید لعل شاہ

زندہ فلسفے

ایچ ۔ جی ۔ ویلز

انگلستان کے اس مصنف نے اپنی گوناگوں علمی و ادبی تصنیفات سے عالمگیر شہرت حاصل کر لی ہے۔ یہ نہ صرف ناول نویس ہی بلکہ انسانی معاشرہ پر طبعی و مذہبی و معاشی اثرات کا اندازہ لگانے اور معاشری پیشین گوئیاں کرنے میں یہ آج کل کے مفکرین میں ممتاز ہے۔ "آنے والی چیزوں کا خاکہ" جس کا اسی نمبر میں دوسری جگہ خلاصہ دیا گیا ہے اُس کی تازہ تصنیف ہے جو ۱۹۳۳ء میں شائع ہوئی ہے۔

میں اس بات پر بہت غور و خوض کرتا رہا ہوں کہ میں اپنے عقیدے کو کہاں تک چند ہزار لفظوں میں تمہارے سامنے پیش کر سکتا ہوں۔ کیونکہ اس کے معنی ہیں یہ بتانا کہ میرے خیال میں میں کیا ہوں؟ میں کیوں زندہ ہوں؟ میں کس مقصد کے لئے موجود ہوں؟ زندگی کے متعلق میرا خیال کیا ہے؟ اپنے اردگرد کی دنیا کے متعلق میرا خیال کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ یہ وہ سوال ہیں جن پر میں گھنٹوں غور کرتا رہا ہوں، گفتگو میں، نوشت و خواند میں، تنہا مقامات میں اور بالخصوص اُس تنہا ترین مقام رات کی تاریک خاموشی میں۔ کم از کم میں اپنی طرف سے کوشش کروں گا کہ تمہیں ان کے متعلق اپنا اعتقاد بتاؤں۔

فرانس کے صوبہ پرووانس میں شہر گراس کے عطر کے کارخانوں میں جاؤ تو وہ لوگ تمہیں عطر کی چھوٹی چھوٹی بوتلیں دکھاتے ہیں اور تمہیں بتاتے ہیں کہ ایک بوتل میں دس لاکھ گلاب کے پھولوں کا عطر کشید کیا گیا ہے دوسری میں بیسیوں بیگھے یاسمن کے کھیتوں کا۔ اپنے اس مختصر سے مضمون میں میں کوشش کروں گا کہ اپنے خیالات کی کئی ہزار راتوں اور دنوں کا نچوڑ تمہارے سامنے پیش کروں . . . . . جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں وہ میں پہلے بقا کے متعلق اظہار خیال کرنے سے واضح کرتا ہوں۔ اس موضوع کو میں ایک سوال سے شروع کرتا ہوں۔ میں یہاں بیٹھا اپنے خیالات قلم بند کر رہا ہوں اور تم وہاں بیٹھے انہیں پڑھ رہے ہو۔ ہم میں ایک ذہنی رابطہ قائم ہے ہم تبادلۂ خیالات کر رہے ہیں۔ ہماری ذہنی زندگیاں حالتِ اتصال میں ہیں وہ سوال جو میں پیش کرنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ کہاں تک ہم اس باہمی ذہنی زندگی کو غیر فانی سمجھ سکتے ہیں؟ اور خاص طور پر میں یہ سوال تمہارے سامنے پیش کروں گا جو بار ہا میں اپنے سامنے پیش کر چکا ہوں کہ یہ ایچ جی ویلز کون ہے جو اس وقت تمہارے سامنے اور تمہارے ساتھ مصروفِ فکر ہے؟

ذرا غور کرو کہ ہماری اس چھوٹی سی مجلس کے کیا معنی ہیں؟ اس وقت کیا وقوع میں آ رہا ہے؟ تم ہو مسٹر فلاں یا مسز فلاں یا مس فلاں اور ایک شخص مسمی ایچ جی ویلز تم سے چھاپے کے ذریعے سے بات چیت کر رہا ہے۔ اکثر لوگ کہیں گے کہ یہ اظہر من الشمس ہے وہ سمجھیں گے کہ یہ ایک صریح حقیقت ہے؟ لیکن کیا واقعی یہ حقیقت من و عن یوں ہی ہے؟ آؤ ذرا معاملے کی تہ تک پہنچیں۔ میں اپنے متعلق یعنی ایچ جی ویلز کے متعلق گفتگو کروں گا لیکن جو کچھ میں کہوں گا وہ بعینہٖ تم پر بھی صادق آئے گا۔

یہ ایچ جی ویلز ایک شخص ہے جو ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوا تھا اور جو اُس وقت سے لے کر آج تک اِدھر اُدھر جا چکا ہے اور یہ وہ کر چکا ہے اُس کے الفاظ یہاں موجود ہیں، بعض خیالات جو اُس کے سمجھے جا سکتے ہیں وہ بھی یہاں موجود ہیں لیکن کیا تم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہو کہ وہ خود تمام کا تمام یہاں موجود ہے؟ کیا میں عرض کر سکتا ہوں کہ تمام تو تمام اُس کا بہت سا حصہ بھی کہیں موجود نہیں ہے بلکہ اس کا بیشتر حصہ اب موجود ہے ہی نہیں۔ وہ فنا ہو چکا ہے۔ وہ مر مٹ چکا ہے۔ دنیا اُسے بھلا چکی ہے اس کا بیشتر حصہ ابھی سے اتنا ہی مردہ ہو چکا ہے۔ جتنا کہ اس کا دادا۔

ذرا مجھے اجازت دو کہ میں اس امر کو اور واضح کروں۔ اس شخص کے بچپن بزنگاہ ڈالو۔ سوچو تمہیں اُن دنوں کا ایک واقعہ بتاتا ہوں ۱۸۶۷ء میں وہ ایک چھوٹا سا بہت ہی شریر بچہ تھا وہ چیزوں کو شدت سے محسوس کرتا تھا اور بڑی سختی سے اپنے خیالات کا اظہار کرتا تھا۔ ایک دن اُسے ایک عظیم الشان وحشت خیز واقعہ پیش آیا۔ اُسے ضرور ایسا معلوم ہوا ہوگا کہ بس دنیا کا خاتمہ ہو گیا۔ وہ ایک صوفے پر لیٹا تھا جس پر سے لڑھکتے لڑھکتے وہ نیچے گر گیا سو وہ اس گرنے سے بہت ڈر گیا [illegible] گرنے کے ساتھ ہی وہ ایک شیشے کی بوتل پر بھی آ پڑا جس سے اُس کا سارا چہرہ لہولہان ہو گیا۔ میرے اس جسم پر آج تک آنکھ کے اوپر ایک زخم کا نشان ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ بہت ڈرا ہوگا اُسے بہت چوٹ آئی ہوگی پھر اسے گود میں لے کر بہلایا گیا ہوگا۔ پھر ڈاکٹر آیا ہوگا اور اس نے زخم کو سی دیا ہوگا۔

احساس کا ایک طوفان اٹھا ہوگا، کتنا کچھ دھوم مچا ہوگا! بالکل درست لیکن اب مجھے اس سب کچھ کا کیا علم؟ کچھ نہیں، خاک بھی نہیں ماسوا اس کے جو میری والدہ نے مجھے بتایا اُس کے سوا کچھ بھی نہیں۔ وہ تمام ڈر، وہ تمام احساس، اُس واقعہ کی تمام تفصیل میری شعوری زندگی میں مٹ چکی ہے۔ وہ سب کچھ اب قطعاً فنا ہو چکا ہے اب کیا میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایک برس کا ایچ جی ویلز یہاں موجود ہے؟ شاید تم کہو گے "بلا شبہ وہ موجود ہے۔ یہ دیکھو وہ زخم۔ اور اگر بارہ مہینے کا وہ بچہ نہ ہوتا تو یہ موجودہ مصنف کہاں سے آتا؟"

لیکن ذرا ٹھہرو۔ وہ میرا دادا! وہ ایک باغبان تھا اور اُسے گلاب کے پھول پیدا کرنے میں مہارت حاصل تھی۔ ایک دن بادشاہ جارج سوم کے عہد حکومت کے آخر میں وہ پنہرسٹ کے مقام میں ایک باغ میں دھوپ میں کھڑا ہوا گلاب کی ایک قلم میں پیوند لگا رہا تھا۔ مجھے یہ واقعہ ٹھیک اس طرح معلوم ہے جس طرح مجھے یہ معلوم ہے کہ ایچ جی۔ ویلز ۱۸۶۷ء میں ایک صوفے پر سے گر پڑا۔ اور ہاں یہ بھی ملاحظہ کرو کہ اگر میرا دادا نہ ہوتا تو یہ موجودہ مصنف بھی نہ ہوتا۔ میری ناک اور میری آنکھوں کا یہ نقشہ اور یہ رنگت نہ ہوتی۔ اگر یہ زخم ۱۸۶۷ء کا ایچ جی ویلز ہے تو پھر یہ آنکھ ۱۸۲۸ء کا جوزف ویلز ہے پس اس حساب سے اگر وہ بچہ ایچ جی ویلز اس وقت یہاں زندہ ہے تو اس کا دادا بھی اسی طرح یہاں زندہ ہے اور اگر ایک مرمٹ چکا ہے تو دوسرے کا بھی بعینہٖ یہی حال ہے۔ دونوں حالتوں میں ایک سا جسمانی تسلسل ہے اور دونوں حالتوں میں ایک ہی کی سی خاموشی۔

غرض یہ خیال کہ وہ ایچ جی ویلز جو یہ لکھ رہا ہے بتمامہٖ ایچ جی ویلز نہیں ہے میرے بیان کا ایک نہایت اہم جزو ہے۔ صرف یہی نہیں کہ میں جو اس وقت بول رہا ہوں کسی طرح صحیح معنی میں وہ ۱۸۶۷ء کا بچہ نہیں ہوں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں وہ بیس سالہ بیمار اور چڑچڑا نوجوان

بھی نہیں ہوں جو ۱۸۸۶ء میں موجود تھا۔ وہ دنیا میں بزعم خود ظالمانہ حالات کے تحت زندگی بسر کرتا تھا اور وہ باتیں بھی کیا کرتا تھا اور لکھا بھی کرتا تھا۔ میرے پاس اُس کے اس زمانے کے فوٹو ہیں جس سے اُس کی صورت شکل کا پتہ چلتا ہے۔ میرے پاس وہ مضمون بھی موجود ہیں جو وہ لکھا کرتا تھا اور میرے لئے یہ ماننا کسی طرح بھی ممکن نہیں کہ میں وہی شخص ہوں جو وہ ہے۔ میں اُس سے تقریباً اُتنا ہی علیحدہ ہو چکا ہوں جتنا اپنے دادا سے۔ اس کے برعکس دیکھو کہ میں حال ہی میں اپنے ایک بیٹے سے مل کر کام کرتا رہا ہوں۔ ہمارے بہت سے خیالات مشابہ ہیں اور ہماری ذہنی طبائع بہت کچھ ملتی جلتی ہیں۔ اس وقت میں بہ نسبت اُس ۱۸۸۶ء کے نوجوان ایچ جی ویلز کے اس اپنے بیٹے سے زیادہ متحد ہوں بلکہ ۱۸۹۶ء کے ایچ۔ جی۔ ویلز سے بھی میرا تعلق کم ہے جس کے فوٹو سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس کے لمبے لمبے گیسو تھے اور نیچے کی طرف خم کھائی ہوئی مونچھیں تھیں اور وہ اپنی بائیسکل پر سوار ہو کر دیہات میں گھوما کرتا تھا۔

اب ذرا اس مسئلے کے ایک اور پہلو کو دیکھو۔ خیال کی یہ رَو جو تمہارے ساتھ محو گفتگو ہے [illegible] شئے ہے جو ایچ جی ویلز سے خاصی کم ہے جو میرے خیال میں زیادہ تر مردہ ہو چکا ہے لیکن ساتھ ہی یہ ایچ۔ جی۔ ویلز سے ایک بہت کچھ زائد شئے بھی ہے۔ تم اور میں اس وقت یہ خیال کر رہے ہیں کہ وہ کیا ہے جو ہم میں غیر فانی ہے، اب غور کرو کہ ایچ جی ویلز نے ازخود اِس موضوع کی ابتدا نہیں کی بلکہ یہ موضوع اُس تک آیا۔ اُس نے لوگوں کو اس موضوع پر باتیں کرتے اور وعظ کرتے سُنا، اُس نے اِس کے متعلق پڑھا، وہ لوگ جو مصر میں پانچ ہزار سال ہوئے مر گئے اور جن کے نام اور چہرے اور عادات اور گناہ سب بھول بھلا چکے ہیں وہ بھی یہ باتیں کیا کرتے تھے۔ افلاطون، بدھ، کنفیوشس، سینٹ پال ان سب نے اس موضوع پر کوئی نہ کوئی اہم خیال ظاہر کیا۔ جب ہم بڑے ہوئے تو یہ زیر بحث مسئلہ ہماری زندگیوں میں بھی آیا۔ اپنے بعد آنے والوں کے لئے اسے ترک کرنے سے پہلے ہم بھی اس مباحثے میں شریک ہو سکتے ہیں اور اس میں کچھ نہ کچھ تبدیلیاں پیدا کر سکتے ہیں۔ یہ روشنی کی اُس کرن کی مانند ہے جو ایک منشور میں سے ہو کر گزرے جو اُس کا امتحان کرے شائد اُسے منعطف کر دے شائد اُسے مقطب کر دے اور یوں اُسے کچھ نہ کچھ تبدیل کر کے پھر آگے کو روانہ کر دے۔ ہم ایسی منشور ہیں۔ خیالات ہماری پیدائش سے پہلے موجود تھے اور ہماری موت کے بعد بھی یونہی جاری رہیں گے۔

جو کچھ میں تم کو بتانے کی کوشش کر رہا ہوں اب اس کے متعلق میں ایک اور زائد بات کہنے والا ہوں اور وہ یا تم کو ایک روشن ترین حقیقت معلوم ہو گی یا محض خیال آرائی۔ ہاں پہلے جو کچھ میں تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں اُسے بالکل واضح ہو جانا چاہیئے۔ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ یہاں ہے یہ ایچ جی ویلز جو بول رہا ہے اور میں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ غیر فانی تو کجا اُس کا بیشتر حصہ ابھی سے فنا اور ملیا میٹ ہو چکا ہے۔ میں تم پر یہ بدیہی اصول عائد نہیں کروں گا۔ ایسا کرنا خود تمہارا کام ہے۔ لیکن اس کے علاوہ ایچ جی ویلز کچھ اور شئے بھی ہے یعنی ایک زندہ پیداوار تصورات کی ایک مسلسل تجدید، ایک ایسا خیالات کا عمل جس سے ہمارے نفوس ایک دوسرے کے قریب تر آتے جاتے ہیں اور خیالات کا یہ عمل ہزارہا سال سے جاری ہے اور جہاں تک ہمیں علم ہے سینہ بہ سینہ اور زمانہ بہ زمانہ ممکن ہے یہ ہمیشہ ہمیشہ جاری رہے۔

ہم فانی ہستیاں ہیں جو ایسے خیالات کی پکار پر لبیک کہتی ہیں جو شاید غیر فانی ہیں۔ ہم محض اپنا آپ نہیں ہیں' ہم انسانی فسکر و تجربہ کا بھی ایک جزو ہیں۔

ایک دوسرا نہایت اہم اساسی مسئلہ جس پر انسان اپنے نفس کے ساتھ صدیوں سے بحث کرتا آیا ہے اور جو ہم میں سے ہر ایک کے سامنے اپنے وقت پر آتا اور ہمیں متحیر کر دیتا ہے یہ ہے کہ فرد کیا چیز ہے؟ یہ مسئلہ بقا کے متذکرہ بالا خیالات سے قریب کا تعلق رکھتا ہے۔ فرد کس طرح اپنی جنس سے متعلق ہے؟ جزو کیسے کُل سے وابستہ ہے؟ ایک کس طرح سب سے واسطہ رکھتا ہے؟ ایک مرد یا عورت بہ ہیئتِ مجموعی اپنی ساری شخصیت سے کیسے مربوط ہے؟ افلاطون کے بہت سے مکالمے انہیں سوالات پر حاوی ہیں۔

میں جانتا ہوں کہ بہت سے لوگوں کو اس قسم کی بحث و تمحیص غیر دلچسپ بے معنی اور محض بال کی کھال اتارنے والی معلوم ہوگی۔ وہ یہ سمجھیں گے کہ یہ سب گومگوکس شے کی بابت ہے اور آخر اس کا فائدہ کیا ہے؟ انہیں پورا یقین ہے کہ وہ افراد ہیں اور بس اس پر سارا جھگڑا ختم ہوا۔ وہ کہیں گے آخر ہمیں کیا ضرورت پڑی ہے کہ خواہ مخواہ اس معاملے میں اپنی سر مغزن کریں۔ ظاہر ہے کہ بہت سے لوگ اب اس طریقے سے اپنی زندگی گزارتے ہیں کہ وہ کسی شے میں بھی اپنا سر نہیں کھپانا چاہتے لیکن پھر اس قسم کے لوگوں نے مدت سے اس قسم کی چیزیں پڑھنی ترک کر دی ہیں بلکہ انہوں نے کبھی ایسی چیزوں کو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ لیکن بہت سے اور اشخاص کے لئے یہ مسائل معنی خیز ہیں اور بعض کے نزدیک تو یہ دنیا کے اہم ترین مسائل میں شامل ہیں۔ خود میرا یہی حال ہے اور میں اپنے ایمان کو بغیر اس مباحثے میں پڑے بیان ہی نہیں کر سکتا۔

اس زیرِ غور سوال کا صاف و صریح جواب غالباً یہی ہوگا کہ فرد ایک زندہ وجود ہے باقی دنیا سے الگ۔ وہ بطور ایک مخصوص متمیز ذات کے پیدا ہوتا اور جداگانہ زندگی بسر کرتا ہے' وہ کچھ عرصے تک ساری کائنات سے الگ اپنے آپ کو برقرار رکھتا ہے اور بالآخر وہ مر جاتا ہے اور کم از کم جسمانی طور پر اُس کا خاتمہ ہو جاتا ہے لیکن کیا یہ بیان بالکل خالی از نقص ہے؟ اگر ہم موجودہ حیاتیات یا نفسیات کا مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ بہت سے امور ہیں جو افراد کے اس مکمل پن کے خیال کی بیخ کنی کرتے ہیں۔ افراد ایسے قطعاً علیحدہ وجود نہیں ہیں جیسا کہ ہمارا خیال ہے۔

پہلے حیاتیات داں سے پوچھو۔ وہ اس بات پر ہم سے متفق ہوگا کہ آدمی اور بلّیاں اور کتے بڑے ہی انفرادی سے وجود ہیں' وہ کہے گا کہ یہ غیر معمولی طور پر منفرد ہیں لیکن جب تم اُس سے سوال کرو گے کہ کیا سب جانداروں کا یہی حال ہے تو وہ فوراً نفی میں جواب دے گا۔ وہ تمہیں بتائے گا کہ اکثر پودے اتنے منفرد نہیں ہوتے جتنے وہ معلوم ہوتے ہیں۔ تم ایک پودے کو اُسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اُس کے بہت سے پودے بنا سکتے ہو۔ کیا یہ نئے افراد ہیں یا کیا یہ محض پہلے پودے کے اجزا ہیں؟ تم مختلف جنسوں کے دو پودے لے کر اُن کا پیوند لگا سکتے ہو' اب بتاؤ کہ پیوند شدہ پودا ایک نیا فرد ہے یا پرانے پودوں میں کا ایک یا دونوں ہے۔ درخت جیسے بالکل الگ الگ معلوم ہوتے ہیں ویسے فی الحقیقت ہوتے نہیں۔ ہمیں تو پہاڑ بھی ایسے ہی معلوم ہوتے ہیں۔ یہ ہمارے دلوں کی عادت ہے کہ ہم انہیں الگ الگ افراد سمجھ لیتے ہیں۔ ہم ژنگ فراؤ یا ویٹر ہارن کے پہاڑ کا

اس طرح ذکر کرتے ہیں گویا وہ بعینہٖ اہرام کی طرح مکمل اور متمیز چیزیں ہوں لیکن فی الحقیقت وہ صرف ایک عظیم الہیئت کوہستانی سلسلے پر کی چوٹیاں ہیں۔

اور صرف پودوں اور ہمارے نباتاتی عالم کا یہ حال نہیں کہ اُن میں انفرادیت نہیں ہے۔ حیاتیات کا ماہر تمہیں بتائے گا کہ اسفل حیوانات میں سے بیشمار کی یہی کیفیت ہے۔ اُن میں سے بعض اوقات دو باہم رِل مِل کر ایک ہوجاتے ہیں اور ایک ٹوٹ کر دو یا اُس سے زائد بن جاتے ہیں اور اسی طرح ایسے افراد بھی ہیں جو دوسروں میں سے تناسخ کی طرح آتے ہیں لیکن بالکل علیحدہ کبھی نہیں ہوتے اور ایک طرح کے "زائد افراد" بن جاتے ہیں اور "نوآبادی" کہلاتے ہیں۔ اگر اعلیٰ جانوروں کا بھی یہی حال ہو تو مسٹر لائڈ جارج مسٹر سنوڈن سے مل کر ایک نیا فرد بن جائے اور مسٹر چرچل کے بیسیوں ٹکڑے ہوکر کوئی چرچل کتابیں لکھنے لگے کوئی نئی حکومت وضع کرے کوئی فوجیں تیار کر دے یعنی اس کی جملہ صفات الگ الگ افراد کی شکل میں ظاہر ہوجائیں۔

لیکن حیاتیات کا ماہر ہمیں یقین دلاتا ہے کہ اعلیٰ طبقے کے جانوروں ملنے جُلنے یوں ٹکڑے ٹکڑے ہوجانے اور اپنے آپ کو یوں پھیلا دینے کی صلاحیت کھو چکے ہیں۔ وہ بہت ہی منفرد ہو چکے ہیں۔ وہ خود متحد ہوکر اپنے آپ میں کھچ کر کائنات سے زیادہ الگ ہوجاتے ہیں لیکن اکثر جانوروں کا حال اس سے دگرگوں ہے اور زندگی کا عام رستہ اس سے جداگانہ ہے۔ لیکن گو ہم بہت منفرد ہستیاں ہیں حیاتیات کا یہ ماہر بتاتا ہے کہ ہماری نوع کی مخلوق بھی قطعاً منفرد نہیں۔ وہ تمہیں بہت سی ایسی مثالیں بتلائے گا جن میں بھیڑوں اور بلیوں اور کتوں اور انسانی بچوں کے پیدائش کے وقت ایک جسم پر دو سر یا دو جسموں پر محض ایک سر تھا۔ غور کرو کہ جہاں دو سر ہوں وہاں فرد کہاں ہوتا ہے؟ اور پھر وہ تمہیں سمجھائے گا کہ اپنے جسمانی وجود کے بہت سے حصے سے ہم عقلی نا آگاہ ہیں۔ ہمیں خبر ہی نہیں ہوتی کہ ہمارے اندر کیا کچھ ہے جب تک ہمیں گفتگو اور اسباق اور کتب سے اس کا پتہ نہ چلے اور جب تک کوئی درد نہ اُٹھے ہمیں معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ہمارے اندر کیا ہو رہا ہے اور نہ ہمیں اس کا کچھ احساس ہوتا ہے واقعہ یہ ہے کہ ہماری خصوصی انفرادیت ہمارے اندرونِ جسم تک نفوذ نہیں کرتی۔

اور اگر تم اس ماہر سے یہ کہانی سننے جاؤ گے تو وہ تم کو بتائے گا کہ ہمارے جسم کے مواد میں اور خون کی نالیوں میں لاکھوں ننھے ننھے جاندار ہمارے جسموں میں یوں چلتے پھرتے ہیں جیسے لوگ کسی شہر کے گلی کوچوں اور گھروں میں گھومتے ہیں۔ یہ ننھی ہستیاں یہ جیسے بیماریوں کے جراثیم کے جانی دشمن ہیں یہ خوراک اور ہوا لاتے اور لے جاتے ہیں نیز اور بہت سے مفید کام کرتے ہیں۔ ہم ایسے لاکھوں ننھے جانداروں سے مرکب ہیں کچھ اُسی طرح جیسے شہر اور قومیں ہم جیسے لاکھوں وجودوں سے بنتی ہیں۔ بات یہ ہے کہ انفرادیت کے مختلف درجے اور قسمیں ہیں انفرادیت کچھ ایسی سادہ شے نہیں جیسی اکثر لوگ سمجھے ہوئے ہیں۔

پھر جب ہم حیاتیات سے منہ پھیر کر آج کل کے ماہر نفسیات کی طرف توجہ کرتے ہیں تو ہمیں اپنی اس انفرادیت کے متعلق جو بادی النظر میں ایک سادہ سی شے ہے اور بھی عجیب و غریب انکشافات کا پتہ چلتا ہے۔ وہ ہمیں ایسے نفوس کا حال بتاتا ہے جو منقسم ہوکر ایک دوسرے کے بالمقابل بن جاتے ہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ تم نے منقسم شخصیت کی مثالیں پڑھی ہیں یا نہیں وہ غایت درجہ دلچسپ ہیں۔ وہ شاذ و نادر وقوع میں آتی

ہیں لیکن اُن کا وجود حقیقی ہے۔ مثلاً بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو فی الفور بھول جاتے ہیں کہ وہ کون ہیں۔ فرد اپنے سے الگ ہو کر کوئی اور فرد بن جاتا ہے۔ "خواب آوری" (ہپناٹزم) سے ایسا ہو جاتا ہے۔ خون بھی یہ اثر پیدا کرسکتا ہے۔

لیکن یہ بات بغیر خواب آوری یا سودا کے بھی ممکن الوقوع ہے۔ ایک ہی دماغ اور ایک ہی جسم میں یہ ممکن ہے کہ پہلے ایک اور پھر دوسری شخصیت برسرِ اقتدار ہو جائے۔ تم نے شاید سٹیونسن کی مشہور کہانی "ڈاکٹر جیکل یا مسٹر ہائڈ" پڑھی ہوگی جہاں ایک دوائی کے اثر سے ایک اسی قسم کا واقعہ ظہور میں آتا ہے لیکن یہ تبدیلی اصلی واقعات میں بغیر دوائی کے بھی عمل میں آتی ہے۔ ہم میں سے کئی شخص ایک حد تک ایسی ہی تبدیلیوں سے متاثر ہوجاتے ہیں۔ مثلاً ہم میں سے کتنے ہیں جن کے نفس میں ایک نصف بہتر اور ایک نصف بدتر نہیں؟

میں نے حیاتیات اور نفسیات سے یہ حقائق مختصر طور پر اس غرض سے لئے ہیں تاکہ تمہیں یہ بتا سکوں کہ کس لئے مجھے اس امر میں انتہائی شک و شبہ ہے کہ میرا یہ ایچ جی ویلز واقعی ایک ایسا پورا خود مختار علیحدہ اور متمیز وجود ہے جیسا کہ ہم اُسے سمجھنے کے خوگر ہیں۔ شاید میری "انفرادیت" میری شخصیت اصل سے زیادہ متمیز نظر آتی ہے یا یوں کہو کہ شاید وہ ایک آرام دہ حیوانیاتی سراب ہے۔

اگر میرے پاس وقت ہوتا تو میں اپنے اس اعتقاد کے ثبوت میں بہت سے واقعات پیش کرسکتا جن سے ظاہر ہوتا کہ انفرادیت کس طرح ارتقا کے دوران میں ظاہر ہوئی ہے اور کیسے ہر فرد ایک نوع کا تجربہ ہے جو فطرت کبھی ان اور کبھی اُن اوصاف کی آزمائش کے لئے عمل میں لاتی ہے۔ ان بیشمار واقعات کو میں نے جولیئن ہکسلے اور اپنے بیٹے جی پی ویلز کی اعانت سے اپنی ضخیم تصنیف "حکمتِ حیات" میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

اب میں اس مسئلے یعنی "میں کیا ہوں؟" اور "تم کیا ہو؟" کی ایک اور شق کی طرف تمہیں متوجہ کرتا ہوں۔ اپنے اندر دیکھو۔ تم اپنے سے اپنی مطابقت کے متعلق کیا خیال کرتے ہو؟ اچھا لو میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میرا ایچ جی ویلز کے متعلق کیا خیال ہے؟ میں تم کو بتانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ اُس کا بیشتر حصہ مردہ ہے اور بے معنی اور میں نے یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ خیال جو اس وقت تم سے بول رہا ہے ایچ جی ویلز سے بہت زائد ایک شے ہے اور جب سوال معائنۂ باطن کرنے کا پیدا ہوتا ہے تو مجھے بلاشک و شبہ محسوس ہوتا ہے کہ میں اس فرد ایچ جی ویلز سے الگ ایک نہایت متمیز شے ہوں جو کھاتا اور سوتا اور دنیا میں ادھر اُدھر بھاگتا دوڑتا ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ میں اس سے کچھ اس طرح وابستہ ہوں جیسے ایک کشتی ایک تیرتے ہوئے لنگر سے۔ اس کے علاوہ مجھے اس کی آواز سے بولنا اس کی آنکھوں سے دیکھنا اور اس کے درد سے چیخنا پڑتا ہے۔ وہ ہی دریچہ جس میں سے مجھے دنیا نظر آتی ہے اور وہی ہے میرا ذریعۂ گفتگو۔ مجھے اُس کے دماغ میں خیال کرنا پڑتا ہے اور اُس کی یادداشتوں کا ذخیرہ ہی میرا کتب خانہ ہے جس سے مجھے اپنی معلومات حاصل ہوسکتی ہیں مجھے شبہ ہے کہ بغیر اُس کے میں بطور ایک فرد کے خیال یا احساس یا عمل کر بھی سکتا ہوں یا نہیں۔ لیکن باایں ہمہ میں محسوس کرتا ہوں کہ میں وہ نہیں ہوں۔

مجھے اُس سے گہری دلچسپی ہے۔ میں اُسے جتنا میرے بس میں ہے صاف رکھتا ہوں اور میں ہمیشہ دھیان رکھتا ہوں کہ وہ کشیدہ یا اداس یا سُست نہ ہوجائے گو میں ہمیشہ اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوتا۔ میں پسند کرتا ہوں کہ مجھ سے کہا جائے کہ وہ ایک اچھا اور غیر معمولی آدمی ہے ایسے ہی جیسے میں یہ چاہتا ہوں کہ مجھ سے کہا جائے کہ تمہاری موٹر کار بہت اچھی ہے۔ لیکن بعض اوقات میں کسی قدر چاہتا ہوں کہ میں کسی طرح اُس سے دور بھاگ

سکوں خدا جانتا ہے بعض دفعہ یہ خواہش بہت زور پکڑتی ہے۔ وہ کئی باتوں میں بھدا ہے اور بدصورت۔ اُس کی جبلتیں اور اشتہائیں شرمناک ہیں۔ اُس میں کئی بار اضمحلال کے نشان صاف نظر آنے لگتے ہیں۔ اس کے کتب خانے کی ترتیب اور اُس کے دماغی خانوں کا کام یقیناً بہتر ہوسکتا ہے لیکن ایک وہی وہ ہے جس سے میں دنیا کے ساتھ تعلق قائم رکھ سکتا ہوں جب وہ چل دے گا تو میں بھی چل دوں گا۔ پھر میں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جاؤں گا۔

میرا اپنے نفس سے علیحدگی کی اس حس کا خیال کوئی نیا خیال نہیں بلکہ اکثر لوگ اس حالت میں پہنچ جاتے ہیں۔ جب ہم جوان ہوتے ہیں تو ہم بڑے شد ومد سے اپنے آپ کو اپنے آپ سے بالکل متحد سمجھتے ہیں۔ ممکن ہے یہ ایک حیوانیاتی ضرورت ہو لیکن جوں جوں ہم عمر میں بڑھتے ہیں اور پختگی حاصل کرتے ہیں یہ علیحدگی بڑھتی جاتی ہے۔ نوعِ انسان کی تاریخ میں علیحدگی کی اس حس کا عہد بہ عہد سراغ ملتا ہے۔ لوگ بولنے والے جزو کو روح پکارتے آئے ہیں اور بستر دجزو کو جسم لیکن میرا نقطۂ نگاہ اس سے کچھ مختلف ہے۔ وہ ایچ جی ویلز جو میرے سامنے موجود ہے جتنا وہ ایک ذہنی وجود ہے اتنا ہی وہ جسمانی بھی ہے۔ وہ ہے تمام کی تمام منفرد وغرقِ ذات شخصیت۔ اپنے متعلق میرا احساس ایک خیال ہونے کی حس سے متعلق ہے کہ میں خیال کے ایک عظیم الشان عمل کا جزو ہوں جو کسی ننھے سے جاندار کی طرح اپنے ہی انڈے کی جھلّی میں پھنسا ہؤا ہو ایک حد سے زیادہ پختہ حد سے زیادہ تند اور حد سے زیادہ محدود وانانیت میں مقید ہے۔

میرے خیال میں جو کچھ میں یہاں کہہ رہا ہوں وہ عام رسمی مسیحیت کا نقطۂ نظر نہیں۔ رسمی مسیحیت اصرار کرتی ہے کہ ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جوں کے توں رہتے ہیں۔ میرا ایمان رواقیت سے کچھ ملتا جلتا ہے۔ قدیم رواقیت موجودہ حیاتیات کی روشنی میں نظر آتی ہوئی۔ مجھے اس پر قطعاً یقین نہیں کہ ایچ جی ویلز کا جسم یا اُس کی شخصیت غیر فانی ہے لیکن ہاں میرا یہ اعتقاد ضرور ہے کہ خیال علم اور ارادے کا وہ روز افزوں عمل جس کے ہم تمام اجزا ہیں جس کا میں ایک جزو اور جس کے تم بھی ایک جزو ہو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ وسعت اور قوت میں ہمیشہ کے لئے بڑھتا چلا جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ انسان غیر فانی ہے مگر افراد غیر فانی نہیں۔

یہ ہے میرا ایمان اور میں نے اسے تمہارے سامنے واضح طور پر بیان کر دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ انسان' وہ اصلی انسان جو ہمارے اندر موجود ہے' انفرادی زندگی کی تمام اشیا سے زیادہ اہم وجود ہے اور میرا یہ اعتقاد محض ایک دھندلا اعتقاد نہیں بلکہ ایک حیاتیاتی اور ذہنی امر واقع کا پورا پورا صحیح بیان ہے۔ ہماری انفرادیت گویا ہمارا ایک پیدائشی جنون سا ہے جس سے ہم زیادہ فہیم ہو جانے کے بعد رہائی پالیں گے۔ ہم عقل میں ترقی کرتے ہوئے ضرور اس قید سے آزاد ہو جائیں گے اس لئے عقل کی پختگی کے ساتھ ہم خوب جان لیتے ہیں کہ ہماری ہر انفرادی خواہش بالآخر پیری' نقاہت اور موت کے ہاتھوں شکست پاتی ہے شخصیت یا انفرادیت ایک حیاتیاتی ہتھکنڈا ہے جو دورانِ ارتقا میں اپنا کام پورا کر چکا ہے اور اب اس کا خاتمہ ہونے والا ہے۔ نسل کی غیر فانی روح کا احساس جو ہماری اپنی ذات سے بالاتر ہے۔ وہ اب ہماری زندگیوں کی رہبری کر رہا ہے۔

اگر میرے پاس کافی وقت اور قابلیت ہوتی تو میری خیال میں میں یہ بات صریح طور پر ثابت کر سکتا کہ نسل کی غیر فانی روح کا یہ تصوّر جس میں ہماری

اپنی زندگیاں گزر جانے والے خیالات کی طرح ہیں وہی ہے جسے کنفیوشس فردِ ممتاز، سینٹ پال "آدم جدید" رواقی "عقلِ کل" اور حال کے مفکرین انسانِ عظیم پکارتے ہیں۔

لیکن اس اعتقاد سے کہ ہمیں اپنی ذات کو ایک زیادہ اعلیٰ وجود کا تابع بنانا چاہیئے۔ یہ ہرگز لازم نہیں آتا کہ ہم میں سے کوئی مخصوص انفرادی اوصاف کو ملیامیٹ ہو جانے دے۔ بلکہ لازم ہے کہ ہم اپنے آپ کو انتہائی حد تک استعمال کریں اور جہاں تک ممکن ہو ہم نئی باتیں سیکھیں اور نئے طریقے وضع کریں۔ اُس قابلیت اور اُس انفرادی وصف کو جو ہمیں وجودِ اعلیٰ یعنی انسان کی ترقی کے لئے عطا ہؤا ہے زندہ درگور کر دینا ایک گناہ ہے۔

اور نہ نسل کے غیر فانی وجود کے لئے اپنی ذات کے ایثار کرنے سے یہ سمجھنا چاہیئے کہ ہم اپنی چھوٹی سی ذات کو اوروں کے ایسے ہی چھوٹے چھوٹے وجودوں کا تابع بنا دیں۔ ان کا بھی ایسا ہی فرض ہے کہ وہ اُس نسل کے وجود کے لئے اور علم و قوت کی افزائش کے لئے اپنا آپ پیش کریں۔ میں اس قسم کا جمہوریت پسند نہیں ہوں جو اپنے عقل و ارادہ کو "زیادہ سے زیادہ افراد کی زیادہ سے زیادہ خوشی" یا اکثریت کے ارادے یا کسی ایسے ہی لغو نظریے پر قربان کر دے یا اُس کا ایک شمہ بھی یوں ترک کرے۔ یہ دنیا اور اُس کا مستقبل کمزور لوگوں کے لئے نہیں نہ وہ خود غرض لوگوں کے لئے ہے۔ وہ عوام کالانعام کے لئے نہیں بلکہ بہترین انسانوں کے لئے ہے۔ جو آج بہترین ہے وہی کل عام ہو جائیگا۔ اگر میں معاشرت میں مساوات کا علمبردار ہوں تو اس لئے نہیں ہوں کہ احمقوں کو مزے اڑانے میں مدد دوں بلکہ اس لئے کہ یہ مواقع کو سب کے لئے سہل الحصول کر دینا چاہتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ کسی شخص کو بھی جس میں کوئی جوہر ہو نظر انداز نہ کیا جائے۔ اگر میں معاشی تبدیلیاں چاہتا ہوں تو محض اس لئے کہ موجودہ نظام بیشمار مُسرف لوگوں کی اعانت اور ہمت افزائی کرتا ہے جو عوام الناس سے اپنے اوصاف میں کسی طرح بہتر نہیں بلکہ جو اپنی کاہل بہانہ ساز روایات کی وجہ سے اُن سے بدرجہا بدتر ہیں۔ اگر میں قومیت اور جنگ کا مخالف ہوں تو محض اس لئے نہیں کہ ان میں بہت سی انسانی توانائی ضائع ہو رہی ہے بلکہ زیادہ تر اس لئے کہ اُن کی وجہ سے اندھا دھند تقلید اور وفاداری کی لغویات کے علاوہ فوجی جھنڈوں اور وردیاں اور جلوسوں کی نمائش میں ہزاروں شریر النفس خبیث بدمعاش پھولتے پھلتے ہیں اور اس لئے کہ اُن کے باعث ہماری زندگیاں تربیت یافتہ قواعد دان جہلا کے بس میں آ جاتی ہیں جنگ و جدال بچوں کی سی باتیں ہیں بلکہ بچوں کی باتوں سے بدرجہا بدتر۔ اُن کا قلع قمع کرنا چاہیئے۔ اُن کو ملیامیٹ کرنا لازم ہے۔ میرا مطمحِ نظر سیاسیات میں ایک کھلی ہوئی سازش کا قائم کر دینا ہے، جو اِن بے ہودہ قبیح اشیا کا جلد سے جلد خاتمہ کر دے جو اس سلطنت اور اُس سلطنت غرض سب سلطنتوں کو مٹا کر انسان کی عالمگیر سلطنت کی بنا ڈالے!

اور میرے لئے فطری بات ہے کہ میں سائنس کا مداح بنوں۔ سائنس کی دنیا میں ہیں اعلیٰ مقاصد کے لئے وہ بے غرض انہماک پاتا ہوں جو مجھے امید ہے کہ ایک روز تمام کے تمام انسانی کاموں میں مصروفِ کار نظر آئے گا۔ میں دیکھتا ہوں کہ وہاں عام انسانی علم کی ترقی کے لئے ہر نسل اور ہر رنگ کے لوگ مل جل کر کام کر رہے ہیں۔ ہم تمام سائنس کی آزاد مملکت کے شہری بن سکتے ہیں لیکن ہماری سیاسی ہماری معاشی اور ہماری معاشری زندگیاں

ابھی ہماری پیدائشی روایات کے باعث مریض و ناتواں ہیں اور اس امر کی سخت ضرورت ہے کہ سائنس اُن کی رہنما بنے اور سائنس کی رُوح اُن کو اپنے نور سے روشن کردے۔

جتنی گنجائش مجھے اپنے خیالات کے اظہار کے لئے دی گئی تھی وہ ہو چکی۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ اپنا عقیدہ بیان کر دو میں نے کر دیا۔ مجھے امید ہے کہ میری باتیں تمہیں دلچسپ معلوم ہوئی ہوں گی اور میں نے کسی طرح تمہارے جذبات کو ٹھیس نہ لگائی ہوگی۔ میری کوشش ہے کہ میں اسی طرح زندگی گزاروں اور اسی طرح میں اس قابل بھی ہوا ہوں کہ میں نے اپنی حرص و ہوا اپنے بیم و خوف اپنے جذبات و شہوات اور اپنے عجب و خود پسندی پر جن کا میں اوائلِ عمر میں شکار رہا کچھ قابو پا لیا ہے اور اب میں موت سے قطعاً بے خوف ہوں۔

زندگی میں شریک ہونا بھی کیا پُر لطف ہے۔ جیسے ایک دھوپ گھڑی صرف روشن ساعتوں کا شمار کرتی ہے ایسے ہی زندگی کو بھی صرف یہ خبر ہوتی ہے کہ وہ زندہ ہے۔ زندگی میں ہزاروں تجربے ہوتے ہیں لیکن ایک تجربے سے ہم کبھی شناسا نہ ہوں گے۔ ہم کبھی نہ جانیں گے کہ ہم مر چکے ہیں یقین جانو کہ میرا اعتقاد ناخوشی پیدا کرنے والا نہیں بلکہ میرے لئے یہ سُودمند ثابت ہُوا ہے۔ کاش اے نوعِ انسان کے دوسرے حصو! کاش تم مجھے بتا سکتے کہ تمہارا اس کے متعلق کیا خیال ہے۔

بشیر احمد

پیغمبرِ اسلام کا بچپن

غالباً آپ کی عمر دس بارہ برس کی ہوئی تو آپ نے بکریاں چرائیں۔ یہ عالم کی گلہ بانی کا دیباچہ تھا۔ زمانۂ رسالت میں آپ اس سادہ اور پُر لطف مشغلہ کا ذکر فرمایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ آپ صحابہؓ کے ساتھ جنگل تشریف لے گئے صحابہؓ جھڑبیریاں توڑ توڑ کر کھانے لگے۔ آپ نے فرمایا جو خوب سیاہ ہو جاتے ہیں زیادہ مزے کے ہوتے ہیں۔ یہ میرا اُس زمانہ کا تجربہ ہے جب میں بچپن میں یہاں بکریاں چرایا کرتا تھا۔



شبِ عروسی

کسی شادی کی تقریب میں چند ایسی نوعمر لڑکیاں جمع ہوئیں جن کی شادیاں حال ہی میں ہوئی تھیں شادی کی تقریب میں ذکر شادی کے سوا بہترین موضوع اور کیا ہوسکتا ہے؟ بیکاری کا مشغلہ یہی طے پایا کہ ہر ایک اپنی اپنی شادی کا واقعہ بلاکم وکاست بیان کرے اس متفقہ تصفیے کے بعد ہر ایک نے اپنی ہمسن سہیلیوں کے سامنے اپنی اپنی داستان بیان کی۔

یوں تو ہر بیان دلچسپ تھا، اور ہر داستان رنگین لیکن ان سب میں سب سے کمسن اور سب سے خاموش گھمنی عائشہ نے انتہائی انکار کے بعد رک رک کر اور چبا چبا کر جو اپنی کیفیت بیان کی ہے اس کو سن کر ایک کیفیت سی پیدا ہوتی ہے آپ بھی سن لیجئے۔

میری بہنو! میری جب نسبت ہوئی — کیا بتاؤں دل کی کیا حالت ہوئی

رات دن رونے سے مجھکو کام تھا — آہ و نالہ شغل صبح و شام تھا

چوں خدا خواہد بما یاری کند — میل مارا جانبِ زاری کند

نیم جاں بستاند و صد جاں دہد — آنچہ در وہمت نیاید، آں دہد (مولوی روم)

نام سے شادی کے وحشت ہوگئی — کھانے پینے سے بھی نفرت ہوگئی

میں، اصولِ معرفت سے بھر گئی — یعنی، موت آنے سے پہلے مر گئی[1]

روح میری خوف سے گھٹتی رہی — زندگانی ضیق میں کٹتی رہی

الغرض، وہ دن بھی آخر آگیا — میرے سر پر غم کا بادل چھا گیا

عقد کے دن کا سویرا آگیا — میری آنکھوں میں اندھیرا آگیا

آج گویا ختم راحت ہوگئی — ہوگئی صبحِ قیامت ہوگئی



[1] موتوا قبل ان تموتوا ۱۲

دل کے کانٹے چننے والا کون تھا، آہ، میری سننے والا کون تھا،

غیر کے دامن سے میں باندھی گئی جان سو سو مرتبہ، آئی، گئی،
وہ مجھے سب سے چھڑا کر لے چلے لے چلے سب کو رلا کر لے چلے

الفراق، اے میری مادر، الفراق الفراق اے جانِ خواہر الفراق
اے مری دیوار و در تجھ کو سلام، اے مرے بچپن کے گھر تجھ کو سلام
وقت آخر، ہے یہی آخر کلام اے مری ہمجولیو! تم کو سلام
میں نے جب رکھا نئے گھر میں قدم خوف سے اُکھڑا ہوا تھا میرا دم
میں ابھی سنبھلی نہ تھی وہ آگئے غالباً کچھ میری حالت پا گئے
بولے ہیں؟ گھبرانے کی کیا بات ہے یہ تو وصل جسم و جاں کی رات ہے
چاہنے والے سے کیوں برہم ہو تم میرے زخموں کے لئے مرہم ہو تم
باتوں ہی باتوں میں جادو کر دیا ایک ہی چلو میں اُلّو کر دیا
اب تو جیتی ہوں، انہیں کے نام سے کٹ رہی ہے اب بڑے آرام سے
کیا کہوں، اب کس قدر راحت میں ہوں پیاری بہنو! میں تو اب جنّت میں ہوں
اب تو ہر شب دید ہے، ہر دن ہی عید خوف ہیں، کس کو تھی امیدِ امید

موت سے بھی اب یونہی ڈرتی ہوں میں
نام سے مرنے کے بھی مرتی ہوں میں

کیا عجب مرنے میں بھی آرام ہو،
کیا تعجب ہے بخیر انجام ہو

کیا عجب، جب بھی ہو یوں ہی انقلاب
الٹی اکثر ہوتی ہے تعبیرِ خواب

کیا عجب انکار میں اقرار ہو،
موت بھی وجہِ وصالِ یار ہو

اے اجل! اے ساعت عشرت قریں
زندگی کی اے وفائے آخریں

آمری جاں! تجھ پہ جان قربان ہے
ایک مدت سے ترا ارمان ہے

جی رہی ہوں صرف اب تیرے لئے
میں ہوں تیری، اور تو میرے لئے

میں جو کچھ ہوں، اور جو میرے پاس ہے
مجھ سے لے لے تجھ کو سب کچھ راس ہے

آگئی اک بار تو میرے لئے
پھول ہیں گوندھے ہوئے تیرے لئے

آ، مری آنکھوں میں آنسو بن کر آ،
چادرِ گل میں مری، تُو بن کر آ

اب تو میری جان تیرے ساتھ ہے
اب تو میری لاج تیرے ہاتھ ہے

اپنا بیگانہ نہ ہوگا جب کہ سات
لوگ جس کو کہتے ہیں "جلوے کی رات"

میں کنول بن کر کھلوں گی رات میں،
اپنے مالک سے ملوں گی رات میں،

احمد حسین امجد

دنیا کا پہلا انقلابی رہنما

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ آزادی، اخوت اور مساوات کی خاطر پہلی جنگ یورپ میں ہوئی اور اس کے علمبردار فرانس کے انقلاب پسند فلسفی روسو، والٹیر اور مانٹیسکیو تھے لیکن یہ درست نہیں انقلابِ فرانس ۱۷۸۹ء میں رونما ہوا اور اس طرح جدید یورپ کی پہلی جمہوریت کی بنا پڑی اس سے دو ہزار سال پہلے فلاطون نے یونان میں جمہوری حکومت کی تلقین شروع کی تھی اور ایک ایسے نظام کا خاکا تیار کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا جس کے ماتحت ایک فلسفی اپنے ملک کو جنتِ ارضی سمجھ سکے۔ بدقسمتی سے وہ نرا فلسفی تھا۔ اس کی تجاویز ناقابلِ عمل تھیں۔ عام لوگ اس کی حمایت کرنا تو درکنار اس کے فلسفیانہ خیالات کو سمجھ بھی نہ سکتے تھے۔ اس لئے فلسفہ اور ادب کا وہ شاہکار جس کی تعریف کرتے ہوئے بہترین نقادوں کی زبانیں خشک ہوتی ہیں، حرفِ غلط کی طرح نظرانداز کردیا گیا۔ فلاطون کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی لیکن دنیا کے ایک دور افتادہ گوشے میں اس کا ایک چینی ہمعصر صاف الفاظ میں اپنے ہم وطنوں کو جمہوریت کا سبق دے رہا تھا۔ لوگ اس کی سادہ تعلیم سے متاثر ہوکر خود بخود اس کی طرف کھنچے آتے تھے اور آہستہ آہستہ اس کے جابر بادشاہ کا سر بھی اس کے آگے جھک رہا تھا۔ ایشیا کا یہ مایۂ ناز فرزند پہلا شخص تھا جو محکوموں کے حقوق کے لئے سینہ سپر ہوا اور جس کی زندگی والٹیر اور مانٹیسکو کے لئے شمعِ ہدایت بنی۔

یہ استاد سیاست منگ زے ایا منگ فلسفی تھا۔ اہلِ یورپ اسے "مِن سی اس" کہتے ہیں جو اس کے نام کی لاطینی شکل ہے۔ اسے دنیا کے فلسفیوں میں وہی درجہ حاصل ہے جو دیوارِ چین کو عجائباتِ عالم میں۔ چینی اس کی ذات پر اسی طرح فخر کرتے ہیں اور غیر ملکوں کے لوگ اسے اسی طرح حیرت اور احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں جیسے دیوارِ عظیم کو۔

منگ زے کی عظمت اور شہرت میں اس کی ماں چنگ شائی کی تعلیم کو بڑا دخل ہے اور اس بات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بچے کا پہلا مدرسہ ماں کی گود ہے۔ چنگ شائی کو ابتدا ہی سے یقین تھا کہ قدرت نے اس کے بیٹے کو کسی عظیم الشان مقصد کی تکمیل کے لئے پیدا کیا ہے۔ اور شروع ہی سے اس کی یہ کوشش تھی کہ ہر وہ چیز جو کسی طرح اس کے بیٹے کے لئے سنگِ راہ ہو دور کردے۔ چینی عورت میں بڑا وصف اس کی پیش بینی ہے، وہ یہ خیال کرتی ہے کہ اسے ایک دن ماں بننا ہے اور ہر کام جو وہ کرتی ہے اس کے بچے کی زندگی پر اثر ڈالے گا۔ اس احساس سے وہ اپنے آپ کو عصمت اور نیکی کا نمونہ بنانے کی کوشش کرتی ہے اور یہ امید رکھتی ہے کہ اس کے جوہر اس کے بچے کی زندگی میں چمکیں گے۔

منگ ۳۷۲ء قبل مسیح میں چین کے شمالی صوبہ شانٹنگ میں پیدا ہوا، جب وہ صرف تین سال کا تھا تو باپ کا سایہ اس کے سر سے اُٹھ گیا اور اس کی پرورش و تربیت کا بار اس کی ماں کے نازک کندھوں پر پڑا۔ چنگ شائی کے پاس دولت نہ تھی کہ منگ کو ناز و نعمت سے پالتی اس کے

پاس صرف اتنا سرمایہ تھا جو بہ مشکل ضروریاتِ زندگی کے لئے کافی تھا لیکن اُس نے ہمت نہ ہاری اور قسم کھائی کہ چاہے پیٹ پر پتھر باندھ کر بسر کرنی پڑے لیکن میں ضرور اپنے بیٹے کو بڑا آدمی بناؤں گی تاکہ وہ میرے محبوب شوہر کا نام روشن کرے۔

افلاس کی وجہ سے منگ اور اس کی ماں کو مجبوراً ایک قبرستان کے پاس رہنا پڑا۔ ننھا منگ ہر روز مردوں کی تجہیز و تکفین کی رسوم دیکھا کرتا تھا اور اُن کی نقل اتارا کرتا تھا۔ اس کی ماں جان گئی کہ اس کا اثر اس کی زندگی کے لئے مہلک ثابت ہوگا، اس لئے وہ اسے ساتھ لے کر شہر میں جا رہی۔ ان کا مکان بازار میں واقع تھا اور فضا قبرستان کی طرح یاس انگیز نہ تھی لیکن یہاں بھی ایک دقت پیش آئی۔ معاملاتِ تجارت کا مشاہدہ منگ کے دل و دماغ کی نشو و نما کے لئے مناسب نہ تھا۔ شہر میں جھوٹ کا بازار گرم تھا، سوداگر اپنی اشیا کی تعریف میں بے سروپا باتیں کہنے سے دریغ نہ کرتے تھے اور گاہک بھی قیمت کم کرانے کے لئے ہر قسم کی غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے نہ شرماتے تھے۔ چنگ شائی نے دیکھا کہ جہاں لوگوں کی گزر اوقات ہی جھوٹ پر ہو وہ جگہ اس کے ہونہار بیٹے کے لئے مناسب نہیں۔

انہوں نے ایک دفعہ پھر مکان تبدیل کیا اور اب کی بار انہیں ایک مدرسے کے پاس رہنے کو جگہ مل گئی۔ منگ ہر روز علما کی نشست و برخاست کو غور سے دیکھتا۔ ان کی تقریریں سنتا اور ان کے نصائح کو دل میں جگہ دیتا۔ اس طرح اسے آدابِ مجالس اور اخلاقی اصولوں سے آگاہی ہوتی گئی۔ چنگ شائی کو اطمینان ہوگیا کہ اب منگ کے لئے شہرت کا راستہ بالکل صاف ہے۔

غریبی ایک بار پھر سدِ راہ ہوئی۔ چنگ شائی کو اتنی بھی مقدرت نہ تھی کہ گوشت خرید سکے، اس پر ستم ظریفی یہ کہ ایک قصاب کی دکان بھی پاس ہی تھی۔ ایک دن منگ نے پوچھا "اماں! قصاب جانوروں کو کیوں ذبح کرتا ہے"۔ ماں کے منہ سے نکل گیا "بیٹا! اس لئے کہ تم کھاؤ"۔ یہ کہہ کر وہ پشیمان ہوئی کیونکہ اسے احساس تھا کہ اس نے نادانستہ جھوٹ بولا ہے اور اسے دیکھ کر منگ کو بھی جھوٹ بولنے کی عادت پڑ جائے گی۔ اس لئے اُس نے محنتِ شاقہ سے اتنی رقم مہیا کی جس سے وہ اسے گوشت خرید کر کھلا سکے اور اپنی بات سچ کر دکھائے۔

بچپن میں منگ کتابوں کی طرف کم توجہ دیتا تھا جس سے اُس کی ماں کو بہت رنج ہوتا تھا۔ ایک دن جب وہ سوت کات رہی تھی وہ اس کے پاس آیا، ماں نے پڑھنے کے متعلق پوچھا تو اُس نے لاپروائی سے جواب دیا "اچھا! دیکھا جائیگا، کتابوں میں رکھا ہی کیا ہے؟" چنگ شائی نے طیش میں آکر چاقو لیا اور سوت کی انٹی کو کاٹ دیا۔ منگ متعجب ہوا اور پوچھنے لگا کہ اس حرکت کا کیا مطلب ہے۔ اُس کی ماں نے کہا "دیکھتے ہو جو کچھ میں نے اس سوت سے کیا وہی تم اپنی زندگی سے کر رہے ہو۔ تم ان امیدوں کو منقطع کر رہے ہو جو تم سے وابستہ ہیں"۔

یہ نصیحت کارگر ہوئی اور اس کے بعد چنگ شائی کو کبھی یہ شکایت نہ ہوئی۔

تعلیم ختم کرنے کے بعد منگ نے رفاہِ عامہ کی طرف توجہ مبذول کی لیکن حالات اس کے لئے بہت حوصلہ شکن ثابت ہوئے۔ ایک دن وہ غم وغصہ کی حالت میں ایک ستون کے ساتھ کھڑا تھا اس کی ماں نے پریشانی کی وجہ پوچھی۔ منگ نے ناقدریٔ زمانہ کی شکایت کی۔ اسے اس بات کا افسوس تھا کہ بادشاہ اپنے فرائض سے غافل تھا' ارکانِ سلطنت بے دریغ رشوت لیتے تھے اور عدل وانصاف کو قائم کرنے کے لئے کوئی کوشش نہ کرتے تھے۔ منگ زانے اصلاحات کے نفاذ کے لئے جاں توڑ کوشش کی لیکن اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ آخر کار اس نے ترکِ وطن کا ارادہ کیا لیکن وہ اپنی ضعیف ماں کو چھوڑنا نہ چاہتا تھا اور کمزوری کی وجہ سے اسے ساتھ لے جانا بھی مشکل تھا۔ اسے خیال تھا کہ اس کی ماں ہرگز اس کا ساتھ دینے پر رضامند نہ ہوگی لیکن چنگ شائی نے اس کی ڈھارس بندھائی اور اپنی فراخدلی اور بلند نظری کا ثبوت ان الفاظ میں دیا۔

عورت کے لئے یہ مناسب نہیں کہ مرد کے حکم سے سرتابی کرے، بچپن میں اس کا فرض والدین کی اطاعت ہے۔ شادی کے بعد اس کا شوہر اس کا مختار ہے اور رنڈاپے میں اسے چاہیئے کہ اپنے بیٹے کی خوشنودی کو اپنی خواہشات پر ترجیح دے، تمہارا ضمیر تمہیں جس بات کی اجازت دے اس پر مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ آزادی کی جنگ میں بوڑھی اماں کا کچھ غم نہ کرو اور خدا کی راہ میں جان لڑا دو!

منگ زا کی ہمت بندھ گئی اور وہ پورے زور وشور سے ملوکیت کی مخالفت میں مصروف ہو گیا۔ اس نے ملک کی دردناک حالت کے متعلق ایک پرجوش خط بادشاہ کو لکھا جس میں وہ لوگوں کے افلاس کا بیان ان رقت انگیز الفاظ میں کرتا ہے:-

"امرا کے باورچی خانوں میں لذیذ اور مرغن کھانے پک رہے ہیں اور ان کے اصطبل میں موٹے تازے گھوڑے بندھے ہیں لیکن غریب سوکھے ٹکڑوں کو ترس رہے ہیں اور صحراؤں میں بھوکے آدمیوں کے پنجر پڑے ہوئے ہیں اگر یہی حالت رہی تو وہ دن دور نہیں جب جنگلی جانور انسانوں کو اور انسان ایک دوسرے کو کھانے دوڑیں گے"

اس خط سے بادشاہ کے دل پر منگ زا کا رعب بیٹھ گیا اور اسے اپنے مصاحبوں میں شامل کر لیا لیکن منگ زا نے یہ نہ چاہا کہ اپنا ایمان درباری خلعت کے بدلے فروخت کر دے۔ اس لئے اس نے کبھی بادشاہ کی بے جا خوشامد نہ کی بلکہ ہمیشہ اپنی وضعداری کا پاس کیا۔ ایک دفعہ جب وہ بادشاہ سے ملاقات کرنے کے لئے درباری لباس پہن رہا تھا تو اسے یہ پیغام ملا۔ کہ آج اعلیٰ حضرت کی طبیعت ناساز ہے اس لئے کل تمہیں شرفِ باریابی بخشا جائے گا۔ منگ نے اس بات کو خلافِ شان سمجھا اور الٹا جواب کہلا بھیجا کہ بندہ علیل ہے اس لئے حاضر نہ ہو سکا۔ اگلے دن وہ دربار میں جانے کے بجائے ایک دوست سے ملنے چلا گیا۔ اس طرح اس نے بادشاہ کی نخوت پر ایک کاری ضرب لگائی۔

ایک دن بادشاہ نے اس سے سوال کیا کہ کیا ایک وزیر کے لئے بادشاہ کو قتل کرنا جائز ہے۔ یہ کہہ کر اس نے شہزادہ وو

کی مثال وہی جس نے ایک نالائق، ظالم اور اخلاق باختہ بادشاہ کو قتل کر دیا تھا۔ منگ زا نے جواب دیا، جو رعایا کا مال غصب کرتا ہے، وہ ڈاکو ہے! جو رعایا کی آبرو کی پروا نہیں کرتا وہ بدمعاش ہے۔ ایک ڈاکو اور بدمعاش کو قتل کرنا کوئی گناہ نہیں جو مثال آپ نے دی ہے اس سے ایک بادشاہ کا قتل ہونا ثابت نہیں ہوتا۔

تاریخ نے بار بار اس فتوے پر مہر ثبت کی ہے۔ انگلستان میں چارلس اول، فرانس میں لوئی شانزدہم اور روس میں زار نکولس کا قتل اسی ہمہ گیر اصول کے تحفظ کے لئے ہوا۔ دنیا خواہ ان واقعات کو نفرت کی نظر سے دیکھے اور انہیں وحشیانہ اور ظالمانہ کہے لیکن منگ زا کا قول تھا کہ خدا خلق کی آنکھوں سے دیکھتا اور خلق کے کانوں سے سنتا ہے اور جو فیصلہ جمہور کے نزدیک مستحسن ہو خدا بھی اس سے خوش ہوتا ہے۔

منگ کے خیال میں فنونِ لطیفہ اور مذہب کی ترقی کا راز اقتصادی خوشحالی میں ہے۔ لوگ حُسن کی قدر اسی وقت کر سکتے ہیں اور خدا کی یاد بھی اسی حالت میں سچے دل اور یکسوئی سے کرتے ہیں جب انہیں پیٹ کے دھندے سے فراغت ہوتی ہے ورنہ وہ انتہائی افلاس میں فنونِ لطیفہ کے شغلہ کو اسراف اور خدا کی یاد کو غیر ضروری سمجھتا ہے۔ اخلاقی اصولوں میں وہ ماں باپ کی خدمت کو سب سے مقدم سمجھتا ہے اور اسی جذبے سے بیتاب ہو کر بادشاہ سے کہتا ہے:-

"اے بادشاہ! انسان اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ ماں باپ کا بوجھ ہلکا کرے۔ رونے کا مقام ہے کہ تیری رعایا کو اس کا بھی مقدور نہیں۔ جب لوگ فاقوں مر رہے ہیں تو ان سے آدابِ مجالس اور مذہب کی پابندی کی کیا توقع ہو سکتی ہے۔ ان کی حالت جانوروں کی سی ہے اور ایسی حالت میں ان پر حکومت کرنا تیرے لئے باعثِ فخر نہیں۔"

بادشاہ نے ایک دن افسوس ظاہر کیا کہ رعیت اس کی حُسن پرستی کی شاکی ہے۔ مزاج شناس فلسفی نے اس زریں موقع سے فائدہ اٹھایا اور مساوات کا وعظ کرنا شروع کیا لیکن وہ کس خوبصورتی سے اس مسئلہ کو چھیڑتا ہے۔

"بادشاہ سلامت! حسن پرستی تو ایک خداداد ذوق ہے جس سے متاثر نہ ہونا تو فطرت پر ظلم کرنا ہے لیکن افسوس ہے کہ رعیت آپ کی پیروی کرنا چاہتی ہے اور نہیں کر سکتی۔ عورتوں کا حسن بشباب تنہائی میں ڈھل رہا ہے اور کئی نوجوان دل پر پتھر رکھ کر تجرد کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کاش انہیں [illegible] کرنے اور حُسن کی صحیح طور پر قدر کرنے کی توفیق ہوتی!"

منگ شیخ سعدی کی طرح ایک مخصوص اسلوبِ بیان کا مالک ہے جس سے وہ اپنے سیاسی عقائد کی تلقین کرتا ہے، وہ ہر وقت مناسب موقع کا منتظر رہتا ہے اور گفتگو کا رخ پھیر کر اظہارِ مطلب کی طرف متوجہ ہوتا ہے کبھی وہ بادشاہ کی تعریف کے پیرایہ میں نصیحت کرنا شروع کر دیتا ہے کبھی تفریحِ طبع کے لئے دلچسپ کہانیاں سناتا ہے لیکن ان کا ماحصل ہمیشہ اس کی سیاسی حکمتِ عملی کے مطابق ہوتا ہے اُس کے فلسفیانہ کارنامے کو چین کا دستورِ سیاست کہا جا سکتا ہے اور مشرقِ اقصیٰ کی سیاسی بیداری اور چینی قوم کی حیاتِ تازہ ایک حد تک انہی کے طفیل ہے۔

عطاء اللہ کلیم۔

گاؤں

گاؤں! اے تہذیبِ انسانی کے نقشِ اولیں!
زندگی کے دورِ عمرانی کے نقشِ اولیں!

منزلِ صحرائیت کی آخری حد کے نشاں
تیرے ٹوٹے پھوٹے بیڈھنگے سے گارے کے مکاں

کہنہ دیواریں تری تاریخِ ماضی کے ورق
ترے مکتب سے ملا پہلا حضارت کو سبق

آدمی جنت سے نکلا تیرے دامن میں بسا،
اس مسرت اور آزادی کے دامن میں بسا

بحرِ وحشت کا شناور تیرے ساحل پر رُکا
دشت و صحرا کا مسافر تیری منزل پر رُکا

رہروانِ زندگی کی منزلِ اوّل ہے تو،
بارِ تہذیبِ بشر کا حاملِ اوّل ہے تو

رہنمایانِ بشر تیری ہی بستی سے اُٹھے
مہر و ماہ و انجم کیا کیا تیری پستی سے اُٹھے

یہ ترے کچے گھروندے مسکنِ اشراف ہیں
تیری جو پائیں ستونِ کعبۂ انصاف ہیں

بے ریا بھولے ترے معصوم اور سادہ مکیں
محنت و اخلاص و دلداری کے دلدادہ مکیں

روح کا سامانِ عشرت تیرے دلکش گیت ہیں
اور تری بستی کے [illegible] ہر کسی کے میت ہیں

نیند سے مخمور دلکش چاندنی راتیں تری
"پی کہاں" کے نور سے پرنور برساتیں تری

دھوپ سے آباد تیری سردیوں کی ہر سحر
چھاؤں سے دلشاد تیری گرمیوں کی دوپہر

تری صبح و شام کا سادہ مگر دلچسپ رنگ
آدمی کے دل میں بس رہ رہ کے اٹھتی ہے اُمنگ

ڈھاک کے پھول، آم کے پھل، چھاؤں ٹھنڈی نیم کی
رشک کھائے، بادشاہت اس پہ ہفت اقلیم کی

لے کے چوپایوں کے گلّے خانۂ دہقان سے — پھرتے ہیں چرواہے اک پیغمبرانہ شان سے

کھیت میں خوددار مزدور اور جفاکش محنتی — جن کا مسلک ہے عمل اور جن کا مشرب سادگی

تیرے میدانوں کی زرخیزی سے دولت شرمسار — تیرے ویرانوں کی خاموشی پہ ہنگامے نثار

حسنِ سادہ کی فسوں خیزی! الٰہی الاماں! — عشقِ صادق کی جنوں خیزی! الٰہی الاماں!

پاسدارِ عصمتِ مریم کنواری لڑکیاں — ناشناسِ فکرِ بیش و کم کنواری لڑکیاں

ناچتے ہیں گیت ان کے محنتوں کے ساز پر — چکّیوں کی منضبط اور دلربا آواز پر

اک طرف ساون میں ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار — اک طرف ان کے سریلے مست گیتوں کی بہار

سردیوں کی لمبی راتوں میں فسانہ گوئیاں — گرمیوں کی دوپہر میں باہمی دل جوئیاں

شہر کے پرشور ہنگاموں سے گھبراتا ہوں جب — رات دن کی کاہشِ پیہم سے اکتاتا ہوں جب

تیری جانب دوڑ کر بے ساختہ آتا ہوں میں — دل کا اطمینان اس ماحول میں پاتا ہوں میں

تجھ سے وابستہ مرا سرمایۂ تاب و قرار — کچھ عزیزوں کے مکاں ہیں کچھ بزرگوں کے مزار

وقت کی رفتار مجھ کو یاں نظر آتی ہے سست — جسم کی بگڑی کلیں ہوتی ہیں یاں آکر درست

زندگی کی حرکتوں میں اک سکونِ دل نواز — شادمانی خرمی کا اک فسونِ دل نواز

تیرے میدانوں کی وسعت میں مرا اپنا خیال — چار جانب دوڑتا ہے لے کے ادراکِ جمال

لطف اٹھاتا ہوں تری روشن فضا میں بیٹھ کر — گیت گاتا ہوں تری تازہ ہوا میں بیٹھ کر

میری خواہش میری آسائش. مری مرضی ہے تو
گاؤں کیا؟ میری نظر میں جنتِ ارضی ہے تو

وقار انبالوی

کاؤنٹیس رونا کا معمّا

تین زبردست محاصروں میں اپنے بقیہ ملک کو فتح کر کے اب سٹینسلاس بہت سی فوج کے ہمراہ ناقابلِ تسخیر شہر آر کے سامنے آ بیٹھا تھا کیونکہ خونخوار کاؤنٹ تھیبولٹ کی بیٹی کسی طرح اُس سے مغلوب نہ ہوتی تھی۔ وہ کہتی تھی پچاس سال تک تو میرے باپ نے بادشاہ کی اطاعت قبول نہیں کی اور نہ خراج بھیجا اب میں اس کے لئے شہر کے دروازے کیوں کھولوں' جب تک خود میرا ہی جی نہ چاہنے لگے اور جب تک میں خود ہی اپنے عزم سے باز نہ آ جاؤں۔ چنانچہ بادشاہ نے آ کر چاروں طرف سے شہر کو گھیر لیا اس طرح کہ نہ تو کوئی اندر جا سکتا اور نہ باہر۔ اس کے بعد اس نے کاؤنٹس رونا کے پاس اپنے ایلچی بھیجے اور کہا کہ "شہر میرے حوالے کر دو۔ ورنہ میں فصیلوں پر حملہ کر کے ایک طوفان برپا کر دوں گا۔ شہر کو لوٹ کر قلعۂ شہر اور سطح زمین ایک کر دیئے جائیں گے اور اُن کا نام و نشان تک باقی نہیں رہیگا۔"

کاؤنٹیس کو بادشاہ کا پیغام دے دیا گیا۔ اس وقت وہ اپنی بلند مسند پر ایک کھڑکی کے نیچے بیٹھی تھی اور سورج کی کرنیں اندر آ کر اس کے خوبصورت بالوں کو چوم رہی تھیں۔

بادشاہ سے کہہ دو ــــــ کیونکہ آخر وہ بادشاہ ہے' اگرچہ میرا نہیں ــــــ کہ ہم خوب مسلح ہیں اور ہمارے پاس ایسے ایسے جانباز موجود ہیں جن کی سپہ گری کا شہرہ دور دور تک ہے ــــــ اُسے بتا دو کہ جتنے عرصے کے لئے ہمارے پاس خوراک کا ذخیرہ جمع ہے اتنے سال اُس کے پاس حکومت کے لئے بھی نہ ہوں گے۔ اس سے پہلے کہ ہم بھوکوں مریں وہ خود تھک کر ہار جائیگا۔"

کاؤنٹیس نے اپنی گفتگو ختم کی اور شاہ کے خاص الخاص ایلچی نے جھک کر آداب بجا لاتے ہوئے پوچھا۔ "بس یہی پیغام ہے؟"

"نہیں اور سنو اُس سے یہ بھی کہہ دو کہ شہر آر میں خونخوار کاؤنٹ تھیبولٹ کی لڑکی کا راج ہے۔"

ایلچی دوبارہ آداب بجا لایا اور بولا۔ "بس یہی پیغام ہے؟"

رونا ایک لمحہ کے لئے رُکی اور پھر بولی "نہیں اور بھی ہے بادشاہ سے کہہ دینا قبل اس کے کہ وہ شہر کی فصیلوں کے اس پار آ سکے اُسے پہلے قلعے کو تسخیر کرنا ہوگا۔"

ایلچی ماتھے پر شکن ڈال کر ذرا مسکرایا اور کہنے لگا "حضور کا ارشاد بجا ہے لیکن یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟ قلعہ ہمیشہ کسی بلند چٹان پر واقع ہوتا ہے اور شہر اس کے نیچے اردگرد' اور پھر شہر کے اردگرد فصیلیں تو بادشاہ کس طرح پہلے ــــــ؟

رونا نے ذرا آزردگی سے اپنے سر کو اوپر کی طرف جنبش دی اور کہا "تمہاری گفتگو تو تمہارے محاصرے سے بھی زیادہ طویل ہو گئی ہے سرہیرلڈ!

تم پیامبر ہو نہ کہ مترجم۔ جاؤ اور بادشاہ کو وہ سب باتیں سنا دو جو میں تم سے کہہ چکی ہوں۔"

آخر ایلچی شاہ سٹینسلاس کے پاس واپس آ گئے اور اُسے رونا کا جواب سنا دیا۔ بادشاہ نے انتہائے غیظ و غضب میں پیغام کے پہلے حصے کو دوسرے حصے کی بہ نسبت زیادہ غور سے سنا اور تین دن تک شہر کی فصیلوں پر زبردست چڑھائی جاری رکھی۔ مگر رونا کے آدمیوں نے اس کی فوج کو بہت نقصان پہنچایا اور پھر اُسے پیچھے کو دھکیل کر تتر بتر کر دیا۔ رونا کے بہادرانہ پیغام سے اس کے آدمی اور بھی مضبوط دل ہو گئے۔ وہ کہتے تھے چونکہ ہماری کاؤنٹیس نے اپنی ہار کے امکان کے متعلق جو شرط بتائی ہے اُسے پورا کرنا ناممکن ہے لہٰذا ہمیں کسی طرح شکست نہیں ہوگی ہمیں بیٹی رونا کے لفظوں پر اعتماد ہے کیونکہ باپ تھیوبولٹ کی باتوں پر بھی ہم ہمیشہ یقین رکھتے تھے۔

تین حملوں میں مسلسل ناکامی کے بعد ایک ماہ تک بادشاہ چپ چاپ وہیں ٹھیرا رہا اور اپنی فوج کو شہر کے قریب لاتا گیا اس کے بعد اس نے پھر کاؤنٹیس کے پاس ایک پیغام بھیجا کہ "میں اپنا نصف عہد حکومت شہر آر کے باہر ختم کر ڈالوں گا تاکہ باقی نصف اس کے اندر گزار سکوں اگر اب بھی تم شہر میرے حوالے کر دو تو میں تمہیں معاف کر دوں گا اور تمہاری تمام دولت بھی تمہارے ہی پاس رہے گی لیکن اگر تم نے ہار نہ مانی تو پھر تمہیں لوٹ کھسوٹ، فاقہ کشی اور میرے بے پناہ غصّے کے مقابلے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔" اس کے جواب میں کاؤنٹیس نے صرف یہ کہا "بادشاہ سے کہہ دو کہ شہر کی فصیلوں کے اس پار آنے سے پہلے قلعے کو تسخیر کرے اس کے علاوہ میں کچھ نہیں کہنا چاہتی۔"

جب بادشاہ کو اپنے پیغام کا دو دفعہ ایک ہی جواب ملا تو وہ چلا اُٹھا اور کہنے لگا "لعنت ہو اس پر! اس عورت اور اس کے گستاخانہ معتوں پر! ــــــــ اس کی شکل کیسی ہے؟ میں نے تو اسے کبھی دیکھا بھی نہیں۔"

مخصوص ایلچی نے جس کا کام قدرتاً فصاحت پروری تھا جواب دیا "وہ خوبصورتی میں آفتاب اور مرتبہ میں آفتاب ہے۔"

بادشاہ نے خود پسندی سے جواب دیا "فضول ہے!"

جواب میں ایلچی جھک کر لیکن ذرا بیزاری سے آداب بجا لایا۔

شاہ نے پھر ایلچی سے پوچھا "کیا وہ ہوش میں ہے؟"

"حضور بالکل ہوشمند ہے۔ اگرچہ حضور کے ارشاد کے بموجب اس کا پیغام سُن کر ہرگز یقین نہیں آتا کہ یہ کسی ایسی معقول خاتون کی طرف سے بھیجا گیا ہے جیسے عقل و ہوش ــــــــ"

بادشاہ سُنی ان سُنی ایک کر کے اپنے منتظم سے کہنے لگا "دوسرا اجلاس منعقد کرو! میں تیار ہوں۔"

اور دوسرے اجلاس کے بعد وہ ایک جگہ بیٹھ کر حالات پر غور کرنے لگا۔ عام عقل کے لوگوں کی طرح وہ اس جلسے سے بھی دماغی تکلیف اور برہم مزاجی کے سوا اور کچھ حاصل نہ کر سکا تھا پس اُس نے پھر شہر کی فصیلوں پر تین دفعہ حملہ کرایا لیکن یہ حملہ بھی حسب معمول ناکام

ہی رہا۔ اس کے بعد کاؤنٹیس رونا کے پاس پھر ایک پیغام بھیجا گیا جس کا وہی جواب ملا جو پہلے مل چکا تھا بادشاہ تمام عمر بھی سوچتا رہتا تو اس پیغام کا اصلی مطلب نہ سمجھ سکتا تھا اس کی سمجھ میں اس حل کے سوا اور کیا آسکتا تھا کہ وہ عمر بھر فصیلوں کے پار نہیں جاسکیگا جب وہ سوچ سوچ کر تنگ آگیا تو کہنے لگا "جو کچھ وہ کہتی ہے وہ صرف پرندوں کی فوج ہی کر سکتی ہے" اتنی ناکامیوں کے بعد وہ فی الواقع اس قدر مایوس اور خجل ہو چکا تھا کہ شاید وہ اسی وقت شہر کا محاصرہ چھوڑ کر اپنے دارالسلطنت کو واپس چلا جاتا لیکن بدقسمتی یہ تھی کہ اس نے آتی دفعہ رعیت کے سامنے اور درپردہ قسم اُٹھا کر کہہ دیا تھا کہ جب تک آر نتح نہ کر لوں گا نہ تو اپنے شہر کو واپس آؤں گا اور نہ اپنی رعیت کو مُنہ دکھاؤں گا اب وہ، تھا اور اتنی بڑی فوج کی خوراک کے انتظام کا بار موسم سرما آرہا تھا اور اس کے صدرالصدور نے مستقبل کی پر اضطراب کیفیت پہلے ہی سے بیان کر دی تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ شہر سے کاؤنٹیس کی رعایا کے جشن منانے کی پیہم صدائیں آرہی تھیں۔ وہ دعوتیں اُڑا کر بچی کھچی ہڈیاں باہر شاہ کی فوج پر پھینک رہے تھے جس نے فصیلوں کا محاصرہ کر رکھا تھا اور یہ کس قدر توہین آمیز بات تھی۔

کاؤنٹیس رونا اپنی بیش دستوں اور بہادر سرداروں کی مجلس میں کھڑکی کے نیچے بیٹھی تھی ـــــ اُس کھڑکی کے نیچے جس پر ملک کے بہادروں کی تعریف میں شعر کندہ تھے۔ . . . . اور آفتاب کی شعاعیں اس کے خوبصورت بالوں کے آرپار ہو رہی تھیں۔ اس وقت شاید وہ حیران بیٹھی تھی اور سوچ رہی تھی کہ بادشاہ اب کیا کرے گا اور اس کے پیغام کا مطلب کب سمجھے گا۔

(۲)

شاہ سٹینلاس کی فوج کے ساتھ نکولس نامی ایک راہب بھی تھا وہ ایک بہادر نیک اور خوش خلق آدمی تھا اگرچہ بعض لوگوں کے خیال کے مطابق وہ خوش طبعی، اختلاط اور میل جول کا حد سے زیادہ دلدادہ تھا اور یہ باتیں اس کے مقدس فرض کے پیش نظر اسے زیبا نہ تھیں لیکن چونکہ وہ ایک تیز فہم اور دور اندیش رفیق بھی تھا اس لئے اپنی گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے وہ سٹینلاس کا منظور نظر ہو گیا تھا۔ بادشاہ نے اُسے کسی قدر بے تکلف ہونے کی جرأت بھی دے رکھی تھی۔ وہ بھی کاؤنٹیس رونا کا وہ پیغام سن چکا تھا جواب بادشاہ کی فوج کے کانوں تک بھی جا پہنچا تھا اور جس کے متعلق بادشاہ کے آدمی اپنے خیموں کے قریب آگ کے اردگرد بیٹھ کر بحث و تحقیق کر رہے تھے۔ راہب ان کی تمام گفتگو سن رہا تھا اور اس کے متعلق وہ ہر آدمی کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے نہایت دانائی سے اپنے سر کو جنبش دے دیتا تھا لیکن خود اس کی زبان بالکل بند تھی اور کسی آدمی نے کاؤنٹیس رونا کے پیغام کے متعلق اُسے کوئی رائے ظاہر کرتے نہ سنا۔ شاہ کے آدمیوں کا خیال تھا کہ اس پیغام کا مقصد ایک سادہ اور علانیہ دھمکی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

ایک رات شاہ اپنے خیمے میں بہت فکرمند اور آزردہ خاطر بیٹھا تھا کہ خیمے کا پردہ اُٹھا۔ سامنے نکولس کھڑا تھا۔ بادشاہ کہنے لگا "میں نے تمہیں نہیں بلایا"۔

نکولس نے جواب دیا" داؤد نے کب نیتن کو بلایا تھا۔ وہ بھی خود ہی اس کے پاس آ پہنچا تھا۔
بادشاہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا"میں نے کون سی بھیڑ کی بچھیا چھینی ہے"؟
بادشاہ سوچ بچار سے اکتا گیا تھا۔ خود اُس کی بھی یہ خواہش تھی کہ کوئی اُس کے پاس آکر بیٹھے اس نے نکولس کی طرف شراب کی صراحی دھکیلتے ہوئے کہا"اچھا نیتن داؤد کے ساتھ کچھ پی سکتا ہے"۔ نکولس نے دعوت قبول کرتے ہوئے خیمے کا پردہ اپنے پیچھے گرا دیا اور خود اندر آ گیا۔ بادشاہ نے پھر پوچھا" کیا میری تمام سلطنت میں یہی ایک"بھیڑ کی بچھیا" ہے جو میرے خلاف اب تک اڑی ہوئی ہے؟ کیا ارکاؤنٹس دنیا کی بھیڑ کی بچھیا ہے؟
نکولس نے شراب ختم کرتے ہوئے جواب دیا"شہر آرہی تو بھیڑ کی بچھیا ہے۔
"اے رسول! اسے فتح کرنے کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ میں اسے حاصل کرنے میں ایک دفعہ ناکام رہا ہوں" لعنت ہو اس پر!—
اور دوسرے اس پر حق بھی میرا ہی ہے کیونکہ یہ میرے باپ کی ملکیت تھا پھر معلوم نہیں اے مقدس رسول تم مجھے کیوں دھمکا رہے ہو؟
نکولس جو اس وقت خیمے کے وسط میں چغہ لپیٹے کھڑا تھا بولا" میں کب کہتا ہوں کہ آپ اسے فتح نہ کریں میں تو یہ بتلانے آیا ہوں کہ اسے کیونکر فتح کرنا چاہیئے۔ . . . . بادشاہ سلامت میں آپ سے ایک سوال کروں گا"۔
بادشاہ اپنی کرسی پر پیچھے کی طرف جھک گیا اور کہنے لگا کہو میں سنتا ہوں"!
"اچھا ذرا یہ بتائیے کہ فوج میں قلعہ کہاں ہوتا ہے"؟
"فوج میں قلعہ!؟ . . . فوج میں قلعہ کہیں نہیں ہوتا۔ قلعہ تو اینٹوں اور پتھروں کے بنے ہوئے شہر کے وسط میں کسی اونچی جگہ پر بنا ہوتا ہے لیکن فوج خیموں میں یا صاف زمین پر رہتی ہے جو ادھر اُدھر بھی آجا سکتی ہے۔ اے رسول! فوج میں تو کوئی قلعہ نہیں ہوتا۔ کیا تمہیں اپنے سوال کا جواب مل گیا؟"
"نہیں بادشاہ سلامت نہیں ——— بتائیے فوج میں قلعہ کہاں ہوتا ہے"؟
"فوج میں کوئی قلعہ نہیں ہوتا۔ شہر جو اینٹوں اور پتھروں کا بنا ہوتا ہے قلعہ اس میں ہوتا ہے۔ فوج اینٹوں اور پتھروں کی نہیں ہوتی اُس میں تو صرف آدمی ہی ہوتے ہیں جو گوشت پوست ہڈیوں رگ و پے اور دل و دماغ کے ہوتے ہیں۔ اے رسول فوج میں کوئی قلعہ نہیں ہوتا کیا تمہیں جواب مل گیا؟"
نکولس نے تیسری دفعہ پھر کہا نہیں بادشاہ سلامت۔ آپ کا جواب درست نہیں بتائیے فوج میں قلعہ کہاں ہوتا ہے؟
اب شاہ نے سوچا کہ اس سوال کا واقعی کوئی گہرا مطلب ہوگا۔ اس لیے اُس نے سوچنا شروع کیا اور بہت دیر تک خیالات میں ڈوبا رہا اور نکولس خیمے کے وسط میں بت بنے اس کے چہرے پر نظریں گاڑے کھڑا رہا۔
آخر کار بادشاہ نے سوچ سوچ کر جواب دیا"ہاں نکولس میں نے جان لیا واقعی فوج کا قلعہ بھی ہوتا ہے

ـــــــــــــ
[1] حضرت داؤد اور نیتن نبی کے عہد کے ایک واقعے کی طرف اشارہ ہے۔

فوج کا قلعہ اس رہبر کا مضبوط دل ہے جو فوج کی رہنمائی کر رہا ہو اسے رسول! کیا اب تمہیں اپنے سوال کا جواب مل گیا؟"

"ہاں ہاں اب مجھے اپنے سوال کا جواب مل گیا" یہ الفاظ کہہ کر نکولس واپس مڑا اور خیمے سے باہر چلا گیا۔

بادشاہ کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی وہ اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا اور پکار اُٹھا "میں نے جان لیا شہر کا قلعہ بھی شہر کے رہبر کا دل ہی ہو سکتا ہے! اور اب آر کی فصیلوں سے گزرنے سے پہلے مجھے اس شہر کا قلعہ فتح کرنا ہوگا۔"

(۳)

روناہی بلند مسند پر منقش کھڑکی کے نیچے بڑے ہال میں بیٹھی تھی اس کے ارد گرد اس کی مصاحب خواتین اور سردار جمع تھے۔ ایک افسر نے رخصت چاہتے ہوئے اُسے بتایا کہ وہ ایک قیدی کو پیش کرنا چاہتا ہے۔ اجازت حاصل کرنے کے تھوڑی دیر بعد کاؤنٹیس کی خدمت میں ایک نہایت ہی وجیہہ و شکیل نوجوان پیش کیا گیا۔ اگرچہ اس وقت وہ دو محافظوں کے درمیان قیدی بن کر کھڑا تھا لیکن اب بھی اُس کا چہرہ کافی پُر غرور تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے سر میں ایک آزاد دماغ ہے۔ اس کا قد دراز بال سیاہ آنکھیں نیلی اور کندھے چوڑے چکلے تھے وہ پہلو کی طرف ذرا جھکا ہوا تھا۔ روناہی نے منظوری میں اس کے چہرے پر ایک نگاہ دوڑائی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی آنکھیں کہہ رہی ہیں "کہ تم نے اسے قیدی کیوں بنایا ہے" آخر وہ افسر سے پوچھنے لگی۔ "تم یہ قیدی کہاں سے لائے ہو"؟

افسر نے جواب دیا "رات کافی گزر چکی تھی کہ یہ جنوبی دروازے کی طرف آیا اور شاہ سٹینلاس کے غضب سے پناہ مانگنے لگا"۔

کاؤنٹیس نے چیں بجبیں ہو کر پوچھا "تو کیا یہ مفرور ہے"۔

"وہ ہمیں کچھ نہیں بتاتا وہ کہتا تھا کہ میں اپنی کہانی صرف یور ہائی نس ہی کو سناؤں گا"۔

ایک مصاحبہ کے ہاتھ سے مورچھل لیتے ہوئے اور اس کے پیچھے اپنا نصف چہرہ چھپاتے ہوئے کاؤنٹیس نے کہا۔ "اسے بولنے کی اجازت ہے"۔

افسر نے قیدی سے کہا۔ "بولو!"

"اگر میں قیدی بنا تو اپنی مرضی سے۔ کیونکہ میں کچھ ایسی پریشانی میں مبتلا ہو گیا تھا کہ میں نے اس کے سوا چارہ نہ دیکھا کہ اپنے آپ کو یور ہائی نس کے رحم پر چھوڑ دوں۔ تاہم میں غدار نہیں ہوں اور اب بھی اس کے سوا میری اور کوئی تمنا نہیں کہ میرے آقا شاہ سٹینلاس کا بھلا ہو!"

"اچھا پھر تو تم ضرور چاہتے ہو گے کہ وہ اب اپنے شہر کو واپس ہی چلا جائے اور میرے شہر کا پیچھا چھوڑ دے۔"

نائٹ مسکرا پڑے اور عورتیں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اجنبی نے نہ تو ان باتوں کی اور نہ ہر ہائی نس کے چست فقرے کی کچھ پروا کی ہے۔ اس کے بعد اجنبی نے سلسلۂ کلام یوں باندھا: "میں شاہ سٹینلاس کا بڑا معتمد تھا۔ وہ مجھے ایک عقلمند آدمی سمجھتا تھا اور اس کا خیال تھا کہ میں سب ایسی باتیں جان سکتا ہوں جو جاننے کے قابل ہیں اور صرف میری مدد سے وہ تمام سربستہ راز

کا انکشاف اور کل سے مشکل معموں کا حل کرسکتا ہے۔ میں گزشتہ فتح کی تین مہموں میں اس کے ساتھ تھا۔ اس کے بعد وہ مجھے آر کی لیوار ڈ کے پاس لایا۔ اُس کو اس بات کا پورا یقین تھا کہ وہ میری بہادری اور مشوروں کی مدد سے آر کا مالک بن سکتا ہے۔ میں شیخی نہیں بگھار رہا۔ میں صرف وہی باتیں بیان کر رہا ہوں جو بادشاہ میری نسبت متعدد دفعہ لوگوں کے سامنے کہہ چکا ہے۔"

روزمانے اجنبی سے کہا "اچھا تو پھر کم از کم ایک آدمی کے دل میں تمہاری کبھی قدر ہے؟"

اجنبی نے جواب دیا "میرے خیال میں ایک کے دل میں نہیں دو کے دلوں میں ہے۔"

عورتیں پھر کھلکھلا کر ہنس پڑیں اور نائٹ مسکرانے لگے لیکن اُس پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔

اجنبی نے پھر نہایت شیریں آواز اور پرزور انداز میں جس نے سننے والوں کے کانوں پر عجیب اثر ڈال لیا تھا اور عورتیں اس کی ہنسی اڑانے پر پشیمان نظر آرہی تھیں یوں کہنا شروع کیا "اس کے بعد وہ دن آن پہنچا ——— وہ مہلک دن ——— جب لیور ہائی نس کی طرف سے ہز میجسٹی کو ایک پیغام بھیجا گیا اور جب بادشاہ سلامت نے حضور کے پیغام کا مطلب مجھ سے پوچھا اور کہا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ آدمی فصیلوں کے پار جانے سے پہلے قلعہ فتح کرے۔ میں نے جواب میں انہیں بتایا کہ یہ بات بالکل فضول اور ناقابل توجہ ہے۔ شاہ نے مجھ پر یقین کرلیا اور فصیلوں پر تین دفعہ پھر حملہ کیا گیا اور بہت سے آدمی بلاوجہ مارے گئے اس کے بعد دوبارہ حضور کا پیغام آیا اور جب شاہ نے پھر مجھ سے اس کا مطلب پوچھا تو میں نے اُسے یہی جواب دیا کہ ایک گستاخانہ للکار کے سوا اس کا اور کوئی مطلب نہیں۔ اب بھی شاہ نے مجھ پر یقین کرلیا اور پھر تین دفعہ فصیلوں پر حملے کئے گئے اور بہت سے بہادر بیکار موت کی گھاٹ اُتر گئے اب تیسری دفعہ حضور کا پیغام آیا اور شاہ نے مجھ سے اس کا مطلب پوچھا لیکن مجھے اس کا مطلب نہ آتا تھا۔ مبادا اور آدمیوں کی جانیں ضائع ہوں میں نے اس بات کا اعتراف کرلیا اور کہہ دیا کہ میں اس معمے کا مطلب بتانے سے قاصر ہوں۔"

موچھل کی چوٹی پر سے دیکھتے ہوئے کاؤنٹیس نے کہا "خوب عقلمندی سیکھ تو لی مگر ذرا دیر سے اور پھر اس کی قیمت بھی ادا کردی۔"

جب میں نے یہ مان لیا تو اس نے مجھے احمق کہا اور اس کے علاوہ بہت سے سخت الفاظ کہے اور مجھے صاف صاف بتادیا کہ میری خیر اسی میں ہے کہ میں یہ معما حل کر ڈالوں۔ اب تیسری دفعہ بالکل درست حل ہونا چاہیئے اور اگر مجھ سے حل نہ ہوسکے تو پھر مجھے ہرگز اپنا وطن دیکھنے یا اپنے آدمیوں سے دوبارہ ملنے کی اجازت نہ دی جائے گی بلکہ میری زندگی کا خاتمہ یہیں شہر کی دیواروں کے باہر کر ڈالا جائیگا اور میرا انجام نہایت ذلت اور بیچارگی میں ہوگا۔ شاہ نے جب غصے میں مجھ سے ایسے الفاظ کہے تو میں اس کے خوف اور موت کے خیال سے رات کو چپ چاپ خیمے سے باہر نکلا اور اپنے آپ کو یور ہائی نس کے ایک افسر کے سپرد کردیا جو شہر کے جنوبی دروازے پر کھڑا محافظت کر رہا تھا۔"

رو زمانے پوچھا "تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"یا تو معمے کا حل تاکہ میں اسے بادشاہ کے پاس لے جاؤں اور دوبارہ اس کی خوشنودی حاصل کروں ———

"اور اگر یہ نہ ہو سکے تو؟" روناؔ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تو پھر مجھے یہاں تھوڑے عرصے کے لئے رہنے کی اجازت دی جائے تاکہ میں اپنی عقل سے اس کا حل دریافت کروں"۔

نائٹ مسکرا پڑے اور حقارت سے آہستہ آہستہ کچھ بڑبڑانے لگے لیکن عورتیں جن پر اجنبی کی شکل وصورت نے کچھ کم اثر نہ ڈال لیا تھا نہایت غمگین ہو کر آہیں بھرنے لگیں۔ شاید وہ اس لئے افسردہ ہو گئی تھی کہ اتنے بڑے آدمی کو ناحق اس قدر فضول درخواستیں کرنی پڑی ہیں لیکن اس وقت روناؔ کا سر خیالات میں جھکا ہوا تھا اور اجنبی اس کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا جب روناؔ نے سر اٹھایا تو دونوں کی نگاہیں ایک ہو گئیں اس وقت روناؔ کی نیلی اور پر شوق آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہو گئی اور اس کے رخسار پر ایک ہلکی سی سرخی دوڑ گئی ——— یا شاید اوپر کی رنگین کھڑکی سے سرخ روشنی اس کے رخسار پر پڑنے لگی تھی۔

کاؤنٹیس نے کہا "سات دن اور سات راتیں تم یہاں رہ سکتے ہو لیکن اس شرط پر کہ جب یہ رات ختم ہو جائے گی تو میرے افسر تمہیں پھر بادشاہ کے پاس چھوڑ آئیں گے۔ اگر اس وقت تک تم نے معمے کا حل تلاش کر لیا تو تمہارے اور تمہارے بادشاہ کے لئے اچھی بات ہو گی لیکن اگر تم نہ حل کر سکے تو پھر تم پر اور اس پر مصیبت آئے گی ——— موت کی سی مصیبت ——— اب بتاؤ تمہارا کیا خیال ہے"؟

"مجھے یہ شرط منظور ہے! میں یہاں رہوں گا!"

روناؔ نے اشارہ کیا کہ اجنبی کو وہاں سے لے جایا جائے اور پھر کہنے لگی تم سب بھی یہاں سے چلے جاؤ اور مجھے تنہا رہنے دو"۔

(۴)

اب سات دنوں اور سات راتوں کا آغاز تھا۔ ہر روز اجنبی پوشیدہ طور پر اور بڑے ہال میں جہاں عورتیں اور نائٹ بیٹھے ہوتے اُس سے گفتگو کرتا۔ اس نے اپنے بادشاہ اور سلطنت کی نسبت اُسے بہت کچھ بتایا اور روناؔ نے اُسے اپنے شہر کی دولت اور طاقت دکھائی۔ لیکن جب وہ اُس سے پوچھتی کہ تم خود کون ہو تو وہ جواب دیتا میں بادشاہ کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوں۔ اس کے سوا اپنی نسبت وہ اور کچھ نہ بتاتا۔ روناؔ اس عجیب وغریب شخصیت کو دیکھ کر بہت حیران تھی اور زیادہ سے زیادہ وقت سوچنے میں گزارنے لگی کہ وہ کون ہو سکتا ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ اس دوران میں بادشاہ کی فوج اپنے خیموں میں بڑی سستی سے پڑی تھی اور اب تک اس نے فصیلوں پر بھی کوئی حملہ نہ کیا تھا۔

آخر کار جب تین دن گزر چکے تو روناؔ نے اس سے پوچھا "اچھا ذرا یہ تو بتاؤ کہ بادشاہ تمہارا آقا اپنی اتنی وسیع سلطنت چھوڑ کر صرف میرے ہی غریب شہر کے خلاف کیوں نبرد آزما ہو گیا ہے"؟

"وہ اس لئے جنگ کرتا ہے کہ ملک میں امن وامان اتفاق اور طاقت کا دور دورہ ہو۔ تین سال کے عرصے میں اس نے تمام سلطنت میں امن قائم کر دیا ہے۔ صرف یہی شہر دوستوں میں ایک دشمن، فرمانبرداروں میں ایک سرکش اور زورآوروں میں ایک کمزور باقی رہ گیا ہے"۔

بغیر سلطنت کے شہر کچھ نہیں ہے اور بغیر شہر کے سلطنت کمزور ہے"۔

رونا چیں بجبیں ہو کر خاموشی سے یہ باتیں سنتی رہی اور تھوڑی دیر بعد کہنے لگی" اگر شاہ ان الفاظ کے ساتھ میرے پاس ایلچی بھیجتا تو ممکن تھا کہ میں اس کے الفاظ پر توجہ دیتی اس نے تو صرف مجھے ہار ماننے کے لئے پیغام بھیجا تھا"۔

دوسرے دن پھر رونا نے اجنبی کو بلایا اور پوچھا کہ" اگر میں شہر شاہ کو دے دوں اور اپنے آپ کو بھی اس کے حوالے کر دوں تو پھر میں کیا ہوں گی ـــــــ میں جو کاؤنٹس رونا ہوں"؟

اجنبی نے جواب دیا" بادشاہ کی مجلس مشاورت میں اور اُس کی محبت میں تمہارا مرتبہ بلند ہوگا"۔

رونا نے پھر چتون بدل کر کہا" میں بادشاہ کی محبت نہیں چاہتی"۔

اجنبی نے آہستہ سے کہا" مادام تم نہیں جانتیں کہ یہ کیا شے ہے"۔

پانچویں دن اس نے پھر خفیہ طور پر اُسے بلایا اور پوچھا کہ" اگر میں اپنا شہر دے دوں اور اپنے آپ کو بادشاہ کے حوالے کر دوں اور سلطنت میں امن وامان کا دور دورہ ہوا ایسا امن وامان جو میرے باپ کاؤنٹ تھیوبولڈ آف آر کے عہد میں بھی نہیں ہوا تھا تو پھر بادشاہ کیا کرے گا؟

"پھر وہ اپنی سلطنت کو اور زیادہ خوشحال کرے گا اور اسے خوبصورت بنائے گا۔ اور تمام دشمنوں سے اُسے محفوظ کر ڈالے گا"۔

"اور تم کیا کرو گے"؟

"میں بادشاہ کے ساتھ ہوں گا بشرطیکہ میرے ساتھ ایسا اتفاق پیش آجائے کہ میں اُسے کوئی اچھی صلاح دے سکوں"۔

"تو کیا وہ تمہیں عزت سے مالامال کر دے گا"؟

"ہاں اگر میں معمّا حل کر لوں تو عزت فوراً میری غلام ہو جائے گی"۔

"تو تم نے ابھی حل نہیں کیا"؟

"میں اُس کا حل آپ کی آنکھوں میں دیکھ رہا ہوں" اجنبی نے ذرا جرأت سے کام لیتے ہوئے جواب دیا اور رونا نے اپنی آنکھیں دوسری طرف پھیر لیں مبادا وہ اُن میں حل دیکھ لے۔

ساتویں دن شام کو اُس نے پھر اجنبی کو خفیہ طور پر بلایا جس کی کسی نائٹ یا مصاحبہ کو خبر نہ ہوئی۔ وہ بڑے ہال میں بیٹھی تھی جس میں دھیمی دھیمی روشنی کی گئی تھی۔ صرف اس کا چہرہ اس کے خوبصورت بال اور خوبصورت قیمتی لباس ہی ایک ایسی چیز تھی جو اندھیرے میں بھی چمک رہی تھی۔ اجنبی آگیا اور اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

رونا نے کہا" کل آفتاب نکلنے پر میں تمہیں ضرور تمہارے آقا شاہ کے پاس بھیج دوں گی جیسا کہ تم سے وعدہ کرایا جا چکا ہے تم اپنے

ساتھ بادشاہ کے لئے کیا انعام لئے جا رہے ہو جس سے تمہیں پھر اس کی خوشنودی حاصل ہو جائے"؟

"میں اپنے دماغ میں قلعہ کی چابیاں تو نہیں لے چلا میرے پاس کچھ نہیں ہے"

اس کے بعد دونوں خاموش ہو گئے اور بڑا ہال اور بھی زیادہ پر سکوت ہو گیا تھوڑی دیر کے لئے اجنبی رونا کے نزدیک آگیا اور اُس کی بلند مسند کے ایک بازو کے قریب آن کھڑا ہوا۔

"مادام خدا حافظ"۔

رونا نے نظریں اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا "خدا حافظ"۔

"لیکن ہم پھر ملیں گے"

رونا نے پوچھا "کب"؟ اُس وقت اس کے ہونٹ کھلے کے کھلے رہ گئے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ تھکی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہی ہے۔

"ایک دن کے اندر اندر فصیل سے باہر!"

"فصیل سے باہر"؟

"ہاں"۔ وہ اس کے سامنے جھک گیا اور اس کا ہاتھ چوم کر کہنے لگا "شہر کا قلعہ شہر کی ملکہ کا دل ہے!"

یکایک کاؤنٹیس اُٹھ کھڑی ہوئی اور شاید وہ کچھ بولتی بھی لیکن اجنبی نے اپنا ہاتھ اُٹھا کر اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ کاؤنٹیس کے چہرے پر کچھ عرصے تک نظریں جمانے کے بعد وہ واپس مڑا اور اُسے اس منقش کھڑکی کے نیچے تنہا چھوڑ گیا جہاں سے مہتاب کی ایک کرن اندر آکر چپ چاپ اس کے خوبصورت بالوں کو چوم کر جگمگا رہی تھی۔ اور وہ اپنے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں ابھی تک اُس دروازے پر لگی تھیں جہاں سے وہ ابھی ابھی باہر نکلا تھا۔

کاؤنٹیس نے آہستہ سے کہا "میرے دل نے اپنے مالک کو پہچان لیا ہے۔ میں شاید اپنے بادشاہ کے ساتھ باتیں کر رہی تھی"۔

(۵)

دوسرے دن دوپہر کے وقت شاہ سٹینلاس ایک سفر سے واپس آیا جو بعض ملکی معاملات کی بنا پر اُسے پیش آگیا تھا۔ اس نے اپنی فوج کی کمان دوبارہ اپنے ہاتھ میں لی اور اُسے جنگ کے لئے صف آرا کر کے آگے بڑھایا اور خود جنوبی دروازے کے سامنے میدان میں شہر کی فصیلوں کے ذرا نزدیک آن کھڑا ہوا۔

نکولس جو ضرورت پر اپنے مقدس فرائض انجام دینے کے لئے وہاں کھڑا تھا دیکھ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ ایک سپاہی نے کہا "ہم فصیل پر دوبارہ حملہ کرنے والے ہیں"

نکولس ہنس کر کہنے لگا "میرا خیال تو یہ ہے کہ بادشاہ سلامت قلعہ تسخیر کرنے والے ہیں"۔ باقی تمام لوگ بھی یہ سمجھ کر ہنس پڑے کہ نکولس نے شاہ کی اس بات پر ہنسی اڑائی ہے کہ وہ خواہ مخواہ فضول وقت اور دولت ضائع کر رہا ہے۔

جب کلاک نے ٹن ٹن بارہ بجائے تو شاہ کی شاندار آراستہ سواری آگے بڑھی۔ وہ اس وقت ایک سیاہ طاقتور اور شوخ جنگی گھوڑے پر تھا جب اس کے اور شہر کی دیواروں کے درمیان کوئی دو سو گز کا فاصلہ رہ گیا تو اس نے تمام فوج کو وہیں ٹھیرا دیا اور خود اکیلا آگے بڑھا اب اس کے ساتھ صرف ایک ایلچی تھا اور وہ فصیل کے نیچے بہت ہی قریب جا پہنچا تھا جہاں کاؤنٹیس رونا کے نائیٹوں اور مسلح آدمیوں کا ایک انبوہ کھڑا تھا ان لوگوں کی اس نے کچھ پروا نہ کی جو حملہ آوروں پر پتھروں اور لوہے کی بھاری بھاری سلاخوں سے حملہ کرنے کے لئے تیار بیٹھے تھے اب وہ ایلچی سے کہنے لگا "ذرا اطلاع کر کہدو کہ شاہ سینسلاس ہر ہائی نس کاؤنٹیس رونا سے بات کرنا چاہتے ہیں"۔

اس پیغام سے فصیلوں کے قریب کی فوج میں ایک ہل چل مچ گئی شاہ بے حس و حرکت اپنے بڑے سیاہ گھوڑے پر بیٹھا رہا۔ اس طرح آدھ گھنٹہ یا اس کے قریب گزر گیا۔ اس کے بعد شہر کا دروازہ کھول دیا گیا اور رونا اپنے ساتھ عورتیں اور نائٹ لئے ہوئے قرمزی رنگ کا لباس پہنے ایک چھوٹے سے سفید گھوڑے پر سوار ہو کر آگے آئی۔

پرانے سپاہی نے مضطرب ہو کر مبادا وہ لڑائی سے محروم رہ جائے نکولس سے کہا "یہ فصیلوں پر حملہ تو نہیں ہو رہا"۔

نکولس نے جواب دیا "میرا خیال ہے تم ابھی ابھی ان فصیلوں کے اس پار جا پہنچو گے"۔

جب بادشاہ نے کاؤنٹیس کو دیکھا تو اس نے آہستہ سے اپنے گھوڑے کو مہمیز سے چھوا اور اس جگہ جا پہنچا جہاں رونا اس کی منتظر کھڑی تھی۔ جب کاؤنٹیس نے بادشاہ کو دیکھا تو اس کی آنکھوں میں ایک نئی چمک پیدا ہو گئی لیکن اس نے اپنی حیرانی کو چھپا لیا۔

اس نے آہستہ سے کہا "میرا دل جان گیا"۔ اور یہ الفاظ سن کر اس کی عورتیں اور نائٹ حیران رہ گئے شاہ سٹینلاس رونا کے سامنے آداب بجا لایا۔

کاؤنٹیس نے پوچھا "میرے بادشاہ کدھر؟"

بادشاہ نے جھک کر اس کی کمر میں اپنے بازو ڈال دیئے اور اسے سفید گھوڑے سے اٹھا لیا فصیلوں کے محافظ اور میدان کی فوجیں مسرت کے نعروں سے چیخ اٹھیں۔

بادشاہ نے کاؤنٹیس کو بڑے گھوڑے پر اپنے آگے بٹھا لیا تھا۔

بادشاہ نے کہا "قلعہ تسخیر ہو چکا! اور اب میں فصیلوں کے پار جا سکوں گا"۔

اور وہ دونوں مسرت و شادمانی کے نعروں کے درمیان شہر میں داخل ہو گئے۔

———

(۶)

یہ کہانی ہے تو چھوٹی سی لیکن نتائج اس سے بہت نکلتے ہیں :۔

بادشاہوں اور حکمرانوں کے لئے :۔ بادشاہوں اور حکمرانوں کو چاہیئے کہ اپنا مطلب صاف صاف بیان کر دیں بشرطیکہ وہ اسے ظاہر کرنا چاہتے ہوں ۔

بچوں کے لئے :۔ خواہ اُن کے باپ پچاس سال سے کسی بات پر کاربند رہے ہوں بعض دفعہ ان کے لئے یہی دانائی ہوگی کہ وہ اس کو فوراً ترک کر دیں ـــ خصوصاً اگر وہ اچھی شادیاں کرنا چاہتے ہیں ۔

مردوں کے لئے :۔ اگرچہ یہ بات ناممکن ہے کہ عورت جو کچھ کہے اس کا کوئی مطلب بھی تاہم جو کچھ وہ کہتی ہے اس کا کچھ نہ کچھ مطلب ضرور ہوتا ہے اور خصوصاً اس وقت جبکہ وہ ایک ہی بات کو تین دفعہ دہرائے ۔

عورتوں کے لئے :۔ اگرچہ فصیلیں قلعہ کی حفاظت کرتی ہیں لیکن اکثر قلعہ بھی فصیلوں کو دھوکے میں ڈال سکتا ہے ۔

سب کے لئے :۔ جو آدمی اپنی عقل دوسروں کی بہتری کے لئے صرف کرتا ہے اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ اس نے اپنے ہمسایے کا کھانا تو پکایا لیکن خود اس کھانے پر مدعو نہ کیا گیا ۔ کیونکہ جب ایک دفعہ قلعہ فتح ہوگیا لوگ فصیلوں کے پار چلے گئے اور عاشق و معشوق ایک دوسرے سے مل کر خوش ہوگئے تو نہ تو شاہ نہ کاؤنٹس اور نہ کوئی اور شخص اپنوں میں غریب نجومی کا خیال تک بھی لایا

(سر انتھنی ہوپ ہاکنس)

مہدی علی خاں کریم آباد

بڑا آدمی وہ ہے جو اپنی فطرت پر قائم رہے اور جسے دیکھ کر ہمیں کوئی اور یاد نہ آجائے ۔



احسن الکلام

لیجئے حُسنِ عمل سے کام، احساں کیجئے
کم سے کم کچھ خاطرِ بیمارِ ہجراں کیجئے

ہو کے خود معدوم، نام اپنا نمایاں کیجئے
اُٹھئے، بعدِ مرگ بھی جینے کا ساماں کیجئے

جان کو مایوس، دل کو وقفِ حرماں کیجئے
پھر کسی کو چاہیئے! پھر کوئی ارماں کیجئے

ہے دلِ بے مایہ تنہا اور صدہا تیرِ ناز
کہہ رہی ہے ہمّتِ دل سب کو مہماں کیجئے

عشق ہے آوارۂ قسمت، حُسن ہے راحت نصیب
آپ کیوں بے چین ہوں، ہم کو پریشاں کیجئے

ہو نہ جائے خونِ دل نا واقفیّت میں کہیں
آشنائے درد بن کر دل کا درماں کیجئے

میری وحشت ہی سے ہے جمعیّتِ خاطر اگر،
بیٹھئے! نظارۂ چاکِ گریباں کیجئے

نقدِ دل دنیا لٹاتی ہے، لٹانے دیجئے
آپ کیوں حُسنِ گراں مایہ کو ارزاں کیجئے

دیکھ لیں قول و قسم کا ہم بھی انجام و مآل
ایک دن تو پھر ایفا عہد و پیماں کیجئے

حضرتِ دل! عشق کی خاطر اگر منظور ہے
دے کے دعوت اُس کو رسوائی کا ساماں کیجئے

قید و غم میں کس طرح رہتے ہیں ہم آزاد و شاد
یہ تماشا دیدنی ہے، سیرِ زنداں کیجئے

ڈھونڈ لے گی ہر جگہ چشمِ تصوّر آپ کو
جلوہ پنہاں رکھئے اپنا یا نمایاں کیجئے

حشر سے پہلے نہ ہو مشقِ خرامِ ناز ختم
جتنے گھر آباد ملتے جائیں ویراں کیجئے

صدقے اس حُسنِ تبسّم کے، ہنسی جاری رہے
دل کے زخموں پر ہی خالی یہ نمکداں کیجئے

ہو چکی صبحِ قیامت آخر، احسن آپ بھی
ختم اپنی داستانِ شامِ ہجراں کیجئے

احسن مارہروی

رباعیات

سرمدؒ

راضی دل دیوانہ بہ تلقین پیر نشد
فارغ ز خیال و فکر و تدبیر نشد
ایام شباب رفت و باقی ہوس است
ما پیر شدیم و آرزو پیر نشد

سرمدؒ

گر شیفتہ ہم کار بیاراست مرا
با سبحہ و زنار چہ کار است مرا
این خرقہ پشمینہ کہ صد فتنہ دروست
بار منت چشمہ بدوش عار است مرا

ترجمہ

من اپن بھس آگ لگھاکانے
جتن سے من تن نہ مانے
گئی جوانی بنیا نے
بوڑھے بھئے پر تن نہ بڈھانے

ترجمہ

بھگت ہوئے تسبیح کے ساتھی
ہم ہیں کیوں بھاتی
مالا ڈورا سب ڈھکوسلا
ٹیکا اور تلک سب
اس سے ہیم کی شوبھا جاتی

مقبول

رباعیات

حکیم عمر خیام

گویند بہشت و حور عین خواہد بود
وانجا مے ناب و انگبین خواہد بود
گر ما مے و معشوق پرستیم رواست
چوں عاقبت کار ہمین خواہد بود

حکیم عمر خیام

در دہر چو آوازۂ گل تازہ دہند
فرمائے کہ پیالہ بہ اندازہ دہند
از دوزخ و از بہشت و از حور و قصور
فارغ بنشیں کہ آں خود آوازہ دہند

ترجمہ

جنت میں شراب ارغواں بھی ہے یہی
اور صرف حوران جناں بھی ہے یہی
پھر ہم مے و معشوق یہاں کیوں چھوڑیں
جب عاقبت کار وہاں بھی ہے یہی

ترجمہ

ہر وقت رکھ اپنے پیش در عشرت باز
خوش رہ جی سے مے و شاہد کو بنا کر دمساز
ناداں! اے نعیم خلد و حور و غلماں کب تک
اک وعدۂ [illegible] دیتے ہیں آواز

آزاد انصاری

اچھے سے پڑھنے والے

کیا میں سچ کہتا ہوں ؟

ع میں نے اس کا فیصلہ موقوف تجھ پر کر دیا ۔

لفظ بھی کیا ساحر ہیں ؟ موقوف ؟ فیصلہ موقوف ؟ اہلکار موقوف ہوا کرتے تھے عمارتیں وقف ہوا کرتی تھیں اردو سے سوائے دلی والوں کے اور سب ناواقف تھے کچھ وقوف والے چند بے وقوفوں سے اوقافِ اسلام کے مسائل بیان کرتے تھے مگر بچارے لفظ "موقوف" پر کیا موقوف ہے اور بہت سے ایسے لفظ ہیں جن کے حسب نسب کو دیکھو تو انسان کہاں سے کہاں جا نکلتا ہے ۔ بات کرتے کرتے یہ وقفہ بیچ میں یونہی آن پڑا ۔ ہاں تو کیا میں سچ کہتا ہوں ؟ پہلے معیارِ صداقت سمجھ لو ۔ صرف ایک معیار ہے اور وہ اٹل ہے ۔

وہ تحریر کس کام کی جس سے دماغ مہک نہ اٹھیں ۔

باغ میں اپنے اپنے موسم میں بیسیوں پھول ہوتے ہیں موتیا، چنبیلی، گلاب، ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر ۔ اچھے پھولوں کی صورت بھی اچھی سیرت بھی اچھی ۔ اچھے لفظ مگر نہ صرف خوبصورت خوب سیرت ہوتے ہیں بلکہ ایک معشوقانہ ادا سے کچھ ایسے مالا مال ہوتے ہیں کہ پھول کا تبسم اچھے لفظ کی رعنائی کے پیچھے لنگڑا لنگڑا کر چلتا ہے ۔ یہ اصل میں اچھے لفظ کے لئے ہی کہا گیا ہے ۔

ع تو از پری چابک تری و ز برگِ گل نازک تری

ہاں تو اچھے سے پڑھنے والے میرے ان چند جملوں میں سے اپنے لئے کوئی نازک سا مطلب انتخاب کر لے ۔ کیا ہوگا ؟

ع غنچۂ باغ دل ما زیب دستارے شود ،

سچ کہتا ہوں کہ لفظ میرے ہونگے خوشبو تمہاری اپنی ہوگی ۔ آؤ اور ایک ایسے باغ کی سیر کرو جس کی دیواریں بلند ہیں دروازہ بند ہے

کیا تم مجبور ہو ؟ جانِ من مجبوری کے قفل کی ایک ہی کلید ہے اور اس کا نام ہے پریت عشق کے نشے میں ایسے سرشار ہو کہ پھر کبھی ہوش نہ آئے ۔ "ولے افتاد مشکلہا" والا مضمون ہے مگر مجبوری سے رہائی کی اور سب ترکیبیں غلط ہیں ۔ زمین کو چاہو، آسمان کو چاہو ان کے اندر اور باہر اور درمیان جو کچھ بھی ہے اُسے چاہو اور اس قدر چاہو کہ خود اپنے آپ کو سچے دل سے چاہنے لگو ۔

کیا تم آزاد ہو یعنی وقت سے اور اس غیر متحرک منجمد زمانہ سے جس کا انگریزی نام Space ہے ؟ اس قدر آزاد ہو کہ تمہیں اتنی بھی اپنی خبر نہیں آتی کہ کب کہاں ہوتے ہو ؟ جانِ من اس پابہ زنجیر آزادی سے چھٹکارا بھی صرف پریت پر ہی موقوف ہے ۔ سچی

اصلی، پیاری پریت ہی وہ خوشبو ہے جو آزادی کے مکروہ تعفن کو مٹا دیتی ہے۔

کیا تم مجبوری اور آزادی کے بین بین ڈانواڈول ہو؟ کیا تم نہ گھر کے ہوتے ہو نہ گھاٹ کے؟ جانِ من پریت کی مضبوط کڑی اپنے گلے میں ڈالو اور جدھر پریت کھینچ لے اُدھر کھنچ جاؤ۔ کیا تم لائق ہو، نیک ہو مگر غریب ہو؟ اور کیا غربت کے جنجال نے تمہارا قافیہ ایسا تنگ کر رکھا ہے کہ نہ نیکی کام آتی ہے نہ لیاقت؟ جانِ من! اس بیچارگی کا درماں بھی صرف پریت ہی ہے۔ ناداری کو اس قدر عزیز جانو کہ زمین کچھ نہ رہے آسمان کچھ نہ رہے۔ سنو جانِ من! میں تمہاری قوم میں سے ہوں۔ خاندانی ناداروں میں سے ایک کثیر العیال نادار گھر کا بجھا سا چراغ ہوں۔ وہ شعر یاد کر لو۔ شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے۔ دل ہے گویا چراغ مفلس کا۔ کیا یہ کم رتبہ ہے؟ غریب ابن غریب ابن غریب تا بہ وقتِ آدم۔ میری جان! غریبوں کی دنیا کو اشد ضرورت ہے۔ امیر مٹتے رہتے ہیں غریب قائم ہیں۔ غریب قائم ہیں تو دنیا قائم ہے۔ دورنگیٔ عالم غریب پر موقوف ہے۔ اے میرے غریب بھائی! تو خدائی کا شاندار ستون ہے۔ تو لاثانی ہے۔ خاکم بدہن مگر یا خدا بے نیاز ہے یا تو ضرورت کی چیزوں سے آزاد ہے۔ کیا اب بھی تو اپنے آپ سے پریت نہ کریگا۔ کیا تو عالم ہے اور تجھے سب خبر ہے کہ یہ کیا بنا ہوا ہے اور کیوں بنا ہوا ہے اور نیک و بد کی میزان کا بھی تجھے علم ہے کہ کون زیادہ ہے اور کون کم ہے؟ جی چاہتا ہے، بہت چاہتا ہے کہ تجھے بھی جانِ من کہہ کر گلے سے لگاؤں مگر تو مجھے ٹھکرا دے گا۔ علم کا نشہ پریت کے نشے سے کہیں زیادہ تیز ہے۔ مگر اے عالم تیرے مرض کا علاج بھی مجھے آتا ہے۔ اپنے آپ سے اور اپنے علم سے نفرت کر۔ اس قدر نفرت کر کہ علم کی سیاہی تیرے قلب سے دھل جائے اور تو فردا کا اجارہ دار نہ رہے۔ اے عالم تو پھولوں میں سے کانٹے چنتا ہے۔ تجھے پریت کی خوشبو سے سروکار ہی نہیں۔ اے عالم علم کو موقوف کر دے۔

اچھے سے پڑھنے والے! امیرے باغ سے تیرا اپنا محصور مقفل باغ کہیں زیادہ آراستہ ہے۔ سُن، سُن، سُن۔ روز تجھ سے نہ کہونگا سُن

درِ دل کشا بہ چمن درآ

اور کسی کا نہیں اپنے دل کا دروازہ کھول۔ جو قفل برسوں بند رہیں وہ دیر سے کھلتے ہیں مشکل سے کھلتے ہیں۔ پریت کی کلید بھی رُک رُک کے پھرتی ہے۔ جلدی کرو اور بہت جلدی کرو۔ یہ نہ ہو کہ تم قفل ہی کھولتے رہو اور خزاں آجائے۔ اس بہارستان سے ایسے بے نصیب نہ جانا کہ خود دنیا کا باغ بھی نہ دیکھو۔ باغ بہت ہیں، باغوں میں پھول ہزاروں ہیں۔ پھولوں میں مہک فراواں ہے مگر عطار کم ہیں۔ کیا تم اپنے بھی عطار نہ بنو گے؟ کیا اب دنیا میں بخیلوں کا راج ہے؟ نہیں تم بخیل نہیں ہو، تم عالم نہیں ہو۔ تم لیڈر نہیں ہو۔

اچھے سے پڑھنے والے! تم صرف بھولے ہو۔

فلک پیما

کمسن سعیدہ کی یاد میں

نہیں کہ غم مجھے اے جانِ بے شعور نہیں،
میں تجھ سے دور ہوں لیکن میں تجھ سے دور نہیں

نظر کے سامنے ہے شکل ہو بہو تیری
وہ میٹھی میٹھی زباں اور وہ گفتگو تیری

اُسی طرح تو پہیلی سنا رہی ہے مجھے،
کہ اب بھی کان میں آواز آ رہی ہے مجھے

اگرچہ آنکھ مری کچھ اُداس رہتی ہے
مگر نگاہ ترے آس پاس رہتی ہے

سہیلیوں سے جو تو کھیلتی ہے راہوں میں
وہ نقشہ صاف کھچا ہے مری نگاہوں میں

مرا خیال تجھے پھول لا کے دیتا ہے
کسی گلاس میں رکھ کر سجا کے دیتا ہے

وہ ایک روز جو مورت مجھے دکھائی تھی
پسند تجھ کو ردی کاغذوں میں آئی تھی

کہا تھا تو نے کہ اخبار سے نکالی ہے۔
بتا وہ پاس ہے تیرے کہ پھاڑ ڈالی ہے؟

عجیب شغل ہیں تیرے عجیب کام ترے
کھلونے اپنے سجانے میں انتظام ترے

کسی طرح مری حیرانیاں ہٹا دینا
خدا کے واسطے مجھ کو کوئی بتا دینا

یہ کمسنی میں حلاوت کہاں سے آتی ہے!
دل اور جان کی راحت کہاں سے آتی ہے!

نشاطِ روح سے لبریز غم رُبا باتیں،
وہ پیاری پیاری سعیدہ کی جانفزا باتیں

جنوں

اُردُو کے ابتدائی مرثیے اور اُن کا ارتقا

(ولی کے دَور تک)

اردو زبان کی ابتدا اور تشکیل کے متعلق اب تک متعدد نظریے پیش کئے جا چکے ہیں لیکن ان میں سے شاید کوئی ایک بھی ایسا نہیں جسے ہر حیثیت سے مکمل کہا جا سکے بعض قرائن یہ بتاتے ہیں کہ اردو کی اصل پنجابی ہے بعض کے نزدیک دکنی اُس کی اصل ہے بعض موقعوں پر دل یہ ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ برج بھاشا کی گود میں اُس کی پرورش ہوئی۔ لیکن حقیقت ان سب کے خلاف ہے۔ اردو کی اصل اگر پنجابی کو کہا جا سکتا ہے تو دکنی بھی اس کی اصل ہو سکتی ہے۔ اگر برج بھاشا اُسے اپنا کہہ سکتی ہے تو مغربی ہندی کے چاہنے والے بھی اُردُو کو اپنا کہنے کا حق رکھتے ہیں۔ اردو نے مختلف وقتوں میں، مختلف سرزمینوں اور مختلف زبانوں میں پرورش پائی۔ جب تک اُس نے کوئی مستقل صورت نہیں اختیار کی تھی نہ وہ پنجابی تھی اور نہ دکنی نہ اس کا گہوارہ گوکل اور جھابن کی گلیاں تھیں نہ متھرا کے سرسبز اور شاداب میدان۔ ایک خاص وقت آیا کہ دتی نے سب کو اپنی طرف کھینچا اور شاہجہانی لشکر کے لئے ایک نئی زبان کے ترتیب دینے کی کوشش کی۔ پنجابی نے اپنے جمع بنانے کے قاعدے پیش کئے۔ دکنی نے فارسی اور عربی زبانوں اور بولیوں کے اثر کو اس بارگاہ تک پہنچایا مغربی ہندی نے روزمرّہ کے سیدھے سادے لفظ اس میں شامل کر دیئے۔ برج بھاشا نے ان سب تحفوں کو ایک جگہ جمع کیا اور مصدروں کا بیش بہا خزانہ لے کر آگے بڑھی اور ان بکھرے ہوئے موتیوں کی ایک لڑی گوندھ دی۔

زبان کی تشکیل کا مرحلہ تو اس طرح طے ہوا۔ اب ادب کے دعوےدار اٹھے اور ڈھونڈنا شروع کیا اردو کا موجودہ ادب کس کا مرہون منت ہے۔ ہندوستان بھر کے ادب چھان مارے لیکن اس عالیشان عمارت کی بنیادوں کا پتا صرف دکن میں ملا۔ سب نے متفق ہو کر کہہ دیا کہ قصیدہ، غزل، رباعی، مثنوی سب کی ابتدا دکن میں ہوئی اور رفتہ رفتہ انہوں نے موجودہ شکل اختیار کر لی۔ مرثیہ کی طرف لوگوں نے ذرا دیر میں توجہ کی لیکن تلاش کے بعد پتا چلا کہ مرثیہ نے بھی دکن ہی میں جنم لیا لیکن اس بات کا پتا چلانا ممکن نہ ہو سکا کہ مرثیہ سب سے پہلے کس نے کہا۔ اب تک اوّلیت کا شرف شجاع الدین نوری کو حاصل تھا پروفیسر تاسی (De Tassy) نے نوری کے متعلق لکھا ہے لیکن بعد کی تحقیقاتوں سے پتا چلا کہ نوری نام کے دو شاعر ہوئے ہیں ایک ابوالفضل اور فیضی کے زمانے میں اور دوسرا ابوالحسن تاناشاہ[1] کے عہد میں۔ اس نوری کا نام شجاع الدین تھا اور وطن گجرات تھا لیکن حیدرآباد میں رہتے تھے۔ سلطان ابوالحسن تاناشاہ کے وزیر سید مظفر کے لڑکے کو تعلیم دیا کرتے تھے۔ اور انہیں کے مرثیے مشہور ہیں[2]۔ چونکہ ابوالحسن کا عہد ۱۶۷۲ء سے ۱۶۸۲ء تک ہے اس لئے نوری کو پہلا

---

[1] آخری تاجدار گولکنڈہ (۱۶۷۲ء تا ۱۶۸۲ء)۔ [2] اردوئے قدیم حکیم شمس اللہ قادری و دکن میں اردو ہاشمی تذکرہ میر حسن صفحہ ۱۹۹۔

مرثیہ گو نہیں کہا جا سکتا۔ اس سے تقریباً پچاس سال پہلے[1] محمد قلی قطب شاہ کا دیوان مرتب ہو چکا تھا اور اس میں علاوہ اور اصناف سخن کے مرثیے بھی موجود ہیں۔ اس لئے پہلا مرثیہ گو قلی قطب شاہ کو کہنا چاہیئے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

دو جگ اماماں دکھ تھے سب جیو کرتے زاری وائے وائے ــ تن روں کی لکڑیاں جال کر کرتی ہیں خواری وائے وائے

آسماں جھج جالا ہوا سورج اگن والا ہوا ــ چندر سو جل کالا ہوا ہے دکھ اپاری وائے وائے

یک پوت کو دیتے زہر یک پوت پر کھینچے خنجر ــ کافر کئے کیسے قہر لو زخم کاری وائے وائے[2]

نمونہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مرثیوں کی بھی قریب قریب وہی شان ہے جو اور اصناف کی۔ قصیدے اور غزل میں کافی شگفتگی اور جدت پائی جاتی ہے مرثیوں میں وہ بھی مفقود ہے۔

قطب شاہی عہد کا دوسرا مرثیہ گو شاہی ہے افسوس ہے کہ اس کے مرثیوں کے نمونے ایسی جگہ ہیں جہاں سے بہ آسانی حاصل نہیں ہو سکتے۔ ڈاکٹر زور نے ان کے دو مرثیوں کا ذکر کیا ہے جو اڈنبرا یونیورسٹی میں ہیں۔ اُن کے متعلق کسی رائے کا اظہار نہیں کیا اور نہ اُن کا کوئی نمونہ ہی پیش کیا۔ صاحب اردوئے قدیم نے بھی ان کے مرثیوں کے متعلق صرف اتنا لکھا ہے کہ خوب کہتے تھے[3]۔ لیکن یہ تعریف یا تنقید اس قدر اضافی ہے کہ اُس سے کوئی رائے نہیں قائم کی جا سکتی۔ نساخ اور میر حسن نے بھی شاہی کا ذکر کیا ہے لیکن ان تذکروں سے اُن کے فنِ مرثیہ گوئی پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ مجموعی حیثیت سے صرف اُن کے متعلق اتنا ہی معلوم ہو سکا کہ اُن کا نام شاہ قلی خاں تھا حیدرآباد کے رہنے والے تھے قطب شاہی لشکر میں ملازم تھے اور آخر میں تانا شاہ کے مصاحب ہو گئے[4]۔

عادل شاہی عہد میں مرثیوں نے کسی قدر زیادہ ترقی کی اور اس عہد میں کافی مرثیہ گو گزرے اور اُن میں سے ہر ایک نے کچھ نہ کچھ خدمت انجام دی۔ اس عہد میں مرثیہ کے ترقی کرنے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ خود بادشاہوں کو بھی اس صنف سے محبت ہو گئی تھی۔ وہ اہل بیت کی محبت کو اپنا فرض سمجھتے تھے اور اُن کے مصائب پر آنسو بہانے کو اپنا ایمان۔ چنانچہ محمد عادل شاہ کے عہد میں ہر سال محرم کے مہینے میں طلبا اور علما کو تحفہ تحائف تقسیم کئے جاتے تھے[5]۔ محمد عادل شاہ بے حد علم دوست تھا شعر سے بھی اُسے کافی لگاؤ تھا اس لئے یقینی ہے کہ اُس کے عہد میں شاعروں نے جہاں اُس کے خوش کرنے کو غزلیں، قصیدے اور مثنویاں کہی ہوں گی وہاں دوسری طرف اُس کے مذہبی لگاؤ کو دیکھ کر مرثیے بھی ضرور کہے ہوں گے لیکن زمانے نے انہیں زندہ نہیں رکھا ممکن ہے ایسا اس لئے ہو کہ اُن میں لطف سخن کی کمی تھی اور اس لئے قبول عام کی سند نہیں ملی۔ پھر بھلا وہ ہم تک کیسے پہنچتے۔ ایک دوسری دلیل اس خیال کو اور زیادہ قوی بنا دیتی ہے اور وہ یہ کہ علی عادل شاہ خود بھی شاعر تھا اور شاہی تخلص کرتا تھا۔ ممکن ہے اڈنبرا یونیورسٹی کے دو مرثیے بجائے قطب شاہی عہد کے اسی کے ہوں[6] یا یہ بھی ممکن ہے کہ ایک اس کا ہو اور ایک دوسرے کا۔ ممکن تھا کہ مرثیوں کی زبان دیکھنے کے بعد اس بات کا فیصلہ کیا جا سکتا کہ دونوں ایک ہی شخص کے کہے ہوئے ہیں یا نہیں۔ لیکن موجودہ صورت میں یہ بھی غیر ممکن ہے۔

---

[1] (۱۰۲۵ ہجری مطابق ۱۶۱۴ء) [2] مضمون مولوی عبدالحق اردو جلد ۲ ۱۹۲۲ء [3] اردوئے قدیم [4] تذکرہ شعرائے اردو میر حسن صفحہ ۱۲۳) [5] و [6] اردوئے شہ پارے ۔

اس دور کا دوسرا اہم نام مرزا بیجاپوری کا ہے۔ یہ بھی علی عادل شاہ ثانی کے ہمعصر تھے اپنی شاعری کو صرف نعت منقبت اور مرثیے سے زینت دی۔ چنانچہ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ بادشاہ نے اپنی مدح کہنے کی فرمائش کی تو مرزا نے دو مرثیے کہے اور ان میں اپنے تخلص کے بجائے بادشاہ کا نام ڈال دیا[1]۔ بعض کا خیال ہے کہ اس نے اس موقع پر ایک مرثیہ لکھا اور اُسے بادشاہ کے نام معنون کر دیا[2]۔ بہر حال دونوں واقعات کی نوعیت یکساں ہے اور اُس سے مرزا کے کردار کے ایک ہی پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

الودا اے الودا شاہ شہیداں الودا ، الودا ابن علی دو جگ کے سلطاں الودا

یو شفق نہیں ہے گگن پر صبح و شام اس درد سوں نت بھرا ہیں لہو سنے دامن گریباں الودا

یا دوسرے مرثیہ میں کہا ہے ؎

یہی نہ تنہا لباس نیلا ہے سب خباں کے تن میں غم نقیں سیاہ پھیرا ہے پتلیوں نے ازل سوں جگ کے نین میں غم نقیں

خبر محباں کی اشک ریزی کی جب بدخشاں سوں گئی عرب میں عقیق جینے تھے سب لوہو ہو کے بہ چلے ہیں ان میں غم نقیں[3]

مرزا کے شعروں کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک مکمل شاعر تھا۔ اپنے خیالات کو شاعرانہ انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے غم اہل بیت نے دل پر جو اثر کیا ہے اس کی مختلف کیفیتوں کو مجموعی حیثیت سے شاعرانہ تعلیلوں کے پیرایہ میں پیش کیا ہے لیکن باوجود اس کے اثر مفقود نہیں۔ مرزا کے ہمعصر شاعروں میں ہاشمی بھی مشہور مرثیہ گو گزرا ہے۔ بعض کے نزدیک وہ ۱۶۸۸ء اور بعض کے نزدیک ۱۶۹۷ء میں مرا لیکن اس اختلاف سے اس کے عہد کے تعین میں کوئی دشواری نہیں پڑتی۔ ہاشمی کا پورا نام سید میراں تھا اور وہ بیجاپور کے رہنے والے تھے اُن کی مثنوی یوسف زلیخا نے انہیں کے عہد میں کافی شہرت حاصل کر لی تھی اس مثنوی کے علاوہ ہاشمی نے خود ہی اپنا دیوان بھی مرتب کیا جس میں قصائد۔ غزلیات۔ قطعات اور رباعیات کے علاوہ مرثیے بھی موجود ہیں[4]۔ اسی بنا پر ڈاکٹر زور نے لکھا ہے کہ وہ اردو کے پہلے مرثیہ گو کہے جاتے ہیں لیکن کوئی وجہ نہیں سمجھ میں آتی کہ جب اُن کے زمانے سے بہت عرصہ پہلے قلی قطب شاہ کے دیوان میں مرثیے موجود ہیں تو ہاشمی کو پہلا مرثیہ گو کیوں کہا جائے۔ علاوہ بریں اگر قطب شاہ سے قطع نظر بھی کر لیا جائے تو خود ہاشمی کے ہمعصر مرزا شاہی اور نوری کو کس طرح نظر انداز کیا جا سکتا ہے اور کس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اپنے ہمعصروں میں ہاشمی ہی سب سے پہلے مرثیہ گو ہیں۔

ہاشمی اور مرزا کے ہمعصر شعرا میں سیوا کا نام بھی پیش پیش ہے۔ اُن کا وطن گلبرگہ تھا لیکن بیجاپور میں رہتے تھے انہوں نے ۱۰۹۲ھ/۱۶۸۱ء میں مولانا کمال الدین حسین الواعظ کی کتاب روضۃ الشہدا کا ترجمہ اردو نظم میں کیا اور اس طرح واقعات کربلا کو مجموعی حیثیت سے اردو نظم کا جامہ پہنایا۔

۱۶۸۶ء میں بیجاپور کی عادل شاہی اور ۱۶۸۷ء میں گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنتوں کا خاتمہ ہو گیا دکن کے ادبی ذوق میں وہ سرگرمی باقی نہ رہی جو ان قدر دان حکمرانوں کے عہد میں تھی لیکن چونکہ لوگوں میں اچھا خاصا ذوق پیدا ہو چکا تھا اس لئے اُس کا یکبارگی فنا ہو جانا غیر ممکن تھا۔ ان سلطنتوں کے زوال کے بعد بھی ہر طرف شعر و شاعری کا مشغلہ جاری رہا اور اسی کے ساتھ شاعر برابر مرثیے بھی کہتے رہے چنانچہ اس زمانے

---

[1] اردوئے قدیم۔ [2] و [3] اردو شہ پارے [4] اردوئے قدیم

میں بھی بہت سے مرثیہ گو ہوئے ان مرثیہ گویوں میں ذوقی۔ بحری اور احمد قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن ان تینوں کے مرثیوں میں بھی اُس جوش کی کمی ہے جو ان کے بعض پیشروں میں موجود ہے اور اس کی وجہ ظاہراً یہی سمجھ میں آتی ہے کہ حکومتوں کے ساتھ مذہبی بلند آہنگیوں میں بھی کمی آنی شروع ہوگئی جو شاعر مرثیے کہہ کر دین و دنیا کے مقاصد حاصل کرتے تھے انہوں نے اب اُسے صرف نجات کا ایک ذریعہ سمجھ کر تبرکاً کہنا شروع کر دیا اس لئے اُن میں سوائے مذہبیت کے اور کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔

ذوقی جو تقریباً ۱۶۹۸ء میں مرا ایک مذہبی شاعر تھا اور اُسے فخر تھا کہ وہ اورنگ زیب جیسے مذہبی بادشاہ کے عہد میں پیدا ہوا اُس نے کئی نظمیں مذہبی موضوعات پر لکھیں۔ ایک مرثیہ آنحضرت صلعم کا لکھا اور اس کے علاوہ کچھ مثنویاں اور غزلیں بھی لکھیں لیکن اُن پر بھی مذہبی رنگ چڑھا ہوا ہے۔ اُس کے مرثیے بھی محض مذہبی فرض سمجھ کر لکھے گئے ہیں[1] نمونہ کلام یہ ہے ؎

اے شمع بزم مرتضیٰ گھر آج آتے کیوں نہیں	تاریک ہے تم بن جہاں جلوہ دکھاتے کیوں نہیں
وہ جاہل وہ دوزخ وطن آئے ہیں بادل کے نمن	جوں برق تیغ صف شکن شہ جگمگاتے کیوں نہیں
وہ شمع بزم مصطفیٰ بادِ اجل سوں گل ہوا	سب سوز دل سوں تن سدا یاراں گلاتے کیوں نہیں

آخری شعر سے مرثیہ گوئی کے مقصد کا بھی اظہار ہوتا ہے۔

زبان میں صفائی موجود ہے۔ سوائے بعض بعض جگہ کے شاعر کی زبان دکنی سے بہت کم متاثر معلوم ہوتی ہے بالکل اسی عہد کا دوسرا شاعر بحری[2] ہے۔ بحری کا نام قاضی محمود تھا۔ ایک صوفی مشرب بزرگ تھے علی عادل شاہ کے درباری شاعر ہونے کے علاوہ عالمگیر کے دربار تک بھی رسائی حاصل کی تھی اُن کی شہرت کا خاص ذریعہ ان کی مثنوی من لگن ہے لیکن اس مثنوی کے علاوہ انہوں نے دوسرے اصناف سخن پر بھی طبع آزمائی کی ہے اور اُن کے قلمی دیوان میں غزلوں اور قصیدوں کے علاوہ چار مرثیے بھی ہیں ان مرثیوں کے عام انداز سے بھی پتا چلتا ہے کہ ان کے کہنے کا مقصد ادبی نہیں تھا بلکہ محض مذہبی واقعات کا انتخاب ہے کسی کاوش سے کام نہیں لیا گیا محض مسلمانوں کے رُلانے کے لئے واقعہ کربلا کو مجموعی حیثیت سے یا اُس کے مجموعی اثر کو بیان کیا گیا ہے اور یا اپنے بیان کو محض سید الشہدا کی شہادت اور اس کے رنج و الم کے اظہار تک محدود رکھا گیا ہے۔ ان کی زبان بھی ذوقی کی طرح صاف نہیں۔ صرف بعض بعض شعر صاف ہیں لیکن کہیں کہیں تخیل کسی قدر بلند ہے۔ بیان کو جا بجا تشبیہ اور استعاروں سے رنگین بنانے کی کوشش کی ہے لیکن لفظوں کے گورکھ دھندے نے کہیں لطف نہیں پیدا ہونے دیا۔ نہ مجموعی حیثیت سے پڑھ کر دل پر کوئی خاص اثر پڑتا ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ جہاں زبان صاف ہے وہاں کچھ نہ کچھ اثر بھی ضرور ہے۔ اُن کے اُس کلام کا نمونہ درج کیا جاتا ہے جو اردو معلوم ہوتا ہے ؎

جب شاہ کے وجودِ مبارک پہ غم ہوا	تب سب جہاں تے حرف خوشی کا عدم ہوا
گلزار گلستاں منے غم تے ہو چاک چاک	روتا ہے ہر سحر نہ کہ شبنم سے نم ہوا

---

[1] شہ پارے [2] شہ پارے۔ اردوئے قدیم (صفحہ ۸۶) دکن میں اردو (صفحہ ۲۷) داستانِ اردو

اس شعر کا فاعل معلوم نہیں شاعر نے کس چیز کو قرار دیا ہے

بحری مدام شاہ کے ماتم میں یوں گلے، چوں چاند آسمان پہ گل گل کے کم ہوا[1]

بحری کے ہمعصر ایک شاعر کا ذکر ڈاکٹر زور نے اردو شہ پارے میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ اڈنبرا یونیورسٹی میں ان کے سات مرثیے موجود ہیں۔ پانچویں مرثیے کی بہت تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ اس میں حضرت شہر بانو کے جذبات کی ترجمانی ہوئی ہو۔ اس میں جذبات و احساسات بہت ہیں لیکن افسوس ہے کہ نمونہ موجود نہیں ورنہ یہ اندازہ ہو جاتا کہ آج سے دو سو برس پہلے جذبات کی ترجمانی کس طرح ہوتی تھی۔

بحری۔ ذوقی اور احمد کے ذرا ہی بعد ولی دہلوی[2] کا نام لینا چاہیئے۔ اُن کا نام سید محمد فیاض تھا۔ ملا باقر آگاہ نے مراۃ الجنان کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ ویلوران کا وطن تھا۔ عالمگیر کے عہد میں گزرے ہیں جراست خاں نامی ایک امیر کے ملازم تھے اُن کی تصنیفات میں قصہ رتن پدم اور روضۃ الشہدا کا ترجمہ مشہور ہیں۔ یہ کتاب ۱۱۱۹ھ ہجری میں تصنیف ہوئی اور ۱۲۹۰ھ ہجری میں بمبئی میں شائع ہوئی۔ اس میں دس باب ہیں جن میں آنحضرت صلعم کی وفات سے شہادت امام حسینؑ تک کے تمام واقعات نظم کئے گئے ہیں۔ اکثر اوقات یہ شبہ پیدا ہو جاتا ہے یہ کتاب ولی اورنگ آبادی کی ترجمہ کی ہوئی ہے لیکن میر، فتح علی گردیزی۔ قائم۔ شفیق۔ خواجہ حمید علی ابراہیم خاں۔ میر حسن۔ مصحفی اور لساخ میں سے کسی نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ مصنفین اُردوئے قدیم اور دکن میں اُردو نے بھی اس کی تردید کی ہے۔

ولی ویلوری کے بعد اُن مرثیہ گویوں کا ذکر آجاتا ہے جو یا تو ولی کے ہمعصر تھے اور یا اُن کے شاگرد۔ ان میں سے اکثر نے مرثیے کہے ہیں! ور وہ زبان اور ترتیب و تسلسل کے اعتبار سے اپنے پیش رووں سے بہتر ہیں۔

اس عہد کا سب سے مشہور شاعر اشرف ہے خواجہ خان حمید اورنگ آبادی نے ان کے متعلق لکھا ہے "محمد اشرف اشرفی تخلص۔ گجراتی بلاواسطہ شاگرد ولی محمد[3]" شفیق نے بھی ولی کا ہمعصر لکھا ہے[4]۔ ولی نے ان کے ایک شعر پر تضمین بھی کی ہے ایک مثنوی جنگ نامہ لکھی ہے اس میں جا بجا بہادر۔ جہاندار اور فرخ سیر کے نام بھی اس طرح آئے ہیں کہ زمانہ کا تعین یقینی ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر زور نے اڈنبرا یونیورسٹی کی بیاض میں ان کے ۱۳ مرثیوں کا ذکر کیا ہے جن میں ۴۰ اشعر ہیں اُن مرثیوں کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

حضرت شہر بانوؓ فرماتی ہیں ؎

کہاں ہے وہ ولی والی حیدر حسنؓ میرا، کہاں ہے وہ حسینؓ ابن علیؓ صفدر شکن میرا

اگن سوں ماتم شہ کے جلا ہے تن بدن میرا، برنگ برق خرمن سوز دل ہے ہر سخن میرا

لگا ہے بسکہ تیر ماتم شہ دل منے کاری، شہید کربلا ئے غم ہوا ہے جگ میں من میرا

یا ایک دوسری جگہ فرماتی ہیں ؎

بانوؓ کہیں صغر نہیں اب میں جھلاؤں کس کے تئیں، سونا ہوا ہے پالنا اب میں جھلاؤں کس کے تئیں

---

[1] قلمی نسخہ دیوان بحری کتب خانہ ڈاکٹر سید محمد حفیظ صاحب [2] شہ پارے اردوئے قدیم (صفحہ ۸۹) [3] گلشن گفتار خواجہ خاں حمید اورنگ آبادی (صفحہ ۱۲) [4] چمنستان شعرا شفیق اورنگ آبادی (صفحہ ۳۵) - اردو شہ پارے۔

نہلا کے ہیں کپڑے پہنا اس کو بناتی گُل نمن	وہ پھول سوکھا نیر بن اب میں بناؤں کس کے تئیں
سوتا تھا جب وہ نیند بھر پینے اُٹھاتی دودکیوں	بیدم ہے دیکھو آج وہ اب میں جگاؤں کس کے تئیں
جب مسکراتا وہ ہچا میں شاد ہوتی دل منے	بے جاں پڑا ہے گود میں اب میں ہنساؤں کس کے تئیں

ماں کے جذبات کی کتنی پراثر اور صحیح ترجمانی ہے۔

ولی کے ایک دوسرے شاگرد کا ذکر اردو شہ پارے میں ہے گلشن گفتار میں بھی ان کا تذکرہ ہے۔ اس میں ان کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ صرف اتنا ہے "محمد رضی۔ رضی تخلص۔ نیز متوطن احمد آباد از شاگردان رشید ولی محمد ہم دراں جواب ریختہ محمد اشرف مذکور موزوں ساختہ"۔ اُن کے مرثیے کے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں ؎

غم سوں ہے بے قرار میرا دل	دکھ سوں ہے زار زار میرا دل
گلشن غم میں ہے شہیداں کے	لالۂ داغدار میرا دل
غم کی بجلی پڑی ہے جب سینے	تب سوں ہے شعلہ زار میرا دل
نیم بسمل نمن تڑپتا ہے	ہو کے غم کا شکار میرا دل
گردِ غم سوں امام کے اے رضیؔ	کیوں نہ ہو پُر غبار میرا دل

امامی (۱۷۲۵ء) کا تذکرہ سوائے شہ پارے کے کسی تذکرے میں نہیں۔ اس لئے ان کے حالات بھی نہیں معلوم۔ اُن کے مرثیوں کے متعلق ڈاکٹر زور نے لکھا ہے کہ "اسلوب بیان دلچسپ اور دلکش ہے۔ وہ اکثر گفتگو کے طور پر لکھتا ہے اور مرثیوں میں ڈرامائی اثر پیدا کرتا ہے۔ بحریں دلچسپ استعمال کی ہیں"۔ لیکن یہ سب کچھ لکھنے کے باوجود کلام کا جو نمونہ پیش کیا ہے اُس سے ان تمام خصوصیات پر روشنی نہیں پڑتی۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ امامی سے پہلے مرثیے مربع کی شکل میں نہیں ملتے۔ چونکہ ان کے قریبی ہمعصروں میں مرثیے اس شکل میں موجود ہیں اس لئے یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ اولیت کا شرف کسے ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

کیا ظالماں نے ظلم کیا بے حساب آج	مظلوم کربلا میں ہیں عالی جناب آج
اس غم سوں مومناں کوں ہوا پیچ و تاب آج	گویا علی کے گھر کا کھلا غم کا باب آج
تھا آئینہ رسول کو درشن حسینؑ کا	ہے وہ جفا کہ گرد میں درپن حسینؑ کا
کیوں عرش فرش پر نہ گرا بے قرار ہو	کیوں تاب لاسکے نہ فلک دیکھ ظلم یوں
مینا سے قدکوں شہ کے شکستہ کیا دیکھو	سنگیں دلاں نے ظلم کی پی کر شراب آج[۳]

امامی اور رضی کے ہمعصر شعرا میں ایک غلامی (۱۷۲۵ء) بھی ہیں۔ نمونۂ کلام درج ہے ؎

---

[۱] مولفہ خواجہ خان حمید اورنگ آبادی (۱۱۶۶ ہجری) [۲] شہ پارے

اب میں جھولاؤں کسے چھاتی لگاؤں کسے ۔ دود پلاؤں کسے ہے ہے فلک کیا کیا
نکلی میں جب از وطن کیسی ہوئی تھی شگن ۔ گم ہوئے سارے رتن ہے ہے فلک کیا کیا
لوہو میں اکبر میرا زخمیں بدن ہے پڑا ۔ تن ہوا سر سوں جدا ہے ہے فلک کیا کیا
حال مرا زار ہے جیونا دشوار ہے ۔ عابدیں بیمار ہے ہے ہے فلک کیا کیا
میری سکینہ نڈھال پیاس سوں ہی خستہ حال ۔ کیا کروں اے ذوالجلال ہے ہے فلک کیا کیا
آئی تو آئی کہاں بیٹھی بسیا ہی کہاں ۔ میرا جوائی کہاں ہے ہے فلک کیا کیا

ابتدائی مرثیوں میں تسلسل کی کتنی اچھی مثال ہے۔

اماؔمی کی طرح غلاؔمی کے یہاں بھی مربع مرثیے موجود ہیں ؎

بانوؑ پہ کربلا میں کیسا یہ دُکھ پڑا ہے ۔ گودوں میں پیارا اصغرؑ بن دود مرچلا ہے
ہور رانڈ بیٹھی بیٹی داماد مرچکا ہے ۔ سر کا چتر بھی ڈھلتا کوئی دم کو آرہا ہے
سمجھانا اس بچی کو اس وقت کیا مصیبت ۔ بابا بناں تڑپنا اور تشنگی کی شدّت
اے بیٹی تیرے بابا کھانے گئے ضیافت ۔ معصوم کا یہ سُن کر دہ چند جی جلا ہے
کہنے لگی کہ اماں ہے ہے یہ کیا غضب ہے ۔ مرتی ہوں بھوک سینتیں پیاسوں سے جاں بلب ہے
ضیافت میں گئے ہیں بابا مجھ بن تو کیا سبب ہے ۔ بابا نے مجھ پہ شاید شفقت کوں کم کیا ہے[۱]

تسلسل کے علاوہ اس مرثیہ میں بلاغت کے مدارج کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ بچی کو بہلانے کا کس قدر فطری طریقہ ہے کہ "اے بیٹی تیرے بابا کھانے گئے ضیافت" اس کے بعد بچی کا جواب بھی کتنا موافقِ فطرت اور دردبھرا ہے۔ مرثیے نے درجہ بدرجہ جتنی ترقی کی اس کا اندازہ اماؔمی۔ غلاؔمی اور قاؔدر کے مرثیے دیکھنے سے ہوتا ہے۔ قاؔدر بھی اسی عہد کے مرثیہ گو ہیں۔ ہاشم علی برہان پوری نے جن کا ذکر ذرا آگے آئے گا کئی مرتبہ اپنے مرثیوں میں ان کا ذکر کیا ہے[۲]۔ اُن کے کلام میں جا بجا شعریت کی جھلک موجود ہے اور مرثیہ کا مقصد محض مذہبی نہیں رہا کہیں کہیں جذبات کی ترجمانی بھی کی ہے تسلسل کی بھی کمی نہیں۔ ان کے مرثیے عموماً مربع ہیں ؎

ہوا شہرہ محرم میں یو غم ہے شاہ عالی کا ۔ کہ ہے فرزند پیارا وہ دونو عالم کے والی کا
چھوپا ہے دین کا شہرہ کہ جس کے سوگ سوں جگ ۔ فلک پر ملک ہیں تانے شمیانا رات کالی کا
ستارے سب یہ قدسیاں لے ملا کر سب گگن اوپر ۔ حسینؑ کے عرس کو بھاندے سنڈف موتیاں کی جالی کا

---

[۱] شہ پارے ص۔ سن اگیارہ سو انچاس سال ۔ سنہ بانا قادر کا لہو میں لال
ختم کریو مرثیا پایا وصال ۔ ہائے کیا غم غم پہ غم ہے مستقیم

دیکھو غم کے میانے میں لطافت غم کے مالی کا[۱] — سہس لو اشک شبنم سوں کھڑے ہیں آہ کے گلُ ہو

جہاں ان دو بندوں سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ قادر ایک حقیقی شاعر تھا وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اپنے دوسرے ہمعصروں کے مقابلہ میں اُس کی زبان دکنی سے زیادہ متاثر تھی۔

کاظم بھی اسی عہد کے مرثیہ گو ہیں۔ اُن کی زبان میں زیادہ پختگی ہے۔ بندش الفاظ بھی بہت چُست ہے ؎

گلزار احمدی پہ چلی صرصرِ خزاں — کانٹوں پہ سوگوار ہو بیٹھے ہیں بُلبُلاں
ہر سرو راستی پہ کریں نوحہ قمریاں — بیدل صنوبراں کی خبر لو علیؑ ولی
دریائے خوں میں غرق محباں ہیں شاہ کے — تا آسماں بگولے اڑاتے ہیں آہ کے
آتش لگے ہے خرمن ہستی میں ماہ کے — اوس خاک بستراں کی خبر لو علیؑ ولی

اس زمانے کا ایک بہت جدت پسند شاعر سیدن ہے۔ سیدن کے دو مرثیے ایڈنبرا یونیورسٹی میں موجود ہیں اُن میں سے ایک مرثیے کے تھوڑے سے شعر نقل کئے جاتے ہیں جس سے اُس کی جدت پسندی کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ سودا کے دیوان میں ایک مربع مرثیہ[۳] حضرت قاسم کے حال میں ہے جس میں انہوں نے رنج و آلام و مصائب کربلا کے مختلف پہلوؤں کو ایک جگہ جمع کرکے حضرت قاسم کی شادی کے سامان ترتیب دیئے ہیں لیکن اُن سے کم از کم ۲۵ - ۳۰ سال قبل سیدن نے اپنے ایک مرثیہ میں تمام چیزوں کو اسی التزام کے ساتھ شاعرانہ انداز میں جمع کیا ہے ؎

ماہ محرم میں دیکھو ہو حسیندا مالی آئیا — تارے گگن کے گوند کے سہرا جو شہ کوں لائیا
کنگنا ستم کا باندکر روکہ کا او بٹا کوں لگا — حیرت کی چوکی کے اوپر انجھواں سے تن نہلائیا
دولا حسینا چھپر تر نگ سر ڈال مکھنا نور کا — سارے براتی ساتھ لے دولھن کوں بھیانے دھائیا
باجے بجیر دیں بین کے غم کے نفیریاں کا ہے غل — ملعون لشکر بل سبھی منڈف تیراں کا چھائیا
اپنے یو جیو کوں وار کر دیوے دھنگانا سیس کا — ہر اک نے شہ کے سنگ سوں خلعت سہانی پائیا
قاضی قضا نے عقد بن کر ختم شرطاں شرعیاں — ڈھالاں کے خواناں کر نگیں شمشیر چولہا کھائیا
آکر مشاتا موت کی دولھن شہادت کی بنا — تقدیر کے سو تخت اوپر بھٹلا کے جلوا لائیا
سیدن سقا شہ کا سدا میدان تر کرنے بدل — نینوں کی مشکاں اشک سوں بھر بھر کے نت چھڑکائیا[۴]

اس مرثیہ میں کوئی بات ایسی نہیں جو اس کی قدامت پر دلالت کرتی ہو۔ پہلی نظر میں یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ یہ دکنی کے عہد کی اُردو نہیں لیکن اگر یہ بات ذہن نشین کرلی جائے کہ دکنی کے عہد میں بھی دو طرح کی زبان استعمال ہو رہی تھی۔ وہ شاعر جن پر دکنی اور اُس کے اطراف کی زبان

[۱،۲] شہ پارے [۳] کلیات سودا مطبوعہ نولکشور پریس دسمبر ۱۹۳۲ء صفحہ ۱۴۳ "یارو ستم نو یہ سنو چرخ کہن کا"۔ [۴] شہ پارے۔

کا اثر تھا ایسی زبان استعمال کرتے تھے جو بالکل اردو معلوم ہوتی تھی۔ وہ شعرا جن پر دکنی زبان کا اثر تھا اپنے شعروں میں اسموں اور فعلوں کو بالکل اسی طرح لکھ دیتے تھے جیسے اُن کی زبان پر تھے دونوں کے لب ولہجہ اور تلفظ میں کافی فرق تھا۔ اس لئے ایک ہی لفظ محض تلفظ اور لب ولہجہ کے اختلاف کی وجہ سے بالکل نیا معلوم ہونے لگا۔ سیدن کے مرثیے کا بھی یہی حال ہے۔ اُن پر زمانے کے ارتقا نے برابر اثر کیا اور اس لئے خیالات اور مرثیے کی ترتیب میں اُس کا اثر نمایاں ہے لیکن زبان فطری چیز ہے وہ انہوں نے وہی استعمال کی ہے جس سے وہ بچپن سے متاثر ہوئے تھے۔

ہاشم علی برہان پوری نے اپنے ہمعصروں میں جا بجا روحی اور منظر کا بھی ذکر کیا ہے۔ شہ پارے میں دونوں کے مرثیوں کے نمونے موجود ہیں۔ ایڈنبرا یونیورسٹی میں روحی کے پانچ مرثیے ہیں جن میں ۴۶ شعر ہیں[۱]۔ ایک مرثیے کے کچھ شعر نقل کئے جاتے ہیں جن کے پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ روحی کے مرثیوں میں کتنا تغزل ہے ؎

آج غم ناک ہیں چمن کے گل | بلکہ دل چاک ہیں سمن کے گل
غم زدہ سینہ داغ حیراں ہیں | نرگس و لالہ یاسمن کے گل
یوں یہ لالے شفق کے دسنے میں | لہو میں ڈوبے ہیں سب گگن کے گل
جب سُنی شہ کی بات مجلس میں | جل بجھے شمع انجمن کے گل
نقش پا دیکھ دل ہوس رکھتا | سر پہ رکھنے کوں تجھ چرن کے گل
خوش لگے تجھ طبع سوں ای روحی | دل کے باغاں منے سخن کے گل[۲]

منظر کا کلام بھی اپنے ہمعصروں کا سا ہے۔ زبان میں ذرا صفائی اور زور اور روانی سے کچھ زیادہ ہے ؎

یاراں ہزار حیف رسولؐ خدا نہیں | اور فاطمہؓ علیؓ و حسنؓ مجتبےٰ نہیں
تنہا حسینؓ رن میں کوئی آشنا نہیں | بازو نہیں رفیق نہیں۔ دلربا نہیں[۳]

مرثیہ گوئی کے ابتدائی دور کا آخری اور سب سے زیادہ پُرگو شاعر ہاشم علی برہان پوری ہے۔ ولی کا انتقال ۱۱۵۵ھ ہجری مطابق ۱۷۴۴ء عیسوی میں ہوا۔ ہاشم علی نے اپنے ایک مرثیے کے عنوان میں یہ عبارت لکھی ہے :-

"از جملہ تفضیلات امام شہید کہ بریں عاصی شدہ آنست کہ برادر ایمانی حافظ فضل الدین در عالم رویا بتاریخ ہشتم ماہ مبارک رمضان ۱۱۴۸ھ ہجری مشاہدہ نمود کہ گویا پائے علاوہ آنحضرت نشستہ و محباں جمع شدہ اند . . . . "[۴]

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۱۴۸ھ ہجری میں زندہ تھے۔ ایک مرثیہ کے آخری شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۱۴۹ھ میں بھی زندہ تھے[۵]۔ ممکن ہے ولی کے بعد زندہ رہے ہوں لیکن یہ یقین ہے کہ وہ ولی کے ہمعصر ضرور تھے۔

---

[۱] مضمون ڈاکٹر زور (اردو) اپریل ۲۹ء [۲] ۲۱۳ اردو شہ پارے [۳] مضمون ڈاکٹر زور (اردو) اپریل ۲۹ء [۵] سنہ گیارہ سو اُنچاس سال پر سبز بانا قادر اکا لہو میں لال
غم کر یو مرثیا پایا دسال پر ماننے کیا غم غم پر غم ہے مستقیم

ہاشم نے اپنے مرثیوں کو ردیف وار ایک جلد میں جمع کیا اور اس کا نام دیوان حسینی رکھا دیوان حسینی میں کل ۲۳۸ مرثیے ہیں[۱]۔ کچھ شعر لکھے جاتے ہیں ؎

جلوہ سیں اُٹھ کے رن کوں چلا تب کہی دُلھن | دامن پکڑ کے لاج سوں انجھواں بھرے نین
مت چھوڑ کر سدھارو تم اس حال میں ہمن | تم بن رہے گا ہائے یہ سونا بھون میرا
کیسی یو کدخدائی و کیسی ہے یو برات | آنا فراق تم سوں یو جلوہ کی آج رات
گھر کوں نہ لے گئے ہو نہ بولے ہو ہم سوں بات | دیکھا نہیں مجال کوں بھر کے نین مرا
شعلہ لگا ہے دل منے اس غم کا کیا کروں | مجھ کوں روا ہوا ہے اگر زہر کھا مروں
دوری میں ہائے تیری میں ان رین کیوں بھروں | فرقت کی آگ سینے میں جلے گا بدن مرا

حضرت قاسمؑ جواب میں فرماتے ہیں ؎

مجھ کوں نہیں ہے تیری جدائی کا اختیار | تیرے فراق سات میں جاتا ہوں اشکبار
میں کیا کروں علاج نہیں حکم کردگار | حق سے کیا ہے ان میں مقرر رہن مرا[۲]

ہاشم علی کے ان چار بندوں کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے مرثیہ نے اس وقت تک ترقی کے کتنے مدارج طے کر لئے تھے۔ جذبات نگاری، بلاغت حسن ترتیب اور کردار نگاری کے ابتدائی نقوش صاف صاف نظر آ رہے ہیں۔ یہی وہ بنیادیں ہیں جنہیں سودا، میر اور سکندر نے اس کے بعد آنے والے دور میں اپنی بساط کے مطابق بلند کیا۔ خنجر، خلیق اور دلگیر نے ان بلند دیواروں کو قصر عالیشان بنا دیا اور دبیر اور انیس نے عالیشان محلوں کے گوشہ گوشہ کو ایسی زینت دی کہ یہ رشک ارم بن گئے۔

ان شاعروں کے علاوہ ڈاکٹر زور نے دو اور شاعروں کے مرثیوں کے نمونے پیش کئے ہیں اور لکھا ہے کہ یہ بھی اسی دور کے مرثیہ گو تھے۔ ان شاعروں کا نام ندیم اور شرف ہے ہمیں زور صاحب کی رائے سے اتفاق نہیں مختلف تذکرے دیکھنے کے بعد صرف ایک تذکرے میں ندیم اور شرف کا تھوڑا سا حال ملا! ور اس سے اگر اور کچھ نہیں ہوتا تو کم از کم ان کے زمانے کا تعین ضرور ہو جاتا ہے۔

عبدالغفور خاں نسّاخ نے اپنے تذکرے سخن شعرا میں ندیم[۱] نامی ۶ شاعروں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں صرف دو ایسے ہیں جنہیں انہوں نے میر اور سودا کا ہمعصر بتایا ہے۔ ان میں سے ایک کا نام مرزا علی ہے اور اُن کے متعلق لکھا ہے کہ معاصر میر تقی میر تھے۔ دوسرے ندیم کا نام شیخ علی ہے ان کے متعلق لکھا ہے مرثیہ گو بھی تھے اور سودا کے معاصر تھے[۲]

شرف[۳] کے متعلق بھی سخن شعرا سے صرف اتنا معلوم ہوا کہ سودا کے شاگرد تھے اور مرثیہ اور منقبت کہتے تھے[۴]

(باقی) سید وقار عظیم

---

[۱] سخن شعرا صفحہ ۵۰۶ [۲] معلوم نہیں نساخ نے معاصر سودا اور معاصر میر کی تفریق کس لئے کی ہے [۳] سخن شعرا صفحہ ۲۴۵ [۴] ان مرثیہ گویوں کے علاوہ

(باقی بر صفحہ ۲۰۹)

ٹھہر!

ٹھہر، ٹھہر! اسی طرح جیسے میں تجھے دیکھ رہا ہوں میرے حافظے میں ہمیشہ کے لئے باقی رہ جا!

تیری آواز کا آخری نغمہ ختم ہو چکا ہے۔ تیری آنکھوں میں اب کوئی روشنی، کوئی چمک باقی نہیں رہی؛ وہ اب ماند پڑ گئی ہیں، خوشی کے بوجھ سے، ——— احساسِ حُسن کے پُر مسرت بوجھ سے وہ دب گئی ہیں کیسی خوش نصیب تھی تو کہ خدا نے تجھے حُسن کے اظہار کے لئے پیدا کیا ——— حسن جس کی جستجو میں تیرے پُر آرزو ہاتھ پھیلے ہوئے ہیں، فیروز مند، تھکے ہوئے ہاتھ۔

یہ چمک آفتاب کی چمک سے بھی زیادہ روشن اور صاف کیسی ہے جو تیرے تمام اعضا اور تیرے کپڑوں کی ایک ایک شکن سے نکل رہی ہے؟

یہ کس دیوتا کا سانس ہے جو تیری بکھری ہوئی زلفوں کو لہرا رہا ہے؟

ہاں راز کھل گیا، شعر، زندگی اور محبت کا راز! یہ، یہ ہے بقا! اس کے علاوہ بقا اور کچھ نہیں، نہ کچھ ہو سکتی ہے۔ کیونکہ اس لمحے میں تو غیر فانی ہے

یہ لمحہ گزر جائے گا تو ایک دفعہ پھر تو خاک کا ایک ذرہ ہو گی، ایک عورت، ایک بچہ . . . لیکن تجھے اس کی فکر کیوں ہو! اس ایک لمحے میں تو ہر اس چیز سے بالاتر ہے جو مٹ جانے والی ہے، عارضی ہے۔ تیرا یہ لمحہ کبھی ختم نہ ہو گا۔ "ندیم"

(بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۲۰۸) نواب نصیر حسین خیال نے اسی دور کے ایک اور مرثیہ گو کا ذکر کیا ہے، اور لکھا ہے کہ اُن کا نام حیدر یا حیدری تھا اور وہ ۱۰۶۷ھ سے ۱۱۶۷ھ ہجری تک زندہ رہے۔ اُس کے متعلق (De Tassy) اور کریم الدین کی رائیں بھی پیش کیں ہیں۔

De Tassy نے اُن کے متعلق لکھا ہے کہ "حیدر شاہ نام تھا۔ وطن دکن۔ گھر سے دہلی آئے اور بعد کو شجاع الدولہ کے زمانہ میں مرشدآباد پہنچے اور احمد شاہ درانی کے دوسرے حملے تک جئے۔"

کریم الدین اُن کے متعلق لکھتے ہیں "میر حیدر شاہ دکنی جیسا کہ وہ قابلیت لڑائی کی رکھتا تھا ویسا ہی شعر کہنے میں لیاقت رکھتا تھا۔ دہلی سے بنگالے شجاع الدین کی عملداری میں اور نواب علاؤالدولہ کی خدمت میں جو اس کا بیٹا تھا رہتا تھا وہ قدما کے طور پر شعر لکھتا تھا اکثر ولی کی غزلوں کا خمسہ بنایا کرتا تھا اس کی عمر تقریباً سو برس کی تھی۔ عملداری احمد شاہ بادشاہ میں فوت ہوا۔

مثال میں صرف ایک بند پیش کیا گیا ہے ؎

عزیزو آج ناموسِ نبیؐ پر آفت آئی ہے — شرِ رخصت ہے ہنوز سے شہ دیں کی جدائی ہے
خصہ صاحبی بی بانو نے عجب حالت بنائی ہے — سرانے بی سکینہ کے کھڑی دیتی دہائی ہے
منہ اُس کا چومتی ہے اور یہی کہہ کہہ کے روتی ہے
اری اللہ لاڈلی میری غضب! صبح ہوتی ہے

صرف ایک بند سے پتا چل سکتا ہے کہ De Tassy یا کریم الدین کا بیان صحیح ہے یا غلط۔ ممکن ہے کہ یہ مرثیہ پورا مل سکے تو اس کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ ہو سکے۔ کچھ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ چونکہ اس کی زبان بہت صاف ہے اس لئے یہ اس دور کا مرثیہ نہیں ہو سکتا لیکن ولی کے ہمعصروں کا جو کلام پیش کیا گیا ہے اس سے اندازہ ہو جائیگا کہ خود انہوں نے بھی بعض بعض مرثیے ایسی ہی بلکہ اس سے بھی زیادہ صاف زبان میں کہے ہیں۔

غزل

میرا غبار بھی جو گوارا نہیں۔ نہ ہو
یوں سرگراں خدا کے لئے اے زمیں! نہ ہو

دل میں نہ رکھ غبار کسی خاکسار سے
اس گردِ کارواں میں وہ محمل نشیں نہ ہو

دریا میں کود معرکہ آرا ہو موج سے
گوہر کی آرزو ہی۔ تو ساحل گزیں نہ ہو

خال و خطِ نگارِ سحر ہے سوادِ شام
آفات کے ہجوم سے اندوہگیں نہ ہو

درد آفریں کی خیر ہو۔ درد آفریں رہے
اس دردِ جانستاں کا جو درماں نہیں نہ ہو

دنیا گزیدہ کوئی عدم کو چلا ہے آج
یارب! کہیں وہاں بھی یہی سرزمیں نہ ہو

آتش نوا مدینۂ دل میں ہے یوں کوئی
خاکِ آستانِ غیر کی ننگِ جبیں نہ ہو

یارب! یہ کیا بلا ہے تغافل ہی یا نظر
ایسا فسوں طراز بھی کوئی حسیں نہ ہو

عشق آفریں ہی حسن ہو حسن آفریں ہی عشق
آ محفلِ مجاز میں۔ خلوت نشیں نہ ہو

کیا جل رہا ہے دور افق میں وہ دیکھنا
نشتر! ترا ہی نخلِ تمنا کہیں نہ ہو

نشتر! وہ شعر شعر کہاں، ننگِ شعر ہے
جو نشترِ اثر سے، حیات آفریں نہ ہو

نشتر جالندھری

انوکھی شادی

حضور! عقیدہ محال کو ممکن اور مشکل کو آسان بنا دیتا ہے۔ آپ اعتقادِ کامل کی مدد سے دنیا میں سب کچھ کر سکتے ہیں۔ ان بڑے بڑے فلک بوس پہاڑوں کو بھی ان کی جگہ سے بآسانی ہٹا سکتے ہیں۔ اسی طرح جیسے میں پتوار کی مدد سے اپنی کشتی چلاتا ہوں ——— اعتقاد کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا ——— آپ ہنستے ہیں لیکن میں جو کچھ عرض کر رہا ہوں وہ بالکل صحیح ہے۔

حضور! میں نے بہت سے انگریز سیاحوں اور مسافروں کو وینس کی سیر کرائی ہے اور آپ کی طرح ان سب نے بھی ہمارے متبرک معبدوں کے معجزات کا مضحکہ اڑایا ہے لیکن گستاخی معاف میرے خیال میں معجزات کا مضحکہ اڑانا لاعلمی کی دلیل ہے یقین مانئے حضور! کلدار کشتیوں اور بجلی کی روشنی والے موجودہ ترقی یافتہ وینس میں بھی خود میری نظر سے ایک ایسا واقعہ گزرا ہے جو ہر سننے والے کو غرقِ تحیر کر دے گا۔ ایک شیشہ گر کی لڑکی، روزا نیلڈی کا واقعہ اعتقادِ کامل کا حیرت انگیز کرشمہ اور ہمارے معبدوں کے معجزے کی ایک حقیقی مثال ہے۔

روزا نیلڈی ——— کچھ نہ پوچھئے وہ کیسی لڑکی تھی۔ نوخیز شباب کی کیف آور رعنائیوں سے پُر۔ وجد آفریں حسن کی قابلِ بیان حدوں سے باہر۔ اس کی کشادہ اور بلوریں جبیں پر خندۂ مسرت ہر وقت رقص کناں رہتا۔ بڑی بڑی پُرکشش اور شعلہ بار آنکھیں جوانی کی پُرکیف مستی سے معمور رہتیں۔ اور پتلے پتلے ہونٹوں پر دلنواز تبسم کھیلا کرتا۔ اس کے بال نرم چمکیلے اور شبِ دیجور کی طرح سیاہ تھے اور اس کے اعضا متناسب۔ وہ دنیا بھر کی خوبیوں کا مجموعہ تھی۔ اس کے لاثانی حسن و جمال میں ایک ایسی کیفیت پنہاں تھی جو سینکڑوں کا صبر و قرار غارت کر چکی تھی۔ اور حضور اس کی سیرت بھی کسی طرح صورت سے کم نہ تھی وہ ہمہ صفت موصوف تھی ——— جوانانِ وینس اس کے لئے دیوانے ہو رہے تھے۔

جب اس کا بوڑھا باپ اس کی شادی کی فکر کرتا تو روزا اپنی نغمہ پاش آواز سے ملتجیانہ کہتی "ابا! اتنی جلدی مجھے اپنے گھر سے نکالو" اور حقیقتہً بوڑھے نیلڈی کے لئے روزا کی جدائی شاق تھی۔ اس کی چہیتی بیوی روزا کے پیدا ہوتے ہی جہانِ فانی سے کوچ کر گئی تھی اور روزا ماں کی زندہ نشانی تھی۔ اسی لئے بوڑھا نیلڈی بھی اسے کلیجے سے لگائے رکھتا تھا۔

نوجوان گائیڈو ریبی کی ملاقات سے قبل روزا کا نازک دل محبت کی قید و بند سے مطلقاً آزاد تھا۔ اسے صرف اپنے بوڑھے باپ، اپنے گرجے اور اپنے چھوٹے سے باغ کے شاداب اور خوشرنگ پھولوں سے محبت تھی اور بس۔ لیکن گائیڈو کا ثانی آج تک میری نظر سے نہیں گزرا۔ وہ تندرست دراز قد، خوش طبع اور خوش خلق تھا۔ اسے مذاق کرنے میں بڑا لطف آتا تھا جب موقع پاتا کوئی نہ کوئی شوخی ضرور کر بیٹھتا لیکن اس کا مذاق

دلچسپ اور اُس کی شوخی خوشگوار ہوتی تھی۔ اُس نے کبھی کسی کو مذاق میں بھی تکلیف یا نقصان نہیں پہنچایا تھا۔

میں گائڈو سے بخوبی واقف تھا۔ کیونکہ وہ بھی میری طرح ایک غریب ملّاح تھا مگر اُسے دولت کی ضرورت بھی نہ تھی۔ مبدأ فیاض نے اُسے ایسے اوصاف سے مُتّصف کیا تھا جن کا بدل زر و جواہر کی صورت میں ناممکن ہے۔ اُس کا خوبصورت گنڈولا (سیر و تفریح کی چھوٹی سی کشتی جو وینس میں رائج ہے) میرے گنڈولے کے برابر رہتا تھا وہ اُسے اتنا صاف ستھرا رکھتا تھا کہ عموماً سب لوگ اور خصوصاً دولتمند امریکن ہمیشہ اُسی کا گنڈولا پسند کرتے تھے لیکن کسی نے کبھی اُسے حسد کی نگاہ سے نہیں دیکھا کیونکہ وہ بہت ہر دلعزیز تھا۔

گائیڈو کی مسرتوں کی تکمیل کے لئے قدرت نے روزا کو بھیجا حضور میں نے ان کی پہلی ملاقات بچشم خود دیکھی تھی۔ بوڑھے نیلڈی کی سالگرہ کے دن روزا نے لذیذ کھانے پکائے اور نفیس شراب کی ایک بوتل خریدی۔ وہ یہ تمام سامان جزیرہ مرانو لے جانا چاہتی تھی جزیرہ مرانو میں اس کے باپ نے شیشہ سازی کا کارخانہ جاری کیا تھا جہاں وہ صبح سے شام تک کام کیا کرتا تھا۔ روزا چاہتی تھی کہ کھانے کے وقت تک سارا سامان لے کر اپنے باپ کے پاس پہنچ جائے لیکن جب وہ ریالٹو گھاٹ پر آئی تو اسٹیمر جا چکا تھا۔ مایوسی سے اس کی رسیلی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میری طرح گائیڈو بھی اسے دیکھ رہا تھا۔ فوراً اپنا گنڈولا لے کر اُس جگہ جا پہنچا جہاں روزا مایوسی کا مجسمہ بنی کھڑی تھی۔

اُس نے مسکراتے ہوئے کہا "بانو! تشریف لائیے"۔ اُس کی مسکراہٹ نہایت ہی دل پذیر تھی۔ خدا جانے اس میں کونسا جذبہ پنہاں تھا جس نے روزا کو بھی مسکرانے پر مجبور کر دیا حضور مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کے درمیان اول ہی سے کوئی عجیب و غریب قوت کار فرما تھی کیونکہ اُن کی داستانِ محبت ایسی ثابت ہوئی جس کی مثال دنیا کم تر ہی پیش کر سکی ہوگی۔

روزا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "نہیں میں گنڈولے پر نہیں جا سکتی۔ میرے پاس اسٹیمر کے کرایہ کے لئے ہی کافی دام ہیں۔ گنڈولے کے لئے نہیں"۔

"آپ کہاں جائیں گی؟"

"جزیرہ مرانو"۔

"تشریف لائیے۔ میں خود وہیں جانے والا تھا" حضور! اگر روزا بیت المقدس جانا چاہتی تو بھی گائیڈو یہی کہتا۔

روزا کشتی میں بیٹھ گئی اور کشتی مرانو کی جانب روانہ ہوئی۔ جب تک کشتی آنکھوں سے اوجھل نہ ہو گئی میں اُسے دیکھتا ہی رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قدرت نے گائیڈو اور روزا کو ایک دوسرے ہی کے لئے خلق کیا ہے۔ میرے خیال میں عالم عشق میں ان سے مناسب تر جوڑا کوئی نہیں گزرا۔ ان دونوں کے دل ہر ناپاکی آلودگی سے مبرا تھے۔ انہوں نے کبھی کسی کا دل نہیں دکھایا۔ وہ صحیح معنوں میں دنیا کی بہترین راحتوں اور زندگی کی اعلیٰ مسرتوں کے حقدار تھے۔

حضور! میں یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں نے اب تک شادی نہیں کی کیونکہ مجھے بھی روزا سے محبت تھی۔ گو میرا اس سے

کہیں زیادہ تھا۔ جب وہ بالکل بچی تھی اور میں اُسے اپنے گھٹنے پر بٹھا کر بہلایا کرتا تھا جب ہی سے مجھ کو اُس سے محبت ہوگئی تھی۔ یہ ایک راز ہے حضورِ والا جو اب تک میرے سینے میں پوشیدہ رہا لیکن روزا میرے لئے نہ تھی۔ قدرت نے اُسے گائیڈو کے لئے بنایا تھا۔

بوڑھے نیلاڈی کو اپنی اکلوتی لڑکی سے اتنی محبت تھی کہ وہ کافی تحقیقات کے بغیر کسی سے اُسے میل جول بڑھانے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ لیکن گائیڈو کی صورت سے ایک ایسی شریفانہ وجاہت ٹپکتی تھی جس نے فوراً بوڑھے کو اُس کا گرویدہ بنا لیا۔ اور جب روزا کی زبانی اُسے گائیڈو کے احسان کا حال معلوم ہوا تو بوڑھا اور بھی خوش ہوا اور وینس کے سچے اخلاق پر عمل کرتے ہوئے اُس نے گائیڈو کو اپنے ساتھ کھانا کھانے پر مجبور کیا۔

کھانے سے فارغ ہونے پر بوڑھے نیلاڈی نے گائیڈو کو فنِ شیشہ گری کے مختلف نکات سمجھاتے ہوئے اس خطرے سے بھی آگاہ کیا جو ایک پھکنی کے ذریعے پگھلے ہوئے شیشے میں منہ سے ہوا بھر کر پھول، چڑیا، گلدان یا اسی قسم کی کوئی اور آرائشی چیز بناتے وقت پیش آتا ہے، اُس نے کہا "اکثر نوآموز ذرا سی غلطی سے اپنی جانِ عزیز کھو بیٹھتے ہیں۔ اگر کہیں پھکنی منہ سے لگائے ہوئے سانس اندر کی طرف لے لی جائے تو پگھلا ہوا شیشہ پھیپھڑوں میں داخل ہو کر آنِ واحد میں کام تمام کر دے۔ پھر اُس نے کہا "دیکھو میں تمہارے لئے کچھ بنائے دیتا ہوں"۔

نیلاڈی اپنے فن میں استادِ کامل تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُس نے گلابی رنگ کا ایک خوبصورت سا کیوپڈ (محبت کا دیوتا) بنا دیا جو رُوئی کی طرح ہلکا تھا۔ اُسے دیکھ کر گائیڈو نے چپکے سے روزا سے کہا "دیکھو یہ ایک نیک شگون ہے"۔

روزا نے بے پروائی سے جواب دیا "میری محبت اس سے کہیں زیادہ ٹھوس ہوگی"۔ روزا کو لاتے وقت گائیڈو نے کیوپڈ کی شیشے کی مورتی اپنی کشتی کے ایک کونے میں بطور آرائش رکھ دی۔

حضورِ والا! واقعی وہ شگون نیک نکلا — کیوپڈ اپنا کام کر گیا۔ اس روز ایک ایسی محبت کی ابتدا ہوئی جس نے عشق و محبت کی فضا سے معمور وینس کو بھی تلاطمِ حیرت میں غرق کر دیا — ایسی محبت جس کی مسرت آفرین نعمتیں ہم آپ جیسے معمولی انسانوں کو محبت کرنے کی ترغیب دلاتی ہیں۔ ایک معمولی نظر میں روزا اور گائیڈو کی محبت رنج و محن کا سرچشمہ تھی لیکن باریک بین نگاہوں سے اُس کی حقیقی پُرکیف مسرتیں مخفی نہیں رہ سکتیں — نہیں نہیں! حضور، بوڑھے نیلاڈی نے ان کی محبت میں کسی قسم کی رخنہ اندازی نہیں کی۔ وہ تو ان کی محبت کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اور اس نے اُن کی شادی منظور کر لی تھی۔ بلکہ تاریخ تک مقرر کر دی تھی۔ اس روز سے جب کبھی موقع ملتا گائیڈو روزا کو اپنے گنڈولے پر بٹھا کر سیر کرانے لے جاتا۔ اکثر رات کے وقت روپہلے چاند کی ٹھنڈی روشنی میں یہ دونوں محبت کے متوالے سمندر کی سیر سے لطف اندوز ہوا کرتے اور کبھی سرمست فضاؤں اور سرشار ہواؤں والی جھیل کے کنارے کشتی پر بیٹھ کر بے چین دل والی بلبل کے پرسوز نغمے سنتے یہ دونوں مترنم ہستیاں اپنی خودی کو گم کر دیتیں ان پر وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی اور گھنٹوں یہی حال رہتا اور جب دلی جذبات کے تلاطم سے مجبور ہو جاتے تو وہ ایک دوسرے کا ہاتھ گرمجوشی سے تھام لیتے اور محبت بھری نگاہوں سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگتے۔

جب مقدس باپ پاؤلو اپنے متبرک وعظ سے اہلِ وینس کو روحانی مسرتوں کے راستے بتاتا تو یہ دونوں سرشارانِ محبت بھی وہاں موجود ہوتے۔ ایک مرتبہ جب مقدس باپ نے موت کی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا "موت انسان کو جہانِ فانی کی حدوں سے نکال کر بقائے دوام کی سرحدمیں پہنچا دیتی ہے۔ فنا کے بعد بقا کا آغاز ہوتا ہے اور کوئی بھی حقیقتاً فنا نہیں ہوتا" تو ان دونوں کے چہرے خوشی سے دمکنے لگے۔ حضور اس خیال نے انہیں بہت ہی مسرور کیا کہ موت انہیں ایک دوسرے سے جدا کرنے کے بجائے ایک ایسی دنیا میں پہنچادے گی جہاں انہیں مفارقت کا خوف ہی نہ ہوگا۔

سارے وینس میں روزا اور گائیڈو کی محبت کا چرچا تھا اور لوگ بے چینی سے ان کی شادی کے منتظر تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ شادی میں بوڑھا نیلڈی ایسی دعوت دیگا جو وینس میں برسوں یاد رہے گی۔

اس محبت نے گائیڈو اور روزا کو اس مادی دنیا سے نکال کر عالمِ روحانیت میں پہنچا دیا تھا جہاں افکار کی گھٹائیں تھیں نہ آلام کی بارش۔ ہر طرف ایک سکون طاری تھا۔ سکونِ مطلق! اُن کے باغِ زندگانی میں مسرت وشادمانی کی ہوائیں مستانہ وار چل چل کر ان کی روحوں میں فرحت کی لہر دوڑا رہی تھیں اور عیش ونشاط کی کلیاں کھلنے ہی والی تھیں کہ ـــــ آہ حضور! آگے کا واقعہ بیان کرتے میرا کلیجہ پاش پاش ہوا جاتا ہے۔ آہ ایک معمولی سے واقعہ نے ان کے باغِ زندگانی کی بہار کو خزاں سے بدل دیا۔ ان کی مسرت وشادمانی کا خاتمہ ہو گیا۔

حسبِ معمول ایک منحوس دن' شام کے قریب گائیڈو روزا کے ساتھ بوڑھے نیلڈی کو کارخانے سے واپس لانے کے لئے مرانو پہنچا۔ بوڑھا وہاں نہ تھا۔ شاید کہیں کام سے گیا تھا۔ گائیڈو نے یونہی مذاق سے ایک پھکنی اٹھاتے ہوئے روزا سے کہا "میں تمہارے سیاہ بالوں کے لئے ایک خوبصورت سُرخ پھول بناؤں گا۔"

پگھلے ہوئے شیشے کو سانچے میں ڈال کر اُس نے پھکنی سے پھونکنا شروع کیا۔ اُس کی سانس ختم ہوگئی ـــــ اور اُس نے لبوں سے پھکنی علیحدہ کئے بغیر ہی سانس اندر لے لی ـــــ بس حضور! پگھلا ہوا شیشہ اُس کے پھیپھڑوں تک جا پہنچا اور لحہ بھر میں وہ مردہ تھا۔

سچ کہتا ہوں حضور! اگر مجھے موت کا فرشتہ مل جاتا تو میں اُسے اس ظلم کا مزہ چکھائے بغیر نہ چھوڑتا۔ خدا غارت کرے اس موت کو جس نے روزا کی پُر مسرت زندگی کو قعرِ غم میں دھکیل دیا ـــــ آہ! روزا بدنصیب روزا! اُس کے باغِ تمنا پر مایوسی کی گھٹائیں چھا گئیں۔ اس کے ارمانوں کی کلیاں کھلنے سے پیشتر ہی مرجھا گئیں ـــ آہ! حضور یہ منحوس واقعہ ان کی شادی کے دن سے پورے ایک ماہ قبل وقوع پذیر ہوا۔ کاش ان کی شادی ہوگئی ہوتی۔ کاش وہ اپنی محبت کے مزے لوٹ چکے ہوتے اور اس طرح ان کی بلاخیز محبت کا جوش گھٹ گیا ہوتا تو شاید یہ واقعہ اتنی اہم صورت اختیار نہ کرتا۔

خیر حضور! گائیڈو مر گیا اور روزا کی زندگی تباہ ہوگئی۔ کئی روز تک وہ گھر سے باہر نہ نکلی۔ آخر ایک دن مقدس باپ پاؤلو کے پاس پہنچی اور

انہیں اپنی داستانِ غم کہہ سنائی۔ وہ ہمیشہ مقدس باپ کی نصیحتوں پر عمل پیرا رہی تھی اور اُسے ان پر بڑا اعتقاد تھا۔
مقدس باپ نے کہا "موت۔ ایک عارضی جدائی ہے۔ حقیقتہً گائیڈو ہمیشہ کے لئے تم سے جدا نہیں ہوا وہ تمہارے قریب ہے اور تمہیں دیکھتا ہے"۔

روزا نے پوچھا "کیا وہ اس وقت بھی میرے نزدیک ہے اور مجھے دیکھ رہا ہے؟" اُس کی آواز بھرائی ہوئی رخسارے تمتماتے ہوئے اور آنکھیں روئی ہوئی سی معلوم ہوتی تھیں۔

مقدس باپ نے جواب دیا "بیشک بیٹی"۔ وہ اس دن کا بے چینی سے منتظر ہے جب تم اس سے دوبارہ اور ہمیشہ کے لئے ملوگی۔ بیٹی اگر تم کو آسمانی باپ پر بھروسا اور اُس کی قدرت کاملہ پر اعتقاد ہو تو مطمئن رہو جنت میں وہ تم دونوں کو ہمیشہ کے لئے ملا دیگا"

"لیکن اَب؟ کیا وہ ہر وقت میرے نزدیک رہتا ہے اور مجھے دیکھتا ہے؟"

"ہاں ہاں! بیٹی اس کی روح ہر وقت تمہاری نگران رہتی ہے"۔

روزا واپس چلی گئی۔ اب وہ قدرے مطمئن ہو گئی تھی لیکن وہ اُداس اور خاموش رہنے لگی! ـــــ پہلے سے کہیں زیادہ۔ وہ سوچا کرتی کہ جب گائیڈو اُس کے نزدیک رہتا ہے اور اُسے دیکھتا ہے تو اُسے نظر کیوں نہیں آتا۔ اُس کا خیال تھا کہ اُس کے اعتقاد کی کمزوری گائیڈو کو اُس کی نظر سے پوشیدہ رکھتی ہے۔ اس روز سے کئی کئی گھنٹے اور اکثر ساری ساری رات وہ آسمانی باپ کی بارگاہ میں سر نیاز خم کئے مصروفِ دعا رہنے لگی۔ اس کی دعاؤں کا لُبِ لُباب یہ تھا کہ اُسے اعتقادِ کامل حاصل ہو جائے تاکہ گائیڈو کو دیکھ سکے۔

آخر ایک روز اُس کی دعا کو بارگاہِ الٰہی سے جامۂ قبولیت عطا ہوا اور اُسے اعتقادِ کامل حاصل ہو گیا۔ جب اس نے دعا سے فارغ ہو کر آنکھیں کھولیں تو گائیڈو کو سامنے کھڑے دیکھا۔

حضور! آپ غالباً یقین نہیں کریں گے کہ مرا ہوا گائیڈو واپس آیا۔ کیونکہ آپ کو گائیڈو کی واپسی کی نہ خواہش ہے اور نہ ضرورت اور ایسی محیرالعقول باتیں سچی ضرورت اور کامل اعتقاد کے ملنے ہی سے ظہور پذیر ہوتی ہیں آپ کیا سارے وینس میں کسی نے یقین نہیں کیا۔ ساری دنیا میں گائیڈو کی واپسی کے خواہشمند صرف دو تھے۔ ایک "روزا" جس کے پاس گائیڈو واپس آیا اور دوسرا میں حضور سب سے پیشتر روزا نے مجھے ہی گائیڈو کی واپسی کی خبر دی ـــــ اور میں نے یقین کر لیا۔

روزا نے اپنے باپ کو اس واقعہ کی اطلاع نہیں دی لیکن جب بوڑھے پیانڈی نے اُسے تاریک رات کے ہولناک سناٹے میں کبھی باغ میں اور کبھی کمرے کے اندر خود بخود اس طرح باتیں کرتے سنا گویا گائیڈو اس کے پاس بیٹھا ہے تو وہ بہت پریشان ہوا اور دوڑا ہوا میرے پاس مشورہ کرنے آیا۔

اُس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا "گلیا مو! گلیا مو!" شدید غم نے روزا کی عقل گم کر دی ہے وہ دیوانی ہو گئی ہے میں نے خود اُسے

بار ہا دیوانوں کی طرح بڑبڑاتے اور گائیڈو کا نام لیتے سنا ہے۔ آہ میری اکلوتی بچی! میری چہیتی بیوی کی نشانی! آسمانی باپ تجھ پر اپنی رحمت نازل کرے" بوڑھے ہنیلاڈی کی پریشانی کا سبب مجھ پر ظاہر تھا۔ میں نے جواب دیا" تم اُسے دیوانی کیوں کہتے ہو؟ اس لئے کہ اس کی نگاہیں حسن کی روشنی کو معصومیت اور اعتقادِ کامل نے دوبالا کر دیا ہے اُسے دیکھ سکتی ہیں جسے دیکھنے سے تمہاری کمزور نظر قاصر ہے؟ میرے عزیز دوست جاؤ اور اطمینان سے بیٹھو۔ روزا کی عقل اتنی ہی سالم ہے جتنی تمہاری! ہاں! خبردار اس کے معاملات میں دخل نہ دینا"۔

حضور! کچھ روز بعد روزا نے ایسی حرکت کی جس نے اس کی دیوانگی کی افواہ کو یقین سے بدل دیا۔ اس نے اعلان کیا کہ مقررہ تاریخ کو گائیڈو کے ساتھ اس کی شادی جس طرح ہونے والی تھی اب بھی ہوگی۔ سارے ونس نے اس کا مضحکہ اڑایا سوائے مقدس باپ پاؤلو کے جن کے پاس وہ نکاح پڑھانے کی درخواست لے کر گئی تھی لیکن اُن کا بھی خیال تھا کہ اگر روزا اب تک دیوانی نہیں ہوئی ہے تو عنقریب ہونے والی ہے۔ وہ جانتے تھے کہ انکار بُرا ہوگا اس لئے انہوں نے نکاح پڑھانا قبول کر لیا۔ لیکن آدھی رات کے وقت تاکہ گرجے میں تماشائیوں کا اژدہام نہ ہو۔

اتفاقاً اس واقعہ کے کچھ ہی روز قبل روزا کے والد کو چند تجارتی ضرورتوں نے روم جانے پر مجبور کر دیا۔ اور وہ مجھے روزا کی خبر گیری کی ہدایت کرتے ہوئے روم روانہ ہو گئے۔ اس لئے روزا نے مجھی سے شادی کے انتظام کے لئے کہا۔

حضور! اس انوکھی شادی کی رات بھی نہایت ہی دلکش تھی۔ مہتاب فلک کی نیلگوں زریں چادر سے اپنا منور چہرہ باہر نکالے ہوئے جھانک رہا تھا۔ گویا وہ بھی اس روحانی شادی کا مشاہدہ کرنا چاہتا تھا۔ کبھی کبھی ابر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے، جو راہ بھولے ہوئے مسافر کی طرح آسمان پر اِدھر اُدھر بھٹکتے پھر رہے تھے، وفورِ شوق سے مجبور ہو کر قمرِ تاباں کو اپنے آغوشِ محبت میں لے لیتے اور اس طرح چند لمحوں کے لئے کائنات کو نور کی بارش سے محروم ہو جانا پڑتا۔ لیکن ہوا جو ان بیباک ابر کے ٹکڑوں کی گستاخی سے برہم ہو کر خوشگوار تیزی سے چل رہی تھی۔ انہیں فوراً ڈھکیل ڈھکیل کر ہٹا دیتی تھی اور حضور روپہلی چاندنی میں سفید رنگ کا خوبصورت لباسِ عروسی زیبِ تن کئے ہوئے روزا ایک آسمانی حور معلوم ہوتی تھی۔ اُس کا چہرہ حقیقی مسرت کی روشنی سے دمک رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آج مسرت و انبساط کے بادل نے اس کے پاک و صاف دل پر جی کھول کے شادمانی کا مینہ برسایا ہے۔ حُسن کے نور سے اس کا دلکش چہرہ رشکِ قمر بنا ہوا تھا۔ حضور! روزا سے زیادہ مسرور عروس میری نظر سے نہیں گزری۔

اپنے گنڈولے میں بٹھا کر میں اُسے گرجے کے قریب والے پل تک لایا۔ یہاں ہم گنڈولے سے اُتر کر آہستہ آہستہ پاپیادہ گرجے کی جانب روانہ ہوئے۔ سارا عالم سنسان پڑا تھا۔ رات کا ہولناک سناٹا کاٹے کھاتا تھا۔ ایک نامعلوم خوف و دہشت سے میں تھر تھر کانپ رہا تھا۔ میرے پیر بوجھل ہو گئے تھے اور میں بمشکل چل رہا تھا۔ جب ہم گرجے کے عظیم الشان پھاٹک کے قریب پہنچے تو مجھے ایسا معلوم ہونے لگا گویا ہم کسی دوسری دنیا میں پہنچ گئے ہیں۔

اپنے وعدے کے مطابق مقدس باپ نے چور دروازہ کھلا رکھا تھا۔ اُس کے ذریعے سے ہم گرجے میں داخل ہوئے۔ گرجے میں بھی ہیبت ناک

تاریکی چھائی تھی صدر مقام پر چند شمعیں روشن تھیں۔ جن کی مدھم روشنی میں میں نے مقدس باپ کو کھڑے دیکھا۔

ہال کے وسط میں پہنچتے ہی روزا میرا ہاتھ چھوڑ کر تیزی سے آگے بڑھی۔ میں ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے دیکھا وہ مسکرا رہی تھی۔ —— اس نے اپنے دونوں ہاتھ بڑھا کر کسی نظر نہ آنے والی شے کو اس طرح تھام لیا جیسے وہ کسی سے مصافحہ کر رہی ہو حضور! وہ کسی ایسے شخص کا استقبال کر رہی تھی جو معمولی نظروں کی رسائی سے بالاتر تھا —— پھر وہ اپنے مخفی ساتھی کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے ہوئے اس طرح قربان گاہ کی جانب بڑھی جیسے کوئی لڑکی اپنے ہونے والے شوہر کے ساتھ شادی کے لئے پادری کے روبرو جائے۔

حضور! اس رات کو میں تعجبات اور معجزات کی رات کے نام سے پکارتا ہوں۔ کیونکہ اس رات میں نے بہت سی تعجب خیز باتوں کا مشاہدہ کیا۔ آپ یقین نہیں کریں گے لیکن جب روزا گائیڈو کے ساتھ (اس کا مخفی ساتھی یقیناً گائیڈو تھا) قربان گاہ کی جانب بڑھ رہی تھی۔ اس وقت میرے کانوں میں ایک ایسے سریلے ساز کی دلکش اور دھیمی آواز آ رہی تھی جس سے بہتر ساز آج تک میں نے نہیں سُنا۔ اور جب روزا مقدس باپ کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور انہوں نے نکاح پڑھنا شروع کیا تو تاریک گرجا ایک نامعلوم روشنی سے منور ہونے لگا۔ اور حضور! اپنے دیوتاؤں اور آسمانی فرشتوں کو گرجے کی کھڑکیوں اور روشندانوں کے ذریعے سے ہال میں داخل ہوتے میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

میں ایک معمولی کمزور انسان ہوں۔ میرا دل روزا کی طرح عصیاں کی سیاہی سے مبرا نہیں۔ اسی لئے میں معصوم سیرت گائیڈو کی پاک روح کو نہیں دیکھ سکا لیکن میرے وہ ولی اور فرشتے جنہیں میں ہمیشہ مصیبت کے وقت مدد کے لئے پکارا کرتا ہوں اور جن سے میں روزانہ رات کو دعا مانگا کرتا ہوں اپنے عقیدتمند سے روپوشی پسند نہیں کرتے تھے اور مجھے صاف نظر آ رہے تھے۔ اور ان کی موجودگی گائیڈو کی موجودگی کی شہادت دے رہی تھی۔

حضور! کیا یہ دنیا کی مقدس ترین اور سب سے زیادہ عجیب شادی نہیں تھی؟ اور کون شادی اس سے زیادہ مقدس ہو سکتی ہے جس میں فرشتے اور ولی تک شریک ہوں؟ حضور! ہم نے کسی قسم کا انتظام نہیں کیا تھا۔ پھر بھی جب مقدس باپ نے روزا اور گائیڈو کے زن و شوہر ہونے کا اعلان کیا تو میرے کانوں میں شادی کے گھنٹوں کی آواز صاف صاف آ رہی تھی۔ اور گرجے کی گھڑی بھی بج رہی تھی حالانکہ ابھی اس کے بجنے کا وقت بہت دور تھا۔

حضور! میرے دل پر ایسی ہیبت چھائی جس کی تاب نہ لا کر میں بیہوش ہو گیا۔ اور جب مجھے ہوش آیا تو گرجے میں تاریکی تھی۔ صدر مقام پر جلنے والی شمعیں بھی گل ہو گئی تھیں۔ مقدس باپ جا رہے تھے اور —— اور روزا غائب تھی۔ . . . .

نہیں نہیں! روزا گم نہیں ہوئی۔ وہ میری توقع کے خلاف گائیڈو کے گھر چلی گئی جہاں مرنے سے پیشتر گائیڈو رہا کرتا تھا! اور وہیں رہنے لگی کئی بار میں نے اس سے گھر چلنے کو کہا لیکن وہ جواب دیتی کہ شادی کے بعد دلہن کو شوہر کے گھر میں رہنا چاہیئے۔ میں نے بھی مناسب خیال کرتے ہوئے زیادہ اصرار نہیں کیا۔

حضور! اہل وینس خلقتاً بڑے وہمی واقع ہوئے ہیں اور بھوت پریت وغیرہ کی احمقانہ باتوں پر بہت جلد ایمان لے آتے ہیں۔ گائیڈو کے مرتے ہی اُس کا مکان آسیب زدہ خیال کیا جانے لگا۔ اور ابھی روزا کو گائیڈو کے مکان میں رہتے ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ اس کی نسبت شہر میں عجیب

عجیب افواہیں مشہور ہونے لگیں۔ خیر یہاں تک بھی غنیمت تھا۔ واقعات زیادہ خطرناک صورت اختیار نہ کرتے اگر قصاب کا لڑکا انجیلو گائیڈو کی کشتی کو مشکوک حالت میں دیکھ کر شور نہ مچا دیتا۔

ایک روز شام کے وقت دوکان سے گھر واپس جاتے ہوئے جب انجیلو سین ریفائل (ایک نہر کا نام) کے پل پر پہنچا تو اس کی نظر گائیڈو کی کشتی پر پڑی جو پل کے نیچے سے گزر رہی تھی۔ انجیلو کا بیان ہے کہ چپو از خود چل رہے تھے لیکن چلانے والا نظر نہیں آتا تھا اور کشتی میں روزا بیٹھی تھی جو کسی نظر نہ آنے والے سے کہہ رہی تھی:۔ "آج کی رات بڑی پرلطف ہوگی"۔ خوف و دہشت سے انجیلو کے پیر زمین میں گڑ گئے اور ہیبت کے مارے اس کے جسم میں کپکپی پڑ گئی۔ جب کشتی کچھ دور نکل گئی تو وہ دوڑتا ہوا قریب کے ہوٹل میں جا گھسا اور شرابیوں سے یہ واقعہ بیان کر دیا۔ وہ سب کے سب شور مچاتے ہوئے ہوٹل سے نکل پڑے اور کشتی کی جانب دوڑے نہر کے موڑ پر انہوں نے کشتی کو جا لیا اور انہیں انجیلو کے کلام کی تصدیق ہوگئی۔

حضور! کیا بتاؤں جس سرعت سے یہ خبر شہر میں پھیلی ہے۔ آن کی آن میں سارا شہر نہر کے کنارے اُمڈ آیا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ روزا کوئی جادوگرنی ہے جو شیطانوں کی مدد سے کشتی چلا رہی ہے" اس ساحرہ کو مار ڈالو۔ اس چڑیل کو جلا دو" کے شور سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔ حضور! تمام اہل ونیس دیوانے ہو گئے تھے ——— ہاں وہ پاگل ہو گئے تھے۔ میری معصوم روزا کو ساحرہ اور چڑیل بتا رہے تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے میری روزا کو کشتی سے گھسیٹ کر اس طرح نوچنا شروع کیا جیسے کتے اپنے شکار کو نوچتے ہیں۔ مظلوم روزا ان سے اپنے آپ کو چھڑا کر بھاگی اور انہوں نے اس کا پیچھا کیا۔ حضور! وہ اس کے نزدیک آتے جا رہے تھے۔ اور ہر طرف سے اس بیکس اور مظلوم لڑکی پر پتھروں اور بوتلوں کی بارش کر رہے تھے۔ جب روزا گائیڈو کے مکان کے دروازے پر پہنچی تو کسی نے ایک بڑا سا پتھر اس زور سے اس کے سر پر مارا کہ اس کا سر پاش پاش ہوگیا اور وہ بیہوش ہو کر گر پڑی۔ ایک مسن عورت اُسے اٹھا کر اندر لے گئی لیکن فوراً ہی وہ واپس آئی اور کہنے لگی:۔ "آسمانی باپ ہم پر اپنی رحمت نازل کرے اور ہمیں عذاب سے بچائے۔ وہ معصوم لڑکی مر گئی"۔

اس واقعہ کے پیشتر ہی میں نے بوڑھے نیلڈی کو لکھ دیا تھا کہ اُسے فوراً واپس آجانا چاہیئے اور وہ بیچارہ ۲۴ گھنٹے کے اندر ہی واپس آگیا لیکن حضور! اسے بہت دیر ہوگئی تھی۔ وہ اس وقت پہنچا جب سانپ نکل گیا تھا اور لکیر باقی رہ گئی تھی۔

حضور! اس روز سے گائیڈو کی کشتی کو کسی نے نہیں دیکھا لیکن میں نے دیکھا ——— صرف ایک بار۔ ایک رات میں ایک مسافر کو جو آپ ہی کی طرح ایک شریف انگریز تھا۔ لڈو سے واپس لا رہا تھا کہ میں نے چاند کی روشنی میں گائیڈو کی کشتی کو سمندر کی جانب جاتے ہوئے دیکھا کشتی میں گائیڈو اور روزا بھی مجھے نظر آئے ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈالے اور سر سے سر ملائے کھڑے تھے۔ اُن کے چہرے آسمان کی طرف اُٹھے ہوئے تھے۔

حضور! ان دونوں کو مرنے کے بعد میں نے جب ہی پہلی اور آخری بار دیکھا۔ میرے منہ سے بے اختیار ایک چیخ نکل گئی:۔ "میرے اللہ یہ کیا؟" اور اس انگریز نے متعجب ہو کر کشتی کی جانب جدھر میں نے انگلی سے اشارہ کیا تھا دیکھا اور حیران ہو کر کہا:۔ "ہائیں! ایک خالی کشتی بہاؤ کے خلاف بہہ رہی ہے"۔

(ترجمہ) ——— **مرزا یاور علی**

درشن پیاسی

پی درشن کی پیاس
لگی ہے پی درشن کی پیاس

پھلواری میں پھول ہیں پھولے
سکھیوں نے ڈالے ہیں جھولے
وہ اپنی داسی کو بھولے
ہو کر کس کے داس
لگی ہے پی درشن کی پیاس

سکھ کو مطلب بیچینوں سے
کام ہے سارا دن بینوں سے
کتنے دور ہیں وہ نینوں سے
جو تھے ہر دم پاس
لگی ہے پی درشن کی پیاس

برسوں بیتے آنکھ لگائے
اک جاں پر سَو سَو دُکھ پائے
یہ دن آئے اُن کو آئے
ٹوٹ چلی ہے آس
لگی ہے پی درشن کی پیاس

امرچند قیس جالندھری

محفلِ ادب

انسان کہ شیطان؟

فرانسیسی شاعر یامز کی ایک مختصر نظم کا لفظی ترجمہ یہ ہے:-

دعا کہ شاعر بہشت میں گدھوں کے ساتھ جائے،

"اے خدا جب تو مجھے بلائے تو کاش یوں کرے
کہ کسی میلے کے دن بلائے جب سڑکیں گرد آلود ہوتی ہیں۔
زمین پر ہمیشہ سے میری عادت ہے کہ ایسے رستے پر چلتا ہوں جو مجھے پسند ہو۔
میں چاہتا ہوں کہ تیری بہشت کی طرف بھی (جہاں ستارے
تمام دن چمکتے ہیں) اپنی پسند کی سڑک پر چلوں۔
اُس بڑی شاہراہ پر ہاتھ کی لکڑی لے کر چل کھڑا ہوں۔
جس پر بوجھ تلے جھکے ہوئے گدھے جا رہے ہوں اور میں
اپنے پیارے دوستوں۔ گدھوں سے کہوں
میں "فرانسے یامز" ہوں، بہشت کو جا رہا ہوں۔
کیونکہ جہاں خدائے برگزیدہ ہے وہاں کوئی دوزخ نہیں۔
میرے ساتھ آؤ۔ اے میرے زنگاری آسمان تلے کے دوستو!
غریبو اور پیارے، بوجھ اٹھانے والو! جو اپنے لمبے لمبے
کان ہلا ہلا کر مچھروں کو،
غصے سے بھرے چوٹ لگانے والے ڈنڈوں کو،
اور بھنبھناتی مکھیوں کو،
ہٹاتے رہتے ہو۔"

اے خدا! مجھے اپنے سامنے ان حیوانوں کے ہمراہ پیش ہونے دے۔

ان سے مجھے بے حد پیار ہے کیونکہ وہ اپنے سر میٹھی اداؤں کے ساتھ
جھکاتے ہیں اور جب چلتے چلتے رک جاتے ہیں تو اپنے چھوٹے چھوٹے
پاؤں اس قدر نرمی سے پاس پاس جما دیتے ہیں کہ جو دیکھے
وہی رحم کرے۔
اے خدا! مجھ کو آنے دے اور میرے ساتھ ان کے دس لاکھ کانوں کو
اور ان سب کو جو اپنے پہلوؤں پر بھاری بھاری بکس اٹھاتے ہیں
اور ان سب کو جو پہلوانوں کی گاڑیاں کھینچتے ہیں
اور ان سب کو جو اپنی پیٹھ پر ٹوٹے پھوٹے کنستر ڈھوتے ہیں۔
اور ان سب گدھیوں کو جو لنگڑا کر چلتی ہیں کیونکہ
اُن کے پیٹ چمڑے کی بوتلوں کی طرح پُر ہیں۔
اور ان سب کو جن کو چیتھڑوں سے ڈھانکا جاتا ہے۔
کیونکہ اُن کے بہنے والے زخموں کے گرد
ضدی مکھیوں کے جھنڈ کے جھنڈ جمع ہوتے ہیں۔

اے خدا! مجھے اپنے پاس بہشت میں آنے دے مع سب گدھوں کے،
اور فرشتوں کو حکم دے کہ وہ ہمیں وہاں لے جائیں جہاں تیرے دریا
اپنے ساحلوں کے ساتھ لطف سے پیش آتے ہیں
جہاں درختوں سے "چیری" کے گچھے لٹکتے ہیں۔
ایسی "چیری" کے جو رحمدل کنواریوں کے ہنسنے والے رخساروں کی طرح نرم ہے۔
اور اے خدا! جہاں تیرا مکمل امن ہے وہاں مجھے بھی اپنے گدھوں کی طرح بنا۔
کہ میں آسمانی دریاؤں کے اوپر جھکا ہوں تیرے گدھوں
کی طرح جو اپنی میٹھی نیند اور عاجزانہ غربت کے ساتھ۔ تیری دائمی محبت کے شفاف پانیوں میں منعکس ہوتے ہیں ——"

انسانی دعاؤں کے خارزار میں یامز کی یہ بھولی سی دعا گویا کنول کا پھول ہے جس دنیا میں اکثر لوگ حکومت، دولت، فتح اور انتقام کی دعاؤں کے تیروں سے آسمان کا کلیجہ چھلنی کرتے رہتے ہیں یامز کی دعا کا وجود غنیمت ہے مگر مگر ......

۲

اس سے بحث نہیں کہ فرانس میں یا یورپ میں اس نظم کا اثر کیا ہوا۔ ممکن ہے گدھوں کے ساتھ انسانی سلوک پہلے سے بہتر ہو گیا ہو۔ قیاس ہے کہ ایسا ہوا۔ بیمار گدھوں کے لئے ہسپتال بنائے گئے اور گدھوں کے ساتھ بدسلوکی کرنے والے مستوجب سزا قرار دیئے گئے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اب باقی کرۂ زمین پر بھی گدھوں کے ساتھ بمقابلۂ سابق بدسلوکی کم ہو جائے اور آخر کار مفقود ہو جائے محض اپنی نظروں میں اپنا وقار زیادہ کرنے کے لئے انسان مختلف اقسام کی غیر ضروری بدسلوکیوں میں (گدھوں کے ساتھ "بیویوں کے ساتھ) بغیر اس قسم کی نظموں کے بھی کمی کر رہا ہے۔

اس سے بھی بحث نہیں کہ بے زبان حیوانوں کے ساتھ ہزارہا سال کے مسلسل ظلم کی روسیاہی کسی بعد کی خودغرضانہ توبہ سے دُھل نہیں سکتی۔ بے زبان حیوانوں پر جو قدرت انسان کو حاصل ہے اور جس طرح انسان نے اپنے اختیار کو استعمال کیا ہے اس سے فطرت کا اور فطرت کے ساتھ انسان کا منہ ایسی بُری طرح کالا ہے کہ اگر اور کسی غرض کے لئے نہیں تو اس ظلم کی پاداش کے لئے ایک یوم الحساب کی اشد ضرورت ہے انسان کی مکروہ عادتوں میں سے مکروہ ترین یہ ہے کہ ظلم کم کرے تو اپنی روحانی ترقی پر فخر کرتا ہے۔ شرم کو انسان سے شرم ہے۔

دنیا میں صرف ایک ہی بے رحم ظالم حیوان ہے اور وہ انسان ہے مگر بے رحمی سے بڑھ کر یہ بیحیائی ہے کہ انسان آرزو کرے کہ خدا کے حضور میں مسکین اور نیک گدھوں کے ہمراہ پیش ہو۔ یہ گویا خدا کو بھی ظلم میں شریک ہونے کی دعوت ہے کہ وہ آنکھیں بند کرکے جفا پیشہ انسان کو بھی وہی رتبہ دیدے جو گدھے کا حق ہے اور محض اس لئے کہ شاعر گدھوں سے محبت کرکے ایک انوکھے کفارے کا طلبگار ہے۔ گدھوں کے رتبے میں ہرگز محض ایک شاعر کی محبت کی وجہ سے یہ روا کمی نہیں ہو سکتی کہ انسان گدھوں کے برابر میں بیٹھے۔ یامز کی یہ آرزو جس غلط خیال پر مبنی ہے اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ مختصراً وہ خیال یہ ہے کہ ظالم مظلوم کے ساتھ ہمدردی کرکے اپنے مظالم کو مٹا سکتا ہے۔ یہ قطعی غلط ہے۔

۳

یامز گو زمانۂ حال کا شاعر ہے۔ مگر ایک متروک تخیل کا شکار ہے۔ اسے اتنا بھی پتہ نہیں کہ یہ ہماری دنیا جسے جہلا ایک آنے والے دوزخ اور ایک آنے والے بہشت کا پیش خیمہ بنائے بیٹھے ہیں در اصل ایک مٹی ہوئی دنیا کا دوزخ ہے اس مٹی ہوئی دنیا میں جو بُری ہستیاں تھیں وہ یہاں گدھے ہیں۔ جو ان سے بھی زیادہ بُری تھیں وہ یہاں انسان یعنی اس دوزخ کے شیطان ہیں۔ یہ ان شیاطین کی سزا ہے کہ وہ صرف گدھوں پر ظلم نہیں کرتے بلکہ خود اپنے ہمجنسوں پر بھی ہاتھ صاف کرتے ہیں۔ خدائی کارخانے میں انصاف شاعرانہ قسم کا ہے شیطان سمجھا ہے کہ شیطان کوئی اور ہے اگر یوں نہ ہوتا اور یہ دوزخ واقعی ایک دارالامتحان ہوتا تو آج سے مدتوں پہلے مٹ جاتا کیونکہ انسانوں کے امتحان کی ضرورت نہیں۔

"گاروال"

فلک پیما

آخری وصیت

"اگر وہ لوٹ آئیں تو میں اُن سے کیا کہوں ؟"

"——— یہی کہ میں ان کا عمر بھر انتظار کرتی رہی۔"

اور جو انہوں نے کچھ اور پوچھا۔ مجھے نہ پہچانا؟

——— بہنوں کی طرح نرمی سے بولنا۔ شاید دکھیا ہوں

اور جو انہوں نے تمہارا نام لے کر پوچھا کہ وہ کہاں ہے؟

——— تو انہیں یہ میرا چھلا دے دینا۔ خاموشی سے

اور جو انہوں نے پوچھا کہ یہ ایوان سنسان کیوں ہے؟

——— تو انہیں یہ جل جل کر بجھی ہوئی شمع دکھا دینا اور یہ کھلا دروازہ

اور جو انہوں نے پوچھا کہ تمہاری سہیلی کو نیند کیسے آئی؟

——— کہنا کہ مسکرا کر جان دے دی دیکھنا۔ وہ دردمند نہ ہوں

آنسو نہ بہائیں ———

"ماٹرلنک"

"کارواں"

"مدوجزر"

آج پھر دیر میں آئے

میں انتظار کرتی رہی۔

ہاں۔

نہ کیا ہوتا۔

کل بھی دیر میں آئے تھے

اب نہیں کیا کروں گی۔

ہاں۔

مہربانی۔

اب دو بجے ہوں گے۔

ہاں اب دو بجے ہوں گے۔

کھانا کھا لیا؟

بلکہ تین۔

ہاں کھا لیا۔

بلکہ تین۔

کب؟

کہاں رہے؟

دیر ہوئی۔

ادھر ادھر۔

کیا کھایا؟

اتنی دیر میں کیوں آئے؟

جو مل گیا۔

کچھ ایسی ہی بات تھی۔

کہاں؟

جہاں مل گیا ؟

پوچھنا کوئی گناہ ہے ؟

ثواب بھی نہیں

پہلے تو تم ایسے نہ تھے

کون ؟

تم۔

مجھے کیا ہو گیا ہے ؟

اپنے دل سے پوچھو۔

کیا پوچھوں ؟

اپنے دل کا حال۔

میں تو وہی ہوں۔

تو میں بدل گئی ہوں گی

بے شک۔

کیا خبر تھی کہ ایک دن یہ حال ہوگا۔

کسی کو بھی خبر نہیں ہوتی۔

میں راتوں کو تین تین بجے تک جاگا کروں۔

کیوں جاگا کرو ؟

لیکن تمہاری سیریں ختم نہ ہوں گی۔

سیریں کیسی ؟

میں کیا جانوں کیسی سیریں۔

گویا میں اب سیر سے واپس آیا ہوں۔

اور کیا ؟

ہاں۔ میں رات کے تین بجے تک سیر کرتا ہوں میں بہت برا ہوں

نہیں تم بہت اچھے ہو۔

نہیں میں بہت برا ہوں۔ مجھ میں دنیا بھر کے عیب ہیں۔

نہیں تم بہت اچھے ہو نیک اور فرض شناس میں بری ہوں

نہیں تم بیچاری۔ صابر۔ شاکر

اور تم مروت کیش۔ بی بی بچوں کا حق پہچاننے والے کبھی
کسی کا دل نہ دکھانے والے۔

اور تم ستم زدہ۔ راضی برضا رہنے والی۔ پلٹ کر بات نہ
کرنے والی شوہر کی فرمانبردار۔ اطاعت گزار ــــ

مجھ سے یہ دکھ نہیں سہے جاتے۔

کیا دکھ ؟

یہی دکھ

نہ سہو

جب تک زندگی ہے سہوں گی۔

جب تک زندگی ہے میں بھی سہوں گا۔

تمہیں کیا دکھ ہے ؟

اور تمہیں کیا دکھ ہے ؟

میرے دکھ میرا خدا جانتا ہے۔

میرے دکھ بھی میرا خدا جانتا ہے۔

خدا سے ڈرو۔

میں خدا سے زیادہ تم سے ڈرتا ہوں۔

میرے اللہ میں کہاں جاؤں۔ مجھے موت بھی نہیں آتی۔

. . . .

. . . .

. . . .

خدا کے لئے شور نہ مچاؤ

میں شور مچاتی ہوں کہ تم؟

میں کہتا ہوں بچہ بے آرام ہوگا۔

تمہیں بچے کی بہت پروا ہے

تم سے کم بھی نہیں۔

خبر بھی نہیں کس حال میں ہے کس حال میں نہیں۔

کیا خبر نہیں؟

پروا نہیں صحت کیسی ہے کیسی نہیں۔

صحت کیوں خیریت تو ہے؟

تمہیں کیا؟

میں کیا پوچھ رہا ہوں؟

تم اپنے کھیل تماشوں میں رہو۔

میری بات کا جواب دو

کس بات کا؟

بچہ کیسا ہے؟

تمہیں رات کے تین بجے بچے کی محبت کیوں ستانے لگی۔

میں پوچھتا ہوں ــــ

جیسے بڑی محبت ہے۔

جتنی تم کو ہے اس سے کم نہیں۔

جبھی رات بھر سیریں کرتے ہو۔

سیریں کہاں کرتا ہوں؟

مجھے کیا خبر کہاں سیریں کرتے ہو۔

میں سیریں نہیں کرتا۔

اور رات کے تین بجے کیا کرتے ہو؟

کون کہتا ہے اب تین بجے ہیں؟

تین نہیں بجے تو اور کیا بجا ہے؟

ابھی تو دو بھی نہیں بجے۔

کون کہتا ہے؟

میں کہتا ہوں۔

جھوٹ؟

میں جھوٹ کیوں بولتا۔

شور نہ مچاؤ آہستہ بولو۔

بچے کی صحت تو بالکل ٹھیک ہے نا؟

بالکل کیوں؟

تمہاری بات سے مجھے خدشہ سا پیدا ہوا تھا۔

خدا کرے بچے ہی سے تمہارا پیار قائم رہے۔

میرا پیار ہمیشہ قائم رہتا ہے۔

بڑے آئے ثابت قدم۔

بے شک۔

دکھ دینے میں ثابت قدم

دکھ سہنے میں ثابت قدم

تمہیں کیا دکھ پہنچے ہیں؟

کوئی بھی نہیں۔

پھر شکایت کیسی ؟
میں نے کب شکایت کی ؟
کیا کہا ۔ شکایت نہیں کی ؟
کب کی ؟
توبہ
اور تمہیں کیا دکھ پہنچے ہیں ؟
تم سن کے کیا کروگے ۔
آخر ؟
بڑے آئے رات کے تین بجے ہمدردی جتانے والے
میں کہتا ہوں تین نہیں بجے
دو سہی ۔
ہاں دو ۔
بڑے آئے رات کے دو بجے ہمدردی جتانے کے لئے
میں تنویر کے ساتھ تھا ۔
تنویر کے ساتھ !
ہاں ۔
جھوٹ ۔
تمہاری قسم
جیسے میری بڑی پروا ہے ۔
یہ تم اپنے دل سے پوچھو ۔
کس سے پوچھوں ؟
اپنے دل سے ۔
کیا پوچھوں ؟
کہ میرے دل میں محبت ہے کہ نہیں ۔
آہستہ بولو نچے کی آنکھ نہ کھل جائے ۔
کیسی پیاری نیند سو رہا ہے ۔
ہاتھ سر کے نیچے رکھ کے ۔
ننھا سا ہاتھ ۔
اور ہونٹ [illegible]
بال ماتھے پر گر رہے ہیں ۔
بالکل تمہاری طرح ۔
بالکل میری طرح
نیند میں مسکرا رہا ہے ۔

میری جان
میری جان

"کارواں"

مجید ملک

جلد نمبر ۲۵ — نمبر ۳

فہرست مضامین

”ہمایوں“ بابت ماہ مارچ ۱۹۳۴ء

تصاویر:- (۱) کیوپڈ اور سائکی (۲) ہم آہنگی

چندہ سالانہ ۵ روپے مع محصول ششماہی ۳ روپے مع محصول — قیمت فی پرچہ ۸ آنے

بزمِ ہمایوں

"ہمایوں" ہماری اور قارئینِ "ہمایوں" کی متاعِ مشترک ہے لیکن مدت سے قارئینِ ہمایوں میں سے کسی نے ہمیں "ہمایوں" کے متعلق کوئی مشورہ نہیں دیا حالانکہ "ہمایوں" کی ترقی کے لئے ہمارا اور قارئینِ کرام کا اشتراکِ عمل بیحد ضروری ہے۔ ہم نے ارادہ کیا ہے کہ آپ کی باتیں سننے اور آپ کو اپنی باتیں سنانے کے لئے "بزمِ ہمایوں" کا عنوان مستقل طور پر قائم کریں اور اس طرح آپ کے اور ہمارے تعلقات کا ایک نیا دور شروع ہو۔

اب تک آپ کے مشورے کے بغیر ہم "ہمایوں" کو آپ کی پسند کے مطابق دلچسپ اور مفید بنانے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ ہمارا مطمحِ نظر یہ رہا ہے کہ نہ صرف انفرادا "ہمایوں" کے ایک ایک پرچے میں مضامین کا تنوع ہو بلکہ سال بھر کے پرچوں میں بحیثیتِ مجموعی بھی اس قدر مختلف النوع مضامین شائع ہو جائیں کہ ہر قسم کے ذوق کے لئے اس میں دلچسپی کا سامان پیدا ہو سکے اور اس کے ساتھ ہی قارئین کے پاس مختلف علوم و فنون کے متعلق مضامین کا ایک معتدبہ ذخیرہ بھی جمع ہو جائے۔ چنانچہ وقتاً فوقتاً اصلاحِ زبان، ادب و تنقید، تمدن و معاشرت، مذہب، فلسفہ، تاریخ و سیرت، اقتصاد و سیاسیات کے علاوہ جغرافیہ، سیر و سیاحت اور جدید مغربی تحریکات کے متعلق بھی مضامین شائع ہوتے رہے۔ اس کے ساتھ افسانے، نظمیں، لطیف ادبی مضامین، مزاحیہ مقالے اور ڈرامے وغیرہ بھی "ہمایوں" کا موضوعِ خاص رہے۔ اردو نظم کی ترقی اور اس کی جدید ممکنات کے متعلق ہم نے خاص کاوش سے کام لیا۔ اور اس کے ساتھ ہی مضامینِ نظم و نثر میں علی العموم معیار کی بلندی ہمارا محبوب مطمحِ نظر رہی۔ ان کوششوں میں ہمیں جو کامیابی حاصل ہوئی ہے اس کے لئے ہم اپنے قلمی معاونین کے ممنونِ احسان ہیں اور آئندہ کے لئے آپ کے مشورے کے منتظر۔

عموماً سالگرہ نمبر کے علاوہ زائد خاص نمبر شائع کرنا "ہمایوں" کا شیوہ نہیں رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خاص نمبر کے متعلق ہمارا تصور محض ضخامت سے وابستہ نہیں۔ جتنی توجہ ہم سالگرہ نمبر کی ترتیب اور انتخابِ مضامین پر صرف کرتے ہیں اتنی ہی توجہ سے ہم ہر "عام نمبر" کو بھی مرتب کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے حجم سے قطعِ نظر کیا جائے تو عام نمبر اور خاص نمبر میں بہ لحاظِ مضامین کوئی غیر معمولی فرق نہیں ہوتا۔ ہماری رائے یہ ہے کہ ضخامت سے قطعِ نظر کرنے کے بعد جیسا کسی رسالے کا عام نمبر ہوتا ہے ویسا ہی اس کا خاص نمبر بھی ہونا ہے لیکن حال ہی میں بعض حضرات نے ہمیں مشورہ دیا ہے کہ چونکہ "ہمایوں" میں علمی مضامین کثرت سے شائع ہوتے رہتے ہیں اس لئے ہم کبھی کبھی اس کا کوئی خاص پرچہ ادبِ لطیف کے لئے بھی وقف کر دیا کریں ؎

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل   لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

علم کے ساتھ ادب کی خدمت بھی "ہمایوں" کے اولیں فرائض میں داخل ہے اور ہم اس تحریک کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ فی الحال ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اگر ممکن ہو تو دو تین مہینے کے اندر "ہمایوں" کا ایک افسانہ نمبر شایع کریں جس میں ایسے بہترین اور منتخب افسانے شائع کئے جائیں جو ہر طرح "ہمایوں" کے شایانِ شان ہوں۔ اس کے لئے اہلِ قلم کے اشتراکِ عمل کی بہت ضرورت ہے۔ افسانے طبعزاد بھی ہونے چاہئیں اور تراجم بھی۔ طبعزاد ہونے کی صورت میں بہ لحاظِ فن اور ترجمے کی صورت میں بہ لحاظِ انتخاب افسانے اپنی نظیر آپ ہونے چاہئیں۔ دونوں صورتوں میں زبان کی خوبی کو خاص اہمیت دی جائے گی۔

موصولہ افسانوں میں سے تقریباً دس بہترین افسانے منتخب کر کے "افسانہ نمبر" میں شائع کئے جائیں گے۔ معاونین تا بہ امکان یہ کوشش فرمائیں کہ افسانے "ہمایوں" کے دس بارہ مطبوعہ صفحات سے زائد جگہ نہ لیں۔ اگر افسانے ہمارے قائم کردہ معیار کے مطابق ہوئے تو پہلے اور دوسرے نمبر کے افسانہ نگار حضرات کو معقول انعام دیا جائے گا۔ افسانے زیادہ سے زیادہ ۳۰ اپریل ۱۹۳۴ء تک دفتر "ہمایوں" میں پہنچ جانے چاہئیں۔

سالگرہ نمبر ۱۹۳۴ء کے سلسلے میں ہم اپنے دہلوی معاصر "ساقی" کے شکر گزار ہیں جس نے "ہمایوں" کا ذکر کرتے ہوئے یہ حوصلہ افزا فقرہ بھی لکھا ہے کہ "ہمایوں" اُن

رسالوں میں سے نہیں جو سال بھر میں صرف ایک نمبر خاص اہتمام سے شائع کر کے باقی پرچے معمولی نکال دیتے ہیں بلکہ اس کے ہر پرچے میں مضامین کا خاص اہتمام ہوتا ہے۔
اسی سلسلے میں ہمیں اپنے معزز معاصر ندیم (گیا) کی رائے بھی جاذب توجہ معلوم ہوئی۔ معاصر موصوف "ہمایوں" کی "روش کے اعتدال اور پنجاب میں اس کی گراں بہا ادبی خدمات" کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

"ہر سال التزام سے سالگرہ نمبر اور شاندار نمبر نکالنا کوئی معمولی کام نہیں۔ موجودہ سالگرہ نمبر اپنی سابقہ روایات کی شان لئے ہوئے ہے۔ مضامین تقریباً سب معیاری اور نظمیں بہترین ہیں لیکن کاش "ہمایوں" کے روشن چہرے پر فرنگیت کا جو ہلکا سا اثر ہے وہ نہ ہوتا بلکہ مشرقی ہونے اور مشرقی زبان کا سچا خادم ہونے کی حیثیت سے اس پر مشرقیت کا غلبہ ہوتا اور اس کے ساتھ مذہبیت کے دائرے سے بھی آزاد نہ ہوتا۔"

ہم اپنے معزز معاصر کے خراج تحسین پر دلی شکریہ ادا کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ جو کچھ کہا گیا ہے ہم کسی طرح اس کے قابل نہیں لیکن "ندیم" کے آخری الفاظ سے ایک غلط فہمی پیدا ہونے کا احتمال ہے۔ اس لئے ہم اس کے متعلق باادب اپنا نقطۂ نگاہ واضح کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔

"فرنگیت" کے متعلق یہ عرض ہے کہ "ہمایوں" ایشیائی رسالہ ہے اور ایشیائی زبان اور ایشیائی ادب کا خدمتگذار ہے۔ اس لئے اس پر قدرتاً "مشرقیت کا غلبہ" ہے اور بہرحال رہیگا لیکن حصول علم کے باب میں "ہمایوں" پوری رواداری سے کام لینا چاہتا ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ صحیح علم خواہ چین سے ملے یا انگلستان سے بہرحال حاصل کرنے کے قابل ہے۔ آغاز اسلام میں خود عربوں نے یونان کے فلسفے سے استفادہ کر کے علم و حکمت کی شمع روشن کی۔ اگر ہم مغربی حکما کے خیالات سے اپنے قارئین کو روشناس کراتے ہیں تو یہ کسی بدعت میں داخل نہیں۔ مغرب آج کل علوم و فنون کا گہوارہ ہے اور کوئی طالب علم مغرب سے بے نیاز ہو کر نہیں رہ سکتا۔ نہ یہ مناسب ہے اور نہ اس کی ضرورت ہے۔ لیکن مشرق اور مشرقی روایات ہمیں قدرتاً عزیز ہیں اس لئے اگرچہ ہم علم کے حصول میں کامل رواداری کے حامی ہیں لیکن مغرب کی کورانہ تقلید کو بھی جائز نہیں سمجھتے۔

"مذہبیت" کے دائرے سے آزاد ہونے کے متعلق ہمارے معزز معاصر نے جو اشارہ کیا ہے وہ ناقابل فہم ہے۔ "ہمایوں" میں شروع سے لے کر اب تک بیسیوں مذہبی مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان میں سے بعض مضامین تو سو سو صفحات پر پھیلے ہوئے تھے۔ مثلاً "اسلام کا اثر مغربی تہذیب پر" جس میں مدیر "ہمایوں" نے یہ ثابت کیا تھا کہ مغرب کی تہذیب اسلام ہی کی شرمندۂ احسان ہے۔ ایک اور مضمون جو بہت طویل تھا "دنیا کی مذہبی و معاشرتی تاریخ پر ایک نظر" کے عنوان سے شائع ہوتا رہا۔ دو اور طویل مضامین "اسوۂ حسنہ" اور "حریت فی الاسلام" کے عنوان سے یکے بعد دیگرے متعدد اشاعتوں میں نکلتے رہے۔ "عورت اور مختلف مذاہب" میں یہ ثابت کیا گیا تھا کہ اسلام نے عورت کے معاملے میں سب سے زیادہ انصاف سے کام لیا ہے۔ اس کے علاوہ مشاہیر اسلام اور اسلامی ممالک کے متعلق اچھے اچھے مضامین "ہمایوں" نے شائع کئے۔

"مذہبیت" سے ہماری بیگانگی کا خیال عجیب ہے کیونکہ ہم تو اسلامی مضامین کے علاوہ بدھ مت، ہندو مت اور گورو نانک وغیرہ کے متعلق بھی مضامین شائع کرتے رہے ہیں۔ مذہب سے "ہمایوں" کی دلچسپی اور رواداری کا اس سے بہتر ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے۔

گزشتہ دنوں جب ایک مغربی تعلیمیافتہ نوجوان نے لندن سے مذہب کے خلاف ایک مضمون لکھ کر بھیجا تو ہم نے خود اس کا جواب لکھنے کے لئے اہل بصیرت کو دعوت دی۔ چنانچہ اس کے بعد مذہب کی حمایت میں مولانا محمد علی ایم اے (کنٹب) کا طویل اور مدلل مضمون شائع کیا گیا۔

ہم یہاں واضح طور پر یہ ظاہر کر دینا چاہتے ہیں کہ ہم "ہمایوں" کو اپنے ذاتی مسلک کا پابند بنانا نہیں چاہتے بلکہ اسے ہر قسم کے آزاد افکار کا آئینہ بنا رکھنا چاہتے ہیں۔ تاکہ ہم تنگ نظری میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ اگر ہم لامذہبیت کے سیلاب کی طرف سے بالکل آنکھیں بند کر لیں گے تو پھر ہم اس کے مقابلے کے لئے بھی تیار نہیں ہو سکتے۔ "ہمایوں" کا شیوہ کامل رواداری ہے اور "خذ ما صفا ودع ما کدر" کا اصول ہمارے لئے اور ہمارے ناظرین کے لئے دلیل راہ ہے۔

جہاں نما

بھونچال

شمالی بہار اور نیپال کی تباہی

ہندوستان کے قرونِ اولیٰ یا قرونِ وسطیٰ کی کوئی تاریخ اُس جہاں آشوب زلزلے کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے جس نے ۱۵ جنوری ۱۹۳۴ء کو شمالی ہند کے بعض قطعات کی بنیادیں ہلا دیں۔ شمالی بہار کو سب سے زیادہ نقصان پہنچا ہے اور اس کے بعد نیپال کی آزاد ریاست کو۔ بہار میں جان ومال کے نقصان کا اندازہ رنج فرسا ہے۔ جو لوگ ہلاک ہوئے ہیں اُن کی تعداد کے متعلق ابھی کوئی فیصلہ نہیں ہو سکتا کیونکہ ابھی ملبے کے نیچے سے تمام لاشیں برآمد نہیں کی جا سکیں لیکن اُن کے برآمد ہونے پر بھی صحیح اندازہ دشوار ہے کیونکہ جو لوگ زلزلے کے دوران میں جل گئے یا دریاؤں میں بہ گئے اُن کے اعداد وشمار بہم نہیں پہنچ سکتے۔ دیہات کے نقصانات کا بھی ابھی کوئی اندازہ قائم نہیں ہوا۔ بہرحال اگر آخری متحقق اعداد وشمار بہار کے شہروں اور دیہات میں مجموعی طور پر ایک لاکھ ہلاکت زدہ مردوں عورتوں اور بچوں کی فہرست پیش کریں تو تعجب کا مقام نہ ہوگا۔

نیپال میں بھی تقریباً تین ہزار اشخاص ہلاک ہوئے اور تین بڑے بڑے شہر جن میں دار السلطنت کھٹمنڈو بھی شامل ہے کھنڈروں کا انبار بن کر رہ گئے۔

بعض صورتوں میں پورے کا پورا گھرانا ہلاک ہو گیا اور اکثر صورتوں میں گھر کا ایک فرد یا ایک سے زیادہ افراد اپنے عزیزوں کا ماتم کرنے کے لئے باقی رہ گئے۔ بعض لوگ ملبہ اٹھانے پر بھی نیچے زندہ پائے گئے۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ اگر ملبہ اٹھانے کا کام فوراً شروع کر دیا جاتا تو شاید زیادہ جانیں بچائی جا سکتیں لیکن اس ناگہانی عذاب سے نہ صرف عام لوگ بلکہ اراکین حکومت بھی دو تین دن کے لئے از خود رفتہ وحواس باختہ ہو گئے چنانچہ اس مصیبت عظمیٰ کے بعد سلسلۂ رسل ورسائل جو قطع ہو گیا تھا جلد قائم نہ کیا جا سکا اور بیرونِ ملک میں تباہی کی خبریں بھی دیر سے پہنچیں۔

وہ لوگ جن کا گھر بار برباد ہو گیا ہے یا جن کے کمانے والے ہلاک ہو گئے ہیں ایسی ناقابلِ بیان مصیبت میں مبتلا ہیں جس کے تصور سے بھی جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ نہ اُن لوگوں کے پاس سر چھپانے کے لئے ٹھکانا ہے نہ اوڑھنا بچھونا نہ کھانا اور نہ بچوں کے لئے دودھ۔ حالت یہ ہے کہ کنوئیں بھی بھر گئے ہیں اور انہیں پانی بھی مشکل سے ملتا ہے۔

حکومت اور اہلِ ملک کا احساسِ فرض

یہ بات بہت قابلِ اطمینان ہے کہ حکومت اور اہلِ ملک اپنے صحیح فرائض کا احساس کر رہے ہیں۔ بیسیوں امدادی وفود اب تک جا چکے ہیں۔ اس کے علاوہ طول وعرضِ ہند کے لوگ نہایت فراخ دلی سے چندہ جمع کر کے مصیبت زدہ علاقہ کو امداد بہم پہنچا رہے ہیں۔ وائسرائے نے بھی چندے کا فنڈ کھول رکھا ہے

جس کا آغاز خود والسرائے نے پانچ ہزار روپے کے عطیے سے کیا۔ اس فنڈ میں اب تک سولہ سترہ لاکھ روپیہ جمع ہو چکا ہے۔ سب سے زیادہ امدادی رقم یعنی ایک لاکھ روپیہ مہاراجہ گونڈل کا عطیہ ہے۔ ملک معظم نے سو پاونڈ اور ملکہ معظمہ نے پچاس پاونڈ چندہ دیا ہے جو بہت ہی قابلِ قدر ہے یہاں ذکر کر دینا دلچسپی کا موجب ہوگا کہ ۱۹۲۳ء میں جب زلزلے نے جاپان کو تہ و بالا کر دیا تو شہنشاہِ جاپان نے اپنی جیبِ خاص سے ...... ۱ین اور جاپانی حکومت نے ۸۰۰۰۰،۳۰۷ ین کی رقم اپنے خزانے سے بطور امداد دی۔ جاپان تو ایک آزاد سلطنت ہے۔ وہاں کے عوام نے جو تندہی اپنے ملک کو دوبارہ آباد کرنے میں دکھائی وہ اُن کو سزاوار تھی لیکن ہندوستان کے عوام نے بھی اس معاملے میں باوجود اپنی اقتصادی تباہی کے جو مستعدی دکھائی ہے وہ ہر طرح باعثِ اطمینان ہے۔

کیا بہار زلزلے کا مرکز بن جائیگا

بعض حلقوں میں یہ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ بہار مستقل طور پر زلزلوں کا مرکز بن جائیگا۔ اس کا بظاہر کوئی ثبوت نہیں ملتا لیکن اگر ایسا ہو بھی تو اہلِ بہار کے لئے اپنا ملک چھوڑ دینا لازم نہیں۔ جاپان میں عموماً زلزلے آتے رہتے ہیں لیکن جاپانیوں نے جاپان کو چھوڑ نہیں دیا۔ اٹلی میں وسوویس کا آتش فشاں وقتاً فوقتاً پھٹتا رہتا ہے لیکن اس کے باوجود اہلِ اٹلی کی کاشت کردہ زمینیں وسوویس کے دہانے تک پھیلی ہیں۔ زلزلے کے اندیشے نے دنیا کا کوئی حصہ خالی نہیں کیا۔

بہار اور نیپال کی آئندہ عمارات

موجودہ صورت میں البتہ یہ ضروری ہے کہ بہار میں آئندہ جو مکانات تعمیر کئے جائیں وہ ایسے ہوں کہ زلزلے کے چھوٹے موٹے جھٹکوں کا مقابلہ کر سکیں۔ انجینیروں اور معماروں کو عمارات کی طرزِ تعمیر اور مسالے کے متعلق اپنی تجاویز پیش کرنی چاہئیں تاکہ امیروں اور غریبوں کے لئے ایسے مکانات بہم پہنچ سکیں جو کم از کم اس سے کم درجے کی ناگہانی آفات کا مقابلہ کرنے کے قابل تو ہوں۔ اس میں جاپان کی مثال سے مدد لی جا سکتی ہے۔

بہار کی زراعت

بہار کے اکثر علاقوں میں جہاں پہلے خشک زمین تھی اب پانی ہے اور بعض جگہ جہاں پہلے زرخیز زمین تھی وہاں اب ریت کے انبار لگے ہیں۔ موجودہ صورت میں یا تو زمینداروں کو کسی دوسری جگہ زمین ملنی چاہیئے اور یا ریت ہٹا کر دوبارہ اِن زمینوں کو قابلِ کاشت بنا دینا چاہیئے۔ بہار میں ایکھ کے وسیع کھیت کھڑے ہیں لیکن شکر کی جن ملوں کو شکر بنانے کے لئے گنا بہم پہنچایا جاتا تھا وہ تباہ ہو چکی ہیں۔ اس لئے ایکھ کا کوئی گاہک آسانی سے نہیں مل سکتا۔ اس لئے اب مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ بہاری کاشتکار خود گڑ بنا کر فروخت کر دیں۔ بعد میں گڑ صاف ہونے پر سفید شکر میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

یونیورسٹی کی تعلیم

ڈاکٹر ارکوہارٹ نے روٹری کلب کلکتہ کے اجلاس میں ایک تقریر کی جو صنعتی تعلیم کے حامیوں کے لئے قابلِ غور ہے "تاکہ وہ اپنے نظریات پیش کرتے وقت بیروزگار صناعوں کی عبرتناک حالت کو مدِ نظر رکھ سکیں۔ آج کل یہ خیال عام ہو رہا ہے کہ ادبی تعلیم کے بجائے صنعتی تعلیم کی طرف بہت زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔ کہتے ہیں کہ ریاضی، فلسفے اور سائنس کی تعلیم سے خاندان کی اقتصادی حالت کی کوئی اصلاح نہیں ہوتی تعلیم اس قسم کی ہونی چاہیئے جو دنیا کے کاروبار میں مدد دے سکے۔ "فضول تعلیم" سے احتراز اور "مفید تعلیم" کی طرف توجہ کرنے کی اشد ضرورت محسوس کرائی جاتی ہے۔ فوری نفع کے نقطۂ خیال سے شاید ادبی تعلیم فضول قرار دی جا سکتی ہو لیکن بالآخر یہ فضول ثابت نہیں ہوتی۔ کم از کم ہمیں بے سوچے سمجھے اس قسم کا فیصلہ نہ کرنا چاہیئے۔ ہم محض طریقۂ تعلیم کو بدل کر اقتصادی مشکلات کا حل نہیں ڈھونڈ سکتے۔ صنعتی تعلیم کی ترقی مفید ضرور ہوگی لیکن یہ ہر مرض کا علاج ثابت نہیں ہو سکتی۔ مثلاً اس تعلیم کے اثر سے وہ زمین جو اب پچاس آدمیوں سے زیادہ کی خوراک مہیا نہیں کر سکتی سو آدمیوں کی خوراک بہم نہ پہنچانے لگے گی صنعتی تعلیم اسی صورت میں مفید ہو سکتی ہے کہ طلبہ کے کالج سے نکلتے ہی صنعتی عہدے اُن کے لئے منتظر موجود ہوں لیکن صورتِ حال یہ نہیں۔ حالت یہ ہے کہ یورپ سے بہترین صنعتی تعلیم حاصل کر لینے کے بعد جو ہندوستانی طلبہ یہاں آتے ہیں انہیں کوئی کام نہیں ملتا۔ ایک عام تعلیمیافتہ شخص تو کسی دوسرے شعبے میں بھی کام کر سکتا ہے لیکن اس طرح کے خاص قسم کی تعلیم حاصل کئے ہوئے لوگوں کا حال بہت قابلِ رحم ہوتا ہے۔ وہ اپنے مخصوص فن کے علاوہ کوئی کام نہیں کر سکتے۔ اگر ذاتی طور پر مجھ سے پوچھا جائے تو میں خالی دماغ کے بجائے مملو دماغ کے ساتھ بیکار رہنا قابلِ ترجیح سمجھتا ہوں۔ یونیورسٹی کی تعلیم دماغ کو کم از کم بھر دینے کا کام ضرور لیتی ہے۔ اس طرح فراغت کی حالت میں انسان کم از کم کچھ نہ کچھ سوچنے کے قابل ضرور ہو جاتا ہے۔ ورنہ خالی معدے کے ساتھ ہی دماغ کا بھی خالی رہنا کسی خاص نفع کا موجب معلوم نہیں ہوتا۔

تصاویر

کیوپڈ اور سائکی: ۔ یہ تصویر کیوپڈ اور سائکی کی قدیم درد انگیز اور معنی خیز کہانی کا آخری حصہ ہے۔ سائکی لفظ روح کا یونانی مرادف ہے اور اس کے مصائب کی کہانی در اصل ایک گہری تمثیل ہے جسے محبت اور روح کے افسانے کا شاعرانہ بیان کہنا بجا ہے۔ اس تصویر میں بچاری سائکی (روح) اُن پر صعوبت سفروں اور جہاں گردیوں کے بعد جن پر وہ وینس کے حکم سے مجبور ہوئی تھی تھک ہار کر ایسی حالت کو پہنچ چکی ہے کہ اب مزید مصائب برداشت کرنے کے قابل نہیں رہی۔ آخری سفر شہر خموشاں کا تھا جس کے خوفناک گنبد دُور نظر آ رہے ہیں۔ سائکی بہ مشکل اپنے آپ کو بچا کر بھاگ نکلی ہے اور تھکی ہاری ایک تالاب کے کنارے گر پڑی ہے۔ اس موقع پر جب کہ وہ اپنا سب کچھ کھو چکی ہے اور کوئی اس کا پرسانِ حال نہیں آسمان سے محبت (کیوپڈ) اتر کر اُسے مصیبتوں سے نجات دلاتی ہے۔

اور جھک کے اُس کے کان میں کہتی ہے میری جاں ۔۔۔ آ مجھ سے مل کہ میں ہوں ترے انتظار میں

ہم آہنگی۔ یہ خوبصورت تصویر رچرڈسن کریمر کے تخیل کی تخلیق ہے جو وہاں تھا اور لالے کی ایک شاخ لے کر مصور نے ایک سحر کن حسن پیدا کر دیا ہے خطوط کی ہم آہنگی اور مستعدی کے لحاظ سے یہ تصویر اپنا جواب آپ ہے۔



کیوپڈ اور سائکی



غزل

اِس دل سے یقیں اُس کی وفا کا نہیں جاتا
دھوکا ہی سہی خیر، یہ دھوکا نہیں جاتا

دبتی ہے دبائے سے کہاں حسرتِ دیدار
ہم چُپ ہیں مگر دل کا تقاضا نہیں جاتا

سو بار بھی ہم جان سے گزرے تو عبث ہے
ظالم ترا سودا نہیں جاتا نہیں جاتا

دل جاتا ہے، جاں جاتی ہی، جاتا ہے زمانہ
جب آپ چلے جاتے ہیں کیا کیا نہیں جاتا

سُوجھی یہ نئی طرزِ جفا بوالہوسوں کو
جور و ستمِ دوست کا چرچا نہیں جاتا

حامد علی خاں

اردو کے ابتدائی مرثیے اور اُن کا ارتقا

دلی کے دور تک

(۲)

اردو مرثیہ نگاری کے اس ابتدائی دور کو اگر ہم دو مختلف حصّوں میں تقسیم کر دیں تو ہمیں معلوم ہو جائیگا کہ محمد قلی قطب شاہ کے زمانے سے ہاشم برہان پوری یا دوسرے الفاظ میں ولی کے دور تک اس میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں۔ ابتدا کے خیالات کو آنے والے شاعروں نے کتنا بلند کیا۔ اپنے پیش روؤں کے قائم کئے ہوئے راستوں پر کس حد تک چلے اور کس جگہ سے دوسری راہیں اختیار کرنی شروع کر دیں اور ان راہوں نے انہیں کہاں تک پہنچا دیا۔ قلی قطب شاہ سے ہاشم کے وقت تک قریب قریب ہر اس مرثیہ گو کے کلام کا نمونہ پیش کیا گیا جو اب تک ہمارے سامنے آچکا ہے۔ اس کے دیکھنے سے یہ اندازہ ہوا کہ اس ڈیڑھ سو برس کے عرصہ میں کوئی زمانہ ایسا نہیں ہوا جس میں مرثیہ گوئی برابر جاری نہ رہی ہو لیکن یہ یقینی ہے کہ اتنے عرصہ تک وہ کسی حیثیت سے بھی ایک روش پر نہیں رہ سکتی تھی۔ زبان کی تبدیلیاں وقت کے ساتھ ہوتی رہتی ہیں اور دیکھنے والے اس کا احساس بھی نہیں کر سکتے۔ دوسری صوری اور معنوی تبدیلیاں بھی اسی طرح عمل کرتی رہتی ہیں کہ اُن کو آسانی سے محسوس نہیں کیا جا سکتا تاوقتیکہ وہ کوئی نہ کوئی مستقل صورت نہ اختیار کر لیں۔ یہی حال مرثیوں کا ہوا۔ اردو کے ابتدائی مرثیے محض مذہبی نقطۂ نظر سے کہے جاتے تھے۔ شاعروں کا خیال تھا کہ مسلمانوں کے آنسوؤں سے اُن کے گناہ دھل جائیں گے۔ چنانچہ اردو کا پہلا مرثیہ گو اپنے مرثیے میں اس طرح کہتا ہے ؎

قطبا کو ہے اللہ مدد دستا ہے اس دل میں خدا — تو منج مدد حیدر ولد مریاں کو زاری وائے وائے

قلی قطب شاہ کے بعد کوئی سو برس تک یہی جذبہ جاری رہا۔ اور ہر شاعر مرثیوں کو صرف اسی مقصد سے کہتا رہا چنانچہ قاضی محمود بحری نے اپنے چار مرثیوں میں کئی جگہ اس خیال کا اظہار کیا ہے ایک جگہ کہتے ہیں۔

تب کیا واجب لاں پر اور کے دکھ شاہ کا — فرض کر اول جب اپنے پر لیا یو مرثیا[1]

یا جیکوئی دل میں شاہ کے غم کا نہال لائے — او دل الیقین کہ حشر کوں باغ ارم ہوا[2]

یا یک انجو جن بہا ہے اس غم سوں — آپ جنت میں اُن مقام کیا[3]

[1]، [2] و [3] قلمی دیوان بحری کتب خانہ ڈاکٹر محمد حفیظ۔

لیکن بحری کے بعد اس خیال میں تبدیلی پیدا ہونی شروع ہوگئی۔ شاعروں نے اس مقصد کو محض مذہب تک محدود نہیں رکھا۔ چنانچہ عزلت[1] نے ایک جگہ ببانگ دہل یہ کہہ دیا کہ ؎

خام مضمون مرثیہ کہنے سوں چپ رہنا بھلا ، پختہ دردآمیز عزلت نت توں احوالات بول[2]

چنانچہ اکثر شعرا نے اس کی پیروی کی اور بحری کے طرز کے مرثیہ کو ہر حیثیت سے ترقی دینی شروع کی لیکن اس کا مقصد یہ نہیں کہ اب شعرا نے اسے اپنا مذہبی فرض سمجھنا چھوڑ دیا۔ خود عزلت کے ہمعصر رضا نے اُس کا جواب اس طرح دیا ہے ؎

اے عزیزاں گرچہ عزلت مرثیہ میں یوں کہا ، خام مضمون مرثیہ کہنے سوں چپ رہنا بھلا

لیکن اس مظلوم بے سر کا بیاں کرنا روا ، تا کہ سُن کر یو بیاں رو دیں محباں اشک بار[3]

اس ذہنی تبدیلی کا یہ نتیجہ ہوا کہ شاعروں نے مرثیوں میں ہر قسم کی تبدیلی اور ترقی کرنے کی کوشش کی۔

قلی قطب شاہ کے زمانے سے بحری کے زمانے تک مرثیے عموماً غزل کی صورت میں کہے جاتے تھے۔ چنانچہ قلی قطب شاہ، مرزا، وَلی اور بحری کے مرثیوں کی جو مثالیں پیش کی گئی ہیں وہ سب کی سب غزلوں کی صورت میں ہیں۔ اس کے علاوہ ان لوگوں کے جو مرثیے اب تک مل چکے ہیں وہ بھی سب اسی شکل میں کہے گئے ہیں۔ خود بحری کے دیوان میں چار مرثیے ہیں اور چاروں اسی شکل میں ہیں۔ اشعار کے مضمون بھی اپنی اپنی جگہ پر علیحدہ ہیں لیکن بحری کے بعد اس روش میں تبدیلی ہونی شروع ہوگئی۔ ایک عرصہ تک شاعروں نے اسی شکل میں مرثیے کہے لیکن انہیں مختلف حیثیتوں سے زیادہ بلند اور ممتاز بنانے کی کوشش کی۔ چنانچہ جن جن لوگوں نے غزل کی شکل کو قائم رکھا ان میں سے قریب قریب ہر ایک نے مرثیے مسلسل غزل کی صورت میں کہے۔ اشرف کے دو مرثیوں کے شعر ترتیب وار نقل کئے گئے ہیں۔ ان دونوں مثالوں میں ایک شعر دوسرے شعر سے بالکل ملا ہوا ہے۔ شاعر نے ایک مسلسل مضمون کو غزل کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔ لیکن خیال کا سلسلہ کہیں ٹوٹنے نہیں پایا۔ اسی قسم کی اور مثالیں اشرف کے ہمعصروں میں بھی ملیں گی۔ رضی کا مرثیہ جس کا مطلع ہے ؎

غم سوں ہے بیقرار میرا دل ، دکھ سوں ہے زار زار میرا دل

ایک مسلسل غزل ہے جس میں شاعر انتہائی تسلسل کے ساتھ اپنے دل کی اُن کیفیتوں کا بیان کرتا ہے جو غم اہل بیت میں اس پر گزری تھیں۔

---

[1] عزلت کا ذکر قریب قریب ہر تذکرہ میں ہے۔ میر قائم، فتح علی شفیق صاحب تحفۃ الشعراء، صاحب گلزار ابراہیم، خواجہ حمید اورنگ آبادی، بلگرامی نے ان کا ذکر بڑے زوردار الفاظ میں کیا ہے اور اس میں شک بھی نہیں کہ عزلت اپنے ہمعصروں میں ایک بلند پایہ کا شاعر تھا۔ شفیق نے صرف نمونہ شعروں میں ان کے اشعار کا انتخاب پیش کیا ہے لیکن ان میں سے ایک بھی اس کی مرثیہ گوئی پر کوئی روشنی نہیں ڈالتا۔ البتہ اس نے میر کے حوالے سے مرثیے کے دو مبتذل شعر نقل کئے ہیں لیکن نکات الشعرا میں وہ شعر موجود نہیں۔ مرثیہ میں اس ابتذال کی مثال یا تو ان دو شعروں میں ہے یا آگے چل کر ہے سیوں میں۔

[2] [3] مضمون ڈاکٹر زور اردو اپریل ۱۹۲۹ء

یاسیدن کا مرثیہ ۶ ماہ محرم میں دیکھو چھندا ہومالی آئیا۔ ایک مسلسل غزل کی صورت میں ہے۔ ان تمام مرثیوں کے دیکھنے کے بعد ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ تسلسل کے علاوہ ان میں اور بھی بہت سی باتیں ہیں۔ رتنی کا مرثیہ جہاں ایک طرف مربوط اور مسلسل شعروں کی ایک کڑی ہے وہاں دوسری طرف تغزل کے جذبات سے مالامال ہے اس دور کے ایک دوسرے شاعر روحی کا ایک مرثیہ پیش کیا گیا ہے اس میں علاوہ تسلسل کے تغزل کے خوش آیند نغمے موجود ہیں ؎

آج غمناک ہیں چمن کے گل — بلکہ دل چاک ہیں سمن کے گل

غم زدہ سینہ داغ حیران ہیں — نرگس و لالہ یاسمن کے گل

یوں نہ لالے شفق کے دستے ہیں — لہو میں ڈوبے ہیں سب گگن کے گل

جب سنی شہ کی بات مجلس میں — جل بجھے شمع انجمن کے گل

خوش لگے تجھ طبع میں اے روحی — دل کے باغاں منے سخن کے گل

سب شعروں میں اُس غم کا بیان کیا گیا ہے جو اہل بیت کے مصائب کی یاد میں محرم میں مسلمانوں کے دلوں پر چھایا رہتا ہے لیکن شعروں کا انداز بالکل وہی ہے جو غزلوں کا ہوتا ہے۔ ہر شعر اپنی اپنی جگہ الگ ہے لیکن خیالات میں ایک سلسلہ ہے۔

ایک تیسرا فرق بالکل ابتدائی اور اس دور کے غزل نما مرثیوں میں یہ ہے کہ دور ثانی کے مرثیہ گویوں نے باوجودیکہ مرثیے غزلوں کی شکل میں کہے لیکن بحروں کے انتخاب میں وہ اپنے پیش رووں سے علیحدہ ہو گئے قلی قطب شاہ۔ مرزا۔ ذوقی اور بحری میں سے کسی نے یہ سوچ کر مرثیے نہیں کہے کہ اُن کا جو مقصد ہے وہ اُس میں کامیاب ہوتے ہیں یا نہیں اور اس لئے انھوں نے اس بات کی ضرورت بھی نہیں محسوس کی کہ مرثیوں کے لئے مخصوص بحروں کا انتخاب کر کے انہیں پر درد بنائیں لیکن بعد میں آنے والے شاعروں نے بحروں کو بھی کچھ نہ کچھ اہمیت دی یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ مضامین اور مقصد کی نوعیت سے ایسی بحریں خود بخود اُن کے ذہن میں آگئیں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ بحروں کے انتخاب نے اُن کے کلام کو پہلے سے زیادہ پر اثر بنا دیا۔ مثال کے طور پر اگر ہم صرف رتنی کا مرثیہ لیں تو ہمیں اندازہ ہو جائے گا کہ محض بحر کے انتخاب نے اس میں کتنا اثر پیدا کر دیا۔

اردو ادب کے شائقین میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے نواب مرزا کی مثنوی زہر عشق کو پڑھا یا سنا نہ ہو اور اس سے متاثر نہ ہُوا ہو۔ زہر عشق بھی اردو کی دوسری مثنویوں کی طرح انہیں خیالات کی حامل ہے جو عام طور پر اس وقت ملک اور قوم کی فضا میں موجود تھے لیکن اس میں اثر اوروں سے زیادہ ہے۔ اس کی جہاں اور بہت سی وجہیں ہیں وہاں ایک یہ بھی ہے کہ اس کی بحر خاص طور پر ایسی ہے کہ اگر اسی انداز میں پڑھی جائے جو اس کے لئے مخصوص ہے تو یقیناً دل پر چوٹ لگے گی۔ رتنی کا مرثیہ بھی اسی بحر میں ہے، اور اگر پڑھنے والا اُسے اسی مخصوص انداز اور نغمہ کے ساتھ پڑھے تو یقیناً اثر زیادہ ہو جائے گا۔ صرف دو شعر پڑھ کر اس کا اندازہ ہو سکتا ہے ؎

غم سوں ہے بے قرار میرا دل — دکھ سوں ہے زار زار میرا دل
گلشن غم میں ہے شہیدوں کے — لالۂ داغدار میرا دل

یا اس کے علاوہ مرثیوں کو موثر بنانے کے لئے اور مختلف طریقے استعمال کئے گئے ہیں مثلاً غلامی کا مرثیہ ہے سے

اب میں جھولاؤں کسے۔ چھاتی لگاؤں کسے — دودو پلاؤں کسے ہے ہے فلک کیا کیا

غلامی نے جو بحر اختیار کی ہے اُسے کسی طرح بھی پڑھا جائے اس میں کوئی اثر نہیں پیدا ہوتا یا لفظوں کی ترتیب ہی ایسی ہے کہ کوئی ترنم اور نغمہ پیدا ہوسکے اس لئے کان اس سے بہت کم اثر لیتے ہیں۔ غلامی نے دونوں مصرعوں کو چار برابر کے حصوں میں تقسیم کرلیا اور شروع کے تین ٹکڑوں کے آخری لفظوں کو ہم قافیہ بنا دیا اور اس طرح شعر میں ترنم پیدا ہوگیا۔

اس قسم کے مرثیوں میں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ وہ ہر موقع پر نہیں پڑھے جاسکتے۔ خدا جانے شاعروں نے بھی اُس وقت یہ بات محسوس کی تھی کہ نہیں لیکن اب انہیں دیکھنے سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ وہ خاص خاص موقعوں کے لئے مخصوص تھے۔ کوئی صرف ایسا ہے جو عورتیں تعزیے کے سامنے بیٹھ کر پڑھیں تو زیادہ اثر کرے گا کوئی ایسا ہے کہ جو صرف ماتم کے ساتھ پڑھا جائے تو زیادہ موثر ہوگا کوئی صرف ایسا ہے جو صرف گا کر پڑھا جائے تو زیادہ غم انگیز معلوم ہوگا۔ لیکن یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ شاعروں نے ارادتاً یہ التزام پیدا کیا ہے یا خود بخود ہوگیا۔ بہرحال جو کچھ بھی ہو لیکن بحری کے بعد والے شاعروں میں کہیں کہیں اس خصوصیت کا بھی اظہار ہوتا ہے برخلاف اس کے خود بحری کے یہاں یا اُس کے پیش رووں کے مراثی میں یہ بات مفقود ہے۔

اس کے علاوہ ایک خصوصیّت اِن مرثیہ گویوں کی یہ ہے کہ باوجود غزل کی شکل میں کہنے کے ان میں بعض نے شاعرانہ جدّتوں سے بھی اپنے مرثیوں کو اپنے پیش رووں پر تفوّق دیا ہے۔ اس قسم کی سب سے قابل قدر مثال سیدن کا وہ مرثیہ[1] ہے جس میں اُس نے نہایت پرتاثیر پیرایہ میں غم کی مجلس میں شادی کا سامان ترتیب دیا ہے۔ اس میں شاعرانہ تاویلات اور استعاروں تشبیہوں کے حسن نے ایک خاص اثر پیدا کردیا ہے۔ تنہا یہی مرثیہ ایسا ہے جو مرثیے کے ارتقا کی ایک خاص منزل کا آئینہ دار ہے۔ اس میں اپنے پیش رووں کے طرز کے خلاف تسلسل بھی ہے تغزّل بھی۔ پراثر بحر بھی ہے اور الفاظ کی پُرتاثیر ترتیب بھی اور ساتھ ہی ساتھ شاعرانہ جدّت کی ایک بہترین مثال بھی۔ اس مرثیے کو پڑھ کر صحیح اندازہ ہوسکتا ہے کہ قلی قطب شاہ کے غزلی مرثیے اور سیدن کے مرثیے میں کتنا فرق ہے۔

مرثیے کی صوری حیثیت میں ایک دوسرا فرق یہ بھی ہوا کہ غزل کی شکل کے مرثیوں کو مختلف حیثیتوں سے ترقی دینے کے بعد بعض مرثیہ گویوں نے مربع کی شکل میں مرثیے کہنے شروع کئے۔ چنانچہ دورِ ثانی کے مرثیہ گویوں کے کلام کے نمونے پیش کئے گئے ہیں اُن میں سے امامی۔ غلامی۔ رضا۔ قادر۔ کاظم۔ ہاشم کے مرثیے مربع کی شکل میں ہیں۔

---

[1] ماہ محرم میں دیکھو ہو حیدر اما لی آئیا ۔ تارے گگن کے گوندکے سہرا جو شہ کوں لائیا۔

ان صوری حیثیتوں کے علاوہ بحری اور اس کے عہد کے بعد کے مرثیوں میں اور بھی بہت سے فرق ہیں۔ ان فرقوں میں سے ایک خاص فرق مضامین کی وسعت میں ہوا۔ بحری اور اُس کے پیش رو دل کے مرثیوں میں واقعات کربلا کا ذکر یا تو عمومی حیثیت سے کیا گیا ہے۔ اور یا کسی شاعر نے ان جذبات کا اظہار کیا ہے جو حضرت امام حسینؑ کی شہادت سے ہر شخص کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ یا زیادہ سے زیادہ بعض شاعر اس حد تک بڑھے کہ انہوں نے مصائب اہل بیت پر آنسو بہائے اور دوسروں کو رلانے کی کوشش کی۔ لیکن بعد کے مرثیہ گویوں نے مضامین میں بھی ترقی کی انہوں نے ان واقعات کے علاوہ حضرت علی اصغر کی شہادت حضرت شہر بانو کے بین اور حضرت قاسم کی شادی کے دردناک واقعات نظم کرنے شروع کئے اور اس لئے اُن کے مرثیوں میں اثر اور زیادہ ہو گیا۔ خود آج کل کے مرثیوں میں یہی تین واقعات ایسے ہیں جن سے مرثیوں میں درد اور اثر پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس لئے بحری کے بعد شاعروں نے اپنے مرثیوں کے لئے انہیں مضامین کو مخصوص کر لیا۔ اشرف کے دو مرثیوں کے تھوڑے سے شعر نمونۃً پیش کئے گئے ہیں اُن میں سے ایک میں حضرت شہر بانوؑ سید الشہداؑ کو یاد کر کے گریہ فرماتی ہیں اور دوسرے میں حضرت علی اصغرؑ کو یاد کر کے بین کرتی ہیں۔ آخر الذکر میں بے حد اثر اور درد ہے۔ غلامی کا جو مرثیہ نمونہ کلام کے طور پر پیش کیا ہے۔ اُس میں حضرت شہر بانو سلسلہ وار ہر ایک کو یاد کر کے روتی ہیں۔ پہلے انہیں اپنا جگر گوشہ یاد آتا ہے۔ پھر سارے شہدائے کربلا کو یاد کرتی ہیں۔ پھر نوجوان اکبرؑ کی یاد ستاتی ہے۔ دل میں درد اٹھتا ہے تو اپنی حالت پر رونے لگتی ہیں۔ روتے روتے عابد بیمار کی مصیبت کا خیال آجاتا ہے اور دل قابو سے جاتا رہتا ہے۔ پھر پیاسی اور بے باپ کی بیٹی سکینہ کی حالت پر رونا آتا ہے۔ خدا کو یاد کر کے مدد چاہتی ہیں۔ بیٹی کی مصیبت کے ساتھ قاسمؑ کی یاد آجاتی ہے اور آخر میں ان مصائب پر گریہ کرتے کرتے اپنے غم کی طرف متوجہ ہو جاتی ہیں اور درد بھرے الفاظ میں کہتی ہیں ؎

بیوہ ہوئی میرے خدا ہے ہے فلک کیا کیا ۔۔۔ شہ مرا مارا پڑا کوئی نہیں والی مرا

بالکل قدیم مرثیوں میں اس قسم کا تسلسل اور اتار چڑھاؤ بالکل مفقود ہے۔ سو برس کی ارتقائی منزل میں غلامی کا بھی ایک خاص حصہ ہے۔ غلامی نے اپنے مرثیے میں حضرت شہر بانو کے غم کی حالت کی تصویر کشی نہایت پر اثر پیرایہ میں کی ہے۔ ہاشم علی کے مرثیہ میں حضرت قاسم کی رخصت، اور ایک دن کی بیاہی دلھن کے جذبات کا اظہار جس طریقہ پر ہوا ہے اُسے پڑھ کر کلیجا منہ کو آتا ہے۔

اُردو کے ابتدائی دوروں کے جن مرثیوں کا ذکر کیا جا رہا ہے اُن میں اور بعد والے مرثیوں میں ایک خاص فرق یہ بھی ہے کہ پہلے دور میں کردار نگاری بالکل مفقود ہے لیکن بعد والے دور میں کہیں کہیں اس کی جھلک پائی جاتی ہے۔ اگر حضرت امام حسینؑ کی صفات کے بیان کو کردار نگاری کہا جا سکتا ہے تو وہ یکساں طور پر دونوں دوروں کے شاعروں میں موجود ہے لیکن حقیقتاً کردار نگاری کی حدود اس سے بالکل الگ ہیں۔ کردار نگاری کے روشن پہلو اُس وقت زیادہ پُر اثر معلوم ہوتے ہیں جب اُن کا اظہار کرداروں کے مکالمہ کے ذریعہ سے ہو۔ چونکہ ابتدائی مرثیے بالکل بیانیہ ہیں۔ اس لئے ان میں مکالمہ بالکل نہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان میں نہ کہیں حقیقت نگاری ہے

اور نہ کردار نگاری لیکن بعد کے مرثیوں میں یہ دونوں باتیں موجود ہیں اور مکالمہ کی صورت میں موجود ہیں۔ کردار نگاری کا بہترین مظاہرہ اس مرثیہ میں ہوتا ہے جو ہاشم نے حضرت قاسم کے حال میں کہا ہے۔ حضرت قاسمؑ اپنی غم نصیب دلھن سے رخصت ہو رہے ہیں۔ وہ زار زار رو رہی ہے اور انتہائے محبت میں انہیں رَن میں جانے سے روکتی ہے۔ اُن کے جذبات کی ترجمانی شاعر نے جس درد بھرے انداز میں کی ہے وہ بے حد قابلِ قدر و ستائش ہے۔ حضرت قاسمؑ کی اس وقت جو حالت ہے اُس کا اندازہ شاعر کے الفاظ میں کیجیے ؎

قاسم کھڑا نمنار دتے نین سُن دولھن کی بات	غم ناک اپنا دیکھ کے دامن دولھن کے ہات
تب آہ دردناک سوں بولا دولھن کے سات	اے بوستانِ راحتِ سرو چمن مرا
مجھ کوں نہیں ہے تیری جدائی کا اختیار	تیرے فراق سات میں جاتا ہوں اشکبار
میں کیا کروں علاج نہیں حکم کردگار	حق نے کیا ہے رَن میں مقرر رہن میرا

اس نازک موقع پر شاعر نے حضرت قاسمؑ کے کردار پر صرف ایک شعر سے جو روشنی ڈالی ہے وہ مرثیہ گوئی کے ابتدائی دور میں بیحد قابلِ قدر ہے۔ کتنی مکمل تصویر ہے ؎

میں کیا کروں علاج نہیں حکم کردگار

پہلے بند میں واقعہ نگاری کی جھلک ہر لفظ میں نمایاں ہے۔ ایک شوہر کو اپنی دلھن اور وہ بھی ایک دن کی بیاہی ہوئی جس قدر عزیز ہو کم ہے۔ اس سے ہمیشہ کے لئے بچھڑنے کا خیال انسان کے دل کی کیا حالت نہ کر دیگا؟ ایسے غم کے موقع پر حضرت قاسمؑ کی حالت کا نقشہ ایک ابتدائی مرثیہ نگار اس سے بہتر طریقہ پر نہیں کھینچ سکتا تھا۔

اس مرثیے کے ابتدائی بندوں میں واقعہ نگاری کی اس سے بہتر مثال موجود ہے ؎

جلوہ سیں اُٹھ کے رَن کوں چلا تب کہی دُلھن	دامن پکڑ کے لاج سوں۔ انجھواں بھرے نین
مت چھوڑ کر سدھار دتم اِس حال میں ہمن	تم بن رہے گا ہائے یہ سونا بھون مرا

چار مصرعوں کے ایک بند میں شاعر نے واقعہ نگاری کے جو مدارج طے کئے ہیں وہ حقیقی معنوں میں آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے ایک قابلِ قدر بنیاد ہیں۔ خصوصاً دوسرا مصرعہ

دامن پکڑ کے۔ لاج سوں۔ انجھواں بھرے نین

کس قدر بلیغ ہے۔

کردار نگاری اور واقعہ نگاری کے سلسلہ ہی میں اس بات کا اظہار بھی ضروری ہے کہ مرثیے نے اپنی ارتقائی منازل طے کرتے کرتے اس دَور کے آخر میں وہ منزل حاصل کر لی تھی جہاں جذبات اور احساسات کے کافی امید افزا مظاہرے ہونے شروع ہو گئے تھے۔

اوپر لکھی ہوئی مثال میں ایک نئی بیاہی ہوئی دلھن اور دولھا کے جو جذبات ہو سکتے ہیں انہیں ہاشم نے حتی الامکان ایک موثر اور فطری انداز میں پیش کیا ہے۔

اشرف۔ ندیم۔ غلامی اور امامی کے جن مرثیوں کے نمونے پیش کئے گئے ہیں اُن میں سے ہر ایک میں حضرت شہر بانو کے جذبات اور احساسات کا پُر تاثیر خاکہ موجود ہے۔ فطری جذبات کو حُسن ترتیب کے ساتھ پراثر اور سادہ لفظوں میں اس طرح بیان کیا ہے کہ دل اُن سے کافی متاثر ہوتا ہے۔ بالکل ابتدائی مرثیوں میں جذبات نگاری بھی محض اسی لئے مفقود ہے کہ اُن میں سے کسی نے کوئی مرثیہ کسی خاص فرد کے حال میں نہیں لکھا۔ اس لئے کیسے ممکن تھا کہ اُن کے جذبات کا اظہار کیا جاتا چونکہ بعد کے مرثیے خاص طور پر حضرت شہر بانوؑ یا حضرت قاسمؑ کے حال میں کہے گئے ہیں۔ اس لئے اُن کے جذبات کی ترجمانی بھی انہیں کی زبانی کی گئی اور اسی لئے ان میں فطری رنگ موجود ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ یہ سب چیزیں مکمل صورت اختیار کر چکی تھیں۔ ان شاعروں نے صرف خاکے کھینچ دیئے۔ بعد میں پیدا ہونے والوں شاعروں نے انہیں اور پھیلایا اور اُن میں ہر جگہ منظر فریب رنگ بھر دیئے۔

اس کے علاوہ بھی دور ثانی میں بعض ایسی خصوصیات ہیں جو ابتدائی دور میں نہیں۔ ان میں سے بعض ایسی بھی ہیں جن کی ایجاد کا سہرا اب تک میر ضمیر کے سر ہے

موجودہ دور کے مرثیوں کو عموماً ۸ حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:۔

۱۔ چہرہ (۲) سراپا (۳) رخصت (۴) آمد (۵) رجز (۶) جنگ (۷) شہادت اور (۸) بین ان تمام چیزوں کا ترتیب وار التزام میر ضمیر کے وقت سے شروع ہوا۔ لیکن ان میں سے بعض چیزیں مرثیہ گوئی کے بالکل ابتدائی دور میں بھی موجود تھیں۔ مثلاً ہاشم علی کے ایک مرثیے کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے ؎

اس دُکھ سوں آج بلبل نالاں ہا چمن میں ۔۔۔ یہ موسم خزاں ہے گلہا بنی کے سُوکھے

اس شعر کے بعد پھر حضرت امام حسینؑ کی شہادت کے غم کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

یا امامی اپنے ایک مرثیے کو اس طرح شروع کرتا ہے ؎

مظلوم کربلا میں ہیں عالی جناب آج ۔۔۔ کیا ظالماں نے ظلم کیا بے حساب آج

اسی قسم کی اور مثالیں ہیں جن سے اگر چہرہ کا صحیح مقصد نہیں ادا ہوتا تو کم از کم یہ ضرور یقین ہو جاتا ہے کہ قدیم شاعروں نے بھی اصل واقعہ کے بیان کرنے سے پہلے ایک آدھ شعر یا مصرعہ بطور تمہید کے کہا اور وہ مصرعہ یا شعر سودا کے عہد میں آکر ایک یا دو بند تک ترقی کر گیا۔ میر ضمیر نے اپنے عہد میں اس کی شکل ایسی بدلی کہ اب پہچاننا بھی مشکل ہے۔

ہاشم علی برہان پوری نے جو مرثیہ حضرت قاسمؑ کے حال میں لکھا ہے۔ اُس کے درمیان کا ایک بند یہ ہے ؎

جلوہ سے اُٹھ کے رن کوں چلاتب کہی دُلھن　　　دامن پکڑ کے لاج سوں۔ انجھواں بھرے نین

مت چھوڑ کر سدھارو تم اس حال میں ہمن　　　تم بن رہے گا ہائے یہ سونا بھون میرا

اس بند اور اس کے بعد والے بندوں سے رخصت کا وہ مفہوم جس نے میرضمیر کے عہد میں ایک مستقل صورت اختیار کرلی کس قدر نمایاں طور پر ظاہر ہوتا ہے۔

مرثیوں کا سب سے اہم اور پر اثر حصہ بین ہیں۔ اُن کی ابتدا بھی اس دور میں اچھی طرح ہو چکی تھی اور اکثر شاعروں نے حضرت شہر بانو کے بین اپنے مرثیوں میں نظم کئے ہیں۔

ان خصوصیات کے علاوہ مرثیوں کی سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ وہ مسلسل ہوں۔ جہاں مرثیے کے مختلف جزو اپنی اپنی جگہ پر اہم ہیں وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ اُن میں باہم ربط ہو۔ ایک کی کڑی دوسرے سے اس طرح ملی ہوئی ہو کہ باوجود الگ الگ ہونے کے بھی بیان مربوط اور مسلسل ہو ورنہ واقعے کی لطافت اور شیرینی بالکل غائب ہو جائے گی۔ ابتدائی دور کے گروہ ثانی کے مرثیہ گویوں نے خاص طور پر ہر جگہ اس کا لحاظ رکھا ہے۔

ان مرثیوں کی زبان نے عہد بہ عہد جو ترقی کی وہ مرثیوں کے لئے مخصوص نہیں۔ زبان بلا کسی روک ٹوک کے برابر ترقی کی طرف گامزن رہتی ہے۔ یہی حال ان مرثیوں کی زبان کا بھی ہے۔ گروہ اوّل کے مرثیوں کی زبان نے دوسرے گروہ کے مرثیوں تک بہت کافی ترقی کرلی۔ البتہ لب ولہجہ اور تلفظ کے فرق کی وجہ سے افعال اور اسموں کی ترکیبیں ایسی ہیں جو شمال میں کسی قدر غیر مانوس معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن یہ فرق بھی ولی کے زمانے کے تھوڑے ہی دنوں بعد بالکل مٹ گیا اور دکنی اور شمالی الفاظ کی ساخت میں یکسانیت پیدا ہو گئی۔

اب تک جتنی باتیں بیان کی گئیں اُن سے کم از کم یہ اندازہ ہو جانا چاہیئے کہ اُردو مرثیہ نگاری نے اپنے ابتدائی دور میں کس طرح ایک منزل سے دوسری میں قدم رکھا۔ پہلی منزل میں نہ اثر ہے نہ درد۔ نہ تسلسل ہے۔ نہ روانی۔ نہ جذبات و احساسات ہیں نہ شاعرانہ تصرفات۔ نہ کردار نگاری کے نمونے ہیں نہ واقعہ نگاری کے مرقعے۔ ساتھ ہی ساتھ زبان میں پختگی اور سلاست نہیں۔ کلام ترنم اور نغمے سے بالکل بے نیاز ہے۔ برخلاف اس کے دوسری منزل میں ان میں سے کوئی چیز ایسی نہیں جو نہ ہو۔ اس میں وہ باتیں بھی موجود ہیں جو اُس زمانے کے لئے مخصوص تھیں۔ اُس میں اُن چیزوں کی جھلک بھی موجود ہے جو اگلے دوروں میں چل کر ماہِ درخشاں بنیں لیکن ساتھ ہی ساتھ کچھ باتیں ایسی بھی ہیں جو مجموعی حیثیت سے پہلی منزل میں بھی موجود ہیں اور دوسری منزل میں بھی۔ بلکہ بعض اوقات تو پہلی منزل کو دوسری پر تفوّق حاصل ہے۔

جہاں ایک طرف ہم نے کلام کے مختلف نمونوں سے یہ دیکھا کہ دوسری منزل کے شعرا نے شاعرانہ جدّتوں سے کام لیا وہاں یہ بھی

جاننا ضروری ہے کہ بالکل ابتدائی شعرا ان چیزوں سے بالکل ہی بے بہرہ نہیں۔ اُن کے کلام میں ویسے ہی لطیف تشبیہ واستعارے موجود ہیں جیسے متاخرین کے یہاں۔ فرق صرف یہ ہے کہ وقت نے اُن سے سب کچھ چھین لیا اور ہمیں سب کچھ دے دیا۔ اس لئے اُن کی لطافتیں بھی اب بُری لگتی ہیں۔ صرف ایک شعر لکھتا ہوں :-

بحری مدام شاہ کے ماتم میں یوں گلے ـــ جوں چاند آسمان پہ گُل گُل کے کم ہُوا

قدیم شعراء کی ایک خصوصیت جو آگے چل کر بالکل مفقود ہوگئی یہ ہے کہ انہوں نے مرثیوں میں مبالغوں سے پرہیز کیا ہے اور اگر کبھی ایسا کیا بھی تو حُسن التعلیل سے مبالغہ کو بھی لطیف بنا دیا لیکن زمانے نے ترقی کی تو وہ سادگیاں بھی رنگینیوں سے بدل گئیں۔ اُن کے محاسن ہمارے لئے معائب بن گئے اور اپنے معائب ہمیں حُسن نظر آنے لگے لیکن اس میں آدمی کا کیا قصور ہے۔ زمانے کی آنکھیں ہمیشہ نئے نشے میں چور رہنے کی عادی ہیں۔ ممکن ہے کہ آج کا نشہ کل کا خمار بن جائے :

سید وقار عظیم بی اے

رُوحِ مسرّت

شیلے کے گیت "روحِ مسرت" (Spirit of Delight) کا آخری بند مجھے بہت بھلا معلوم ہُوا اس کا ترجمہ حاضرِ خدمت ہے :-

محبت سے محبت ہے مجھے گو اس سے واقف ہوں
کہ اس کے پر ہیں اور یہ برق سے بھی تیز اڑتی ہے
پر اے روحِ مسرت! سب سے بڑھ کر تجھ سے اُلفت ہے
کہ تو جانِ محبت اور حیاتِ جاوداں بھی ہے،
مرا ویرانۂ دل آ کے پھر آباد فرما دے!
ہمیشہ کے لئے اِک غمزدہ کو شاد فرما دے!

I love Love, though he has wings,
And like light can flee,
But above all things,
Spirit, I love thee -
Thou art love and life, O Come,
Make once more my heart thy home.

دوست محمد خاں

دُو رنگ

اُن کی جانب پہلے یونہی دیکھتا رہتا تھا میں
بات گو کوئی نہیں تھی دیکھتا رہتا تھا میں

دیکھتے رہنے سے میرے وہ بہت مسرور تھے
اپنے حُسنِ دلبری سے آپ ہی مسحور تھے

اُن کو خوش کرنے کی خاطر آہ بھر لیتا تھا میں
گاہے گاہے اپنے دل پر ہاتھ دھر لیتا تھا میں،

وہ سمجھتے تھے کہ اُن کے حُسن پر مرتا ہوں میں
اُن سے کرتا ہوں محبّت اُن کا دم بھرتا ہوں میں

گھر میں اُن کو چین آتا تھا نہ میرے دھیان میں
بس بہے جاتے تھے وہ جذبات کے طوفان میں

باغ میں ہر روز مجھ کو دیکھنے آتے تھے وہ
بن سنور کر مجھ سے دادِ حُسن لے جاتے تھے وہ

مدعا اس کھیل کا کیا تھا فقط اک دل لگی
اُن کو خوش کرنے میں پنہاں تھی مری اپنی خوشی

کر کے خوش فہمی میں اُن کو مبتلا ہنستا تھا میں
سادگی پر اُن کی دل میں بارہا ہنستا تھا میں

آہ لیکن ہم نشیں اب دل کی حالت اور ہے
دل کی حالت اور ہی، رنگِ طبیعت اور ہے

جب نظر آتی نہیں گلزار میں اُن کی جھلک
ٹھوکریں کھاتی ہیں سودائی نگاہیں دُور تک

باغ میں آتا تھا پہلے سیر کو میں اب مگر
کھینچ لاتی ہے کشش ان کی یہاں شام و سحر

اُن کو دیوانہ بنا کر مجھ کو وحشت ہو گئی
دل لگی کی تھی، مگر سچ مچ محبّت ہو گئی

عدمؔ

بُلبُل اور گلاب

نوخیز طالب علم چلّایا "وہ کہتی ہے میں تبھی رقص میں تمہاری شریک بنوں گی جو تم مجھے گلاب کے سرخ پھول لادو گے لیکن میرے باغ میں ایک بھی سرخ پھول نہیں"!

بلبل شاہ بلوط کے درخت پر اپنے گھونسلے میں بیٹھی تھی طالب علم کی آواز سُن کر اس نے درخت کے پتوں میں سے جھانکا اور حیران ہوئی۔ اس کی خوبصورت آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے وہ پھر کہنے لگا: تمام باغ میں گلاب کا کوئی سرخ پھول نہیں! . . . مسرت کے لئے بھی کیسی کیسی فضول باتیں کرنی پڑتی ہیں - دنیا بھر کے داناؤں اور اک جہان کے عالم جو کچھ لکھ گئے ہیں وہ سب تو میں نے پڑھ ڈالا ہے اور فلسفہ کے سربستہ راز بھی میرے سامنے کھلے پڑے ہیں لیکن آہ گلاب کے ایک پھول نے میری جان عذاب میں ڈال دی ہے۔

بلبل کہنے لگی "بس! یہ تو عاشقِ صادق ہے۔ آخر آج میری آنکھوں نے اسے دیکھ ہی لیا میں ہر رات اپنے گیتوں میں اس کی تعریف کرتی تھی اگرچہ اس سے ناآشنا تھی' اور ہر رات اس کی کہانی ستاروں کو سناتی تھی اور آج! آج وہ میرے سامنے موجود ہے!! ——— اس کے بال سنبل کی طرح سیاہ ہیں اور اس کے ہونٹ پھول کی طرح سُرخ ——— اُسی پھول کی طرح جو اُسے درکار ہے ——— لیکن چہرہ زرد ہو رہا ہے نہ جانے اس کے دل میں کیا کیا آرزوئیں ہیں' اور غم واندوہ نے تو بس اُس پر غلبہ ہی پالیا ہے۔

طالب علم بڑبڑا کر کہنے لگا "کل رات شہزادے کے ہاں محفلِ رقص ہے' اور میری شیریں ادا بھی وہاں جائے گی۔ اگر میں اُسے گلاب کا سرخ پھول لادوں تو رقص میں وہ میری شریک بنے گی اور ہم دونوں نور کے تڑکے تک مصروف رقص رہیں گے۔ اُف . . . . اگر میں اُس کے لئے سرخ پھول لے جاؤں تو میں اس کی کمر کے گرد اپنے بازو بھی حمائل کرسکوں گا اس کا سر میرے کندھے پر آ جھکے گا اور میرا ہاتھ اُس کے ہاتھ سے بس لپٹ ہی جائیگا لیکن میرے باغ میں تو گلاب کا سرخ پھول ہے ہی نہیں میں تنہا ایک طرف بیٹھ جاؤں گا۔ وہ آئے گی اور میری طرف دیکھے بغیر ہی قریب سے گزر جائے گی اور میرا دل ٹوٹ کر رہ جائیگا۔

بلبل کہنے لگی "یقیناً یہی ہے سچا عاشق میں جس درد کے گیت گاتی ہوں وہ اس میں مبتلا ہے: جو میری خوشی ہے وہی اس کے لئے رنج ہے محبت یقیناً ایک عجوبہ شے ہے زمرد سے بھی زیادہ مہنگی اور ننھے ننھے سفید پتھروں سے بھی زیادہ پیاری۔ یہ انار اور موتیوں کے بدلے بھی نہیں مل سکتی۔ یہ جنسِ گراں بکتی کب ہے؟ وہ کون سوداگر ہے جس کے پاس یہ بھی ہو؟ کون اسے خرید سکتا ہے۔ چاہے اس کے

ساتھ سونا بھی تول کر دینے کے لئے تیار ہو۔"

نوخیز طالب علم کہنے لگا " سازندے اپنی مخصوص نشست پر بیٹھ جائیں گے اور اُن کے تار دار ساز بجنے لگیں گے اور چنگ و رباب کے نغموں کی آواز پر میری شیریں ادا کا رقص شروع ہوگا۔ اس کے رقص میں اس قدر شوخی اور نزاکت ہوگی کہ اس کے ننھے ننھے پاؤں فرش کو بھی چھوتے نظر نہ آئیں گے۔ تمام درباری زرق برق لباسوں میں حیرانی سے اس کے گرد آ جمع ہوں گے لیکن وہ میری شریک تو نہیں ہوگی! میرے پاس تو گلاب کا سرخ پھول ہے ہی نہیں کہ اُسے نذر دوں"۔

طالب علم نے اپنے آپ کو گھاس پر گرا لیا اور اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر زار و قطار رونے لگا۔

پاس ہی سے سبز رنگ کا ایک گرگٹ اپنی دُم ہوا میں اٹھائے ہوئے دوڑ کر گزرا اور کہہ گیا " یہ کیوں رو رہا ہے!؟"

اور ایک تیتری بھی جو سورج کی ایک سنہری کرن کا پیچھا کرتے ہوئے ادھر اُدھر اپنے پر پھڑپھڑاتی پھرتی تھی کہنے لگی " ہیں! سچ مچ!! میں کبھی نہیں مان سکتی! کیوں!!"

اور ایک ننھا سا پھول بھی ساتھ کے پھول سے اپنے نرم و نازک لہجے میں کہنے لگا " ہیں! سچ مچ کیوں!!"

بلبل کہنے لگی " وہ گلاب کے ایک سرخ پھول کے لئے رو رہا ہے"۔

سب چلا اُٹھے " صرف گلاب کے سرخ پھول کے لئے؟ کتنی مضحکہ خیز بات ہے!" ... اور منہ پھٹ گرگٹ نے تو بلا توقف ایک قہقہہ بھی لگا دیا۔

لیکن طالب علم کے رنج و غم کا راز تو کچھ بلبل ہی جانتی تھی جو شاہ بلوط کے درخت پر خاموش بیٹھی عشق کے معمے پر غور کر رہی تھی۔

یکایک اڑنے کے لئے اس نے اپنے خاکستری پر پھیلائے اور درختوں کے اوپر ہوا میں چلی گئی پھر درختوں کے جھنڈ میں ایک سائے کی طرح گزری اور پھر سائے کی طرح ہی آہستہ آہستہ باغ کے پار چلی گئی۔

گھاس کے ایک تختے کے بیچ میں گلاب کے پھولوں کا ایک خوبصورت پودا تھا اُسے دیکھ کر بلبل نیچے اُتر آئی اور اس کی ایک شاخ پر آن بیٹھی۔

پھر چلا کر اُس سے کہنے لگی " گلاب! گلاب!! تو مجھے اپنا ایک سرخ پھول دے۔ میں تجھے اپنا سب سے شیریں گیت سناؤں گی"۔

لیکن جواب میں گلاب کے پودے نے اپنا سر ہلا دیا۔ کہنے لگا " میرے پھول تو سفید ہیں۔ بہت سفید۔ پہاڑ کی برف سے بھی زیادہ سفید اتنے سفید جتنا سمندر کا جھاگ ہے تم میرے بھائی کے پاس چلی جاؤ — وہ! جو پرانی دھوپ گھڑی کے پاس اُگا ہے — شاید جو کچھ تم مانگ رہی ہو تمہیں وہاں سے مل جائے۔

بلبل اڑ کر اب اُس پودے کے پاس آئی جو پرانی دھوپ گھڑی کے گرد اُگا تھا اور کہنے لگی " گلاب! گلاب!! تو مجھے اپنا ایک سرخ

پھول دے۔ میں تجھے اپنا سب سے شیریں گیت سناؤں گی"۔

جواب میں گلاب کے پودے نے اپنا سر ہلا دیا کہنے لگا "میرے پھول تو زرد ہیں۔ بہت زرد۔ نرگس کے زرد رو پھولوں سے بھی زیادہ زرد جو وادی میں انتہائی خوف کی حالت میں گلچیں کا انتظار کر رہے ہوں ـــــــ کہربا کے تخت پر بیٹھنے والی بنت البحر کے بالوں کے سے زرد ـــــــ ہاں تم میرے بھائی کے پاس چلی جاؤ۔ وہ طالب علم کی کھڑکی کے نیچے اگا ہے شاید جو کچھ تم مانگ رہی ہو تمہیں وہیں سے مل جائے۔

بلبل اڑ کر اس پودے کے قریب آئی جو طالب علم کی کھڑکی کے نیچے اگا تھا۔

بلبل نے پھر کہا "گلاب! گلاب! تو مجھے اپنا ایک سرخ پھول دے میں تجھے اپنا سب سے شیریں گیت سناؤں گی"۔

لیکن جواب میں پودے نے سر ہلایا۔ کہنے لگا "میرے پھول سرخ ہیں۔ بہت سرخ۔ مونگے کے بڑے بڑے ٹکڑوں سے بھی زیادہ سرخ جو سمندر کے حجروں میں ہلتے جلتے نظر آتے ہیں ـــ اتنے سرخ جتنے فاختہ کے پاؤں ـــ لیکن جاڑے کا جاڑا میری رگوں سے چمٹ گیا ہے۔ پالے نے میری کلیاں نوچ لی ہیں اور طوفان نے میری ٹہنیاں توڑ ڈالی ہیں اس سال تو مجھ میں پھول بالکل آئینگے ہی نہیں"۔

بلبل چلا کر کہنے لگی "میں صرف ایک ہی پھول مانگتی ہوں! صرف ایک ہی! کیا مجھے یہ کسی طرح حاصل ہو سکے گا؟"

پودے نے جواب دیا "ایک طریقہ ہے لیکن بہت ہی ڈراؤنا میں تمہیں وہ کیسے بتاؤں!"

بلبل کہنے لگی "بتا دو۔ بتا دو۔ میں ڈروں گی نہیں"۔

پودے نے جواب دیا "اگر تمہیں سرخ پھول ضرور ہی چاہیئے تو پھر تمہیں چاندنی رات میں اپنا راگ الاپ الاپ کر اس کی تخلیق کرنی ہو گی اور اپنے دل کے خون سے اسے سینچنا ہوگا۔ تمہیں ایک کانٹے کے ساتھ اپنا سینہ جوڑ کر مجھے رات بھر اپنے گیت سنانے پڑیں گے۔ یہاں تک کہ کانٹا تمہارے سینے سے ہوتا ہوا آخر تمہارے دل میں پیر جائے، اور تمہارا سب خون میری رگوں میں پہنچ کر میرا بن جائے"۔

بلبل چلا کر کہنے لگی "اپنی جان کے بدلے ایک پھول خرید لوں؟ یہ قیمت بہت زیادہ ہے اور جان تو ہر کسی کو بہت ہی عزیز ہوتی ہے۔ ہرے بھرے جنگل میں بیٹھ کر سورج کو اپنے سونے کے رتھ میں اور چاند کو موتی کے رتھ میں بیٹھ کر جاتے ہوئے دیکھنا کتنا روح افزا نظارہ ہے اور دور سے جھاڑیوں کی جو بھینی بھینی خوشبو آتی ہے کتنی فرحت بخش ہے۔ وہ گھنٹیوں کی شکل کے ننھے ننھے نیلے نیلے پھول جو وادی میں چھپ چھپ کر اگے ہیں کتنے خوبصورت ہیں اور بیڑھ کا درخت جو پہاڑی پر بہار دکھا رہا ہے کس قدر سرسبز و شاداب ہے لیکن نہیں! عشق کا رتبہ زندگی سے بہت بلند ہے اور پھر ایک پرندے کے حقیر دل کو انسان کے دل سے بھلا نسبت ہی کیا ہے؟"

پس بلبل نے اڑنے کے لئے اپنے خاکستری پر پھیلائے اور ہوا میں جا پہنچی اور باغ پر سے ایک سائے کی طرح اڑتی ہوئی آئی اور ایک سائے کی طرح ہی وہ درختوں کے جھنڈ میں سے گزرتی گئی۔

نوخیز طالب علم اب بھی گھاس پر گرا تھا بالکل اُسی جگہ جہاں وہ اسے چھوڑ گئی تھی اور ابھی اس کی خوبصورت آنکھوں سے آنسو بھی خشک نہ ہوئے تھے۔

بلبل چلّا کر کہنے لگی "اب تم خوش ہو جاؤ! اب خوش ہو جاؤ! تمہیں سرخ پھول مل جائیگا!!! میں چاندنی میں اپنا راگ الاپ الاپ کر اس کی تخلیق کروں گی اور اسے اپنے دل کے خون سے سینچوں گی۔ لیکن اس کے بدلے میں تم سے ایک درخواست کرتی ہوں وہ یہ کہ تم اپنی محبت میں ثابت قدم رہنا۔ یاد رکھو کہ محبت وہ کچھ دیکھ لیتی ہے جو فلسفہ نہیں دیکھ سکتا۔ خود محبت ہی عقل ہے اور محبت ہی طاقت۔ بڑی سے بڑی زبردست طاقت سے بھی زیادہ زبردست طاقت۔ اس کے پروں میں آگ کے شعلے لپٹے ہیں اور اس کے جسم میں آگ کے شعلوں کی رنگت نظر آتی ہے۔ اس کے ہونٹ شہد کی طرح شیریں ہیں اور اس کی سانس لوبان کی طرح خوشبودار"۔

طالب علم نے گھاس پر سے اپنی نظر اوپر اُٹھائی اور سننے لگا لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ بلبل کیا کہہ رہی ہے کیونکہ وہ تو وہی کچھ جانتا تھا جو اس کی کتابوں میں لکھا تھا۔

لیکن شاہ بلوط کا درخت سب کچھ سمجھ کر غمگین ہو گیا۔ اُسے بُلبُل بہت ہی عزیز تھی۔ مدت سے اس نے اس کی شاخوں میں گھونسلا بنا رکھا تھا۔

درخت نے آہستہ سے کہا "بلبل! اچھی بلبل!! مجھے اپنا آخری گیت سناتی جا جب تو چلی جائیگی تو میں تنہا رہ جاؤں گا"۔

پس بلبل نے درخت کو اپنا گیت سنایا اور اس کی آواز کچھ اس طرح سنائی دی جیسے کسی چاندی کے برتن میں سے پانی انڈیلتے وقت بلبلوں کی آواز نکلتی ہے۔

جب اس کا گیت ختم ہوا تو طالب علم اٹھ کھڑا ہوا اور اُس نے اپنی جیب سے ایک نوٹ بک اور ایک پنسل نکال لی۔

اور جب وہ درختوں کے جھنڈ میں سے گزر رہا تھا تو کہنے لگا "بس اس کے پاس طرز ہی طرز ہے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن سوال یہ ہے کہ آیا اس میں احساسات بھی ہیں؟ میرا خیال ہے نہیں! درحقیقت یہ بھی اکثر صناعوں ہی کی طرح ہے اس کے دل میں ہمدردی تو ہے ہی نہیں بس طرز ہے ہمہ تن طرز۔ بھلا یہ دوسروں کی خاطر کیسے اپنا آپ قربان کر سکتی ہے۔ اس کے دل میں سوا موسیقی کے کچھ اور آہی کہاں سکتا ہے۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ فنونِ لطیفہ میں خود غرضی کو کتنا دخل ہے۔ تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ اس کی آواز میں چند دلکش سُر ضرور ہیں لیکن افسوس کہ ان کا مطلب کچھ نہیں ہوتا۔ سب بے معنی ہیں اور ان کا کوئی عملی فائدہ نہیں!"

. . . . اس کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلا گیا اور اپنے چھوٹے سے بچھونے پر لیٹ کر اپنی محبوبہ کے خیالات میں کھو گیا تھوڑی دیر بعد اس پر نیند نے غلبہ پا لیا۔

اور جب چاند آسمانوں پر چمکنے لگا تو بلبل اڑکر گلاب کے پودے پر ایک کانٹے سے اپنا سینہ لگا کر بیٹھ گئی اور اسی طرح رات بھر گاتی رہی اور بلّوریں چاند سرداو ڈھنی لئے جھک کر سنتا رہا۔ تمام رات وہ گاتی رہی اور کانٹا اس کے سینے میں آگے ہی آگے اترتا گیا اور خون جو اس کی زندگی برقرار رکھنے کے لئے ضروری تھا اترتی ہوئی لہر کی طرح گھٹتا گیا۔

اس کا سب سے پہلا گیت ایک نوجوان اور ایک دوشیزہ کے دل میں محبت کی پیدائش کے متعلق تھا...... اور گلاب کے پودے کی سب سے اونچی اور گھنی شاخ میں ایک نرالی شان کا پھول کھل آیا ایک گیت ختم ہونے پر جب دوسرا گیت شروع ہوتا تو پھول کی ایک اور سنکھڑی بن جاتی اور اسی طرح ایک کے بعد ایک سنکھڑی آتی گئی۔ اور پھول بن گیا۔ پہلے تو پھول کا رنگ کچھ پھیکا تھا صبح کے پردل کی طرح اور اس کہر کے مانند جو دریا پر ہوا میں ٹنگی ہوتی ہے یا اجالے کے پرّوں کی طرح روپہلی۔ یا گلاب کے اس پھول کا عکس جو چاندی کے آئینے میں نظر آرہا ہو یا گلاب کے پھول کے اس عکس کی طرح جو کسی جھیل میں نظر آرہا ہو۔ یہ تھی اس پھول کی شکل جو پودے کی سب سے اونچی شاخوں میں کھل پڑا تھا۔

لیکن درخت اب بھی بلبل سے چلّا کر کہنے لگا "اچھی بلبل اپنا سینہ کانٹے کے ساتھ اور دباتی جاؤ ایسا نہ ہو کہ پھول مکمل ہونے سے پہلے ہی دن نکل آئے۔

پس بلبل نے اپنا سینہ کانٹے پر اور دبایا اور اس کا گیت بلند سے بلند تر ہوتا گیا کیونکہ اب وہ ایک ایسا گیت گا رہی تھی۔ جو ایک نوجوان اور ایک دوشیزہ کی روح میں خواہش کی پیدائش کے متعلق تھا۔

اور پھول کی پتیوں میں یکایک ایک نہایت ہی خوشنما سرخ رنگ آگیا۔ وہی رنگ جو دولھا کے چہرے پر دولھن کے ہونٹوں کا بوسہ لیتے وقت آجاتا ہے لیکن کانٹا ابھی بلبل کے دل تک نہیں پہنچا تھا اس لئے پھول کے دل کا رنگ اب بھی سفید تھا کیونکہ بلبل کے دل کا خون ہی پھول کے دل کو سرخ کر سکتا ہے۔

درخت پھر چلّایا "بلبل! اچھی بلبل!! ابھی اور دباؤ!!! اور کانٹا سینے میں دور تک لے جاؤ ایسا نہ ہو کہ پھول مکمل ہونے سے پہلے ہی دن نکل آئے"۔

پس بلبل نے کانٹے کو اپنے سینے سے اور دبایا یہاں تک کہ کانٹا اس کے دل کو چھو گیا اور اس کا تمام جسم ایک دردناک ٹیس سے کانپ گیا۔ درد لحظہ بلحظہ بڑھتا ہی گیا اور لحظہ بہ لحظہ ہی اس کے گیت میں وحشت بھی بڑھنے لگی کیونکہ اب وہ محبت کا گیت گا رہی تھی ایسی محبت کا گیت جو قبر میں جا کر مردہ نہیں ہو جاتی۔

اور نرالی شان کا یہ پھول بالکل سرخ ہو گیا مشرقی آسمان کے پھول کی طرح سرخ۔ اب پھول کا حلقہ بھی قرمزی تھا اور پھول کا دل بھی یاقوت کی طرح قرمزی۔

لیکن اب بلبل کی آواز دھیمی پڑنے لگی اور اس کے ننھے ننھے پر ٹرپنے لگے اور اس کی آنکھوں پر ایک پردہ چھا گیا اور گیت بھی دھیما دھیما ہوتا گیا۔ اُسے یوں محسوس ہُوا گویا اس کے گلے میں کوئی چیز پھنس گئی ہے۔ آخر اس کا راگ ایک جگہ ٹوٹ کر رہ گیا۔ زرد رو چاند نے یہ ٹوٹے ہوئے آخری نغمے سُن لئے۔ اُسے پو پھٹنے کے وقت کا بھی کچھ خیال نہ رہا اور دم بخود ہو کر وہیں آہستہ آہستہ پھرتا رہا۔ سرخ پھول نے بھی یہ آواز سن لی اور اس نے فرطِ مسرت سے کانپ کر بادِ صبا کے آگے اپنی پنکھڑیاں کھول دیں اور گونج تو یہ نغمے اُٹھا کر پہاڑیوں کے اندر اپنے ارغوانی کھوہ میں لے گئی اور اسے سوئے ہوئے چرواہوں کے کانوں تک پہنچا کر انہیں خواب سے بیدار کر دیا۔ اور جب یہ آواز دریا کے کنارے نیستاں میں سے تیرتی ہوئی گزری تو نیستاں نے یہ خبر سمندر تک جا پہنچائی۔

گلاب کا پودا چلا کر بلبل سے کہنے لگا "دیکھو! دیکھو! پھول مکمل ہو گیا ہے!!!" لیکن بلبل کیا جواب دیتی وہ تو لمبی لمبی گھاس میں مری پڑی تھی۔ کانٹا ابھی تک اس کے دل میں چبھا تھا۔

اور دوپہر کو طالب علم نے کھڑکی کھول کر باہر دیکھا اور چلا کر کہنے لگا "ہیں! سرخ پھول؟ کمال ہو گیا!! اسے کہتے ہیں خوش قسمتی!!! کیا عجیب پھول ہے۔ میں نے تو زندگی بھر ایسا پھول نہیں دیکھا۔ کتنا خوبصورت ہے۔ لاطینی میں ضرور اس کا کوئی بڑا لمبا سا نام ہوگا۔

پھر اس نے اپنی ٹوپی پہنی اور اپنے ہاتھ میں پھول لے کر پروفیسر کے مکان کی طرف دوڑا۔

پروفیسر کی لڑکی دروازے کے راستہ میں بیٹھی ریل پر نیلے رنگ کا ایک ریشمی دھاگا لپیٹ رہی تھی اور اس کا چھوٹا سا کتا اس کے قدموں میں بیٹھا تھا۔

طالب علم چلا کر اُس سے کہنے لگا "تم نے کہا تھا نا کہ اگر تم مجھے گلاب کا سرخ پھول لا دو گے تو میں رقص میں تمہاری شریک بنوں گی۔ تو یہ دنیا کا سرخ ترین پھول ہے۔ تم آج رات اسے اپنے دل کے بالمقابل پہننا اور رقص کے وقت تمہیں معلوم ہو جائیگا کہ مجھے تم سے کتنی محبت ہے۔

لڑکی نے اسے دیکھ کر تیوری چڑھائی۔

پھر کہنے لگی "میں تو اسے نہیں پہنوں گی علاوہ اس کے چیمبرلین کے بھتیجے نے مجھے کچھ اصلی جواہر بھیجے ہیں اور ہر ایک کو معلوم ہے کہ جواہر پھولوں سے بہت زیادہ قیمتی ہوتے ہیں۔

طالب علم خشمگیں ہو کر کہنے لگا "میری پوچھتی ہو تو تم سا ناشکرا بھی کوئی نہ ہوگا"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کے بعد نوجوان نے دنیا کا یہ سرخ ترین پھول گلی میں پھینک دیا جو ایک نالی میں جا گرا اور چھکڑے کا ایک پہیہ اس پر سے گزر گیا۔

لڑکی کہنے لگی "میں ناشکری! ؟ میں تمہیں بتا دیتی ہوں کہ تم نے میری سخت گستاخی کی ہے۔ قصہ مختصر آخر تم ہو کون!!؟ صرف ایک طالب علم ۔ ۔ ۔ ۔ میں نہیں جانتی کہ چیمبرلین کے بھتیجے کی طرح تمہارے بوٹ میں بھی چاندی کے بکسوئے لگے ہوں"۔ ۔ ۔ ۔ یہ کہہ کر

وہ کرسی سے اٹھی اور اندر چلی گئی۔

طالب علم وہاں سے یہ کہہ کر چل دیا کہ "محبت کرنا بھی کتنی حماقت ہے۔ یہ کیسی فضول چیز ہے۔ منطق اس سے بدرجہا زیادہ کام کی چیز ہے اس سے نہ تو کچھ ثابت ہوتا ہے اور یہ ہمیشہ باتوں میں سے کسی ایسی بات کے متعلق ہوتی ہے جو ہو ہی نہیں سکتی اور ہمیں ہمیشہ جھوٹی باتوں کا یقین دلانے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔ درحقیقت یہ ایک نہایت ہی غیر عملی چیز ہے اور چونکہ اس زمانے میں باعمل ہونا ہی سب کچھ ہے اس لئے میرے لئے زیادہ بہتر یہی ہے کہ فلسفہ پڑھوں۔ جاکر علم النفس کا مطالعہ کرتا ہوں۔

پس وہ اپنے کمرے میں واپس چلا گیا اور ایک بڑی سی غبار آلود کتاب نکال کر پڑھنے لگا۔

(آسکر وائیلڈ)

مہدی علی خاں کرم آباد

مشاہیرِ مغرب کی مائیں

"مائیں، آئندہ نسلوں کی، روحوں کی مجسمہ ساز ہیں۔"

نیرو کی ماں ایک قاتلہ تھی، نیرو بھی ایک مشہور قاتل گزرا ہے۔

لارڈ بائرن کی ماں، نخوت پسند، بددماغ اور ترش رو تھی، بائرن بھی، بددماغ اور سخت مزاج تھا۔ واشنگٹن کی ماں، شریف اور نیک سیرت تھی، واشنگٹن بھی شریف اور فرشتہ خصلت تھا۔

سر والٹر اسکاٹ کی ماں، مصوری اور شاعری کی دلدادہ تھی اور آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ سر والٹر کیا تھا؟

کارلائل کی ماں، درشت مزاج اور باوقار عورت تھی، کارلائل بھی انہیں صفات کا حامل تھا۔

نپولین بوناپارٹ کی ماں ایک ایسی عورت تھی جو اپنی دماغی قابلیت، غیر معمولی کاوش اور حسن میں یکتائے روزگار تھی۔ اور بوناپارٹ؟

لارڈ بیکن، اپنے زمانہ کے سب سے زیادہ عقلمند اور قابل شخص کی ماں، اپنی علمی قابلیت اور اپنے قابلِ قدر تحقیقی علوم میں ممتاز شخصیت کی مالک تھی، اور لارڈ بیکن؟

پیٹرک ہنری کی ماں، جو انقلابِ عظیم کے زمانے کا سب سے بہتر اور زبردست مقرر مانا جاتا ہے، ملک بھر میں اپنی غیر معمولی قوتِ تقریر اور طرزِ تکلم کے لئے مشہور تھی۔

مرتبہ محشر عابدی

Very vivid description of the mysteries of love.

غزل

اس طرح جو تم پاس سے شرما کے گئے ہو
میری نگہِ شوق سے کچھ پا کے گئے ہو

مدت ہوئی، جلووں سے ہیں محروم نگاہیں
شاید مجھے ملنے کی قسم کھا کے گئے ہو

کام آئی میری سادگیٔ عشق تمہارے
موہوم تمناؤں میں الجھا کے گئے ہو

تم خاک نکالو گے مری حسرتِ دل کو
جب آئے ہوئے جاں بھی تڑپا کے گئے ہو

پوچھے مرے دل سے کوئی اب لطفِ تکلّم
ان ہونٹوں سے تم پھول جو برسا کے گئے ہو

حاصل تھا محبّت کا مری، جو دمِ رخصت
تم لطف کے پردے میں ستم ڈھا کے گئے ہو

کیا رشک کے قابل ہے مرا حسنِ تصوّر
گویا میرے پہلو سے ابھی آ کے گئے ہو

اُس رمزِ محبّت کو سمجھتا ہے یہی دل،
تم آنکھوں ہی آنکھوں میں جو سمجھا کے گئے ہو

طوفاں بپا دل میں ہے اک وہم و گماں کا
کچھ زیرِ لب اس طرح سے فرما کے گئے ہو

بے صرفہ کئے جاتے ہو اغیار پہ کیوں ختم
جن تیروں سے دل کو مرے برما کے گئے ہو

کس کو نہیں معلوم حفیظ اس کی حقیقت
اُس بزم میں تم ساتھ جو اعدا کے گئے ہو

حفیظ ہوشیارپوری

دہلی کے سلاطینِ تیموریہ برلاس یعنی فارسی الاصل تھے

"ہمایوں" (نومبر ۱۹۳۳ء) میں ملک نذیر احمد ریاض نے ایک مقالہ سپردِ قلم کیا ہے جس میں یہ بات بتائی ہے۔ کہ تیموری خاندان کے سلاطین برلاس تھے۔ مگر ساتھ ہی ان کو مغل بھی کہا ہے۔ جو قیاس مع الفارق ہے۔ کیونکہ برلاس مغل نہیں ہوسکتے اور جو مغل ہے وہ برلاس کہلانے کا مستحق نہیں۔ میرے خیال میں یہ مرکب نام تیموریوں کو دے کر ریاض صاحب اسی فاش غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں جس میں بقول ان کے عام مشرقی مورخین مبتلا رہے ہیں۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں۔ آج نہیں بلکہ برسوں پہلے سے مانتا آیا ہوں کہ تیموری سلاطینِ دہلی اور حاجی برلاس کی اولاد برلاس ہیں۔ مگر برلاس مان کر پھر انہیں انہی مغلوں حبشی مغلوں میں شامل کر دینا تاریخی حقائق کا خون کرنا ہے جیسا کہ آگے چل کر انشاء اللہ ثابت کیا جائیگا۔

ریاض صاحب اپنے مقالہ کے شروع میں مشرقی مورخین پر نکتہ چینی کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:-

"اصل بات یہ ہے۔ کہ مورخین اپنی ذمہ داری محسوس نہیں کرتے۔ حالانکہ مورخ کے قلم کی ایک معمولی سی لغزش کی بدولت نسلوں اور خاندانوں میں ایک ایسی گمراہی پھیل جاتی ہے جس کی تلافی قرن ہا قرن میں بھی مشکل سے ہوتی ہے۔ میری نظر سے بیسیوں تاریخی کتابیں ایسی گزریں جن میں چنگیز خاں کی نسل سے اس خاندان (یعنی تیموریہ خاندان) کا صلبی تعلق بتایا گیا ہے لیکن یہ بالکل غلط ہے۔ چونکہ ہمارے مشرقی مورخین تاریخ نویسی کے فن سے ناواقف ہیں اس بنا پر اس قسم کی غلطیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔"

جو کچھ اوپر فرمایا گیا۔ وہ بالکل درست اور قطعی طور پر بجا ہے۔ اسی اصل کو ہاتھ میں لے کر میں یہ دکھانا چاہتا ہوں۔ کہ مورخین نے برلاسوں کو مغل کہہ کر بڑا ظلم کیا ہے جس طرح بقول ریاض صاحب انہوں نے تیموریوں کے ایک بزرگ قراچار اور اس کی اولاد کو چغتائی بنا دیا۔ اسی طرح انہوں نے برلاسوں کے مورثِ اعلیٰ ایردمجی برلاس کو قاچولی بہادر کا بیٹا لکھ کر آنے والی نسلوں کو جن میں ہم بھی شامل ہیں سخت مغالطے اور حیرانی میں ڈالا۔

ریاض صاحب فرماتے ہیں کہ "چنگیز خاں نے مصلحتاً یہ مجازی رشتہ (یعنی باپ بیٹے کا) قراچار و چغتائی کے درمیان قائم کیا لیکن مورخین نے اس سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور خاندانِ تیموریہ کو چغتائی لکھنے لگے۔ حالانکہ وہ برلاس ہیں اور ان کو قطعاً ان سے نسبتِ قرابت نہیں۔"

یہی رائے ذرا سے تغیر کے ساتھ ایردمجی اور قاچولی بہادر کے حق میں بھی قائم کی جاسکتی ہے۔ کہنے والا کہہ سکتا ہے۔ کہ "برتان بہادر نے مصلحتاً یہ مجازی رشتہ (باپ بیٹے کا) قاچولی اور ایردمجی کے درمیان قائم کیا۔ لیکن مورخین نے اس سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور خاندان برلاس کو مغل لکھنے لگے۔ حالانکہ وہ برلاس ہیں۔ اور ان کو قطعاً ان سے نسبت قرابت نہیں" یہ ساری کارستانی دنیادار اور خوشامدی یا

عقل کے اندھے مورخین کی ہے جو شاہی خاندانوں کے خانگی معاملات میں تحقیق سے کام نہیں لیتے۔ اس زمانے میں مغلوں کا ایشیا اور یورپ میں طوطی بول رہا تھا۔ بڑے بڑے بادشاہ لاکھوں کروڑوں روپے خرچ کر کے مغلوں کے شاہی خاندان کی لڑکیاں حبالۂ نکاح میں لانے کے لئے تیار تھے۔ ان کی تلوارِ خون آشام کا لوہا مشرق اور مغرب مان چکے تھے۔ سارے ایشیا اور مشرقی یورپ میں ان کی قہارانہ حکومت اور رعب داب کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ ایسے وقت میں مغل قوم سے منسوب ہونا ہر شخص کی نظر میں باعثِ صد فخر و عزت تھا۔ اس لئے اگر ایرومجی (مورثِ اعلیٰ قوم برلاس) یا قراچار کو مغل بنایا گیا یا قرار دیا گیا ہو تو کچھ بھی تعجب کی بات نہیں۔ تاہم حقیقت چھپ نہیں سکتی۔ خواہ اسے لاکھ پردوں میں چھپایا جائے آخر ایک دن حق حق اور باطل باطل ثابت ہو جاتا ہے اور شے کی حقیقت کھل جاتی ہے۔ ذیل میں چند دلائل لکھتا ہوں جن سے یہ امر روزِ روشن کی طرح ثابت ہو جائیگا کہ برلاس قوم اور ان کا مورثِ اعلیٰ ایرومجی برلاس جسے سب سے اول مغلوں کے ہاں سے برلاس کا لقب ملا اصل میں فارسی یا پارسی تھے۔ انقلابِ زمانہ سے اور مغلوں کی ایران پر لوٹ کھسوٹ کے دوران میں ایرومجی ہجرت کر کے ماوراء النہر میں آنکلا۔ یہاں آکر اقبال نے قدم چومے اور شاہانِ وقت کی نظر کیمیا اثر نے نہ صرف اسے مغلوں کی وزارت کے عہدے پر متمکن کر دیا۔ بلکہ مرورِ زمانہ کے ساتھ وہ خود بھی مغل مشہور ہو گیا ——— میرے دلائل حسبِ ذیل ہیں :-

۱۔ ایرومجی نام کہے دیتا ہے۔ کہ یہ فارسی نام ہے۔ جیسا کہ بہرام جی۔ سہراب جی۔ کاؤس جی وغیرہ وغیرہ جو سب فارسیوں کے نام ہیں

۲۔ ایرومجی پہلا شخص ہے۔ جسے مغلوں نے برلاس کا لقب دیا۔ برلاس کے معنے خود ریاض صاحب کے بیان کے مطابق "عالی نسب اور بہادر شخص" ہیں یہ معنے صاف کہے دیتے ہیں۔ کہ ایرومجی ایک ایسی قوم سے تعلق رکھتا تھا جو مغلوں کی نسبت زیادہ عالی نسب اور بہادر تھی جس شخص کی اولاد ۲۹ لڑکے ہوں اس کی شہزوری اور بہادری میں کیا کلام ہو سکتا ہے اور اوپر ہم ثابت کر آئے ہیں۔ کہ ایرومجی فارسی نام ہے اور فارسی قوم سامی الاصل ہے یعنی حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے ہے جیسا کہ حدیثِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں آیا ہے۔ اہل فارس ھم بنو اسحٰق (اہل فارس اسحٰق کی اولاد ہیں) دیکھو کنز العمال۔

پس سامی الاصل ہونے کی وجہ سے فارسی یقیناً از روئے نسب مغلوں سے افضل ہیں۔

۳۔ اب میں ایک اور زبردست ثبوت برلاسوں کے فارسی الاصل ہونے کا پیش کرتا ہوں۔ وہ لفظ مرزا ہے۔ جو خاندانی لقب کے طور پر تیموریوں کے ناموں کی زینت رہا ہے۔ یہ لفظ مرزا خاص فارسی لفظ ہے مغلی زبان کا لفظ قطعاً نہیں جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ اس زمانے میں فارسیوں کے اندر یہ لفظ بطور لقب کے عام طور پر مروج ہو گیا تھا۔ اور ہمارے زمانے میں بھی مروج ہے۔ اس کے دو معنے ہیں۔ (۱) امیرزادہ یا شہزادہ (۲) فاضل یا ادیب یا منشی۔ پہلے معنی میں جب مستعمل ہو تو عموماً نام کے اخیر میں آتا ہے جیسے جہانگیر مرزا۔ عمر شیخ مرزا۔ پس تیمور کی اولاد نے چونکہ وہ خود فارسی الاصل تھے۔ اپنے وطن کے فیشن کی تقلید میں اس لقب کو اپنے ناموں کا جزو بنایا اور آج تک یہ فیشن بدستور چلا آتا ہے ان کی نقل یا تقلید کے طور پر عام مغلوں نے بھی ہندوستان میں لفظ مرزا کو اپنے ناموں کا جزو بنا لیا۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ یہ نام صرف ایرانی ہے۔

اور ایرانیوں کو یا ان لوگوں کو جو فارسی الاصل ہوں اس کے استعمال کا حق پہنچتا ہے مغلوں نے برلاسوں کے طفیلی بن کر اس مقدس لقب کو حاصل کر لیا ہے۔ ورنہ وہ وراثت میں انہیں نہیں پہنچا۔ کیونکہ ان کے بزرگوں نے کبھی اس نام کو اپنے ناموں کی زینت نہیں بنایا۔ مغلوں کا لقب خاں تھا اور اب بھی بجز ہندوستان کے اور کسی ملک میں کوئی مغل اپنے تئیں مرزا کہلانا پسند نہیں کرتا۔ کیونکہ یہ ان کا قومی اور موروثی لقب نہیں۔ ہندوستان کے لوگ عموماً عجائب پسند ہیں۔ لہٰذا ہندوستانی مغلوں نے فیشن کے طور پر تیموریوں کی تقلید میں اس لقب کو اپنے لئے پسند کر لیا۔

۴۔ چوتھا ثبوت برلاسوں اور تیموریوں کے فارسی الاصل ہونے کا یہ ہے کہ فارسی قوم آرین نسل سے ہونے کی وجہ سے ایک نہایت ذہین و فہیم قوم تھی۔ برخلاف مغلوں کے، جنھوں نے "تہوّر" دلاوری اور جسارت کے کارناموں کے سوا کوئی دماغی قابلیّت یا ذہن و ذکا اپنے بزرگوں سے ورثے میں نہیں پایا۔ نہ ان میں کوئی بڑا ادیب یا شاعر یا انجینیر یا طبیب گزرا ہے۔ غرضکہ یہ لوگ تمدّن کے اعلیٰ اصولوں سے ہمیشہ بے بہرہ رہے ہیں۔ اندریں صورت کیا یہ ظلم نہ ہوگا کہ توزکِ بابری، توزکِ جہانگیری اور رقعاتِ عالمگیری کے مصنفین کو مغلوں کی قوم سے منسوب کریں تیموریوں کے ادبی ذوق، فنونِ لطیفہ سے ان کی دلبستگی اور ان کی دماغی قابلیتوں کی بوقلمونیوں سے تاریخ کے صفحات اب تک مزیّن ہیں کیا اس کی نظیر کسی مغل بادشاہ میں کوئی دکھا سکتا ہے؟ پھر کس منہ سے ہم تیموریوں کو مغل کہہ دیں۔

۵۔ تیموریوں اور عام برلاسوں کے خط و خال بالکل آریوں (پارسیوں اور ہندوؤں) سے مشابہ ہیں اور رنگت بھی وہی ہے۔ یہ بھی ان کے فارسی الاصل ہونے پر ایک زبردست دلیل ہے برخلاف اس کے مغل قوم کے چہروں کو دیکھو تو کیا نظر آتا ہے؟ رخسار کی ہڈی بلند۔ آنکھیں ترچھی جیسے بھیڑیے کی ہوتی ہیں (غالباً اسی وجہ سے مغل قوم کے آباو اجداد سفید بھیڑئے کی پرستش کیا کرتے تھے) اور لمبوتری منہ نیتجہ صاف۔

۶۔ آخر میں میں ایک اور تاریخی شہادت اپنے نظریہ کی تائید میں پیش کرتا ہوں۔ وہ تیموری خاندان کے بانی محمد ظہیر الدین بابر بادشاہ کی شہادت ہے۔ بابر کے متعلق عام تاریخوں میں مذکور ہے۔ کہ وہ مغلوں کو بہت حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اگر وہ خود مغل ہوتا تو کیا یہ بات ممکن تھی کہ ایک قوم کا ایک درخشاں فرد اپنی ہی قوم کو بُرا بھلا کہے؟ ہو۔ مشہور مورخ ارسکن صاحب لکھتے ہیں کہ "قسمت کی بات ہے کہ بابر اور اس کے جانشینوں کی سلطنت مغلیہ سلطنت کہلاتی ہے۔ اگرچہ بابر اس نسل کو اور اس نام کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ تاہم اب بغلط العام نام ہندوستانیوں اور غیر ممالک کے لوگوں میں اس قدر مشہور ہو گیا ہے کہ اس کے بغیر بابر اور اس کے جانشینوں کے حالات سمجھنے اور سمجھانے مشکل ہیں" (بحوالہ جدید تاریخ ہند مصنفہ سید محسن مرزا۔ ایم۔ اے و خان عبدالحمید خاں نیازی ایم۔ اے) علاوہ ازیں یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ تیموری خاندان کے کسی بادشاہ نے کبھی اپنے تئیں مغل یا تاتاری نہیں لکھا۔ اور نہ زبان سے کہا۔

ان دلائل کی موجودگی میں میں نہیں سمجھتا کہ کوئی فہمیدہ اور روشن خیال شخص برلاسوں کو مغل کہہ سکے۔ ہاں مغلوں کے ساتھ رشتۂ مناکحت کے قائم ہو جانے کی وجہ سے بعض مصنف یا مورخ انہیں ترک کہہ دیتے ہیں جو ایک پہلو سے صحیح ہے لیکن اگر نسل کا باپ کی طرف سے ہونا مسلّم ہے تو ہم انہیں فارسی یا ایرانی ہی کہیں گے ـــــ یہ ایک فاش غلطی مدت دراز سے چلی آتی ہے۔ اور جس قدر جلد اس کی اصلاح ہو جائے۔ اتنا ہی بہتر ہوگا۔

نعمت اللہ خاں

مایوسی

(سانیٹ)

کسی شیریں سخن میں مدعائے تلخ ہوتا ہے۔
حقارت چشمِ سرافراز کی خوشیوں کے پھولوں کو
جلا کر خاک کر دیتی ہے — اور رخشاں اصولوں کو
کسی کا جوشِ آزا انصاف کے خوں میں ڈبوتا ہے،
کسی حاسد کی طاقت سے کوئی مظلوم روتا ہے۔
کوئی مشفق نما ناصح بچارے راہ بھولوں کو
رہ عصیاں دکھاتا ہے۔ کہیں خوابوں کے جھولوں کو
ہلاتی ہے اجل اور آدمی بے ہوش سوتا ہے۔

جہاں تاریک ہے بیداد سے ایسے جہاں میں کیوں
امید مہ جبیں حیرت فروزِ بزمِ امکاں ہو،
ترا لطف و کرم خُلدِ تبسّم میں نمایاں ہو۔
بہارِ خواب سے شکوہ خزانِ بے خزاں میں کیوں؟
یہ مایوسی ہے اس پر بھی تمنا تلملاتی ہے
مری حسرت مرے خونِ وفا پر مسکراتی ہے

آوارہ

شام ہوتے ہی طوفان نے عالمگیر صورت اختیار کرلی۔ خوفناک موسلا دھار بارش اور بادلوں کے گرجنے اور بجلیوں کے بار بار کوندنے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آسمان پر اہرمن و یزداں میں لڑائی ٹھنی ہے!۔۔۔ کالے بادل بربادی کے پرچم کی طرح لہرا رہے تھے! گنگا غصہ میں ابل پڑی تھی، اور ساحل کے باغوں کے درخت درد و کرب میں تڑپ رہے تھے۔۔ اور "آہ! آہ!" کی پھنکار کے ساتھ ہلتے تھے!!۔۔۔

چندن نگر میں دریا کے کنارے کے مکانات کے ایک بند کمرہ میں ایک انسانی جوڑا فرش پر بچھے ہوئے بستر پر آرام کر رہا تھا۔ ان کے نزدیک ہی رکھا ہوا مٹی کا دیا اپنی دھیمی دھیمی کانپتی زرد شعاعیں فضا میں بکھیر رہا تھا! شوہر شارات کہہ رہا تھا "میری خواہش ہے تم کچھ دن اور یہیں ٹھہر جاؤ۔ اس کے بعد تم گھر جانے کے قابل ہو جاؤ گی"۔

بیوی، کیرن کہہ رہی تھی "میں بالکل اچھی ہو چکی ہوں۔ گھر جانے سے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔

ہر متاہل شخص فوراً اندازہ لگا سکتا ہے کہ گفتگو اتنی مختصر نہ تھی۔ معاملہ کچھ بھی پیچیدہ نہ تھا لیکن موافق اور مخالف بحثیں کسی نتیجہ پر پہنچنے نہ دیتی تھیں۔ ایک بے پتوار کی کشتی کی طرح بحث ایک ہی صورت میں قائم تھی اور آخرکار اس نے آنسوؤں کے بے پناہ گرداب میں غرق ہو جانے کی دھمکی دی۔

شارات: "ڈاکٹر کی رائے ہے کہ تمہیں چند دن یہاں اور ٹھہرنا چاہیئے۔"

کیرن۔ "تمہارا ڈاکٹر تو سب کچھ جانتا ہے!"

شارات۔ "پیاری تم جانتی ہو کہ ان دنوں بیماریاں ہر چہار طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ مناسب تو یہی ہے کہ تم کچھ دنوں کے لئے ٹھہر جاؤ"

کیرن۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ یہاں تو سب اچھے ہی ہیں!"

واقعہ یوں تھا کہ کیرن اپنے ہمسایوں اور خاندان میں بہت ہر دلعزیز تھی۔ جب وہ بیمار پڑی تو سب اس کے لئے متردد تھے۔ گاؤں کے بڑے بوڑھوں کے نزدیک شوہر کے لئے اپنی بیوی کا اس قدر خیال رکھنا اور تبدیل آب و ہوا کی رائے دینا نہایت شرمناک بات تھی۔ انہوں نے شارات سے سوال پر سوال کرنا شروع کیا:۔ "کیا تمہارا خیال ہے کہ کبھی کوئی عورت بیمار نہیں پڑی؟ کیا تمہارا خیال ہے کہ اس جگہ کے لوگ جہاں تم اپنی بیوی کو لے جانا چاہتے ہو غیر فانی ہیں؟ کیا تمہارا خیال ہے کہ قسمت کی حکومت سے وہ جگہ خالی ہے؟ وغیرہ وغیرہ لیکن شارات اور اس کی ماں نے اپنے کان بالکل بہرے کر لئے۔ انہوں نے خیال کیا کہ گاؤں بھر کی متحدہ فہم و فراست اُن کی پیاری کی زندگی کے مقابلہ کوئی حقیقت نہیں رکھتی جب کسی عزیز ہستی کی جان خطرے میں ہوتی ہے تو لوگ اس وقت بحث وغیرہ میں نہیں پڑتے۔ پس شارات

چند دن گزر گیا اور کیرن اچھی ہو گئی۔ اگرچہ کمزوری ابھی باقی تھی۔ اس کے چہرے پر عجیب طرح کی زردی تھی جسے دیکھ کر دیکھنے والوں کو رنج ہونے لگتا اور یہ سوچ کر کہ وہ کس قدر بال بال بچی ہے تکلیف ہوتی۔

کیرن میل جول کی شائق تھی۔ ساحل کی خاموش فضا کی بود و باش میں وہ تکلیف دہ تنہائی محسوس کرتی۔ نہ کوئی کام کرنے کو تھا۔ نہ وہ عجیب ہمسائے۔ تمام دن دواؤں اور تندرستی کے خیال میں گزارنے سے اسے سخت نفرت تھی۔ خوراک ناپنے اور گرم گرم دواؤں سے مالش کرنے میں کوئی بھی دلچسپی نہ تھی۔ اور یہی وہ بات تھی جس پر بند کمرے میں اس طوفانی شام کو بحث ہو رہی تھی!۔۔۔۔

جب تک کیرن نے بحث پسند کی شارات کے لئے مخالفت کی گنجائش رہی لیکن جب اُس نے جواب ہی دینا چھوڑ دیا اور سر ہلا کر اظہارِ خفگی کے لئے دوسری جانب دیکھنے لگی تو غریب کو ہار ماننی پڑی۔ وہ بغیر کسی شرط کے ہتھیار ڈالنے ہی کو تھا کہ نوکر نے باہر سے آواز دی۔ شارات اٹھا اور دروازہ کھولتے ہی اسے معلوم ہوا کہ طوفان سے ایک کشتی الٹ گئی اور مسافروں میں سے ایک کم عمر برہمن کے لڑکے نے تیر کر ان کے ساحل پر کے باغ میں پناہ لینے میں کامیابی حاصل کر لی ہے۔

کیرن فوراً ہی پیاری کیرن ہو گئی جو درحقیقت اس کی فطرت تھی۔ اس نے لڑکے کے لئے گرم کپڑے تلاش کرنے شروع کئے۔ اس کے بعد ایک پیالہ دودھ کا گرم کیا اور لڑکے کو اپنے کمرے میں بلایا۔

لڑکے کے بڑے بڑے گھنگریالے بال تھے۔ اور بڑی بڑی جذبات کی مظہر آنکھیں! اس کے چہرے پر ابھی بالوں کے آثار بھی نہ تھے کیرن نے اسے دودھ کھلا کر اس کا حال پوچھا:۔

لڑکے نے اپنا نام نل کانتا بتایا۔ وہ ایک تھیئٹریکل کمپنی سے تعلق رکھتا تھا کمپنی کسی رئیس کے ہاں تماشا دکھانے آ رہی تھی جبکہ طوفان نے یکایک کشتی کو الٹ دیا۔ اسے کچھ خبر نہ تھی کہ اس کے ساتھیوں کے ساتھ کیا پیش آیا؟ وہ اچھا تیراک تھا اور اس لئے ساحل تک پہنچ سکا!۔۔۔۔

لڑکا ان لوگوں کے ساتھ رہنے لگا۔ ایک خوفناک موت سے بال بال بچنے کی وجہ سے کیرن کو اس سے ایک خاص دلچسپی اور ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔ شارات کو بھی ایسے موقع پر لڑکے کا آنا اچھا معلوم ہوا۔ کیونکہ اس کی بیوی کے لئے اب دلچسپی کا سامان ہو گیا تھا اور اب وہ کچھ دن اور وہاں ٹھہر سکتی تھی۔ کیرن کی ساس بھی اپنی برہمن مہمان کی خاطر تواضع کرنے سے خوش تھی۔۔۔ اور نل کانتا بھی دوسری دنیا میں جاتے جاتے رہ جانے اور اپنے آقا سے چھٹکارا پانے پر خوش تھا اور اس کی خوشی اس وجہ سے اور زیادہ تھی کہ اس نے ایک امیر گھر میں اپنا ٹھکانا بنا لیا۔

لیکن تھوڑے ہی دنوں میں شارات اور اس کی ماں کا خیال بدل گیا اور وہ اس کے جانے کی خواہش کرنے لگے۔۔۔۔۔۔

لڑکا شارات کا حقہ پینے میں ایک عجیب لذت محسوس کرتا۔ وہ موسلا دھار بارش میں صرف تفریح کی غرض سے اور دوستوں کی تعداد بڑھانے کے لئے شارات کا بہترین ریشمی چھاتا لے کر باہر نکل جاتا۔ اس کے علاوہ اس نے ایک دوغلا کتا پال رکھا تھا جو اس کے پاس اپنے کیچڑ میں لتھڑے ہوئے پنجوں کے ساتھ آتا اور شارات کے صاف ستھرے بستر کو داغدار کر جاتا۔ اس نے لڑکوں کی ایک جماعت جمع کر رکھی تھی جس میں ہر قد اور ہر قسم کے لڑکے تھے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پڑوس کے ایک آم کو بھی پکنا نصیب نہ ہوا!

اس میں شک نہیں کہ لڑکے کو خراب کرنے میں کیرن کا ہاتھ بھی تھا۔ شارات نے کئی بار متنبہ کیا لیکن اس نے کچھ نہ سنا۔ اس نے لڑکے کو شارات کے کپڑے پہنائے اور نئے بھی بنا دیئے اور چونکہ اسے اس سے ایک خاص دلچسپی ہو گئی تھی اور وہ اس کے متعلق اور زیادہ باتیں معلوم کرنا چاہتی تھی وہ اکثر اسے اپنے کمرے میں بلایا کرتی۔ کھانے اور غسل کے بعد کیرن چارپائی کی ادوائن پر بیٹھ جاتی۔ پان کی ڈبیہ ہاتھ میں ہوتی، خادمہ بالوں میں کنگھی کرتی ہوتی اور انہیں خشک کرتی، اور نلکانتا سامنے کھڑا اپنا ہنگامہ خیز کلام اشارات سے واضح کرتے ہوئے سناتا۔ اس وقت اس کے پریوں جیسے حسین بالوں کی لٹیں جھوم رہی ہوتیں! . . . . . .

اس طرح سہ پہر کی طویل ساعتیں خوشی اور سرور میں گزر جاتیں۔ کیرن اکثر شارات کو مجبور کرنے کی کوشش کرتی کہ وہ بھی تماشائیوں کی طرح حصہ لے لیکن شارات کو لڑکے سے ایک عجیب طرح کی نفرت تھی اور اس لئے وہ ہمیشہ انکار کر دیتا۔ اس کے علاوہ نلکانتا بھی شارات کی موجودگی میں وہ کیفیت نہ پیدا کر سکتا۔ کبھی کبھی شارات کی ماں گانے میں پاک ناموں کے سننے کی امید میں شریک ہو جاتی لیکن دوپہر کی نیند اس کے مذہبی جذبہ پر غالب آجاتی . . . اور وہ نیند کی آغوش میں دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑی ہوتی! . . . .

شارات اکثر لڑکے کی گوشمالی کرتا لیکن وہ اس سے زیادہ سزا کا عادی رہ چکا تھا اس لئے وہ اس کا کچھ خیال نہ کرتا۔ دنیا کے چند روزہ تجربات کی بنا پر وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ جس طرح یہ زمین بحر و بر سے مرکب ہے اسی طرح زندگی بھی رنج و راحت دونوں سے لطف اندوز ہونے کا نام ہے! اور یہاں رنج بہ نسبت راحت کے زیادہ ہے!"

نلکانتا کی عمر کا صحیح اندازہ مشکل ہے۔ اگر وہ چودہ پندرہ برس کا تھا تو اس کے چہرے پر عمر سے کہیں زیادہ بزرگی پائی جاتی تھی اور اگر سترہ اٹھارہ برس کا تھا تو بہت کم سن معلوم ہوتا تھا۔ یا تو اس کی جوانی کا آغاز بہت پہلے ہوا تھا یا اس کا لڑکپن زیادہ دنوں تک قائم رہا! . . .
واقعہ یہ تھا کہ اس نے بہت کم عمر میں تھیٹر والوں سے تعلق پیدا کر لیا اور رادھیکا رمینتی اور سیتا کے بہروپ میں اسٹیج پر آتا رہا۔ صانع قدرت نے بھی اس کی جسمانی ساخت اور اس کا قد ایسا بنایا تھا جیسا کہ مینجر چاہتا تھا۔

ہر شخص اسے بہت کم عمر سمجھتا تھا۔ اس لئے اس کی عزت بھی اس کی عمر کے مطابق نہ ہوتی تھی۔ اسباب قدرتی اور

مصنوعی۔ بعض وقت یہ تسلیم کرنے پر مجبور کر دیتے کہ وہ سترہ برس کا ہے لیکن بعض وقت تو معلوم ہوتا کہ وہ بالکل چودہ برس کا لڑکا ہے لیکن اس کی سمجھ سترہ برس کے لڑکے سے کہیں زیادہ ہے!! اور چونکہ ابھی چہرے پر بالوں کے آثار نہ تھے اس لیے سنجیدگی اور بڑھ جاتی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر لکیریں بن گئی تھیں کیونکہ وہ تمباکو نوشی کا عادی تھا۔ وہ بڑھ بڑھ کر باتیں بنایا کرتا اور اس سے بھی یہی معلوم ہوتا تھا کہ اس کی عمر زیادہ ہے۔ کمسنی اور معصومیت کا اظہار تو اس کی بڑی بڑی آنکھیں کرتیں! لیکن دنیا کے سرد و گرم تجربات نے اسے وقت سے پہلے بڑا کر دیا تھا۔

چندنگر میں ستارات کے گھر اور باغ کی سایہ دار فضا میں قدرت کو اپنے کام انجام دینے کے لئے بہت موقع تھا۔ نلکا نتا نے رفتہ رفتہ نوجوانی کے باغ میں قدم رکھنا شروع کیا۔ سترہ اٹھارہ برس پورے طور پر ختم ہو چکے تھے کسی کو تبدیلی کا گمان بھی نہ تھا لیکن ثبوت کے لئے یہی کافی ہے کہ جب کیرن اس سے بچوں کی طرح برتاؤ کرتی تو وہ شرما جاتا۔ ایک دن جب کیرن نے اس سے مذاقاً یہ رائے ظاہر کی کہ وہ سہیلی کے انداز دکھائے تو اس کو عورتوں کی جامہ پوشی ناگوار گزری۔

اس نے ستارات کے ایجنٹ سے کچھ علم حاصل کرنا چاہا لیکن چونکہ نلکا نتا کیرن کا منہ لگا تھا ایجنٹ بھی اسے تند نگاہ سے دیکھتا۔ اس کے علاوہ آئے دن خیالات کی فطری تبدیلیوں نے بھی حصولِ علم میں اس کا دل زیادہ دن نہ لگنے دیا۔ کچھ ہی دیر کے بعد اسے معلوم ہوتا کہ حروف رقص کر رہے ہیں۔ اپنی گود میں گھنٹوں وہ کتاب لئے رہتا لیکن گنگا کے کنارے چمپا کی جھاڑیاں، نیچے موجوں کی اٹھکیلیاں اور کشتیوں کی دوڑ، پرندوں کی بلند پروازیاں اور اُن کے خوش الحان نغمے ایک اور ہی دنیا دکھلانے لگتے۔ وہ کتاب کے مطالعہ میں منہمک ضرور ہوتا لیکن اس کے جذبات کیا ہوتے؟ صرف وہی جانتا! وہ ایک لفظ سے دوسرے پر نہیں گیا لیکن شاندار خیالات، جو خود بھی کسی کتاب کے مطالعہ سے کم نہیں، اس کی روح میں مسرت و سکون کی لہر ضرور دوڑا دیتے!! جب کوئی کشتی نظروں سے اوجھل ہونے لگتی، وہ کتاب کو اور زیادہ انہماک سے دیکھنے لگتا اور جتنا کھینچ سکتا کھینچتا لیکن جب وہ نگاہوں سے پوشیدہ ہو جاتی اور مسافر غائب ہو جاتے تو وہ چپ ہو جاتا۔

پہلے تو وہ اوروں کے تیار کردہ گانے گنگنایا کرتا لیکن اب دلکش راگ اس کی رگ رگ اور پے پے میں سرایت کر گئے تھے۔ الفاظ میں آمد کم ہوتی لیکن ہوتے اس قدر لطیف اور حسین کہ جذبات میں ہیجان پیدا ہونے لگتا نفسِ مضمون بھی اس کی سمجھ سے باہر ہوتا لیکن وہ گاتا مثلاً:-

"چڑیا نے جو دو مرتبہ پیدا ہوئی، کدھر پرواز کی!

ہماری ملکہ معظمہ کو زخمی کر کے؟!!"

"اے ہنس! آہ بتا کہ تو کیوں مارے گا

اسے سایہ دار جنگل میں؟!!"

اور پھر اس کو یہ محسوس ہوتا کہ وہ دوسری دنیا میں ہے!! کسی دوسری مخلوق سے تعلق رکھتا ہے! یہ دنیا اور اس کی زندگی سب کے سب سرود اور راگ معلوم ہوتے !! ... خدا جانے اب وہ اپنا مستقبل کیا سمجھتا تھا لیکن اتنا ضرور ہے کہ اپنی تھئیٹر کی زندگی اس کی نگاہوں میں اب ایک دھندلی تصویر سے زیادہ نہ تھی!...

جب شام کے ادا س دھندلکے میں کوئی غربت کا مارا بچہ گندہ اور بھوکا اپنے تباہ شدہ مکان میں پڑا شہزادوں شہزادیوں اور سہانی چاندی کے خواب دیکھتا ہے، اس وقت جھلملاتے ہوئے دیئے سے روشن جھونپڑی کی تاریکی میں اس کا دماغ غربت کے تصورات سے خالی ہوجاتا ہے اور خیالات خوبصورت جگمگاتی پوشاک پہنے پریوں کے طلسمی مسکن سے ہوتے ہوئے دوڑتے ہیں! رکاوٹوں اور دشواریوں سے قطعاً بے نیاز ہو کر!! ...

اسی طرح یہ آوارہ گردوں کے گروہ کا رکن بھی سرود نغمہ کے بربط نواز راگ چھیڑ کر خود کو اپنی بنائی ہوئی دنیا میں لے جاتا!.. موجوں کا تلاطم، پتوں کی سرسراہٹ، پرندوں کا چہچہہ ـــ دیوی جس نے اسے پناہ دی تھی جب وہ مجبور تھا اور لاچار! اس کا شاندار، پیارا چہرہ، اس کے سڈول بازو اور ان میں چمکتے ہوئے کڑے، اس کے گلابی پیر، پھولوں کی طرح ملائم! ـــ یہ سب تصورات گانوں کے ساتھ ہی کسی طلسمی اثر کے باعث اس کے دماغ میں جاگ اٹھتے ؟... جب گانا ختم ہوجاتا، خیالات کا سراب بھی غائب ہوجاتا... اور پھر تھئیٹر والا نلکانتا اپنی لٹکتی ہوئی زلفوں کے ساتھ ظاہر ہوجاتا... اس وقت شارات ہمسائے زبربادشدہ آم کے باغ کے مالک کی نئی شکایتیں سن کر آتا اور اسے طمانچے رسید کرتا اور گوشمالی کرتا.. اور پھر شریر لڑکوں کی جماعت کا سردار نلکانتا اپنی نئی نئی شرارتوں سے خشکی اور تری پر اونچی اونچی شاخوں پر ہنگامہ برپا کرنے کے لئے باہر نکل جاتا!!!

شارات کا چھوٹا بھائی ستیش کالج کی تعطیل ہوجانے کی وجہ سے آگیا۔ کرن ایک نیا ساتھی پاکر بہت خوش ہوئی۔ وہ اور ستیش ہم عمر تھے اور اب وقت خوشی خوشی گزرنے لگا کھیلوں، جھگڑوں، ملاپ، قہقہوں اور کبھی کبھی آنسوؤں میں! وہ یکایک پیچھے سے آکر اس کی آنکھیں اپنی حنائی انگلیوں سے بند کر دیتی یا اس کی پیٹھ پر "بندر" لکھ دیتی۔ یا قہقہوں کے ساتھ باہر سے دروازہ میں کنڈی لگا کر اسے کمرہ میں بند کر دیتی۔ ستیش بھی اپنے موقع پر نہ چوکتا۔ وہ اس کی انگوٹھیاں، کنجیاں چھپا دیتا، اس کے پانوں میں مرچیں ڈال دیتا، جب وہ سوئی ہوتی اسے چارپائی سے باندھ دیتا!

اس دوران میں خدا ہی جانتا ہے نلکانتا پر کیا گزری۔ اس کو روحانی صدمہ پہنچا اور وہ چاہتا کہ کسی سے اس کا انتقام لے! وہ اپنے ساتھیوں کو بغیر قصور کے مار کر رلانے لگا۔ اپنے پیارے کتے کو ٹھوکریں لگاتا اور اس وقت تک لگاتا رہتا جب تک کہ وہ اپنی دلدوز چیخوں سے فضا میں حشر نہ برپا کر دیتا!.. جب وہ سڑک پر ٹہلنے کو نکلتا تو بید سے سڑک کے کنارے کے درختوں کی پتیوں اور ٹہنیوں سے رستے پر پٹاڈ کر جاتا!...

کیرن لوگوں کو اچھے کھانے سے لطف اندوز ہوتے دیکھنا پسند کرتی۔ نلکانتا کھاتا کافی تھا۔ کوئی اچھی چیز چاہے کتنی ہی بار کیوں نہ دی جائے کبھی لینے سے انکار نہ کرتا۔ اس لئے کیرن اسے اپنے سامنے کھلاتی اور اس برہمن کے لڑکے کو سیر ہو کر کھاتے دیکھ کر خوش ہوتی۔ لیکن جب سے ستیش آیا اسے وقت کم ملتا۔ اس لئے وہ نلکانتا کو اپنے سامنے کھلا نہ سکتی۔ پہلے اگر ایسا ہوتا تو نلکانتا کو اس کا ذرا بھی خیال نہ ہوتا جب تک وہ دودھ کا پیالہ چٹ نہ کر جاتا اور اس کے بعد کافی پانی نہ پی لیتا وہ "چوکے" سے نہ اٹھتا!۔۔۔

لیکن اب۔۔۔ اگر کیرن اسے نہ کھلاتی تو اسے رنج ہوتا اور کوئی چیز اچھی نہ معلوم ہوتی۔ وہ بغیر کھائے اٹھ جاتا اور خادمہ سے بھرائی ہوئی آواز میں کہتا "بھوک نہیں ہے!" اسے خیال تھا کہ اس کا یہ پیہم انکار کہ "بھوک نہیں ہے!" کیرن تک پہنچے گا۔ وہ یاد کرتا کہ کیسے وہ پہلے اس کا خیال کرتی تھی اور امید کرتا کہ وہ آئیگی اور اسے کھلائیگی۔۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ کیرن کو اس کی خبر نہ ہوئی۔۔۔ اور نہ وہ آئی۔۔۔ اور نہ اسے کبھی بلایا! جو کچھ بچتا اُسے خادمہ چٹ کر جاتی!۔۔۔ تب وہ چراغ گل کر دیتا۔۔ تاریکی میں بستر پر پڑ جاتا اور تکیے میں منہ چھپا کر خوب روتا! اس کے رنج کا کیا سبب تھا؟ کس نے اس کو رنج دیا تھا؟ کس سے اسے تسلی کی امید تھی؟۔۔۔ جب کوئی نہ آتا تو "نیند کی پری" اپنے ہلکے ہلکے معطر پروں سے اڑتی ہوئی آہستہ آہستہ آتی۔۔۔ اور اپنی مسحور کن گود میں اسے لیتی اور اس یتیم بچے کے زخمی دل کو سکون دیتی!

نلکانتا کو بالکل یقین ہو گیا کہ ستیش ہی کیرن کو اس کے خلاف بھڑکا رہا ہے! اگر کیرن خاموش ہوتی یا اس کے لبوں پر مسکراہٹ نہ ہوتی تو وہ فوراً یہ نتیجہ اخذ کر لیتا کہ ستیش کی کسی حرکت نے اسے ناراض کر دیا ہے! وہ خدا سے انتہائی خشوع کے ساتھ دعا کرتا کہ وہ ستیش ہو جائے اور ستیش وہ! اس کا خیال تھا کہ برہمن کا غصہ بے اثر نہیں رہتا۔۔ لیکن جتنا وہ ستیش کو اپنی سراپ سے جلا دینا چاہتا اتنا ہی اس کا دل اور جلتا!۔۔۔ اور اوپر کی منزل میں وہ ستیش کو اپنی بھاوج کے ساتھ مذاق کرتے اور قہقہے لگاتے سنتا!۔۔۔

نلکانتا نے ظاہراً کبھی ستیش سے دشمنی کی جسارت نہ کی۔ لیکن اس کو پریشان کرنے کے سو سو ذرائع سوچتا۔ جب ستیش دریا میں تیرنے چلا جاتا اور اشنان کے گھاٹ پر اپنا صابون چھوڑ جاتا تو واپس آکر اسے نہ پاتا۔ ایک مرتبہ اس نے اپنا پسندیدہ کُرتا پانی میں بہتے دیکھا۔ اس نے خیال کیا کہ ہوا سے اڑ گیا ہوگا!

ایک دن کیرن نے نلکانتا کو بلایا کہ آکر ستیش کو اپنا مسحور کن راگ سنائے، لیکن وہ چپ چاپ اداس کھڑا رہا۔ کیرن نے متحیر ہو کر پوچھا کہ معاملہ کیا ہے؟ لیکن اس نے جواب نہ دیا۔ اور جب اس سے دوبارہ فرمائش کی گئی کہ کوئی پسندیدہ چیز سنائے تو وہ "یاد نہیں ہے" کہہ کر وہاں سے کھسک گیا۔۔۔۔!

آخر کار وطن واپس جانے کا وقت آگیا۔ ہر شخص سامان وغیرہ باندھنے میں لگ گیا۔ ستیش بھی ان لوگوں کے ساتھ جا رہا تھا۔ لیکن نلکا نتا سے کسی نے ایک لفظ بھی نہ کہا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کا جانا نہ جانا کسی کے لئے کوئی معنی نہ رکھتا تھا۔ ۔ ۔

سچ پوچھئے تو پہلے کیرن نے یہ ذکر چھیڑا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اُسے ساتھ لے جائے لیکن شارات، اس کی ماں اور ستیش نے اس قدر شدید مخالفت کی کہ اسے خاموش ہو جانا پڑا۔ جانے سے چند دن قبل اس نے لڑکے کو بلایا اور بڑے ہمدردانہ لہجہ سے نصیحت کی کہ گھر چلا جائے۔ اتنے دنوں سے اس سے بے پروائی برتی جا رہی تھی اب مہربانی کے یہ الفاظ سن کر وہ بے اختیار ہو گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ کیرن کی آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے۔ اس کو رنج تھا کہ کیوں اس نے محبت کا ایسا تعلق پیدا کیا جسے ٹوٹ جانا تھا لیکن ستیش نوجوان لڑکے کے رونے پر سخت ناراض ہوا۔ اس نے کہا "یہ بیوقوف کھڑے کھڑے رونا کیا ہے۔ باتیں کیوں نہیں کرتا؟" جب کیرن نے اسے ملامت کی کہ تم بے حس ہو تو اس نے جواب دیا "میری بھابی تم نہیں سمجھ سکتیں۔ تم بہت نیک ہو۔ یہ لڑکا خدا معلوم کہاں سے آیا ہے اور اس سے بادشاہ کی طرح سلوک کیا جاتا ہے۔ فطرتاً چیتا کبھی یہ نہیں چاہ سکتا کہ وہ چوہا بنے اور وہ جانتا ہے کہ اپنے مکار آنسوؤں سے وہ تمہارے دل میں رحم کے جذبات پیدا کر سکتا ہے"۔ ۔ نلکا نتا جلدی سے وہاں سے ہٹ گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ کاش وہ ایک چھری ہوتا اور ستیش کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا۔ یا ایک سوئی، کہ اس کے جسم کو چھید کر رکھ دیتا۔ یا ایک شعلہ کہ ستیش کو جلا کر خاک کر دیتا! ۔ ۔ لیکن ستیش پر کوئی آنچ نہ آئی۔ نلکا نتا ہی کی قسمت میں جلنا لکھا تھا۔ سو جلتا رہا۔

کلکتہ سے ستیش ایک نفیس قلمدان لایا تھا۔ دوات سیپ کی ایک کشتی میں رکھی تھی جسے ایک چاندی کا ہنس کھینچ رہا تھا۔ یہ قلمدان اس کو بہت عزیز تھا۔ وہ اس کو روز ایک پرانے ریشمی رومال سے صاف کرتا۔ کیرن ہنستی اور ہنس کی چونچ تھپتھپاتی ہوئی کہتی:۔

"چڑیا جس نے دوبارہ جنم لیا، آہ اس نے کدھر پرواز کی؟

"ہماری ملکہ معظمہ کو زخمی کر کے!"

اور دونوں میں لفظی جھگڑا ہونے لگتا۔ ۔ ۔

جانے سے ایک دن قبل قلمدان غائب تھا۔ اور باوجود تلاش کے نہ ملا۔ کیرن نے مسکرا کر کہا "بھائی۔ تمہارا ہنس اڑ گیا کہ تمہاری دیوتی کی حفاظت کرے!" لیکن ستیش بڑے غصے میں تھا۔ اسے یقین تھا کہ نلکا نتا نے قلمدان چرایا ہے گھر کے کئی آدمیوں نے شہادت دی کہ گزشتہ رات وہ کمرے کے پاس کئی بار دیکھا گیا۔ وہ مجرم کو کیرن کے پاس پکڑ لایا اور ڈانٹ کر کہا "تو نے ہی میرا قلمدان چرایا ہے، چور کہیں کا!"

نلکا نتا نے شارات کی سزائیں، حق یا ناحق، نہایت صبر کے ساتھ برداشت کی تھیں لیکن جب کیرن کے سامنے اسے چوری کا الزام لگایا گیا ـــ اور وہ بھی ستیش کی زبان سے، تو اس کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو گئیں، اس کا سینہ پھول گیا، گلے میں سانس رکنے لگی! اگر ستیش اور کچھ

کہتا تو وہ بلی کی طرح اس پر جھپٹ پڑتا ——— اور اس کے ناخن پنجوں کا کام کرتے!

کیرن کو اس سے سخت تکلیف ہوئی اور لڑکے کو دوسرے کمرے میں لے جا کر اپنی مخصوص نرم آواز میں کہا ——— "نیلو! اگر واقعی تم نے قلمدان لیا ہے تو مجھے چپ چاپ دے دو اور پھر میرا ذمہ اگر کوئی تم کو کچھ کہے؟"

موٹے موٹے آنسو اس کے گالوں پر سے گرنے لگے یہاں تک کہ اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔ . . اور خوب رو دیا! کیرن نے کمرے سے واپس آ کر کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ نلکا نتا نے قلمدان نہیں لیا" لیکن شارات اور ستیش کا خیال تھا کہ اس کے سوا اور کوئی لے ہی نہیں سکتا۔ کیرن نے یہ یقین کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

شارات چاہتا تھا کہ لڑکے سے جرح کرے لیکن اس کی بیوی نے اس کی اجازت نہ دی۔ تب ستیش نے رائے دی کہ اس کے کمرے اور بکس کی تلاشی لی جائے لیکن کیرن نے کہا ——— "اگر تم نے ایسا کیا تو میں ہمیشہ کے لئے ناراض ہو جاؤں گی۔ معصوم بچے کو اس قدر پریشان کرنے سے کیا فائدہ؟" یہ کہتے ہوئے اس کی مسحور کن آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ . . اور معاملہ طے ہو گیا اور پھر کسی نے جرأت نہ کی کہ نلکا نتا کو پریشان کرے۔

ایک بے وطن لڑکے کے خلاف ان سازشوں کو دیکھ کر کیرن کا دل رحم سے بھر گیا۔ اس نے دو جوڑے نئے کپڑے لئے، ایک جوڑا نیا جوتا اور ایک نوٹ اور شام کو چپ چاپ نلکا نتا کے کمرے میں گئی۔ وہ چاہتی تھی کہ رخصت کے ان تحائف کو چپ چاپ اس کے بکس میں رکھ دے۔ بکس بھی اسی کا عطیہ تھا۔ اپنے گچھے کی ایک کنجی لگا کر بغیر کسی آواز کے اس نے بکس کھولا۔ وہ الا بلا سے اس قدر بھرا ہوا تھا کہ نئے کپڑوں کی گنجائش نہ تھی۔ اس نے سوچا کہ بکس کی تمام چیزیں نکال کر پھر ٹھکانے سے رکھ دے۔ اس نے چیزوں کو نکالنا شروع کیا۔ پہلے چاقو، لٹو، پتنگ کی ریلیں، بانس کی تیلیاں، سیپی گھونگے وغیرہ اور ایسی چیزیں جو بچوں کی فطرت کے مطابق تھیں۔ اس کے بعد ململ کا ایک صاف ٹکڑا جس کے نیچے وہی گمشدہ قلمدان! ہنس اور سب کچھ! . . کیرن کا چہرہ شرم سے اس طرح سرخ ہو گیا گویا وہ خود ہی چور تھی! . . . بے اختیارانہ قلمدان ہاتھ میں لئے وہ بیٹھ گئی حیرت زدہ!

اور اسی اثنا میں بغیر اس کے علم کے نلکا نتا کمرے میں اس کے پیچھے سے داخل ہوا۔ اس نے سب کچھ دیکھ لیا اور خیال کیا کہ کیرن میری چوری پکڑنے چور کی طرح آئی تھی، اور اب میں اس کی نظروں میں مجرم ہوں! اب میں اسے کیسے یقین دلا سکتا ہوں کہ میں چور نہیں! صرف انتقام کے جذبے سے مجبور ہو کر میں نے قلمدان لے لیا تھا کہ موقع ملنے پر دریا میں پھینک دوں! اور جب تک کے لئے میں نے بکس میں رکھ دیا تھا!! اس کے دل نے صدا دی "میں چور نہیں ہوں!" لیکن آخر وہ کیا تھا؟ وہ کیا کہہ سکتا تھا! اس نے چوری کی گمشدہ چیز اس کے پاس تھی اور اس پر بھی وہ چور نہ تھا!!! کیرن کو وہ نہیں سمجھا سکتا! ثبوت اس کے خلاف تھے! اور پھر یہ خیال کہ کیرن نے اس کی چوری پکڑی!

اس کے لئے سوہانِ روح تھا!...

آخرکار کیرن نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر قلمدان بکس میں رکھ دیا اور اسے ململ کے ٹکڑے سے چھپا دیا۔ اور بقیہ چیزیں جس طرح سے تھیں اوپر رکھ دیں اور سب کے اوپر تحفہ اور نوٹ جو اس کے لئے لائی تھی!

دوسرے روز لڑکا غائب تھا۔ گاؤں کے لوگوں نے اسے کہیں نہ دیکھا تھا۔ پولیس کو بھی کچھ سراغ نہ مل سکا۔

بشارات نے کہا۔ "آؤ، اب اس کا بکس دیکھیں" لیکن کیرن اپنے انکار پر قائم رہی۔ وہ صندوق اپنے کمرے میں لے آئی اور قلمدان لے کر دریا میں ڈال دیا!

سب لوگ گھر چلے گئے۔ ایک ہی دن میں باغ ویران ہو گیا! اور صرف وہی نلکانتا کا کنارہ گیا جو دریا کے ساحل پر مارا مارا پھرتا اور اپنی دلدوز آواز سے چیخ چیخ کر ساحل کے سکون کو درہم و برہم کرتا رہتا!!

تمنائی

(ترجمہ)

غمِ اُلفت

ہے اسیرِ غمِ اُلفت دلِ ناکام ہنوز! ۔۔۔ میرے افسردہ لبوں پر ہے ترا نام ہنوز!

قلبِ مجبور ہے بیگانۂ تبسم و امید! ۔۔۔ جانِ بے تاب ہے آسودۂ اوہام ہنوز!

فتنہ گر تیرے ہی پندارِ نوازش کی قسم! ۔۔۔ ہے وہی خاطرِ برباد میں کہرام ہنوز!

وہی پیچیدگیٔ جادۂ غم ہے اب تک! ۔۔۔ میں ہوں اور جستجوئے منزلِ آرام ہنوز!

دل کی ہر اک رگِ افسردہ تڑپ جاتی ہے! ۔۔۔ لب پہ اس طرح سے آتا ہے ترا نام ہنوز!

ترکِ الفت کو زمانہ ہوا حالانکہ، مگر!

رازِ محزوں ہے ترے عشق میں بدنام ہنوز

راز بنگش سرحدی!

پیغام

تاروں کی خدمت میں

کس واسطے مجبوب ہے؟ اے عرش کے تارے! ۔۔۔ تُو اوجِ ثریّا پہ سرافراز رہا کر

پستی سے خجل کیوں ہے؟ تری دور ہے منزل ۔۔۔ رفعت سے سرِ عرش سخن ساز رہا کر

افلاک کو مجبوب بنا وسعتِ دل سے ۔۔۔ انجم کا مہ و مہر کا دمساز رہا کر

اڑتا ہی چلا چل ۔ نہ نگہ کر سُوئے پستی ۔۔۔ کس سوچ میں ہے؟ مائلِ پرواز رہا کر

ہونا ہے جو ہو جائے گا مت سوچ خدارا ۔۔۔ جب تک بھی ہے تو زمزمہ پرداز رہا کر

پرواز میں ہو اپنی نگاہوں سے بھی غائب ۔۔۔ اور نغمۂ عنقا سے ہم آواز رہا کر

مت سوچ جواب آئیگا "ہوں" "میں" کہ "نہیں" "ہیں" ۔۔۔ تخیّل میں اس سے سخن آغاز رہا کر

جس بزم میں وہ جانِ تخیّل ہے درخشاں ۔۔۔ اس بزم کی جانب قدم انداز رہا کر

امید ہے شاید وہ نظر تجھ پہ پڑے گی ۔۔۔ غافل نہ ہو اے چشمِ وفا باز رہا کر

ح ۔ ب

محبّت اور شادی

ایک مغربی مصنفہ ہیلن رولینڈ نے سلیمان علیہ السلام کی کتاب امثال" سے متاثر ہوکر ایک "کتاب اقوال" لکھی ہے اور اسے ان کی سب سے چھوٹی اور ذہین ملکہ سے منسوب کیا ہے۔ اس کتاب میں عورت کے نقطۂ نظر سے نوعی تعلقات پر تبصرہ کیا گیا ہے، ان چند اقتباسات سے ازدواجی زندگی کے بعض پرلطف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے ؛

(۱)

بیٹی! میری باتیں سنو اور میری نصیحتوں پر کان دھرو تاکہ تمہیں مرد کی فطرت سے آگاہی ہو جائے' اس کی حرکات' اس کے رات باہر بسر کرنے اور صبح گھر آنے کا سبب تمہیں معلوم ہو جائے اور تم اس کی میٹھی میٹھی باتوں اور پرفریب چالوں سے واقف ہو جاؤ۔

پیاری' مجھ سے یہ سوال نہ پوچھو کہ تمہیں مردوں کے راز کس طرح معلوم ہو گئے' بات یہ ہے کہ کم از کم ایک مرد سے تو مجھے ضرور واسطہ پڑا ہے۔ پھر یہ جان لو کہ عورت اگر ایک مرد کی خصلت سے واقف ہو جائے تو اسے تمام مردوں کی چالوں کا علم ہو جاتا ہے لیکن اگر کوئی مرد فرداً فرداً تمام عورتوں سے بھی دوچار ہو جب بھی یہ ممکن ہے کہ وہ ایک عورت کی فطرت سے بھی آگاہ نہ ہو۔

مرد کی سادگی دیکھو' اگر کسی عورت نے عطر لگایا ہو تو وہ سمجھتا ہے کہ اس سے وفا کی بو آتی ہے' اگر وہ کسی عورت کے ہاتھ میں ریشمی رومال دیکھتا ہے تو دل میں کہتا ہے' اس کا دل اس رومال کی طرح نرم ہے اور وہ مجھے دعوت دے رہی ہے اسی لئے وہ چاہے کسی عورت سے شادی کرے وہ ضرور عمر بھر پچھتاتا ہے۔

(۲)

وہ شوہر جو ہر لحاظ سے کامل ہو ایک نعمت غیر مترقبہ ہے' وہ بنک کے نوٹوں سے زیادہ قیمتی ہے' کیونکہ وہ ان سے زیادہ سودمند ہوتا ہے۔

وہ اپنے ہاتھ سے روٹی کماتا ہے اور تمام تنخواہ گھر لاتا ہے؛

وہ اپنے ہاتھوں سے ٹنیس کے میدان کی گھاس ہموار کرتا ہے اور کتے کو نہلاتا ہے'

وہ اپنی بیوی کی پوشاک کو مناسب جگہ لٹکاتا ہے اور بڑبڑاتا نہیں۔

رات کو جب کوئی بلی مکان میں گھس آتی ہے تو وہ خود بستر سے نکل کر اسے گھر سے باہر نکالتا ہے۔

وہ اپنی جرابیں خود کاڑھتا ہے اور قمیص پر بٹن بھی خود ٹانکتا ہے'
وہ دوسری عورتوں کے وجود سے لاعلمی ظاہر کرتا ہے۔
وہ اپنی بیوی کے خط احتیاط سے ڈاک میں ڈالتا ہے اور ان کے مضامین میں رد و بدل کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔
میں نے لاکھوں مرد دیکھے ہیں، لیکن ایسا کوئی نہیں دیکھا۔
اگرچہ سب عورتوں نے اسے دیکھا ہے ۔۔۔ اپنے خوابوں میں

(۳)

بھولی، نادان لڑکی! میں تجھے کب تک سمجھاتی رہوں گی کہ نئے شوہر کا شوق اچھا نہیں، مفت میں شادی کے اخراجات برداشت کرنے پڑتے ہیں اور جگ ہنسائی ہوتی ہے'
مردوں کی قسمیں تو بہت ہیں لیکن شوہر صرف ایک قسم کا ہوتا ہے۔
اگر تو آنکھیں بند کرے تو تجھے معلوم ہوگا کہ گفتار و اطوار اور محبت کے لحاظ سے پہلے اور دوسرے شوہر میں کوئی فرق نہیں کیونکہ دوسرے شوہر کی ٹھوڑی بھی پہلے شوہر کی طرح کھردری اور اس کی باتیں پہلے شوہر کی طرح چکنی چپڑی ہیں۔
دوسرا شوہر بھی پہلے شوہر کی طرح گرجتا ہے جب اسے بھوک لگتی ہے اور جب اس کا پیٹ بھر چکتا ہے تو پہلے شوہر ہی کی طرح ڈکار لیتا ہے
خاوندوں میں صرف یہ فرق ہوتا ہے کہ پہلا تمہیں رلاتا ہے، دوسرا تمہیں پریشان کرتا ہے اور تیسرا تمہیں اکتا دیتا ہے

(۴)

بیٹی! مرد کا دل توڑنے کا نام نہ لے کیونکہ یہ ٹوٹ نہیں سکتا، یہ ربڑ کی گیند کی طرح ہے اسے جتنا دبانا چاہو اتنا زیادہ اچھلتا ہے۔
عورت کے دل میں نرم گوشے ہوتے ہیں جہاں اس کے عزیزوں کی یاد رہتی ہے، جب اس کا کوئی چاہنے والا مرتا ہے تو وہ برسوں سوگوار رہتی ہے لیکن مرد اپنی پہلی محبوبہ کی قبر پر مٹھی بھر مٹی پھینکتا ہے اور ایک نئی قبر کھودنے لگتا ہے' اس کا دل ایک قبرستان ہے جس پر جا بجا عشق سسکتا' دم توڑتا، نیم دفن یا مدفون نظر آتا ہے'
عورت اپنے چاہنے والوں کے خطوط ریشمی فیتے میں باندھ کر محفوظ رکھتی ہے لیکن مرد لاپروائی سے اپنے پائپ کو اس پھول سے صاف کرتا ہے جو اس کی پہلی معشوقہ نے اپنے بالوں میں گوندھا تھا۔
جب چھ مہینے کے بعد ایک پرانا دستانہ یا زلف اسے ٹرنک میں دکھائی دیتی ہے تو وہ اسے آگ میں پھینک دیتا ہے اور غصے میں کہتا ہے کس شیطان نے ان چیزوں کو یہاں رکھا تھا۔

(۵)

صرف ایک مرد کو خوش کرنے کے لئے عورت کو ان تمام چیزوں کی ضرورت ہے'

بجلی کا تبسم	کاٹھ کے سپاہی کا تحمل
فاختہ کی سریلی آواز	پاانداز کی خاکساری
پتھر کی خاموشی	گنبد کی صدا
حور کی آنکھیں	کتے کی وفاداری
چمگادڑ کا اندھاپن	ملائی کی مٹھاس
ایک بت جیسا جسم	گانے والی لڑکیوں کی ادائیں
سلیمانؑ کی دانائی	

(۶)

بیٹی! کوئی بیوقوف ہوگا جس نے کہا ہے کہ "شادی سب مردوں کے لئے ضروری ہے کیونکہ دنیا میں ہر بات کی کوئی نہ کوئی وجہ ہے، لیکن مجرد رہنے کی کوئی وجہ نہیں" میں نے کنواروں سے بات چیت کی ہے اور بلاتمیز عمر سب سے یہ سوال پوچھا ہے، یاد رکھو کہ شادی نہ کرنے کے اسباب شراب نوشی کے اسباب سے بھی دلچسپ اور حیرت انگیز ہیں' مرد اس لئے شادی نہیں کرتا کہ اس کی عمر بہت کم ہے یا بہت زیادہ ہے' یا اس نے ابھی شادی کے مسئلہ پر غور نہیں کیا' یا اس لئے بھی کہ شادی کے متعلق بہت غور وفکر کیا ہے' یا اس لئے کہ وہ غریب ہے، اور اسے شادی کی مقدرت نہیں' یا وہ امیر ہے اور اسے شادی کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی' یا اس لئے کہ اسے کسی عورت سے محبت نہیں اور اس لئے بھی کہ اسے سب عورتوں سے محبت ہے' اس لئے کہ کوئی مناسب عورت اسے نہیں ملی یا مناسب عورت ملی تو ہے لیکن شادی نہیں کرسکا۔ اس لئے بھی کہ اسے عورتوں کے متعلق بہت سے شکوک ہیں اور اس لئے بھی کہ اسے عورتوں کے متعلق قطعاً کوئی شک نہیں' اس لئے کہ کوئی عورت اس کے لائق نہیں یا وہ کسی عورت کے قابل نہیں' وہ ابھی اس بات کے لئے تیار نہیں کہ ایک مستقل ذریعۂ زندگی اختیار کرے یا مستقل ذریعۂ زندگی تو اسے میسر ہے لیکن وہ قانع ہے؛

(۷)

بیٹی عیش پسند مجرد کا قصہ سنو اور خوش ہو کیونکہ مجرد کو اپنے کئے کا پھل ضرور ملتا ہے، میں جب جوان تھی تو ایک مرد میرے پاس آیا اور کہنے لگا مجھے شادی کی کیا ضرورت ہے' میں ہر طرح سے آرام میں ہوں اور لطف یہ ہے کہ خرچ صرف آدھا ہے' میں دن میں تین مرتبہ کھانا کھاتا ہوں اور میرا کمرہ نازنینوں کے قہقہوں سے گونجتا ہے۔ ہر عورت یہ چاہتی ہے کہ میرے کوٹ پر بٹن ٹانکے' میری زندگی ایک پرلطف دعوت کی طرح ہے جس میں کئی دور چلتے ہیں' سوموار کو میں ایک مزاحدار لڑکی سے آرٹ پر گفتگو کرتا ہوں' منگل کو کسی بیوہ سے محبت پر تبادلۂ خیالات کرتا ہوں اور بدھ کو کسی نرم ونازک بت سے بظاہر مہمل لیکن معنی خیز باتیں کرتا ہوں' لیکن ایک شادی شدہ مرد کو ہمیشہ ایک ہی عورت سے خانہ داری

کی معاشیات پر بحث کرنی پڑتی ہے اور اس کی زندگی ایک میز کی طرح ہے جس پر ہمیشہ ایک ہی کھانا رکھا جاتا ہے۔

میں نے کہا درست فرمایا آپ نے،

لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا اس کے سر سے بال جھڑنے لگے حتیٰ کہ ایک دن اس کی چندیا برقی قمقمے کی طرح چمکنے لگی، شراب خوری اور بیفکری سے وہ پھول کر کپا ہو گیا تھا، پہلے جو عورتیں اسے دیکھ کر کانپنے لگتی تھیں اب اسے دیکھ کر کھلکھلا کر ہنستی تھیں، پہلے وہ سستی سی مٹھائی لا کر انہیں پرچا دیتا تھا اور وہ گھنٹوں اس سے نہ اکتاتی تھیں لیکن اب اسے اپنا تمام اندوختہ ان کی نذر کرنا پڑتا تھا کیونکہ ایک عورت موٹے مردوں کی صورت دیکھنا اس وقت تک گوارا نہیں کر سکتی جب تک وہ شراب اور گراں بہا پھول ساتھ نہ لائیں۔ اس نے اپنے ہم عمر شادی شدہ مردوں کو دیکھا، وہ کام کرنے کی وجہ سے موٹے نہ ہوئے تھے، ان کے جسم اب بھی جاذب نظر تھے لیکن اس نے اپنی دن جمائیاں لیتے گزار دیئے تھے۔ وہ روتا ہوا میرے پاس آیا اور کہنے لگا، اب میرا ارادہ شادی کرنے کا ہے لیکن جس سے مجھے محبت تھی اس نے تو کسی اور سے شادی کر لی ہے، میں بیوی کا انتخاب کیسے کر سکتا ہوں جب سب عورتیں ایک سی ہیں۔

میں نے قہقہہ لگایا اور کہا بیٹا! جس سے شادی کر سکتے ہو اس سے کر، عورتوں کو تم جیسی عہد قدیم کی یادگار کا شوق نہیں لیکن ممکن ہے کہ کوئی بیچاری پانچ خاوندوں سے سیر ہو کر تمہیں قبول کرے۔

محبت کے بغیر زندگی ایک پائپ کی طرح ہے جو سلگایا نہ گیا ہو اور یہی حال غیر شادی شدہ مردوں کا ہے۔

(۸)

سلیمان علیہ السلام اپنی ڈائری میں لکھتے ہیں،

دنیا میں دو چیزیں ہیں جو میرے سکون کو برہم کر سکتی ہیں ایک پائپ اور دوسری عورت دونوں اتنی مشابہ ہیں کہ مجھے خیال ہوتا ہے کہ عورت بھی پہلے جون میں پائپ ہو گی، میں نے بیس سے زیادہ پائپ سیاہ کئے ہیں اور قریباً سات سو عورتوں سے محبت کی ہے لیکن ان میں سے کوئی بھی اس قابل نہ تھی کہ اس کے لئے اتنی تکلیف اٹھائی جائے۔

آدمی پائپ کتنا گراں خریدتا ہے اور عورت کی محبت مرد کو کس گراں قیمت پر ملتی ہے۔ وہ پانی کی طرح روپیہ بہاتا ہے کہ عورت کو زیور ملے اور پائپ پر رنگ چڑھے،

کس تکلیف سے وہ پائپ کو رنگاتا ہے۔

کتنی عمر ضائع کر کے اور کتنی محنت سے وہ عورت کا دل نرم کرتا ہے۔

کس طرح وہ بیدریغ ایک کے لئے تمبا کو جلاتا ہے۔

کس صبر سے وہ دوسری کے آگے خوشبو جلاتا ہے،

لیکن تھوڑی سی سردی ہوئی اور پائپ ٹوٹ گیا' اور گرمجوشی میں تھوڑی سی کمی ہوئی اور عورت کا پیار جاتا رہا'
غریب مرد کے لئے کوئی سکون نہیں کیونکہ ایک پائپ یا عورت کے ساتھ زندگی ایک اکتا دینے والا شغل ہے' اور ان کے بغیر جینے کا کوئی لطف بھی نہیں'

(۹)

بیٹی! میری بات غور سے سن اور میری نصیحتوں پر عمل کر کیونکہ مرد کا سمجھنا معقول آمدنی کی ابتدا ہے اور اس کی فطرت کا علم کالج کی تعلیم سے زیادہ مفید ہے۔

جب ایک عورت کسی مرد سے شادی کرتی ہے تو اس کا مقصد اُس کا حصول ہوتا ہے لیکن مرد اس لئے شادی کرتا ہے کہ اس عورت سے کوئی دوسرا شادی نہ کر لے۔

مرد تنہائی سے بچنے کے لئے عورت سے شادی کرتا ہے اور شادی کے بعد اپنی بیوی سے بچنے کے لئے کسی کلب کا رکن بن جاتا ہے'

وہ ایک عورت سے اس لئے شادی کرتا ہے کہ اس کی "فطرتِ عالی" کی تسکین ہو' شادی کے بعد وہ اپنی تمام عمر ان عورتوں کی جستجو میں صرف کر دیتا ہے جن سے اس کی پست حس کو سکون ملے'

یہ سمجھ کر خوش نہ ہو کہ ایک مرد نے اپنے دل کی کنجی تجھے دے دی ہے' شاید وہ اگلے ہی دن قفل بدل لے'

(۱۰)

نئی دلھن کا گیت

اے محبوب! میں تیری شکرگزار ہوں کہ تو نے مجھے ان عورتوں کے ہجوم میں سے منتخب کیا جن کا تو آرزومند تھا'

اب تیری رضا میری رضا' تیری پسند میری پسند اور تیری سیاسیات میری سیاسیات'

میں تیرے ہاضمے کا خیال رکھوں گی' میں اپنے ہاتھ سے کھانا پکاؤں گی تاکہ تیرا معدہ کمزور نہ ہو جائے۔

میں تیری ہر بات کا یقین کروں گی خواہ مجھے اس کے جھوٹ ہونے کا علم ہو' یقین ~~کبھی~~ [بیں] تیری داستانوں کو احترام سے سنوں گی'

میں ایک ماں کی طرح تیری خبرگیری کروں گی' لیکن اگر تو چاہے تو شوق سے مجھے ایک بچہ سمجھ۔ لیکن خدارا بیوی نہ سمجھ!

میں تیرے بغیر خوش رہنے کی کوشش کروں گی تاکہ تیرے ساتھ خوش رہ سکوں۔

میں تیرے لئے سب کچھ ہونگی' تیری بیوی' تیرا فرشتہ' تیری بلی' تیری گائے' تیرا کتا'

عطاء اللہ کلیم

گُل

اے گُلِ رنگیں قبا، اے غازۂ روئے بہار
تو ہے خود اپنے کمالِ حُسن کا آئینہ دار

ہائے وہ تیرے تبسّم کی ادا وقتِ سحر
صبح کے تارے نے اپنی جان تک کر دی نثار

شرم کے مارے گلابی ہے اِدھر روئے شفق
شبنم آگیں ہے اُدھر پیشانیٔ صُبحِ بہار

یوں نگارِ مہر تیرے سامنے آیا تو کیا
لڑکھڑاتا، سر جھکائے، زرد رو۔ سیماب وار

خامُشی عادت ہے تیری، سادگی فطرت میں ہے
پھر بھی جو تیرا حریفِ حُسن ہے، حیرت میں ہے

اے گُلِ نازک ادا، اے خندۂ صبحِ چمن!
چومتی ہے تیرے ہونٹوں کو نسیمِ مشک تن

گھیر لیں جیسے عُروسِ نو کو کچھ دوشیزگاں
یوں تجھے گھیرے ہوئے ہیں نونہالانِ چمن

وادیوں میں تُو، بیابانوں میں تُو، بستی میں تُو
رونقِ ہر محفل و زینت دہِ ہر انجمن

مسکرانا، جھومنا، پھر خود ہی شرمانا ترا
جس طرح دیوانہ اپنے حال میں خود ہی مگن

جوشِ سرمستی میں وہ بادِ صبا کی چھیڑ چھاڑ
وہ ترے عارض پہ اِک ہلکے تبسّم کی شکن

تُو زمینِ رنگ و بُو، تو آسمانِ رنگ و بُو
مختصر یہ ہے کہ تُو ہے اِک جہانِ رنگ و بُو

جذبی

مچھر

کوٹھڑی کے باہر ہوا بہت تیز چل رہی تھی۔ سارے دن کی محنت سے تھکا ہارا مزدور اپنی گدڑی میں لپٹا ہوا بیٹھا تھا جس کے سوراخوں سے سرد ہوا گھس کر اسے ٹھٹھر کنپا رہی تھی۔ پاس ہی ایک چراغ جل رہا تھا اور غریب مزدور ٹکٹکی باندھے اس کی لو کو دیکھ رہا تھا — شاید سردی کو بھول جانے کے لئے۔

اس کی نظر ایک اڑتے ہوئے مچھر پر پڑی — بہت ہی چھوٹا، کمزور اور سردی میں ٹھٹھرا ہوا۔ وہ بڑی دقت سے اڑ رہا تھا۔ جیسے سمندر میں ڈوبتا ہوا انسان دیوانہ وار ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔ وہ اڑتا ہوا آیا اور مزدور کے پاؤں پر بیٹھ گیا۔ مزدور نے اسے مارنے کے لئے ہاتھ اٹھایا مگر رک گیا۔ مچھر بالکل بے حس و حرکت بیٹھا ہوا تھا، اپنی ننھی ننھی ملتجی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

مزدور جانتا تھا کہ بھوک کیا چیز ہوتی ہے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ مچھر بھوکا ہے۔ اس نے ملائمت سے کہا "ڈرو مت اگر میرے خون کے دو قطرے تمہارا پیٹ بھر سکتے ہیں تو میرا کیا حرج ہے۔ افسوس میرے پاس بہت خون نہیں ہے اور جو کچھ ہے وہ بہت پتلا اور شاید بدمزہ ہے اس وقت سردی بہت پڑ رہی ہے ورنہ میں تمہیں لے جاتا اور اس دولتمند شخص کے عالیشان مکان میں چھوڑ آتا جس نے آج چار من کا ایک بوجھ منگوا کر مجھے دس پیسے دیئے تھے۔ اس کا خون بہت سرخ ہے اور بہت گاڑھا اور لذیذ بھی — مگر تم بہت بھوکے ہو تم اپنا پیٹ بھر سکتے ہو۔"

مچھر بالکل ساکت بیٹھا ہوا تھا۔ گویا توجہ سے اس کی بات سن رہا تھا پھر وہ اڑ گیا — شاید یہ سن کر کہ مزدور کا خون خوش ذائقہ نہیں — شاید اس پر رحم کھا کر مزدور نے اپنی نظروں سے اس کا تعاقب کیا۔ وہ کوٹھڑی کے ٹوٹے ہوئے کواڑوں میں سے نکل کر باہر چلا گیا۔ مزدور نے ایک آہ بھری اور پھر چراغ کی لو کو دیکھنے لگا۔

ذرا سی دیر کے بعد مچھر پھر آیا — پہلے سے زیادہ سفید اور کمزور — وہ گرتا پڑتا آیا اور اس کے پاؤں پر بیٹھ گیا بلکہ لڑھک گیا اور مردہ سا ہو کر لیٹ گیا۔ وہ باہر کی سردی سے ٹھٹھر گیا تھا اور مزدور کے پاؤں کی حرارت سے خود کو گرم کرنا چاہتا تھا۔

اور پھر ذرا سی دیر میں اس میں جان آگئی۔ وہ اپنی کمزور ٹانگوں کے سہارے بیٹھ گیا، مزدور کے ہمت افزا چہرے کی طرف دیکھا اور اپنا پیٹ بھرنے لگا۔

اس نے اپنی سونڈ مزدور کی جلد میں پیوست کر رکھی تھی اور اس کا سر بالکل مزدور کے پاؤں پر ٹکا ہوا تھا۔ اس وقت وہ مزدور کو سجدہ کرتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ یکایک غریب آدمی کے چہرے پر ایک عجیب تغیر واقع ہو گیا۔ اس کی بھویں آپس میں مل گئیں۔ اس کے ماتھے پر ایک ہلکی سی شکن پڑ گئی۔ اس کا نچلا ہونٹ بالائی ہونٹ سے پیوست ہو گیا اور ذرا سی دیر کے لئے، عمر میں پہلی مرتبہ، غریب مزدور کا دل ایک عجیب، ناقابل فہم جذبے سے معمور ہو گیا۔

اور پھر اس نے اپنا ہاتھ بلند کیا اور مچھر کو مار دیا۔ . . . . .

ہوا بدستور تیزی سے چل رہی تھی۔ درختوں کی سائیں سائیں مچھر کے پروں کی کمزور پھڑپھڑاہٹ کی طرح، مزدور کے کانوں میں گونج رہی تھی اور اس گونج کے درمیان تھوڑے تھوڑے وقفے کے ساتھ کوئی اس ایک لفظ کو دہرا رہا تھا۔ "غرور"

احترام

تعلقاتِ مرد و زن پر حکماء کے مقالات

۱۔ خدا نے عورت کو مرد کی پیشانی سے نہیں بنایا کہ وہ مرد پر حکومت کرے نہ اُس کے پاؤں سے پیدا کیا کہ وہ اُس کی غلامی کرے بلکہ اس کی پسلیوں سے پیدا کیا ہے کہ وہ اُس کے دل کے قریب ہو — ہندوستان

۲۔ شادی کی دعوت میں سب سے کم دلھن کھاتی ہے — سپین

۳۔ برات کے دن کوئی عورت دلھن سے زیادہ خوبصورت نہیں ہوتی — سپین

۴۔ جب میں بہو تھی تو ساس اچھی نہ ملی جب ساس ہوئی تو بہو اچھی نہ ملی .... سپین

۵۔ بیوی ستار نہیں کہ بجایا اور دیوار پر لٹکا دیا — روس

۶۔ جس کی دو بیویاں ہوں اس کو آگ جلانے کی ضرورت نہیں — روس

۷۔ بیوہ عورت اُس کشتی کی مانند ہے جس کا چپو نہ ہو — چین

۸۔ خوبصورت لڑکی پیٹ ہی سے منسوبہ ہو کر پیدا ہوتی ہے — جرمن

۹۔ بیٹے کی شادی جب چاہے کرو، بیٹی کی جس وقت کر سکو — فرانس

۱۰۔ جو شخص شادی کے واسطے پردیس جاتا ہے وہ فریب دیتا ہے یا فریب میں آتا ہے — فرانس

۱۱۔ بیاہ جہنم بھی ہے بہشت بھی — ہالینڈ

۱۲۔ بوڑھے خاوند کو جوان بیوی قبر تک پہنچانے میں گھوڑے کی ڈاک ہے — ڈنمارک

۱۳۔ بہو کے لئے ساس شیطان ہوتی ہے — اٹلی

۱۴۔ تمہاری بیوی خواہ تم سے چھوٹی ہو، تم کوئی کام اُس کی صلاح کے بغیر نہ کرو — اٹلی

۱۵۔ جو شادی کرتا ہے وہ اچھا کرتا ہے جو نہیں کرتا وہ بہت اچھا کرتا ہے — جرمن

سید یوسف بخاری۔ دہلوی

یہ تو ہم سمجھ بیٹھے ہیں کہ یہ افسانہ ہے ڈرامہ نہیں

افسانہ!

کہاں زہرہ اور کہاں نمائش! اسے شاید معلوم ہی نہ ہو کہ نمائش ہوتی کیا ہے۔ اول تو احمد پور شہر ہی چھوٹا سا ہے۔ پھر لاہور سے اتنی دور اور سب سے زیادہ یہ کہ زہرہ جیسی لڑکی! خاموش۔ غریب۔ سادہ۔ مثلاً "زہرہ کیا کر رہی ہو" "جی کچھ نہیں"۔ "زہرہ کیا پڑھ رہی ہو" "جی کچھ نہیں یونہی رسالہ سا ہے" "زہرہ آج رشیدہ نے چائے پر بلایا ہے۔ چلو گی؟" "نہیں آپا میں کیا جاکے لوں گی"۔ "زہرہ آج تو عید ہے کوئی اچھا سا جوڑا ہی پہن لے وہ نکال لے نا وہ مخمل کا سوٹ اپنا۔ یا وہ ہری چھال کا پاجامہ اور وہ تیری کاسنی مرینہ کی قمیص وہ جس کا گھیرا اور گلا میں نے کاڑھ کے دیا تھا"۔ "نہیں آپا کیا ہے ایسی کپڑے اچھے ہیں اب کون نکالتا پھرے"۔ "زہرہ آج سیر کو چلیں گے"۔ "اچھا آپا"۔ "مگر آج تو باہر کیچڑ ہوگی کل کی بارش نے سڑکوں کا ستیاناس ہی کر دیا ہوگا"۔ "جی" "تو پھر کل چلیں گے" "اچھا جی"۔ زہرہ! اے زہرہ!! "جی امی جان"۔ "اِدھر تو آ ذرا اس مشین کو دیکھ بخیہ ٹھیک نہیں کرتی اسے تیل دے" "اچھا جی"۔ "آپا زہرہ! آپا زہرہ!! یہ سوال تو ذرا دیکھ دینا۔ ٹھیک نہیں آتا" "ابھی آپا زہرہ!" "آتی ہوں"۔ "زہرہ!" "جی ابا جی"۔ "بیٹا میری بیٹی اور گیٹرز کو عرصہ ہوا کسی نے پالش نہیں کیا۔ یہ نوکر بہت حرام خور ہے کرتا بھی ہے تو ایسی بددلی سے کہ پالش گیٹرز پر ویسے ہی لگا رہتا ہے اور پہنتے ہوئے سب ہاتھ خراب ہو جاتے ہیں" "ابھی کر دیتی ہوں ابا جی"۔ "زہرہ تیرے دولہا بھائی آج آئیں گے۔ مجھے اپنا کمرہ ذری آراستہ کرنا ہے میرے ساتھ آو گی!" "تو آپا جان یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے"۔ کہاں ایسی لڑکی اور کہاں لاہور کی نمائش، اسے کیا معلوم وہاں کیا ہوتا ہے اور قسمتیں کیسے بن اور بگڑ سکتی ہیں!

زہرہ کی آپا بتول کا بیاہ ہوا تو بتول سے زیادہ زہرہ روئی کہ اب آپا بتول جانے غیروں میں کیسے رہے گی۔ زہرہ کے دولہا بھائی حامد حسن بنکوں کے انسپکٹر تھے۔ اس لئے انہیں اکثر دورہ پر رہنا پڑتا تھا۔ زہرہ کی خوش قسمتی کہ آپا بتول سال میں کئی مہینے میکے میں کاٹتی۔ آپا بتول کے بیاہ میں سب سے زیادہ کام زہرہ ہی کو کرنا پڑا۔ مگر زہرہ کی آپا کا بیاہ تھا زہرہ کام نہ کرتی تو اور کون کرتا۔ زہرہ کی عمر اب سترہ سال کی تھی۔ آٹھویں جماعت دو سال ہوئے پاس کر لی تھی۔ زہرہ کے ابا نے کہا اب یہی کافی ہے۔ زیادہ تعلیم بھی ٹھیک نہیں! اور پھر احمد پور میں زنانہ سکول ہی کوئی انٹرنس تک نہ تھا۔ زہرہ کے نام دو ایک رسالے جاری کرا دیئے اور اردو میں جو کوئی مفید کتاب اس کے ابا کے دائرۂ علم میں آجاتی وہ زہرہ کے لئے منگوا دیتے۔ زہرہ کو اور کیا چاہیئے تھا۔ چھوٹے بھائی تھے۔ محلہ میں دو ایک سہیلیاں تھیں۔ زہرہ کی زندگی بہت خوشگوار تھی۔

زہرہ کی اماں کو الف لیلہ کا بہت شوق تھا۔ خود تو انہیں بچوں سے ہی کب فرصت ہوتی تھی۔ اس لئے سردیوں میں ابا کے مردانے سے آنے سے پہلے وہ روز زہرہ سے الف لیلہ سنا کرتی تھیں۔ الف لیلہ کئی دفعہ ختم ہو چکی تھی مگر اماں کو ان کہانیوں سے ایسا رس تھا کہ بار بار سُنے جاتیں۔ زہرہ بیچاری سترہ سال کی تھی۔ دنیائے عشق کا تجربہ اسے الف لیلہ یا رسالوں ہی کے ذریعہ سے ہوتا۔ وہ حیران ہوا کرتی کہ لوگ

کس طرح ایک دوسرے پر عاشق ہوجاتے ہیں اور پھر عشق و فراق میں کیسی کیسی تکلیفیں اٹھاتے ہیں۔ مگر ایسی باتیں اس کے دماغ پر کوئی نقش نہ چھوڑتیں اور پھر دولہا بھائی بھی الف لیلہ کی کہانیوں پر بہت ہنسا کرتے تھے۔

دولہا بھائی کے والد کہیں سب جج تھے۔ پہلے وکیل تھے پھر سب جج ہوگئے۔ اُن کا ارادہ تھا کہ دولہا بھائی کو وکالت پاس کرائیں مگر دولہا بھائی کو وکالت سے بہت نفرت تھی۔ وہ کہتے تھے کہ جب کبھی کچہری میں جاؤ۔ بیس بیس وکیل ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے ہوں گے یا مکھیاں مار رہے ہوں گے پھر وکالت میں یوں انتظار کرنا پڑتا ہے۔ بس بیکار بیٹھے رہو۔ بیکار بیٹھنا دولہا بھائی کے لئے ناممکن تھا۔ اسی لئے اگرچہ کہتے تھے کہ بینکوں کی انسپکٹری بڑی ملعون نوکری ہے مگر کم از کم آدمی بیکار تو نہیں بیٹھتا۔ اپنے بیاہ میں چاہتے تھے کہ خود ہی سب انتظام کریں مگر یہ ہو کیسے سکتا تھا۔ سہرہ بندھا ہوا برات کے ساتھ بیٹھے ہوئے۔ مگر نظر ہر طرف۔ رت کا انتظام یوں تو ان کے ابا کے ہاتھ میں تھا مگر کرنا ان کے چھوٹے بھائی کو پڑا تھا۔ کہتے کہ بھئی مظہر کرتا تو سبھی کچھ تھا مگر مجھے اس کا انتظام پسند نہ آتا تھا۔ وداع کے وقت سب برتنوں کپڑوں اور سامان کی فہرست بنالینی چاہیئے تھی۔ نقصان سے تو بچ جاتے۔ اب اماں (یعنی بتول کی والدہ) کہتی ہیں کہ دو درجن مراد آبادی گلاس تھے، ہمارے گھر پہنچے ہی نہیں! یہ مظہر کالج کا بانکا، اسے کیا آئے براتوں کا انتظام کرنا۔ اسے تو سوٹ پہنے سیریں کرنے اور سینما دیکھنے کو چاہئیں۔ وہ تو اور کوئی تھا نہیں ورنہ کام تو الگ سامان کی طرف دیکھتا بھی نہیں۔

دولہا بھائی کی اور باتیں تو زہرہ قبول کرلیتی مگر مظہر کے متعلق جو کچھ وہ کہتے زہرہ کو ناپسند ہوتا۔ کیونکہ انصاف کا تقاضا یہی تھا بلکہ اکثر اوقات تو زہرہ سنتے سنتے گھبرا کر اٹھ جاتی۔ اس کا دل دولہا بھائی کی باتوں سے الجھنے لگتا۔ اپنے سے کہتی کہ دولہا بھائی بہت ناانصافی کرتے ہیں۔ میں نے خود بھائی مظہر کو برتنوں اور جہیز کی دوسری چیزوں کو باقاعدہ اور اچھی طرح رکھواتے اور الٹواتے دیکھا ہے۔ وداع کے وقت بھائی مظہر تو دو گھنٹہ اندر صحن میں سب چیزوں کو صندوقوں میں رکھواتے اور بوریوں میں بھرواتے رہے، دولہا بھائی کو کیا پتہ۔ میں نے تو انہیں خوب اچھی طرح دیکھا ہے۔ ایسے سلیقہ اور نرمی سے کام لے رہے تھے۔ کیا خوبصورت سوٹ پہنے ہوئے تھے اور کیسے استغنا کے ساتھ ادھر اُدھر اٹھتے بیٹھتے تھے اور کس طرح ہنس ہنس کر بے تکلفی سے سب کام کی نگرانی کر رہے تھے۔ اول تو مانتے میں ہی نہیں آتا کہ چار گلاس گم ہوگئے اور اگر ہو بھی گئے ہوں تو ان کا اس میں کیا قصور ہے۔ بس کھو گئے ہوں گے۔ وہ کیا بوریوں اور صندوقوں کے ساتھ جُڑے رہتے۔ لوچی انتظام اور وہ نہ کرسکیں! زہرہ کے گال غصہ سے لال ہوجاتے۔

آپا بتول کے کمرے میں انگیٹھی پر ایک چوکھٹے میں دولہا بھائی کی، ان کے والد کی اور ان کے بھائیوں کی تصویر تھی۔ جبھی آپا بتول آئیں یہ تصویر انگیٹھی پر درمیان رکھی جاتی۔ پہلے پہل تو آپا بتول ہی نے سب کو یہ تصویر دکھائی تھی۔ مگر اب زہرہ جب کبھی آپا کے کمرہ میں جاتی اور جانا اکثر ہوجاتا تھا تو یونہی پھرتے پھراتے آتشداں کے پاس سے اس کا گزر ہوتا اور آتشداں تھا بھی رستہ ہی میں، تو ایک آدھ منٹ کے لئے وہ تصویر ضرور زہرہ کو روک لیتی۔ تصویر تھی بھی خوب کھنچی ہوئی۔ بیچ میں دولہا بھائی کے والد دائیں طرف دولہا بھائی خود اور بائیں طرف ان کے

چھوٹے بھائی منظر۔ باقی ادھر اُدھر۔ ایسی اچھی تصویر تھی کہ ہر ایک کا ایک ایک نقش ٹھیک دکھائی دیتا تھا اور پھر بعضوں کو شاید تصویر کھنچوانے کا انداز ہی آتا ہے کیونکہ سب سے اچھی تصویر بھائی منظر ہی کی معلوم ہوتی تھی۔ بالکل وہی شکل جو برات کے دن دیکھی تھی۔ بالکل بیٹھنے کا انداز بھی ویسا ہی، وہی ہلکا سا تبسم۔ یوں تو دولھا بھائی سے شکل ملتی تھی مگر دولھا بھائی کے نقوش کچھ بھدے نہیں تھے کیا؟ اور دولھا بھائی یوں بھاری بھی زیادہ تھے۔ کہاں وہ متناسب سا جسم کہاں دولھا بھائی!

مگر یوں دولھا بھائی دل کے بہت اچھے تھے۔ اکثر اپنے بھائی بہنوں ہی کا ذکر کیا کرتے۔ بھائیوں میں منظر کی بہت تعریف کرتے۔ کہتے انتظامی قابلیت تو اس میں ہے نہیں (اگرچہ اس بارے میں ضروری نہ تھا کہ سب ہی ان سے اتفاق کریں) مگر ویسے لائق ہے۔ ابا کہتے ہیں ضرور اچھا وکیل نکلے گا۔ اب ایل ایل بی میں پڑھتا ہے۔ دو ایک سال میں اچھا خاصا کمانے لگ جائیگا۔ ابا جہاں سب جج ہیں وہیں اپنے پاس رکھیں گے۔ دو ایک سال تو وہاں کسی اچھے وکیل کے ساتھ کام میں لگائیں گے۔ پھر ان کا ارادہ ہے کہ چونکہ احمد پور میں کوئی قابل مسلمان وکیل نہیں اس لئے یہیں وکالت شروع کی جائے۔ زہرہ کو دولھا بھائی کی باتیں بہت پسند آتیں۔ کہتے اگلی گرمیوں میں خوب شکار کھیلیں گے۔ احمد پور کے گردونواح میں خوب پانی ہوتا ہے۔ مرغابیوں اور مچھلیوں کا شکار خوب ہوگا۔ بندوق ہے ہی کوئی اچھا سا جال بنواتے ہیں اور باقی بنسیاں وغیرہ سب تیار رکھیں گے۔

دولھا بھائی تقریباً ہر مہینہ کچھ دنوں کے لئے ضرور احمد پور آجاتے۔ زہرہ کو بھی دولھا بھائی کا انتظار رہتا۔ ان کے آنے سے گھر کی رونق چارگنی ہو جاتی اور پھر وہ باہر کی دنیا کی خبریں لاتے۔ لاہور کا ذکر ہوتا۔ وہاں کے کالجوں کا ذکر ہوتا۔ اپنے طالب علمی کے زمانے کی باتیں ہوتیں۔ لا کالج کے متعلق ذکر کرتے منظر کی باتیں ہوتیں۔ زہرہ کو کالجوں کی زندگی کی تصاویر جو دولھا بھائی کھینچ کر دکھاتے، بہت ہی بھاتیں۔

دولھا بھائی نے ایک دن خلوت میں بتول سے پوچھا کہ زہرہ اب جوان ہوگئی ہے تمہاری اماں نے کوئی رشتہ نہیں سوچا۔ بتول نے کہا مجھے تو علم نہیں اور ابھی زہرہ ہے بھی بچی" آج کل میں کوئی نہ کوئی مل ہی جائیگا۔ حامد نے کہا "میں بتاؤں! منظر لڑکا بہت اچھا ہے اور وکالت بھی جلد چلالے گا۔ گھر کا گھر ہے۔ تم اپنی اماں سے بات کرو"۔ بتول بھی اس بات سے خوش ہوئی کہ زہرہ کہیں غیر گھر تو نہ جائیگی اور پھر دونو ایک ہی جگہ اور لڑکا تو منظر سا۔ اس نے بھی اپنی اماں سے بات کرنے میں دیر نہ کی۔ اماں نے کہا میں تمہارے ابا سے بات کروں گی۔ ایسے جلدی میں کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ سوچ بچار کے بعد فیصلہ کرنا چاہیئے۔ لڑکا ابھی پڑھتا ہے اور جانے کب اس کی وکالت چلے۔ ورنہ اس سے اور کیا زیادہ خوش قسمتی ہو سکتی ہے کہ تم دونو ایک ہی گھر جاؤ"۔ بتول نے کہا "اماں منظر تو سب کہتے ہیں بہت ہونہار لڑکا ہے اور ایسا سجیلا جوان ہے ایسے رشتے کم ملتے ہیں"۔ اماں بولی "پھر بھی تمہارے ابا کی مرضی بغیر میں کیسے کہہ دوں"۔ اس دن اس سے زیادہ بات نہ ہوئی۔

مگر زہرہ کے ابا کو بھی مظہر کے خلاف سوائے اس کے کہ ابھی پڑھتا ہے کچھ نہ سوجھی۔ مگر دولھا بھائی نے بتول سے کہا کہ کیا ہوا ہمارے ابا بھی چاہتے ہیں کہ ادھر مظہر ایل ایل بی کرے ادھر اس کی شادی کر دیں۔ کیونکہ ان کا خیال ہے کہ اگر بیوی گھر میں ہو گی تو مظہر ذمہ داری زیادہ محسوس کریگا اور اور بھی دل لگا کر وکالت میں کوشش کریگا۔ اب زہرہ کا ان سے ذکر کروں تو خوشی سے اچھل پڑیں۔ ایسی شریف اور سگھڑ بہو انہیں کہاں سے ملے گی۔

چنانچہ قرار پایا کہ دولھا بھائی اپنے ابا کو لکھ دیں۔ ادھر سے کیا دیر لگتی۔ ابھی ہفتہ پورا نہ ہوا تھا کہ دولھا بھائی کو خط ملا کہ تمہاری اماں کی طبیعت قدرے علیل ہے اس لیئے وہ تو ذرا تھوڑے دنوں میں آئیں گی تم ہماری طرف سے زہرہ کی والدہ کو شگن دے دو۔ دولھا بھائی تو تیار ہی بیٹھے تھے اور اب چونکہ ابتدائی رسوم بھی انہیں کے سپرد ہو گئیں اور بھی پھولے نہ سمائے۔ زہرہ کی اماں سے کہا کہ ہم اپنے گھر سے میں گانا کرائیں گے آپ کو ہمارے ہاں بحیثیت سمدھن کے آنا ہوگا انہوں نے کہا کہ بیٹا مظہر کو بھی پوچھ لیا ہے۔ کہنے لگے "اجی اس سے کیا پوچھیں وہ ابھی بچہ ہے" پھر بھی جب اماں آئیں گی اور باقاعدہ منگنی ہو جائیگی تو اسے اطلاع دے دیں گے"۔ زہرہ سے اگرچہ کسی کو نہ کہنا تھا مگر بچوں نے تو باتیں سن گن لی تھیں۔ چنانچہ جب دولھا بھائی کے والد کا خط آیا اسی دن انہوں نے خبر پہنچا دی۔ زہرہ اس وقت مصالحہ بھون رہی تھی کہ ننھا احسن آپا آپا کہتا دوڑ کے گلے جا لپٹا اور منہ کان کے پاس لے جا کر لگا جلدی جلدی باتیں کرنے۔ زہرہ نے کہا بھی "دیکھ مجھے بھوننے دے اور پھر کندھے جھٹک کر اسے علیحدہ کرنے کی کوشش بھی کی مگر اس نے بھی بات پوری کہہ کے ہی چھوڑا۔ غالباً زہرہ کو اپنے آپ کو چھڑانے میں کافی کوشش کرنی پڑی ہو گی۔ کیونکہ جب احسن علیحدہ ہوا تو زہرہ کا چہرہ گلنار ہو رہا تھا۔

زہرہ کی سعادتمندی کے متعلق کسی کو شک نہ تھا مگر ان دنوں ننھی کی طبیعت ٹھیک نہ ہونے پر اس نے اس تن دہی سے اپنی اماں کی خدمت کی کہ انہیں اکثر کہنا پڑا کہ زہرہ اب تم آرام کرو تھک گئی ہو گی۔ مگر زہرہ کے چہرے پر تھکن کے آثار بالکل پیدا نہ ہوتے۔ رنگ اپنا تھا پر تھا کہ بتول ایک دن کہہ اٹھی "زہرہ تو سفیدہ تو نہیں ملتی؟" اور جب زہرہ نے شرما کر کہا کہ نہیں آپا میں نے تو کبھی سفیدہ نہیں استعمال کیا تو بتول اور حیران ہوئی کیونکہ اس وقت زہرہ کا تمام چہرہ ماتھے تک گلاب کے پھول کی چمک اٹھا۔ زہرہ خود محسوس کرتی اور حیران بھی ہوتی کہ صبح کا وقت کتنا خوشگوار معلوم ہوتا ہے اور رات کو تارے بھی کتنے دلکش دکھائی دیتے ہیں جیسے میں نے پہلے کبھی دیکھے ہی نہیں۔ محلہ میں اگر کہیں گانا ہوتا تو زہرہ کو یونہی بلا وجہ کچھ سرور سا محسوس ہوتا۔ دل میں ہر چیز کے لئے کچھ شوق سا پیدا ہو گیا زندگی ایسی بشاش اور دن رات ایسے شیریں محسوسات سے لبریز ہوتے کہ زہرہ بیچاری خود اپنے جذبات سے گھبرا جاتی۔

دولھا بھائی کی والدہ جب آئیں تو منگنی پختہ ہو گئی۔ دولھا بھائی نے اس پر مظہر کو اطلاع دے دی کہ بھئی تم نہایت خوش قسمت ہو کہ ہمیں تمہارے لئے ایسی اچھی اور خوبصورت اور نیک لڑکی مل گئی ہے۔ ابا چاہتے ہیں کہ آتی گرمیوں میں تمہارا نکاح کر دیں اور پھر دسمبر میں بیاہ۔ میں نہیں کہتا کہ تم مجھ سے اچھے ہو مگر انصاف یہ ہے کہ تم برے بھی نہیں ہو۔ مظہر کو یہ بالا بالا کارروائی پسند نہ آئی۔ پہلے تو اس نے

سوچا کہ میں نے زہرہ کو دیکھا بھی تھا کہ نہیں مگر یاد نہ آیا۔ پھر بھابی جان کے نقوش کو خیال میں رکھ کے زہرہ کے حسن کی بابت قیاس کرنے کی کوشش کی مگر چنداں کامیابی نہ ہوئی۔ بہرحال یہ بات اگر کامل طور پر تسلی بخش نہ تھی تو کم از کم مایوس کن بھی نہ تھی کہ بھابی بتول ایک خوبصورت لڑکی تھیں۔

انہیں دنوں لاہور میں نمائش تھی۔ سارے شہر میں دھوم تھی کہ نمائش کیا ہے مینا بازار ہے۔ کیا ٹھاٹھ ہیں! کیا جلوے ہیں!! اور کیا بہاریں ہیں!!! منظر کے دوستوں نے کہا "یار اکیلے دکیلے تو ایک آدھ دفعہ ہو آئے ہیں کبھی اکٹھے نمائش کی سیر نہیں کی۔ اگر تم چلتے ہو تو آج سب ہی چلیں۔ دو ایک گھنٹے لطف سے کٹ جائیں گے۔" منظر نے کہا "کچھ خریدنا نہ ہو تو یوں اواگون پھرنا بیہودہ معلوم ہوتا ہے۔" اس پر باقیوں نے بہت شور مچایا کہ تم کیسی بچر باتیں کرتے ہو خریدنا اور نمائش میں جانا کوئی لازم وملزوم باتیں نہیں۔ بس ٹہلیں گے، سیر کریں گے، جہاں کوئی چیز دلپسند دیکھی کھڑے ہو گئے نہیں تو آگے کی راہ لی۔ کسی نے کہا "ارے بھئی تم نے وہ سنا ہے جو چھلانگ لگاتا ہے، تڑ تڑ سے اور پھر کپڑوں کو آگ لگا کے، دیکھنے کے قابل ہے پھر لوگ ہوتے بھی وہیں زیادہ ہیں۔ وہ عطر کی لپٹیں اور وہ رنگوں کا خمار ہوتا ہے کہ ہٹنے کو جی نہیں چاہتا میں تو گزشتہ اتوار کو دو گھنٹے اسی تفریح گاہ میں رہا۔" منظر نے کہا "برخوردار تمہاری عادتیں روز بروز بدتر ہوتی جاتی ہیں کسی دن خوب پٹو گے۔" اس نے کہا "بھئی تم اپنی خبر لو، روز بروز چغد بنتے جا رہے ہو۔ تمہیں تو خوبصورت چیزوں اور روشنی سے وحشت ہو گئی ہے۔ ہم سب کہہ رہے ہیں نمائش کو چلو کچھ دیکھ لو گے اور تم ماش کے آٹے کی طرح اینٹھے جا رہے ہو، ساری عمر قسمت کو روؤ گے، ایسا موقع ہاتھ نہ آئے گا۔"

غرض کھینچ گھسیٹ کر منظر کو دوست نمائش میں لے گئے۔ وہاں عالم ہی اور تھا۔ دوکانیں سجی ہوئی تھیں کہ جیسے کسی مصور نے شوخ رنگوں کا کوئی مرقع تیار کر رکھا ہو۔ زیبائشیں تھیں اور بھڑک تھی کہ آنکھیں چکاچوند ہو جاتی تھیں۔ لوگ تھے جیسے کسی میلے میں آ رہے ہیں، ایسی سج دھج، ایسے لباس کہ نظر نہ ٹھہرتی تھی۔ اور پھر بھیڑ! یوں ریلے پہ ریلا آتا تھا کہ قدم ایک جگہ جمانے مشکل ہو جاتے تھے یونہی پھرتے پھراتے منظر اور اس کے دوست ایک طرف مڑ جو مڑے تو ابھی کسی خاص دکان کی طرف متوجہ ہوئے بھی نہ تھے کہ ایک ریلا ایسا آیا کہ منظر چار قدم اکھڑ کے ایک دوکان کے سامنے جا لگا۔ اتفاق کی بات کہ وہیں ایک ساڑھی پوش خاتون مع اپنے ساتھیوں کے کھڑی تھی۔ دھکا ایسا زور کا تھا کہ منظر عین اس کی پشت پر جا لگا اور اتنا قریب کہ اس کے بالوں کی خوشبو اُسے پہلے دو لمحوں ہی میں محسوس ہونے لگی۔ وہ خاتون بیچاری بہت گھبرائی اور اس نے ایک طرف ہٹنے کی کوشش بھی کی مگر دونو طرف لوگ ہی لوگ تھے پیچھے پشت پر منظر تھا اور اس کا جسم اُسے چھو رہا تھا! منظر خود بہت پریشان ہوا۔ اس نے کھسیانے پن سے کہا بھی کہ معاف کیجئے اس میں میرا کوئی قصور نہیں، میں خود مجبور ہوں، ہل نہیں سکتا۔ مگر اس سے بھی صورت حالات میں کوئی بہتری پیدا نہ ہوئی۔ یہ قرب لڑکی کے لئے غالباً بہت ناگوار ہو رہا تھا اس لئے منظر نے ہٹنے کی کوشش کی تاکہ سیدھا ہو کے لوگوں کو اگر پیچھے نہ کرے تو کم از کم خود ہی نکل جائے مگر اس کوشش میں پیچھے سے ایک اور ریلا دھکا لگا۔ اس نے

پھر معذرت کی۔ اس پر لڑکی نے تدرے مڑ کر دیکھا اور کہا نہیں آپ کا کیا قصور ہے مگر منظر کو اس کے بعد یہ معلوم نہ ہوا کہ وہ ریلا کب گزر گیا اور کیسے۔ اس دوکان پر کھڑا رہ گیا۔ لڑکی کی شکل اور شمائل سے زیادہ آنکھیں اور آنکھوں سے زیادہ آواز ایسی سحر کن تھی کہ منظر ایک پل کے لئے اپنی ساتھیوں کو بھول گیا۔

شرافت اور آداب گوارا نہیں کرتے تھے کہ وہ بلا وجہ اس دکان پر کھڑا رہے مگر اس لڑکی کا جسم جسے اب وہ اچھی طرح دیکھ سکتا تھا اور اس کا کھڑے ہونے کا انداز کچھ ایسا جاذب نظر تھا کہ اس سے جایا بھی نہیں جاتا تھا۔ چنانچہ اس وقت سے لے کر اور شام تک دو گھنٹے متواتر کبھی نزدیک کبھی دور، جہاں جہاں اور جس جس دکان پر وہ ساڑھی والی اور اس کی پارٹی کھڑی ہوتی منظر موجود رہتا۔ ایک دفعہ اس کے دوستوں نے اسے سخت مجبور بھی کیا کہ کہیں اور یا پھر تفریح گاہ ہی میں چلے مگر وہ نہ مانا اور کبھی اکیلا کبھی ایک آدھ کے ساتھ، ساری نمائش گاہ میں، تمام وقت اس لڑکی کا طواف ہی کرتا رہا۔ لڑکی بھی اس متواتر اور مکرر قرب کی وجہ سے پہچان گئی تھی کہ یہ وہی نوجوان ہے جو اس ریلے میں اس سے قریب ہو گیا تھا مگر ہر دو منٹ بعد ایک نگاہِ غلط انداز ڈالنے کے سوا وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔

اس عرصے میں منظر نے اس لڑکی کو ہزار دیدہ سے دیکھ لیا تھا اور ہر لحظہ اور ہر منظر اس کا ایک ایک نقش، ایک ایک انداز اس کے دل پر نقش ہوتا جاتا تھا۔ رفتار کی اک لچک تھی کہ منظر کے ہوش اڑائے دے رہی تھی۔ جسم ایسا سیدھا اور جامہ زیب تھا کہ ساڑھی کے باوجود بھی بدن کا کوئی خط، کوئی خم ایسا نہ تھا جو نمایاں نہ ہوتا ہو۔ چہرے کو شباب کی تازگی نے وہ جاذبیت دے رکھی تھی کہ ہر جھلک پر منظر گھبرا جاتا اور اکثر اس کی آنکھیں جھک جاتیں اور پھر آواز میں ایک ایسا لوچ ایسا ترنم سا تھا کہ اس کا ہر لفظ جو وہ اپنے ساتھیوں سے کہتی منظر کے دل میں اتر جاتا۔

منظر خود بھی ایک خوش پوش اور خوش قامت نوجوان تھا۔ عام طور پر لوگ خود ہی اسے دلچسپی سے دیکھا کرتے تھے اور اب بھی دو ایک دفعہ وہ لڑکی اس کے پاس سے شاید فقط اسے نظر بھر کر دیکھنے کے واسطے ہی گزری۔ مگر ایسے مواقع کتنے زیادہ ہو سکتے تھے۔ آخر شام ہونے لگی۔ بجلیاں روشن ہونی شروع ہو گئیں اور منظر کو یہ خیال مضطربانہ اصرار سے آنے لگا کہ اب شاپنگ ختم ہو گئی ہے اور کوئی دم میں وہ پارٹی یہاں سے چلی جائیگی۔ بیقراری سے ان کے ادھر ادھر، ساتھ ساتھ پیچھے آگے پھرتا رہا حتی کہ وہ سب جنوب مغربی دروازے کی طرف ہو لیں تو منظر سب ساتھیوں کا ساتھ چھوڑ بیٹھا کہ ان کے پیچھے ہو لیا۔ مگر کہاں تک! دروازے کے باہر ان کی موٹر کھڑی تھی اور ایک اور جھلک ایک اور نگاہ اور پھر منظر وہاں اکیلا کھڑا رہ گیا۔

رات کو جب واپس اپنی جگہ پر آیا تو دل ڈوبا ہوا تھا۔ مطلق جی نہ چاہتا تھا کہ کچھ پڑھے یا کسی سے بات کرے اس لئے کھانا کھا کے اس نے کپڑے اتارے اور بستر میں جا لیٹا۔ مگر ابھی معمول سے بہت سویرا تھا اس لئے اسے نیند نہ آئی اور پھر سو لے کو شاید ایسی جلدی جی بھی نہ چاہتا تھا۔ اندھیرے میں سہ پہر کے تمام واقعات اس نے اپنے دماغ میں ایک ایک کر کے نہایت تفصیل سے دہرائے۔ کس طرح وہ ریلا آیا اور پھر اس لڑکی کا نرم اور خوشبودار جسم، وہ نگاہیں، وہ آواز، وہ چال اور پھر اس کا یوں چلے جانا۔ جوں جوں سوچتا طبیعت پریشان ہوتی جاتی۔

اس واقعہ کے تیسرے دن زہرہ کے دولھا بھائی کو نظر کا خط ملا کہ مجھے آپ کی ایسی کارروائیاں ہرگز منظور نہیں۔ میں کوئی بچہ نہیں ہوں اور نہ میں یوں آنکھیں بند کئے کھائی میں گرنے کو تیار ہوں۔ بلکہ میں منگنی اور شادی وغیرہ کے لئے ابھی بالکل تیار نہیں۔ یہ غلطی آپ نے خود کی ہے۔ اس لئے اس کا خمیازہ بھی آپ ہی کو بھگتنا ہوگا۔ میں اس جگہ کیا کسی جگہ شادی کرنے کے لئے تیار نہیں بلکہ میں کافی عرصہ تک شادی کے مسئلہ کو خیال ہی میں نہیں لانا چاہتا۔ اگر آپ لوگ مجھ کو مجبور کرنے کا ارادہ کریں گے تو یہ آپ کی اس سے بھی زیادہ غلطی ہوگی اور اسی صورت میں نتائج کے ذمہ دار آپ ہوں گے۔

بتول کو یہ بات اپنی ماں کو بتانی پڑی۔ پہلے تو وہ چپ سی رہ گئیں۔ پھر انہوں نے کہا شکر ہے ہم نے ابھی برادری میں بھاجی نہیں بانٹی تھی اور جب ابا کو اس کا علم ہوا تو وہ کہنے لگے بہت بدتمیز اور ناخلف ہے یہ لڑکا! آج کل کے لونڈے ہوتے ہی ناشدنی ہیں۔ اپنے آپ کو نواب زادے ہی تصور کرتے ہیں۔ چلو خس کم جہاں پاک۔ بتول نے پوچھا۔ "اماں زہرہ کو بتانا چاہیئے کہ نہیں" وہ بولیں "اسے بتانے کی کیا ضرورت ہے۔ اسے کیا ایسی باتوں سے!"

فیاض محمود

محبّت کا نیا دور

صنم کدوں کا وہ طوفانِ رنگ و بو۔ توبہ! وہ دل میں اک خلشِ ذوقِ جستجو۔ توبہ!
فروغِ حُسن سے بہکی ہوئی نگاہیں تھیں دل ایک ہی تھا مگر لاکھ جلوہ گاہیں تھیں
خرابِ شوق تھی مرغِ خیال کی پرواز ہر آستاں کو سمجھتا تھا آستانۂ ناز
خدا کا شکر ہے وہ دورِ اضطراب گیا جنونِ شوق کا وہ عہدِ پیچ و تاب گیا
سمٹ کے آئے ہیں جذبات ایک مرکز پر پناہِ دامنِ الفت میں لے گا ذوقِ نظر
حریمِ شوق ملا ہے جبینِ طاعت کو قرار آئے گا بھٹکی ہوئی محبّت کو

سوالِ عشق نے اپنا جواب ڈھونڈ لیا
نظر نے جلوۂ صد آفتاب ڈھونڈ لیا

"ذوقی"

صدمۂ ہجراں

تضمینِ قطعۂ فصیح الملک حضرتِ داغ دہلوی

خوش فکر سمجھتا ہو جسے صدق سا خوش گو
کس دل کو نہ غم ہوگا وہ مغموم اگر ہو
افسردہ و دلگیر و حزیں دیکھ کے اُس کو
کل داغ سے پوچھا یہ کسی نے کہ بتا تو
کیا حال ہے اے بسملِ صمصامِ جُدائی

کس شوخ کے اندازِ تغافل کا ہے بسمل
کس شمع کا پروانہ ہے کس گُل پہ ہے مائل
معلوم تو ہو باعثِ افسردگیٔ دِل
سرشار ہے کیوں بادۂ اندوہ سے غافل
گردوں نے پلایا تجھے کیا جامِ جدائی

یہ کس کی محبّت نے بنایا ترا نقشا
لاغر ہے بدن خشک ہیں لب زرد ہے چہرا
سب ہجر کے آثار ہیں صورت سے ہویدا
آنکھوں سے برستے ہیں دُرِ اشکِ تمنا
سینہ ہے ترا مخزنِ آلامِ جدائی

درپیش ہے کس دوست کی دوری کا تجھے غم
کس دشمنِ جاں کے لئے تیرا ہے یہ عالم
رہ رہ کے یہ کیوں سینے میں ہُوک اُٹھتی ہے پیہم
کیوں دل پہ ترا ہاتھ ہے کیوں چشم ہے پُرنم
ہے تجھ سے جدا کون سا آرامِ جدائی

حد بھی ہے کوئی رنج کی اے کشتۂ ابرو
بس کھینچ نہ آہیں نہ بہا آنکھوں سے آنسو
جیتا ہے تو مِلنے کا نکل آئے گا پہلو
آغازِ جدائی کو جدائی نہ سمجھ تو
ہوتا ہے وصال ایک دن انجامِ جدائی

ممکن نہیں کیا چارۂ دردِ دلِ مضطر — لیکن ہے ہر اک کام کا اک وقت مقرر
ہوگی تجھے پھر دولتِ دیدار میسّر — ہاں صبر ہے درکار کہ اُس عربدہ جو پر
حسرت نہ کھلی وصل کی ہنگامِ جدائی

مرتا ہے مگر کس ستم آرا پہ بتا تو — کس کے لئے بیتاب ہے معلوم تو کچھ ہو
کیا محرمِ اسرار سمجھتا نہیں ہم کو — یہ سُن کے کہا ہائے نہ پوچھو یہ نہ پوچھو
کچھ اور کرو ذکر نہ لو نامِ جدائی

کس منہ سے کروں آہ میں اقرارِ محبّت — شایانِ محبت نہ سزاوارِ محبّت
چھیڑو نہ مجھے چھیڑ کے اذکارِ محبّت — احباب کہ تھے واقفِ اسرارِ محبّت
جھنجھلائے کہ اُو موردِ الزامِ جدائی

مرتا ہے مگر ضبطِ محبّت کے ہیں دعوے — دے اُن کو یہ فقرے جو نہ ہوں جاننے والے
واقف نہیں کون اس تری شوریدہ سری سے — ہم پوچھ کے احوال خطاوار ہی ٹھہرے
گویا کہ دیا ہم نے یہ پیغامِ جدائی

بے جا نہیں تجھ سے ترے احباب کو نفرت — سچ ہے کہ نہیں رحم کے قابل تری حالت
بس دیکھ کے بے مہریٔ اربابِ مروت — اک نالہ کیا مرغِ گرفتار کی صورت
مطلع یہ پڑھا اُس نے تہِ دامِ جدائی

کیا پوچھتے ہو تلخیٔ آلامِ جدائی — دشمن کو بھی پینا نہ پڑے جامِ جدائی
دل کانپتا ہے سُن کے مرا نامِ جدائی — اللہ نہ دے گردشِ ایّامِ جدائی
کم صبحِ قیامت سے نہیں شامِ جدائی

صدق جائسی

برنارڈ شا کا طریق تصنیف

برنارڈ شا نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے ذیل کی سطور قلم بند کی تھیں :-

جب مجھے کوئی ایسی بات کہنی ہوتی ہے جو لوگوں سے کہنے کے قابل ہو تو میں قلم یا ٹائپ رائٹر لیتا ہوں اور اسے لکھ کر شائع کرا دیتا ہوں: چلو چھٹی ہوئی۔ مجھے خیالات کی تلاش نہیں کرنی پڑتی خیالات خود بخود چلے آتے ہیں اگرچہ ان میں سے اکثر امتحان کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے اور مسترد کر دیئے جاتے ہیں۔ اچھی تحریروں میں اُن خیالات کا جو کسوٹی پر چڑھنے کے لئے پیش ہوتے ہیں صرف دو فیصدی حصہ باقی رہتا ہے۔ شمپین یا سائیڈر کا ایک جام پچیس فیصدی یا اس سے بھی زیادہ خیالات کی بقا کا موجب بن سکتا ہے تصنیف کے معیار کی عمدگی اثنائے تحریر میں یا اس سے قبل خیالات کا کڑے سے کڑا امتحان کر لینے پر منحصر ہے عموماً ایک صفحہ دہرانے پر ایک صفحہ لکھنے سے زیادہ وقت صرف ہوتا ہے۔

اس میں دو حدود ہیں۔ ایک طرف تو تصحیح کی اُجرت جو آج کل خوفناک طور پر بڑھ گئی ہے اور جس کی وجہ سے مسودے کو انیسویں صدی کے مقابلے میں جب تصحیح کے مصارف مقابلتہً ناقابلِ اعتنا تھے بہت زیادہ مرتبہ دہرائے بغیر بن نہیں پڑتی اور دوسری طرف مصنف کی قوتِ برداشت جسے ایک ہی مضمون پر اپنی توجہ مرکوز رکھنے کی طاقت تصنیف کے کامل ہونے سے بہت عرصہ پہلے جواب دے جاتی ہے۔ جب تک واقعات اس بات کی اجازت نہ دیں (اور واقعات شاذ ہی اجازت دیا کرتے ہیں) کہ مسودہ کام ختم ہونے پر ایک طرف رکھ دیا جائے اور کچھ عرصے کے بعد بےفکری سے اس پر نظرثانی کی جائے اس وقت تک تصنیف اُس حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی جو حدِ کمال سے دُور ہے۔

بعض مصنفین لکھنے سے پہلے دل ہی دل میں بہت سا کام کر لیتے ہیں۔ اس لئے انہیں بہت کم دہرانا پڑتا ہے بعض لکھنے کے دوران ہی میں دہراتے جاتے ہیں اور اس کے بعد اپنے مسودے کی نقول کو بھی یکے بعد دیگرے دہراتے، اُن کی اصلاح کرتے، انہیں بدلتے اور ان میں بہت کچھ حذف و اضافہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ راگ بنانے والوں کا عمل بھی یہی ہے موزارٹ پہلے طریق پر کاربند تھا اور بیتھوون دوسرے پر ممکن ہے شیکسپیر نے جس کے متعلق جانسن یہ کہتا ہے کہ اُس نے کبھی ایک سطر بھی نہ کاٹی تھی عمداً یہ فیصلہ کر لیا ہو کہ ہیملٹ شروع کر دینا اس سے بہتر ہے کہ ہملٹ کی اصلاح پر مقابلتہً تضیعِ اوقات کی جائے لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے کبھی اپنے خیالات کو دلائل سے ثابت نہ کیا اور وہ دلائل کی قید سے یکسر آزاد رہے۔ یہ سچ ہے کہ بعض تخیلی مضامین منطقیانہ سوچ بچار کے متحمل نہیں ہو سکتے بلکہ اس سے تباہ ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ بعض ادبی

الہامات توجیہ اور استدلال سے آزاد رکھے جاتے ہیں، لیکن اس بات میں ارادے کا دخل ہونا چاہیئے، سستی کا نہیں۔ عام حالات میں جتنی محنت کی جائے تصنیف اتنی ہی اچھی ہوتی ہے۔

میرا طریقِ عمل حسبِ ذیل ہے :۔

جب اور جہاں ممکن ہو میں شارٹ ہینڈ (مختصر نگاری) سے کام لیتا ہوں میں نے اپنی آخری تصانیف کا بہت سا حصہ ہیڈ فیلڈ اور کنگز کراس کے درمیان ریل گاڑی میں لکھا ہے۔ میرا سکریٹری ان مسودوں کو ٹائپ کر دیتا ہے اور میں نہیں دو مرتبہ (بعض اوقات زیادہ مرتبہ) دہرا کر مطبع میں بھیج دیتا ہوں۔ اس کے بعد میں متواتر دو پروفوں کی تصحیح کرتا ہوں اور تیسرے پروف میں تصحیحات کی پڑتال کر لیتا ہوں۔ اس کے بعد کتاب چھپنی شروع ہو جاتی ہے۔ ڈرامے کی صورت میں پہلے میں مکالمے لکھتا ہوں اور اس کے بعد سٹیج کی ہدایات وغیرہ لکھ کر شامل کر دیتا ہوں۔

تمام نوجوان مصنفین کو انتھنی ٹرالپ کی خود نوشت سوانح عمری پڑھنی چاہیئے جو اب بہت ارزاں قیمت پر مل سکتی ہے اس کا بیشتر حصہ انہیں کی مدد اور رہنمائی کے لئے لکھا گیا ہے اور اس لحاظ سے بھی پڑھنے کے قابل ہے کہ یہ اپنی وضع کی نہایت ہی پائندارانہ تصنیف ہے۔ ٹرالپ میں یہ خوبی تھی کہ وہ ہر اس بات کو چھوڑ دیتا تھا جس کے متعلق اسے یہ خیال ہوتا کہ میں اسے کامل بے ریائی سے بیان نہ کر سکوں گا۔

حامد علی خاں

میں جانتا ہوں میری زندگی ختم ہو جائیگی

میں جانتا ہوں میری زندگی ختم ہو جائیگی۔ آہ میں خوب جانتا ہوں
ایک دن شام کو روشن سورج مایوسی سے مسکرائے گا اور میرے چہرے کو دیکھے گا۔
اس کی وداعی نظروں سے میں بخوبی واقف ہوں میں اُن کو خوب جانتا ہوں
سامنے اس سرسبز خطے پر نفیری کی آواز گونجے گی
دریا کے کنارے گائیں چریں گی
بچے گھروں کے صحن میں کھیلیں گے
پرندے چہچہائیں گے لیکن زندگی ختم ہو جائے گی
میری عمر ختم ہو جائیگی میں خوب جانتا ہوں
اس سے پہلے کہ میں اجل کو لبیک کہوں میں التجا کرتا ہوں کہ مجھے بتا دو

کیوں یہ سرسبز زمین جس کی آنکھیں آسمان کی طرف لگی ہیں مجھے مخاطب کرتی ہے اور کیوں خاموش رات مجھے ستاروں کی سرگوشی کی خبر دیتی ہے
اور دن کی روشنی سے کیوں میرے جسم میں مسرت کی لہر موجزن ہوتی ہے
آہ مجھے اس کی وجہ بتا دو
میری اس دنیاوی زندگی کا دور کب ختم ہوگا
کیا میرے زمزمے ایک وقت معین پر خاموش ہو جائیں گے
کیا میں اپنی ٹوکری کو سال کے ہر موسم کے پھلوں اور پھولوں سے بھر سکتا ہوں
ہاں کیا تجھ کو اس زندگی کی مشعل سے ڈھونڈ سکتا ہوں
اور تیری گردن میں ہار حمائل کر سکتا ہوں
اے میرے معبود!

مترجمہ عصمت اللہ سکندر آبادی

فیضانِ بہار

نہ سردیوں کا زور ہے، نہ شمس شعلہ بار ہے ۔۔۔ نہ جنگلوں میں آندھیاں، نہ دشت میں غبار ہے
زبسکہ اعتدال پر مزاجِ روزگار ہے

اُفق پہ چہلیں کر رہی ہیں ہفت رنگ بدلیاں ۔۔۔ پھٹے پھٹے سے ابر کارواں رواں ہے کارواں
خدا کی شان منظرِ فلک پہ آشکار ہے

پھواڑیں جو پڑ گئیں، پہاڑ سب نہا گئے ۔۔۔ بدل کے سبز خلعتیں درخت لہلہا گئے
جنابِ شیخ! دیدنی فضائے کوہسار ہے

بساطِ دہر پر کھنچا ہے باغِ خلد کا سماں ۔۔۔ قدم قدم پہ چشمہائے سلسبیل ہیں رواں
طرب نواز جا بجا صدائے آبشار ہے

کبھی اُدھر کا رُخ کیا، کبھی ادھر ملٹ گئی ۔۔۔ اچھل کے دو قدم بڑھی پھر ایک جا سمٹ گئی
عجیب لہر بہر پر خرامِ جوئبار ہے

نہال ذوقِ دید ہو جدھر کو ڈالئے نگہ ۔۔۔ لہک رہی ہے نرم نرم دوب سے ہر ایک رہ
جو کل اجاڑ دشت تھا وہ آج مرغزار ہے

بہشت زار ان دنوں بنا ہوا ہے بوستاں ۔۔۔ سرورِ عطرِ عیش سے مہک گیا مشامِ جاں
بسی ہوئی فضاؤں میں شمیمِ مشکبار ہے

صبا جو صحنِ باغ میں ادا سے جھومتی چلی ۔۔۔ تو فرطِ انبساط سے چٹک گئی کلی کلی
گلوں کے بار سے جھکی ہر ایک شاخسار ہے

شگفتہ خاطریں ہوئیں، دلوں کے غنچے کھل گئے ۔۔۔ مقدر آیا اوج پر، بچھڑنے والے مل گئے
مراد پائی دوستوں نے شکرِ کردگار ہے

سُبو لنڈھائے جا رہے ہیں بزمِ ارتباط میں ۔۔۔ جہانِ آرزو ہے غرق بادۂ نشاط میں
زمین و آسماں کو اک سرورِ بے خمار ہے

مچی ہوئی ہے ایک دھوم شش جہت میں سر بسر ۔۔۔ یہ قول صادق آگیا فہیم قصہ مختصر
"جدھر نظر اٹھائیے بہار ہی بہار ہے"

میرزا فہیم بیگ چغتائی

محفلِ ادب

لاہور کا جغرافیہ

تمہید۔ تمہید کے طور پر صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ لاہور کو دریافت ہوئے اب بہت عرصہ گزر چکا ہے۔ اس لئے دلائل و براہین سے اس کے وجود کو ثابت کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ کہنے کی اب ضرورت نہیں کہ کرُے کو دائیں سے بائیں گھمائیے۔ حتیٰ کہ ہندوستان کا ملک آپ کے سامنے آکر ٹھہر جائے پھر فلاں طول البلد اور فلاں عرض البلد کے مقامِ انقطاع پر لاہور کا نام تلاش کیجئے۔ جہاں یہ نام کرُے پر مرقوم ہو۔ وہی لاہور کا محل وقوع ہے۔ اس ساری تحقیقات کو مختصر مگر جامع الفاظ میں رگ یوں بیان کرتے ہیں۔ کہ لاہور لاہور ہی ہے۔ اگر اس پتے سے آپ کو لاہور نہیں مل سکتا تو آپ کی تعلیم ناقص اور آپ کی ذہانت فاتر ہے۔

محلِ وقوع۔ ایک دو غلط فہمیاں البتہ ضرور رفع کرنا چاہتا ہوں۔ لاہور پنجاب میں واقع ہے لیکن پنجاب پنجاب نہیں رہا۔ اس پانچ دریاؤں کی سرزمین میں اب ساڑھے چار دریا بہتے ہیں اور جو نصف دریا ہے وہ تو اب بہنے کے قابل بھی نہیں رہا۔ اسی کو اصطلاح میں راوی ضعیف کہتے ہیں۔ ملنے کا پتہ یہ ہے کہ شہر کے قریب دو پُل بنے ہیں ان کے نیچے ریت میں یہ دریا لیٹا رہتا ہے۔ بہنے کا شغل عرصے سے بند ہے۔ اس لئے اب یہ بتانا بھی مشکل ہے۔ کہ شہر دریا کے دائیں کنارے پر واقع ہے۔ یا بائیں کنارے پر۔

لاہور تک پہنچنے کے کئی رستے ہیں لیکن دو ان میں سے بہت مشہور ہیں۔ ایک پشاور سے آتا ہے اور دوسرا دہلی سے۔ وسط ایشیا کے حملہ آور پشاور کے رستے اور یو۔ پی کے حملہ آور دہلی کے رستے وارد ہوتے ہیں۔ اوّل الذکر اہلِ سیف کہلاتے ہیں اور غزنوی یا غوری تخلص کرتے ہیں۔ موخر الذکر اہلِ زبان کہلاتے ہیں۔ یہ بھی تخلص کرتے ہیں اور اس میں یدِطولیٰ رکھتے ہیں۔

حدودِ اربعہ۔ کہتے ہیں کسی زمانے میں لاہور کا حدودِ اربعہ بھی ہوا کرتا تھا لیکن طلبا کی سہولت کے لئے میونسپلٹی نے اسے منسوخ کر دیا ہے اب لاہور کے چاروں طرف بھی لاہور ہی واقع ہے۔ اور روز بروز واقع تر ہو رہا ہے۔ ماہرین کا اندازہ ہے کہ دس بیس سال کے اندر لاہور ایک صوبے کا نام ہو گا۔ جس کا دارالخلافہ پنجاب ہو گا۔ یوں سمجھئے کہ لاہور ایک جسم ہے جس کے ہر حصے پر ورم نمودار ہو رہا ہے لیکن ہر ورم مواد فاسد سے بھرا ہے۔ گویا یہ توسیع ایک عارضہ ہے جو اس جسم کو لاحق ہے۔

آب و ہوا۔ لاہور کی آب و ہوا کے متعلق طرح طرح کی روایات مشہور ہیں۔ جو تقریباً سب کی سب غلط ہیں حقیقت یہ ہے کہ لاہور

کے باشندوں نے حال ہی میں یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ اور شہروں کی طرح ہمیں بھی آب و ہوا دی جائے۔ میونسپلٹی بڑی بحث و تمحیص کے بعد اس نتیجے پر پہنچی کہ اس ترقی کے دور میں جبکہ دنیا میں کئی ممالک کو ہوم رول مل رہا ہے اور لوگوں میں بیداری کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔ اہل لاہور کی یہ خواہش ناجائز نہیں۔ بلکہ ہمدردانہ غور و خوض کی مستحق ہے۔

لیکن بدقسمتی سے کمیٹی کے پاس ہوا کی قلت تھی۔ اس لئے لوگوں کو ہدایت کی گئی کہ مفاد عامہ کے پیش نظر اہل شہر ہوا کا بیجا استعمال نہ کریں۔ بلکہ جہاں تک ہو سکے کفایت شعاری سے کام لیں۔ چنانچہ اب لاہور میں عام ضروریات کے لئے ہوا کی بجائے گرد اور خاص خاص حالات میں دھواں استعمال کیا جاتا ہے۔ کمیٹی نے جا بجا دھوئیں اور گرد کے مہیا کرنے کے لئے مرکز کھول دیئے ہیں۔ جہاں یہ مرکبات مفت تقسیم کئے جاتے ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ اس سے نہایت تسلی بخش نتائج برآمد ہوں گے۔

بہم رسانی آب کے لئے ایک سکیم عرصے سے کمیٹی کے زیر غور ہے۔ یہ سکیم نظام سقے کے وقت سے چلی آتی ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ نظام سقے کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے اہم مسودات بعض تو تلف ہو چکے ہیں اور جو باقی ہیں ان کے پڑھنے میں بہت دقت پیش آرہی ہے۔ اس لئے ممکن ہے تحقیق و تدقیق میں چند سال اور لگ جائیں۔ عارضی طور پر پانی کا یہ انتظام کیا گیا ہے کہ فی الحال بارش کے پانی کو حتی الوسع شہر سے باہر نکلنے نہیں دیتے۔ اس میں کمیٹی کو بہت کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ تھوڑے ہی عرصے میں ہر محلے کا اپنا ایک دریا ہوگا۔ جس میں رفتہ رفتہ مچھلیاں پیدا ہوں گی اور ہر مچھلی کے پیٹ میں کمیٹی کی ایک انگوٹھی ہوگی۔ جو رائے دہندگی کے موقع پر ہر رائے دہندہ پہن کر آئیگا۔

نظام سقے کے مسودات سے اس قدر ضرور ثابت ہوا ہے کہ پانی بچانے کے لئے نل ضروری ہیں۔ چنانچہ کمیٹی نے کروڑوں روپے خرچ کر کے جا بجا نل لگوا دیئے ہیں۔ فی الحال ان میں ہائیڈروجن اور آکسیجن بھری ہے۔ لیکن ماہرین کی رائے ہے کہ ایک نہ ایک دن یہ گیسیں ضرور مل کر پانی بن جائیں گی۔ چنانچہ بعض بعض نلوں میں اب بھی چند قطرے روزانہ ٹپکتے ہیں۔ اہل شہر کو ہدایت کی گئی ہے کہ اپنے اپنے گھڑے نلوں کے نیچے رکھ چھوڑیں۔ تاکہ عین وقت پر تاخیر کی وجہ سے کسی کی دلشکنی نہ ہو۔ شہر کے لوگ اس پر بہت خوشیاں منا رہے ہیں۔

ذرائع آمد و رفت۔ جو سیاح لاہور تشریف لانے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ ان کو یہاں کے ذرائع آمد و رفت کے متعلق چند ضروری باتیں ذہن نشین کر لینی چاہئیں تاکہ وہ یہاں کی سیاحت سے کماحقہٗ اثر پذیر ہو سکیں۔ جو سڑک بل کھاتی ہوئی لاہور کے بازاروں میں سے گزرتی ہے۔ تاریخی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ یہ وہی سڑک ہے جسے شیر شاہ سوری نے بنایا تھا۔ یہ آثار قدیمہ میں شمار ہوتی ہے اور بے حد احترام کی نظروں سے دیکھی جاتی ہے۔ چنانچہ اس میں کسی قسم کا

روّ و بدل گوارا نہیں کیا جاتا ۔ وہ قدیم تاریخی گڑھے اور خندقیں جوں کی توں موجود ہیں جنہوں نے کئی سلطنتوں کے تختے الٹ دیئے تھے ۔ آج کل بھی لوگوں کے تختے یہاں اُلٹتے ہیں اور عظمت رفتہ کی یاد دلاکر انسان کو عبرت سکھاتے ہیں ۔

بعض لوگ زیادہ عبرت پکڑنے کے لئے ان تختوں کے نیچے کہیں کہیں دو ایک پہیے لگا لیتے ہیں اور سامنے دو ڈنک لگا کر ان میں ایک گھوڑا اٹانک دیتے ہیں ۔ اصطلاع میں اس کو تانگہ کہتے ہیں ۔ شوقین لوگ اس تختہ پر موم جامہ منڈھ لیتے ہیں ۔ تاکہ پھسلنے میں سہولت ہو اور بہت زیادہ عبرت پکڑی جائے ۔

اصلی اور خالص گھوڑے لاہور میں خوراک کے کام آتے ہیں ۔ قصابوں کی دکانوں پر انہی کا گوشت بکتا ہے اور زین کس کر کھایا جاتا ہے ۔ تانگوں میں ان کی بجائے بناسپتی گھوڑے استعمال کیے جاتے ہیں ۔ بناسپتی گھوڑا شکل و صورت میں ومدار تارے سے ملتا ہے ۔ کیونکہ اس گھوڑے کی ساخت میں دم زیادہ اور گھوڑا کم پایا جاتا ہے ۔ حرکت کرتے وقت اپنی دم کو دبا لیتا ہے اور اس ضبط نفس سے اپنی رفتار میں ایک سنجیدہ اعتدال پیدا کرتا ہے ۔ تاکہ سڑک کا ہر تاریخی گڑھا اور تانگے کا ہر ہچکولا اپنا نقش آپ پر ثبت کرتا جائے اور آپ کا ہر ایک مسام لطف اندوز ہو سکے ۔

قابل دید مقامات ۔ لاہور میں قابل دید مقامات مشکل سے ملتے ہیں ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لاہور میں ہر عمارت کی بیرونی دیواریں دہری بنائی جاتی ہیں ۔ پہلے اینٹوں اور چونے سے دیوار کھڑی کرتے ہیں اور پھر اس پر اشتہاروں کا پلستر کر دیا جاتا ہے جو دبازت میں رفتہ رفتہ بڑھتا جاتا ہے ۔ شروع شروع میں چھوٹے سائز کے مبہم اور غیر معروف اشتہارات چپکائے جاتے ہیں ۔ مثلاً "اہل لاہور کو مژدہ" یا "اچھا اور سستا مال" اس کے بعد ان اشتہاروں کی باری آتی ہے ۔ جن کے مخاطب اہل علم اور سخن فہم لوگ ہوتے ہیں ۔ مثلاً "گریجویٹ درزی ہاؤس" "سٹوڈنٹوں کے لئے نادر موقعہ" یا "کہتی ہے ہم کو خلق خدا غائبانہ کیا" رفتہ رفتہ گھر کی چار دیواری ایک مکمل ڈائرکٹری کی صورت اختیار کر لیتی ہے ۔ دروازے کے اوپر بوٹ پالش کا اشتہار ہے ۔ دائیں طرف تازہ مکھن ملنے کا پتہ مندرج ہے ۔ بائیں طرف حافظے کی گولیوں کا بیان ہے ۔ اس کھڑکی کے اوپر انجمن خدام ملت کے جلسے کا پروگرام چسپاں ہے اس کھڑکی پر کسی مشہور لیڈر کے خانگی حالات بالوضاحت بیان کر دیئے گئے ہیں ۔ عقبی دیوار پر سرکس کے تمام جانوروں کی فہرست ہے اور اصطبل کے دروازے پر مس نغمہ جان کی تصویر اور ان کے فلم کے محاسن گنوا رکھے ہیں ۔ یہ اشتہارات بڑی سرعت سے بدلتے رہتے ہیں اور ہر نیا مژدہ ۔ ہر نئی دریافت یا ایجاد یا انقلاب عظیم کی اطلاع چشم زدن میں ہر ساکن چیز پر لیپ دی جاتی ہے ۔ اس لئے عمارتوں کی ظاہری صورت ہر لحہ بدلتی رہتی ہے اور ان کے پہچاننے میں خود شہر کے لوگوں کو بے حد دقت پیش آتی ہے ۔

لیکن جب سے لاہور میں دستور رائج ہوا ہے کہ بعض بعض اشتہاری کلمات پختہ سیاہی سے خود دیوار پر نقش کر دیئے

جاتے ہیں۔ یہ دقت بہت حد تک رفع ہوگئی ہے۔ ان دائمی اشتہاروں کی بدولت اب یہ خدشہ نہیں رہا۔ کہ کوئی شخص اپنا یا اپنے دوست کا مکان صرف اس لئے بھول جائے کہ پچھلی مرتبہ وہاں چارپائیوں کا اشتہار لگا تھا اور لوٹتے تک وہاں "اہالیان لاہور کو تازہ اور سستے جوتوں کا مژدہ" سنایا جارہا ہے۔ چنانچہ اب وثوق سے کہا جاسکتا ہے۔ کہ جہاں بہ حروف جلی "محمد علی دنداں ساز" لکھا ہے۔ وہ اخبار انقلاب کا دفتر ہے۔ جہاں بجلی پانی بھاپ کا بڑا ہسپتال لکھا ہے وہاں ڈاکٹر اقبال رہتے ہیں۔ "خالص گھی کی مٹھائی" امتیاز علی صاحب تاج کا مکان ہے۔ "کرشنا بیوٹی کریم" شالامار باغ کو اور "کھانسی کا مجرب نسخہ" جہانگیر کے مقبرے کو جاتا ہے۔

صنعت و حرفت۔ اشتہاروں کے علاوہ لاہور کی سب سے بڑی صنعت رسالہ بازی اور سب سے بڑی حرفت انجمن سازی ہے ہر رسالے کا ہر نمبر عموماً خاص نمبر ہوتا ہے اور عام نمبر صرف خاص خاص موقعوں پر شائع کئے جاتے ہیں۔ عام نمبر میں صرف ایڈیٹر کی تصویر اور خاص نمبروں میں مس سلوچنا اور مس کجن کی تصاویر بھی دی جاتی ہیں اس سے ادب کو بہت فروغ نصیب ہوتا ہے اور فن تنقید ترقی کرتا ہے۔

لاہور کے ہر مربع انچ میں ایک انجمن موجود ہے۔ پریذیڈنٹ البتہ تھوڑے ہیں۔ اس لئے فی الحال صرف دو تین اصحاب ہی یہ اہم فرض ادا کررہے ہیں۔ چونکہ ان انجمنوں کے اغراض و مقاصد مختلف ہیں۔ اس لئے بسا اوقات ایک ہی صدر صبح کسی مذہبی کانفرنس کا افتتاح کرتا ہے۔ سہ پہر کو کسی سینما کی انجمن میں مس نغمہ جان کا تعارف کراتا ہے اور شام کو کسی کرکٹ ٹیم کے ڈنر میں شامل ہوتا ہے۔ اس سے ان کا مطمح نظر وسیع رہتا ہے۔ تقریر عام طور پر ایسی ہوتی ہے جو تینوں موقعوں پر کام آسکتی ہے۔ چنانچہ سامعین کو بہت سہولت رہتی ہے۔

پیداوار۔ لاہور کی سب سے مشہور پیداوار یہاں کے طلبا ہیں جو کثرت سے پائے جاتے ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں دساور کو بھیجے جاتے ہیں۔ فصل شروع موسم سرما میں بوئی جاتی ہے اور عموماً اواخر بہار میں پک کر تیار ہوتی ہے۔ طلبا کی کئی قسمیں ہیں۔ جن میں سے چند مشہور ہیں۔ قسم اول جمالی کہلاتی ہے۔ یہ طلبا عام طور پر پہلے درزیوں کے ہاں تیار ہوتے ہیں۔ بعدازاں دھوبی اور پھر نائی کے پاس بھیجے جاتے ہیں اور اس عمل کے بعد رسٹورنٹ میں ان کی نمائش کی جاتی ہے۔ غروب آفتاب کے بعد کسی سینما یا سینما کے گردونواح میں رخ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں ادھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے شمعیں کئی ہوتی ہیں۔ لیکن سب کی تصاویر ایک البم میں جمع کرکے اپنے پاس رکھ چھوڑتے ہیں اور تعطیلات میں ایک ایک کو خط لکھتے رہتے ہیں۔ دوسری قسم جلالی طلبا کی ہے۔ ان کا شجرہ جلال الدین اکبر سے ملتا ہے۔ اس لئے ہندوستان کا تخت و تاج ان کی ملکیت سمجھا جاتا ہے۔ شام کے وقت چند مصاحبوں کو ساتھ لئے نکلتے

ہیں اور جود و سخا کے خم ٹھنڈھاتے پھرتے ہیں۔ کالج کی خوراک انہیں راس نہیں آتی۔ اس لئے ہاسٹل میں فروکش نہیں ہوتے تیسری قسم خیالی طلبا کی ہے۔ یہ اکثر روح اور اخلاق اور آواگون اور جمہوریت پر بآواز بلند اظہار خیالات کرتے پائے جاتے ہیں۔ اور آفرینش اور نفسیات جنسی کے متعلق نئے نئے نظریے پیش کرتے رہتے ہیں۔ صحت جسمانی کو ارتقائے انسانی کے لئے ضروری سمجھتے ہیں اس لئے علی الصباح پانچ چھ ڈنٹر پیلتے ہیں اور شام کو ہاسٹل کی چھت پر گہرے سانس لیتے ہیں۔ گاتے ضرور ہیں لیکن اکثر بے سرے ہوتے ہیں۔ چوتھی قسم خالی طلبا کی ہے۔ یہ طلبا کی خالص ترین قسم ہے۔ ان کا دامن کسی قسم کی آلائش سے تر ہونے نہیں پاتا۔ کتابیں امتحانات۔ مطالعہ اور اس قسم کے خرخشے کبھی ان کی زندگی میں خلل انداز نہیں ہوتے۔ جس معصومیت کو ساتھ لے کر کالج میں پہنچے تھے اسے آخر تک ملوث ہونے نہیں دیتے اور تعلیم اور نصاب اور درس کے ہنگاموں میں اس طرح زندگی بسر کرتے ہیں جس طرح بتیس دانتوں میں زبان رہتی ہے۔

پچھلے چند سالوں سے طلبا کی ایک اور قسم بھی دکھائی دینے لگی ہے لیکن ان کو اچھی طرح سے دیکھنے کے لئے محدب شیشے کا استعمال ضروری ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ریل کا ٹکٹ نصف قیمت پر ملتا ہے اور اگر چاہیں تو اپنی انّا کے ساتھ زنانہ ڈبے میں بھی سفر کر سکتے ہیں۔ ان کی وجہ سے اب یونیورسٹی نے کالجوں پر شرط عائد کر دی ہے کہ آئندہ صرف وہی لوگ پروفیسر مقرر کئے جائیں جو دودھ پلانے والے جانوروں میں سے ہوں۔

طبعی حالات۔ لاہور کے لوگ بہت خوش طبع ہیں۔

سوالات

۱۔ لاہور تمہیں کیوں پسند ہے؟ مفصل لکھو۔

۲۔ لاہور کس نے دریافت کیا اور کیوں؟ اس کے لئے سزا بھی تجویز کرو۔

۳۔ میونسپل کمیٹی کی شان میں ایک قصیدۂ مدحیہ لکھو۔

"کارواں" ــــــــــ پطرس

ایک ضروری تصحیح

ماہ فروری کے پرچہ میں ایک اشتہار بعنوان "سرکار ہند" شائع ہوا ہے۔ اس میں مندرجہ ذیل تین غلطیاں ہو گئی ہیں۔ قارئین کرام درست فرمالیں:-

(۱) "سرکار ہند" کے عنوان کے نیچے لفظ "کے" رہ گیا ہے (۲) تیسری لائن کے شروع میں "۸ ½ روپے" نہیں بلکہ "۸ ½" ہونا چاہیئے۔ (۳) پانچویں سطر میں "ایک سال کے لینے کے بعد" کی بجائے "ایک سال کے بعد لینے پر" صحیح ہے۔

مینیجر "ہمایوں"

جدید مطبوعات

ہندوستان اور دیگر افسانے یہ میاں کفایت علی صاحب بی اے کے بیس افسانوں کا مجموعہ ہے جو ۲۲۴ صفحات پر بہ حسن اہتمام مجلد شائع ہوا ہے۔ میاں صاحب کا انداز تحریر سلیس اور دلکش ہے اور افسانوں میں بھی ایک ایسی سادہ دلکشی ہے جو دل کو اپنی طرف کھینچے بغیر نہیں رہتی۔ اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی یہ افسانے قابل ستائش ہیں اور پاکیزہ اور سلیس انداز نگارش کے پیش نظر اس قابل ہیں کہ خواتین اور بچوں کے ہاتھوں میں دیئے جاسکیں۔ ہماری رائے میں میاں صاحب ہر قسم کی حوصلہ افزائی کے مستحق ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ وہ آئندہ بھی اپنا یہ ادبی مشغلہ جاری رکھ کر اردو زبان کی خدمت انجام دیتے رہیں گے۔ پتہ: میسرز عطر چند کپور اینڈ سنز لاہور۔

کیفستان ۔ یہ جناب قیسی رام پوری کے ۱۳ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ حجم ۲۱۶ صفحات ہے۔ کتابت اور طباعت قابل تعریف ہے حضرت قیسی ایک نوجوان اور ہونہار ادیب ہیں۔ ان کے بیشتر افسانوں میں جو دلچسپ اور نتیجہ خیز ہیں پختگی کا رنگ جھلکتا ہے ہمیں بہت مسرت ہے کہ جناب قیسی اس تن دہی سے زبان کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ کتاب کی قیمت ایک روپیہ چار آنے (عہ) ہے اور دفتر کیفستان وفادار بلڈنگ۔ دہلی دروازہ اجمیر سے ملتی ہے۔

سرگزشت اسیر ۔ یہ فرانس کے عظیم الشان شاعر اور ادیب وکٹر ہیوگو کی مشہور تصنیف (The Last days of the Condemned) کا اردو ترجمہ ہے جو نوجوان اور ہونہار ادیب مسٹر سعادت حسن نے کیا ہے۔ سعادت حسن صاحب کے دو تین مضامین "ہمایوں" میں چھپ چکے ہیں۔ ترجمے کے فن میں انہیں دستگاہ وافی حاصل ہے۔ نہ صرف یہی بلکہ ترجمے کے لئے انتخاب کرتے وقت وہ بہت صحت ذوق سے کام لیتے ہیں۔ یہ دونوں باتیں اُن کی کامیابی کی دلیل ہیں۔ اس کتاب کے ترجمے سے نہ صرف انہوں نے اردو ادب میں ایک قابل قدر اضافہ کیا ہے بلکہ فرانس کے اس زبردست مفکّر کے خیالات سے اپنے ملک کو روشناس کرکے قوم پر بھی احسان کیا ہے۔ ہم ہر اردو جاننے والے سے اس کتاب کا مطالعہ کرنے کی سفارش کرتے ہیں۔ افسانے کا مقصد سزائے موت کی تنسیخ کی حمایت ہے۔ حجم بڑے سائز کے ۱۵۰ صفحات۔ قیمت عہ اردو بک سٹال بیرون لوہاری دروازہ لاہور سے ملتی ہے۔

دو آتشہ ۔ از مسٹر دیوان چند گڈھوک۔ یہ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک حصے میں اردو اور فارسی کے ہم معنی اشعار دیئے گئے ہیں اور دوسرے میں اردو اور بھاشا کے ہم معنی اشعار۔ جناب گڈھوک ایک خوش ذوق اور سخن فہم ادیب ہیں اور ان کی یہ ادبی کاوش شائقین کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ یہاں نمونے کے طور پر ہم دو اشعار علی الترتیب فارسی اور ہندی ہم مضمون اشعار کے ساتھ دیتے ہیں تاکہ انتخاب کی خوبی کا اندازہ ہو سکے۔

نہ گلم نہ برگ سبزم نہ درخت سایہ دارم — ہمہ حیرتم کہ دہقاں بہ چہ کار کشت مارا
خجل ہوں باغباں سے میں نہال خشک ہوں ایسا — نہ بیٹھا کوئی سائے میں نہ کچھ مجھ سے ثمر پایا

غافل ز احتیاط نفس یک نفس مباش — شاید ہمیں نفس نفس واپسیں بود
سواس سواس ہر نام جپ برتھا سواس مت کھو — کیا جانے کہ انت کا یہی سواس مست ہو

کتاب کی قیمت ۸ روپے اور دیوان چند صاحب گڈھوک نقشہ نویس کچہری ضلع ایبٹ آباد (ہزارہ) سے مل سکتی ہے۔

مفید ایجادات کی کہانی۔ یہ منشی پیارے لال صاحب شاکر میرٹھی کی قابل قدر تصنیف ہے۔ یہ کتاب اردو میں اپنی وضع کی بالکل انوکھی تصنیف ہے اور مفید معلومات کے لحاظ سے اس قابل ہے کہ ہر شخص کے مطالعہ میں آئے۔ کاغذ کتابت طباعت اور سرورق بے انتہا نفیس ہے۔ اس قدر اچھے اہتمام سے بہت کم کتابیں اردو میں چھپی ہیں۔ کتاب میں تشریح مطالب کے لئے جا بجا متعدد بے شمار تصاویر دی گئی ہیں۔ پروفیسر فیروز الدین مراد ایم۔ ایس سی نے دیباچہ لکھا ہے۔ کتاب کے چند موضوعات یہ ہیں جس سے اس کی علمی حیثیت واضح ہو جاتی ہے۔ (۱) دیا سلائی (۲) چکی (۳) ہل (۴) گھڑی (۵) انگیٹھی (۶) گھر (۷) کتاب (۸) خبر رسانی وغیرہ۔ حجم ۱۹۲ صفحات۔ قیمت درج نہیں۔ انڈین پریس الہ آباد سے منگوائیے۔

دیوان قمر حضرت قمر ایک خوش فکر شاعر ہیں۔ زیادہ تر غزل لکھتے ہیں اور قدیم رنگ کے پابند ہیں۔ حال میں انہوں نے ۱۶۰ صفحات پر اپنا دیوان شائع کیا ہے ہم عام غزل کے شائقین سے اس کی سفارش کرتے ہیں۔ قیمت ۱۲ہ ہے۔ مسٹر دریا پرکاش سرور کھتوریا لائبریری ہیرو غزلی۔ ڈاکخانہ تونسہ (ڈیرہ غازیخاں) سے منگوائیے۔

فہرستِ مضامین

جلد ۲۵ — ہمایوں بابت ماہ اپریل ۱۹۳۴ء — نمبر ۴

تصاویر :- مولیئر اور اس کے رفیق ۔ قابیل اور اس کا خاندان

چندہ سالانہ پانچ روپے ششماہی ۳ روپے مع محصول — قیمت فی پرچہ ۸ آنے

طلسمِ زندگی

یعنی

جناب میاں بشیر احمد صاحب بی اے (آکسن) مدیر ہمایوں کی تازہ تصنیف

کے متعلق

اہلِ ملک کی رائیں

a good comment.

جناب شوکت تھانوی ایڈیٹر سرپنچ لکھنؤ

"میں طلسم زندگی کے حسنِ طباعت یا اس کی عروسانہ زینتوں سے مرعوب ہوکر نہیں بلکہ اس کے سادہ الفاظ کی گہرائیوں تک پہنچنے کے بعد یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ کتاب آپ کے مضامین کا مجموعہ نہیں بلکہ آپ کا دیوان ہے۔ آپ شاعر ہیں اور یقیناً شاعر بلکہ آپ کا درجہ ان شعرا سے یقیناً بلند ہے جو عروض کے قیود میں پھنس کر ان حسین و جمیل، بلند و بالا، لطیف و نازک تخیلات کو کھو بیٹھتے ہیں جو "طلسم زندگی" میں اپنی قدرتی شکل کے ساتھ بکھرے پڑے ہیں "طلسم زندگی" کا ہر صفحہ مجھ کو ایک خوبصورت مصور شعر نظر آیا، آپ نے شاعری بھی کی ہے اور مصوری بھی، آپ کے مضامین سے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ہر وقت کن بلندیوں پر اڑا کرتے ہیں۔

یہ کتاب یقیناً ہندوستان کی ایک یادگار تصنیف ہے اور اردو لٹریچر کی ایک تاریخی کڑی ہے

جناب ہارون خانصاحب شروانی پروفیسر تاریخ عثمانیہ یونیورسٹی۔ حیدرآباد (دکن)

تمہاری طلسمی "طلسم زندگی" آنے کے چند منٹ بعد اس کی دیدہ زیبی پر عش عش کر کے تمہیں اور تمہاری رفیق زندگی "صاحبۂ انتساب" کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ یہ کتاب ہر آئین اردو کی تاریخ میں ایک نئے باب کا افتتاح کرتی ہے۔

جناب سید عابد علی صاحب ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ پروفیسر ڈی۔ ایس کالج۔ لاہور

آپ کی طرف سے میں اپنے دل میں جو جذباتِ عقیدت رکھتا ہوں ان کا اظہار ایک رسمی بات ہوگی لیکن اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ میں درحقیقت آپ کے مضامین کی اشاعت کے لئے بیتاب تھا۔ مکروہاتِ روزگار نے اس کی اجازت نہ دی کہ گاہ گاہ آپ کی صحبتِ بابرکت سے مستفید ہوتا۔ لیکن آپ کے دل افروز اور زندگی بخش مضامین کے ذریعے سے اُس بشیر احمد کی زیارت نصیب ہوتی رہی ہے جسے بہت کم آدمی جانتے اور سمجھتے ہیں۔ میں کیا اور میری رائے کیا۔ لیکن انشاء اللہ ایک مضمون کے ذریعے سے اپنے جذبات کا اظہار کروں گا"۔ قیمت فی جلد پانچ روپے۔

بزمِ ہمایوں

گزشتہ مہینے ہم نے بزمِ ہمایوں میں اپنے مجوزہ "افسانہ نمبر" کا اعلان کیا تھا۔ ہمیں مسرت ہے کہ بہت سے اصحاب نے اس تجویز کا خیر مقدم کیا ہے اور اس سلسلے میں ہماری مدد پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ اگر معاونینِ "ہمایوں" نے اس باب میں پوری دلچسپی سے کام لیا تو ہمیں امید ہے کہ "افسانہ نمبر" "ہمایوں" کے شایانِ شان ہو سکے گا۔

"افسانہ نمبر" کب تک شائع ہو گا؟ اس کا فیصلہ اہلِ قلم کی مستعدی پر منحصر ہے۔ اگر ہمارے قائم کردہ معیار کے مطابق افسانوں کی مطلوبہ تعداد جلد ہم پہنچ گئی تو غالباً جون یا جولائی کا پرچہ افسانہ نمبر ہو گا۔

بعض نومشق مضمون نگار ہم سے پوچھتے ہیں کہ "ہمایوں" کے لئے کس قسم کے افسانے بھیجنے چاہئیں۔ اس کا جواب بہت طویل ہے جس کے لئے افسانہ نویسی کے فن پر جامع مضامین لکھنے کی ضرورت ہے۔ مبتدیوں کو ہم البتہ یہ مشورہ دے سکتے ہیں کہ اگر وہ خود نقادانہ نظر رکھتے ہوں تو صرف ان مصنفین کے افسانوں کا ترجمہ کریں جن کی قابلیت بہ اعتبارِ فن مسلّم ہو چکی ہے۔ ان کے کارناموں میں نومشق اصحاب حسبِ منشا ذاتی انتخاب سے بھی کام لے سکتے ہیں۔

ہمیں افسانوں کے جو تراجم اشاعت کے لئے موصول ہوتے ہیں ان میں سے اکثر کو دیکھ کر ہمیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مترجم نے خود اصل افسانے کو اچھی طرح سمجھا نہیں اور ترجمہ کر دیا ہے۔ جو شخص اپنی تحریر کے مفہوم سے خود ہی ناواقف ہو وہ دوسروں کو کیا سمجھائے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مفہوم میں طرح طرح کی الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں اور اصل کی خوبی کا کہیں نام و نشان تک نہیں ملتا۔ مبتدیوں کو بہت صحیح الدماغ ہونا چاہیئے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ انہیں دونوں زبانوں کے محاورات کا صحیح موقع استعمال سمجھنے پر قدرت حاصل ہو تاکہ وہ اصل کی صحیح روح کو سمجھ کر اسے اپنی زبان کے قالب میں ڈھال سکیں۔

انگریزی سے ترجمہ کرنے والے اصحاب اگر انگریزی سے اچھی طرح واقف ہوں بھی تو اردو سے واقف نہیں ہوتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی ایسی زبان میں ترجمہ کر کے بھیج دیتے ہیں جسے وہ تو اردو کہتے ہیں لیکن ہم اسے "ترکی" سمجھتے ہیں:۔

زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم

ناچار ہم مضمون واپس بھیج دیتے ہیں۔

نئے لکھنے والوں کو ہمارا مشورہ یہ ہے کہ ترجمہ کرنے سے پہلے وہ اچھے مصنفین کے متعدد افسانے پڑھیں۔ ان میں سے جو انہیں اپنے نقطۂ خیال کے مطابق بہترین معلوم ہو اُسے ترجمے کے لئے انتخاب کر کے بار بار پڑھیں۔ یہاں تک کہ وہ اس افسانے کو اتنی اچھی طرح سمجھ لیں کہ وہ ان کے دل و دماغ کا ایک جزو بن جائے۔ اس کے بعد اپنے ذہن میں ترجمے کا ایک خاکا قائم کر کے ترجمہ شروع کر دیں۔ بہترین الفاظ اور بہترین طرزِ بیان کے استعمال پر زور دینے کی ہمیں ضرورت نہیں۔ برا لباس اچھے سے اچھے جسم کو بدوضع بنا دیتا ہے اور ادبیات میں بدقسمتی سے الفاظ کا لباس فن کے جسم سے کسی طرح علیحدہ بھی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے لازم ہے کہ اس کے انتخاب میں بہت کوشش صرف کی جائے۔ مفہوم کی صحت کے لئے یہ ضروری ہے کہ ترجمے کے وقت اصل پر پوری نظر رہے اور زبان کی صفائی کے لئے یہ لازم ہے کہ ترجمہ ختم کرنے سے کچھ دیر بعد اصل سے قطعاً فارغ الذہن ہو کر اپنی زبان اور اس کے اندازِ بیان کے اقتضا کے مطابق ترجمے پر نظرِ ثانی کر لی جائے۔

جہاں نما

حسن ایک مصیبت ہے!

اگر ایک وسط درجے کی عورت کو اپنی بیٹی کے بپتسمے کی تقریب پر کوئی پری مذہبی اماں کے فرائض ادا کرنے کو مل جائے اور وہ بچی کو برکت دیتے وقت ماں سے کہے کہ اُس کی بہتری کے لئے اس وقت جو چیز مانگنی ہے مانگ لو تو آپ کے خیال میں مشتاق ماں بچی کے لئے کیا چاہے گی؟ یقیناً دس میں سے نو ماؤں کی سب سے بڑی خواہش یہی ہوگی کہ ان کی بچی حسین ہو۔ لوگوں کا خیال ہے کہ دنیا کے تمام خزانوں کی کنجی حسن ہی کے ہاتھ میں ہے اور ایک لڑکی کی زندگی کے تمام مسائل کا حل صرف حسن ہی کر سکتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا فی الواقع ایک حسین چہرہ کسی لڑکی کی قسمت سنوارنے کا موجب ہو سکتا ہے۔ جہاں تک ہمارا خیال ہے، یہ بات غلط ہے۔ بیشمار ایسی مثالیں موجود ہیں جہاں حسن رحمت کے بجائے زحمت بن کر حسین ہستی کے لئے موجب آزار ثابت ہو چکا ہے۔

حال ہی میں جج کرافورڈ نے پارنٹ کاونٹی کورٹ میں اس حقیقت کو واضح کرتے ہوئے کہا تھا کہ "عورتوں کے لئے حسن کا نتیجہ ہمیشہ تباہی کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے جس میں مبالغہ کا کوئی دخل نہیں۔ خود ہمارے دیکھنے میں بھی کئی ایسے واقعات آئے ہیں کہ خوبصورت لڑکیوں نے اپنے حسن کی بدولت اسٹیج وغیرہ پر غیر معمولی شہرت حاصل کر لی لیکن ان چمکتے ستاروں کو کبھی سچی خوشی حاصل نہ ہو سکی۔ حسین ترین ایکٹرسوں کی خانگی زندگی کا مشاہدہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زندگی کتنی سخت غمناک اور ناقابلِ رشک ہوتی ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ زیادہ تر حسین عورتیں ہی طلاق کے لئے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاتی ہیں۔ حسن دل کو موہ بھی تو لیتا ہے لیکن اکثر حسینوں کے دلوں کو توڑ کر بھی رکھ دیتا ہے۔ اور انہیں اپنی آگ کی چنگاریوں سے پھونک دیتا ہے۔

گھروں میں مائیں عموماً اپنی بچیوں کے متعلق کہتی رہتی ہیں کہ میری بچی کی شادی کسی بہت ہی اچھی جگہ ہوگی۔ بے شبہ یہ بہت حسین ہے"۔ ان حالات اور اس ماحول میں بچی کے خیالات بھی اپنی نسبت کیا سے کیا ہو جاتے ہیں۔

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب اس کی شادی ہوتی ہے تو وہ اپنے شوہر کے گلے شکوے کرنے لگتی ہے!

"میں کیوں اس چھوٹے سے بُرے مکان میں رہوں میرے شوہر کو چاہیئے کہ وہ کوئی اچھا سا روزگار تلاش کرے"

بیچارا نوجوان شوہر ابھی نوعمر اور ناتجربہ کار ہی تو ہوتا ہے۔ بہتیرے ہاتھ پاؤں مارتا ہے اور اپنے مقدور کے مطابق ہر اچھی سے اچھی چیز لاکر اُسے دیتا ہے لیکن زمانہ بڑا سخت ہے، نہایت جان توڑ محنت کے باوجود بھی اس کا کچھ نہیں بنتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکثر حسین عورتوں کی زندگی غیر مطمئن رہتی ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ حسن نے سینکڑوں خوبصورت عورتوں کی زندگیاں تباہ کر کے رکھ دیں۔ کلوپیٹرا نے خودکشی کر لی۔ این بولین

اور کیتھرائن ہنری کی کتنی زندہ دل اور چنچل بیویاں تھیں لیکن دونوں کا انجام نہایت حسرتناک ہُوا۔

حسین لیڈی ہملٹن پہلے معمولی خادمہ تھی اور غیر معمولی حسن کی بدولت نیپلز کے شاہی دربار میں اعلیٰ مراتب پر سرفراز ہوئی۔ لیکن آخرکار اس کا انجام یہ ہُوا کہ وہ کیلے کے مقام پر نہایت بےکسی کی موت مری۔

قریبی زمانے میں بھی حسن نے عورتوں سے بہتر سلوک نہیں کیا۔ روتھ جوڈا اپنے شوہر کے قتل کے جرم میں اپنے عاشق کی شریک جرم گردانی گئی اور اسے موت کی سزا ہوئی۔

بابی سٹوری لندن کے ایک ہوٹل کی خادمہ تھی اور اس کے حسن کا دور دور تک چرچا تھا لیکن آخرکار اسے اپنی ہاتھوں اپنی زندگی کا خاتمہ کرنا پڑا۔

شاید آپ کو معلوم نہیں کہ بدقسمت ایڈتھ ٹامسن نے جو شوہر کو قتل کرنے کی ملزم گردانی گئی تھی۔ ایک دفعہ نمائشِ حسن میں انعام لیا تھا۔

یوں معلوم ہوتا ہے کہ حسن اور غم وحرماں لازم وملزوم ہیں۔ پھر معلوم نہیں عورتوں کو خوبصورت بننے کا شوق کیوں ہے۔

اٹلی میں مسولینی نے حسن کے مقابلہ کی نمائشیں "اخلاقی نقطۂ نظر" سے قانوناً بند کردی ہیں۔ ہمارے خیال میں اس نے خوب کیا ہے۔

اگلے دن ہمیں خوبصورت عورتوں کی ایک پریڈ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ہمارے قریب ہی ایک سیدھی سادھی شکل کی لڑکی اپنی گود میں ایک بچہ لئے کھڑی تھی۔ کہنے لگی "کاش ان میں ایک میں بھی ہوتی۔

ہم نے کہا۔ "تم ان سے زیادہ خوش قسمت ہو۔ شکر کرو کہ تم ایک سیدھی سادھی شکل کی لڑکی ہو خدا نے تمہیں ایک اچھا شوہر اور ایک بچہ بھی دے رکھا ہے اور تمہاری قسمت میں حسن کا عذاب نہیں ہے۔

وہ یہ باتیں سن کر ہماری طرف کچھ اس طرح دیکھنے لگی جیسے کوئی کسی پاگل کی طرف دیکھتا ہے۔

جج کرانورڈ نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ "عورتوں کے لئے خوبصورتی کا نتیجہ ہمیشہ بُرا ہوتا ہے۔"

خوبصورت لڑکیاں کبھی اچھی بیویاں ثابت نہیں ہوتیں نہیں ہمیشہ یہ خیال رہتا ہے کہ ہم اس سے بہتر حالات کی مستحق تھیں لیکن قدرت نے ہم سے انصاف نہیں کیا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خود بھی غیر مطمئن رہتی ہیں اور دوسروں کی زندگی کو بھی ناقابلِ برداشت بنادیتی ہیں۔

ایک حسین لڑکی ہمیشہ شوہر سے فرمائشیں کرتی رہتی ہے "مجھے یہ لادو! مجھے وہ لادو!" اور ہر وقت یہی سوچتی رہتی ہے کہ میرے پاس کیا ہے کیا نہیں ہے اور مجھے اور کیا حاصل کرنا چاہیئے۔ وہ تو گھر ہی سے بڑی لاڈلی اور نازک مزاج بن کر آتی ہے۔

کیا تم نے کبھی دیکھا ہے کہ کس طرح خوبصورت عورتوں کی زندگی پیہم بےقراری میں کٹتی ہے۔ وہ ہمیشہ یہی خیال کرتی رہتی ہیں کہ قدرت نے ہمیں وہ چیزیں نہیں دیں جن کے ہم قابل تھیں۔ وہ قدرت سے تقاضا تو بہت کچھ کا کرتی ہیں لیکن انہیں ملتا وہی ہے جو اُن کی سیدھی سادھی شکل کی بہنوں کو بغیر حسن کی مدد کے میسّر ہے۔

بس اُن کی تمام عمر دکھ اور تکلیف میں گزرتی ہے۔ اب آپ ہی بتائیے حسن رحمت ہے یا زحمت؟

ہندوستان کے جنگل

مسٹر رابندر موہن دت ایم ایس سی انڈین ریویو میں ہندوستان کے جنگلوں کی اہمیت واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جنگل ہندوستان کی سب سے بیش بہا قدرتی پیداوار ہے جنگلوں کی پیدائش کا انحصار بارش زمین، ارتفاعِ زمین اور دوسرے قدرتی اسباب پر تو ہے ہی لیکن ان کا قیام بڑی حد تک خود انسان ہی کے ہاتھ میں ہے جس نے کھیتی باڑی کے لئے جنگلوں کے جنگل کاٹ ڈالے ہیں۔

ظاہر ہے کہ قدرت میں درختوں کو از سر نو پیدا کرنے کی جو طاقت ہے وہ انسان کی درخت کاٹنے کی سرعتِ رفتار کے آگے کچھ بھی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دُنیا کی حکومتیں ملک کی بہتری کے لئے درختوں کی تباہی کا تدارک کرتی رہتی ہیں۔ حکومتِ ہند کا فرض ہے کہ وہ ملک کی اقتصادی بہتری کے لئے جنگلوں کی حفاظت کے مسئلہ کو زیادہ اہمیت دے۔ زمانۂ قدیم میں ہندوستان کے جنگلوں کو نہایت بے دردی سے کاٹ ڈالا گیا۔ پہلے پہلے کم آبادی ہونے کی وجہ سے اس تباہ کاری کے اثرات محسوس نہ ہوسکے۔ آبادی کی زیادتی کا اثر پہلے پہل عہد مغلیہ میں محسوس ہوا لیکن یا تو ناواقفیت کی وجہ سے اور یا سلطنت کے جھگڑوں میں انہوں نے اس طرف توجہ نہ دی۔ برطانوی راج کے آغاز کے دور میں اور بھی زیادہ سرعت سے جنگل کٹنے لگے ان دنوں ملک کی آبادی بھی نسبتۂ بہت بڑھ گئی تھی اس لئے کاشتکاری کے لئے بھی بہت سے جنگل صاف کرنے پڑے تھے، سب سے پہلے لارڈ ڈلہوزی نے اس خطرے کو محسوس کیا اور ۱۸۵۵ء میں انہوں نے جنگلوں کے متعلق ایک تحفظاتی حکمتِ عملی اختیار کرلی۔ غدر کی وجہ سے اس تحریک پر عمل درآمد نہ ہوسکا لیکن ۱۸۶۰ء میں از سر نو جنگلوں کا انتظام نہایت سرعت اور سلیقے سے شروع ہوگیا، اس سلسلہ میں اب تک بھی کام ختم نہیں ہوا۔ کاٹے ہوئے جنگلوں کی جگہ از سر نو اتنے ہی درخت اب تک بھی نہیں لگائے جاسکے بلکہ یہ کام ابھی شروع ہوسکا ہے۔

ہندوستان کے درخت بہت سی ملکی صنعتوں کے لئے خام اشیا مہیا کرنے کے کام آتے ہیں ۱۸۹۴ء میں تو حکومتِ برطانیہ نے جنگلوں کے متعلق ایک قطعی حکمتِ عملی کا اعلان کرکے جنگلوں کو چار حصوں میں تقسیم کردیا۔

(۱) وہ درخت جن کی حفاظت آب و ہوا اور صحت کے لئے ضروری ہے۔ ایسے درخت پہاڑی علاقوں میں ہوتے ہیں۔ ان کی حفاظت اشد ضروری ہوتی ہے کیونکہ بارش کا انحصار انہیں پر ہوتا ہے اور یہ ملک کو ناگہاں سیلابوں سے بچاتے ہیں۔

(۲) وہ درخت جو تجارتی نقطۂ نظر سے بہت مفید ہیں۔ ان سے نہایت قیمتی عمارتی لکڑی حاصل کی جاتی ہے مثلاً شمالی اور وسطی ہندوستان کے درخت اور کوہ ہمالیہ کے شمال مغربی حصہ کے دیودار اور صنوبر کے جنگل۔

(۳) چھوٹے چھوٹے جنگل جن سے مقامی استعمال کے لئے معمولی لکڑی حاصل کی جاتی ہے۔

(۴) چراگاہوں کے درخت جو نام ہی کے جنگل ہیں

ہندوستان کے جنگلوں سے بیشمار ہندوستانی صنعتوں کے لئے خام مصالحہ تیار کیا جاتا ہے اور یہ ہزارہا لوگوں کو روزی مہیا کرنے کا موجب بنے ہوئے ہیں۔ اگرچہ جنگل کے محکمے کا اہم مقصد کٹے ہوئے درختوں کی جگہ نئے درخت لگانے اور انہیں غیر ضروری طور پر کاٹنے سے روکنا ہے لیکن انہیں یہ امر ہمیشہ پیش نظر رکھنا

چاہیئے کہ ملک کی صنعت اور تجارت پر اِن کا بے حد اثر پڑا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رائل ایگریکلچرل کمیشن نے سفارش کی ہے کہ ہر صوبے میں ایک اعلیٰ افسر رکھا جائے جو جنگل سے متعلقہ صنعتوں کو ترقی دے۔ یہ اقدام زراعت پیشہ لوگوں کے لئے جو جنگلوں کے قریب رہتے ہیں بہت مفید ثابت ہوگا۔ انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ جنگل کے محکمے اور زراعت کے محکمے کو ملا کر ایک کر دیا جائے۔

ملایا کی ہندوستانی عورتیں

مسز ای۔ وی۔ ڈیویز لکھتی ہیں۔ "ملایا کی ہندوستانی عورتیں بھی اپنی دوسری ہندوستانی بہنوں سے تعلیم و تہذیب میں بہت پیچھے ہیں لیکن یہاں کی عورتیں اپنی ہم وطن بہنوں کے مقابلہ میں زیادہ وسیع القلب اور روشن خیال ہیں۔ مثلاً ملایا کی عورتیں دوسری اقوام اور غیر مذاہب کی عورتوں سے بہت جلد بے تکلف ہو جاتی ہیں ایک وجہ غالباً یہ ہے کہ وہاں کی تمام آبادی بڑی الناس واقع ہوئی ہے۔ علاوہ ازیں ملایا کی عورتیں زیادہ صاف ستھری ہیں اور ہندوستان کے مقابلے میں انہوں نے اپنی زندگی کا عام معیار زیادہ بلند کر رکھا ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ملایا میں مقیم یوروپین، چینی یا جاپانی عورتوں کے معیار زندگی کے مقابلہ میں ان کا معیار زندگی بہت کم ہے۔

ہندوستان کے جاہل طبقے کی عورتوں کو تو چھوڑیئے۔ ان کے علاوہ یہاں آئی ہوئی ہندوستانی عورتیں عموماً تعلیم یافتہ اور مہذب ہیں، ان میں سے بہت سی اپنی مادری زبان کے علاوہ انگریزی بھی خوب جانتی ہیں۔ لیکن بعض ہندوستانی عورتیں جو یہیں پیدا ہوئیں اور عرصے سے یہاں آباد ہیں مقابلتہً جاہل ہیں، ان کی بوڑھی عورتیں تو جانتی تک نہیں کہ لکھنا پڑھنا ہوتا کیا ہے۔ نوجوان پود اپنی مادری زبان کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتی۔ اگر کچھ پڑھتی ہیں تو صرف انگریزی۔ ہندوستانی تہذیب اور رسوم کا عنصر ان سے مفقود ہوتا چلا جا رہا ہے۔

وہ ہندوستانی عورتیں جو ملایا میں پیدا ہوئی ہیں نہ تو ہندوستان ہی کے گذشتہ و آئندہ واقعات سے کچھ دلچسپی لیتی ہیں نہ دنیا کے کسی دوسرے حصے سے۔ یہ ایک بہت بڑی غلطی ہے جس کا سد باب ہونا بہت ضروری ہے۔ ان میں اس قسم کی جہالت اور کہنہ خیالی شاید ملایا کی غیر مہذب عورتوں کے زیادہ قرب میں رہنے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ کیونکہ ہندوستانی عورت ملایا کی عورتوں کے بہت سے عادات و اطوار اور زبان سے متاثر ہو چکی ہے۔

اگر کسی طریقے سے انہیں مفید تعلیم دی جا سکے تو میرے خیال میں وہ تھوڑے ہی عرصہ میں بہت ترقی کر سکتی ہیں۔ انہیں ہندوستانی عورتوں کے ماحول اور کاموں سے قریبی تعلق رکھنا چاہیئے۔ کیونکہ ان کی طرف قدرتاً ان کا زیادہ رجحان ہو سکتا ہے اور وہ اس سے زیادہ متاثر ہو سکتی ہیں۔ انہیں اپنی مادری زبانوں کے علم و ادب کا بھی مطالعہ کرنا چاہیئے۔ ہندوستانی زبانوں میں بہت اچھی اچھی کتابیں موجود ہیں جن کا مطالعہ ان کی آنکھیں کھول دے گا۔ اور وہ اپنے شوہروں کی زیادہ مفید بیویاں ثابت ہو سکیں گی۔ بحالت موجودہ وہ ان سے چاول اور سالن کی باتوں کے سوا اور کوئی بات نہیں کر سکتیں۔

اس سلسلہ میں ان عورتوں کو اپنے مردوں کی مدد کی ضرورت ہے۔ شاید ملایا میں پڑھی لکھی ہندوستانی عورتوں میں سے بعض اپنی بہنوں کی رہنمائی کرنے پر تیار ہو سکیں لیکن مردوں کی مدد بھی بہت ضروری ہے۔ ان کی ہمدردی کے بغیر کوئی کام سرانجام نہیں پا سکتا۔"

مولیئر اور اُس کے رفیق

مولیئر جنوری ۱۶۲۲ء کی کسی تاریخ کو پیرس میں (Rue St Honore) کے ایک مکان میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا باپ دربار فرانس میں ملازم تھا۔ ابھی مولیئر دس ہی برس کا تھا کہ اس کی ماں میری کریسی کا سایہ اس کے سر سے اٹھ گیا۔ اس کے ایک ہی سال بعد اس کے باپ نے دوسری شادی کرلی۔ مولیئر نے ابتدائی تعلیم گھر ہی پر حاصل کی۔ اور کالج دی کیلارمنٹ میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد ۱۶۴۱ء میں اسے خیرباد کہدی۔ اور قانون کا مطالعہ کرکے وکالت کی اجازت حاصل کی لیکن دوسرے سال ہی بادشاہ لوئی سیزدہم کی ملازمت میں پروانس گیا۔ یہاں یہ ذکر کردینا بھی برمحل ہوگا۔ کہ ۱۶۳۷ء میں اس کے باپ نے اپنی جگہ پر مولیئر کے فائز کئے جانے کا حکم حاصل کرلیا تھا۔ ۲۸۔دسمبر ۱۶۴۳ء کو اس نے چند دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر ایک ٹینس کورٹ کرایہ پر لیکر وہاں اسٹیج بنایا۔ اور کمپنی کا نام لا السٹر تھیٹر (Illuster Theatre) رکھا۔ جب پیرس میں خاطرخواہ کامیابی نہ ہوئی۔ تو ۱۶۴۶ء کے آخر میں پیرس کو چھوڑ کر دوسرے شہروں کا دورہ شروع کیا۔ ۱۶۵۳ء یا ۱۶۵۵ء کو مولیئر نے اپنی پہلی کامیڈی (Lamma ys) میں اسٹیج کی۔ مولیئر کو جاگیریں عطا کی گئیں۔ غرض کمپنی کو خوب فائدہ ہوا۔

مولیئر کا خاندانِ بیجارڈ (Bejard) سے بھی تعلق تھا۔ اور خصوصاً دو تین افراد سے اس کی گہری دوستی تھی۔ ان میں میڈالین اور ارمنڈے نامی دو بہنیں بھی تھیں۔ اول الذکر ایک کامیاب ایکٹرس تھی۔ اور مولیئر کی سیروسیاحت میں اس کے ساتھ رہی تھی۔ لیکن ۲۰ فروری ۱۶۶۲ء کو اس نے اس کی بہن ارمنڈے سے شادی کرلی۔ اس شادی نے اس کے لیئے کافی رنج وغم کا سامان مہیا کیا۔ اس لئے کہ اس کے دشمنوں نے یہ ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی۔ کہ ارمنڈے میڈالین کی بہن نہ تھی۔ بلکہ مولیئر سے اس کی لڑکی تھی۔ بہرحال وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب نہ ہوسکے۔

مولیئر ایک کامیاب ایکٹر۔ ایک تجربہ کار منتظم اور ایک بہت بڑا ڈرامانویس تھا۔ اس کے معاشرتی ڈرامے آجتک اسٹیج پر کھیلے جاتے ہیں۔ فرانسیسی ادب میں اس کا درجہ تمام دوسرے مصنفین سے بلند ہے۔ اور جدید ڈراما نگاری میں شیکسپیر کے بعد اسی کا نمبر ہے۔ افسوس ہے کہ اس کی عمر نے زیادہ وفا نہ کی۔ اور ۱۷۔ فروری ۱۶۷۳ء کو اکیاون سال کی عمر میں اس کا انتقال ہوگیا۔ وہ ایک ڈرامے میں زکام اور کھانسی میں مبتلا مالیڈے کا پارٹ ادا کررہا تھا۔ کہ اسے سخت کھانسی اٹھی اور وہ کسی چیز سے بری طرح ٹکرایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسی شب ۱۰½ یا پونے گیارہ بجے اس نے دنیا کی اسٹیج کو الوداع کہی۔

وہ قیمتی پوشاک۔ خوبصورت سامان آرائش اور پرانی کتابوں کا شائق تھا۔ بوڑھے لوگ اس کی زیادہ قدر کرتے تھے اس کے دوست دشمن یہ کہنے میں ہمخیال ہیں کہ وہ کامیڈی کا نہایت ہی کامیاب ایکٹر اور آپ اپنی مثال تھا۔ اس تصویر میں وہ اپنے ساتھ کام کرنیوالے ایکٹروں اور ایکٹرسوں کے ساتھ دکھایا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ کوئی ایکٹ کررہا ہے۔ بہرحال یہ پتہ نہیں چلتا۔ کہ وہ اس وقت کمپنی میں ہے یا اپنے مکان پر۔

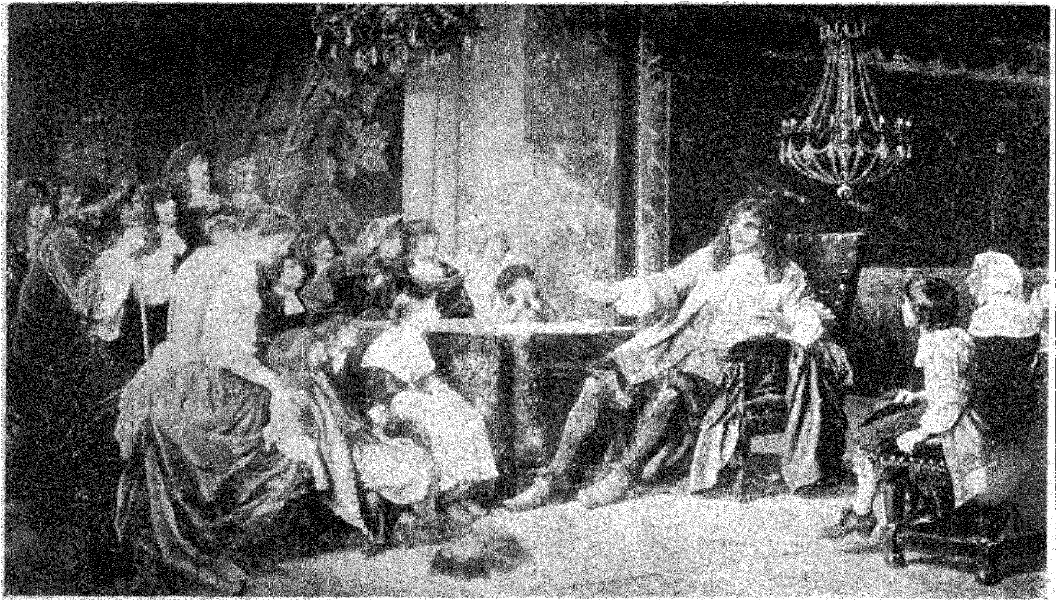
قابیل اور اس کا خاندان

قابیل حضرت آدم علیہ السلام کے سب سے بڑے لڑکے کا نام ہے۔ جو کھیتی باڑی کیا کرتا تھا۔ اس کا چھوٹا بھائی ہابیل ایک گڈریا تھا۔ جسے مشہور مذہبی روایت کے مطابق اس نے رقابت کی وجہ سے ایک کھیت میں مار ڈالا تھا۔ اس قتل کی سزا اس کو ہر جگہ مارے مارے پھرنے اور بےچین بیقرار رہنے کی صورت میں دیگئی اور بدن پر ایک داغ بھی لگا دیا گیا کہ جس کسی کو ملے وہ اس کو قتل کر دے۔ اس نے یہ سزا بھگتنے کے لئے عدن کے جنوب میں ملک ناڈ میں قیام کیا۔ اور یہاں ایک شہر بسایا جس کا نام اپنے بیٹے کے نام پر اینک تھا۔ اس تصویر میں اسے اپنے خاندان کیساتھ جاتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ غالباً یہ اس موقع کی تصویر ہے جب وہ ملک ناڈ کی طرف جارہا تھا بہرحال یہ تصویر اس کی سزا کا اعلان کررہی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ سب لوگ جلدی میں ہیں۔ اور پریشانی سے بھاگے جارہے ہیں۔

دیوانہ مصطفےٰ آبادی۔

"ہمایوں"

نوٹ:۔ اس اشاعت کی دونوں تصاویر کیلئے ہم صاحبِ مضمون جناب دیوانہ مصطفےٰ آبادی کے ممنون ہیں۔



مولئیر اور اُس کے رفیق



قابیل اور اُس کا خاندان

گرامر مرید

کیا واہیات ہے

انگلستان سے ایک دلچسپ لفظی بلوے کی خبر آئی ہے۔ جس طرح بعض حضرات زن مرید ہوتے ہیں۔ اسی طرح بعض لکھنے والے گرامر مرید ہوتے ہیں اور ان گرامر مریدوں نے یہ ظلم ڈھانا چاہا کہ انگریزی زبان میں جو لاطینی لفظ ہیں۔ ان کی صیغۂ جمع کی آواز اور صورت لاطینی گرامر کے تحت ہو۔ مثلاً Pendulam کی جمع Pendula ہو اور automaton کی جمع بجائے automatons کے automata ہو۔ اس ظلم کی برداشت انگلستان میں کہاں! جیتی جاگتی زبان بھلا مردہ گرامر کے کیا پاؤں دھو دھو کر پیئے گی؟ زبانیں ان انسانوں کی طرح ہیں جو قرض لے کر قرض کی رقم کو خود اپنی مرضی اور تدبیر سے استعمال کرتے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ زبان سیکھنے اور بولنے والے بچوں پر یہ بیجا سختی ہے کہ وہ کسی لاطینی الاصل لفظ کی جمع بناتے وقت اسے اس کا پرانا لاطینی کفن پہنائیں۔ زبان خیالات کا لباس ہے، اور لباس ایسا ہونا چاہیئے کہ خیالات آسانی سے چل پھر سکیں، نہ ایسا کہ قدم قدم پر ٹھوکر کھائیں۔

کیا اردو لکھنے والے اور پڑھنے والے (قارئین کے لفظ سے مجھے نفرت ہے) اس قسم کے بلوے کے لئے طیار ہیں۔ کہ "لفظوں" کے بجائے غیر ضروری طریقے سے جو "الفاظ" لکھے "قبروں" کی بجائے جو "قبور" لکھے اور "جاہلوں" جیسی عام چیز کی بجائے جو "جہلا" بروزن "علما" لکھے اس سے چھیڑ چھاڑ شروع کردیں کہ یہ تکلّف ایک بیہودہ تکلّف ہے۔ نوجوان لکھنے والوں میں بیسیوں ایسے ہوں گے جنہیں اردو جیسی شوخ و شنگ پری کو زبردستی عرب کے گھر ڈالنے پر غصہ آتا ہوگا۔ وہی کچھ کریں ؂

جہلاء، قبور اور الفاظ سے زیادہ بہتر اگر کوئی جمع اسکی نظر میں ہو تو لکھے شکریہ [illegible]

عبدالعزیز

ناامیدی

سطحِ دریا پہ کبھی موج کے ہلکوروں سے — جس طرح شکل بگڑتا نہیں عکسِ خورشید
حسرت و یاس کے طوفان و تموج سے یونہیں — دل میں بن بن کے بگڑ جاتی ہے شکل امید۔

یحییٰ نقوی

طاہرہ

بہزین

ایران کی انقلاب پسند خاتون اور آتش نوا شاعرہ

"مرد مسائل ہیں، عورتیں تصاویر" لیکن طاہرہ مسئلہ بھی تھی اور تصویر بھی ــــ ایک ایسا مسئلہ جو اپنے حل کا حریف ہو ــــ ایک ایسی تصویر جو فریم کے حدود پر خندہ زن ہو ــــ مجسمۂ جمال، خزینۂ علم، مفکر، حیرت آفریں، شاعرہ، غیب گو، بے باک و بے جگر، انقلاب پسند ــــ مختصر، یہ کہ دستِ قدرت کی ایک غیر معمولی صنعت! اُس کی زندگی مختصر ہے ــــ اس کا افسانہ مختصر تر۔ اُس نے دنیا کو فتح کیا ایک طوفان کے ذریعہ سے جس نے خود اُس کی شمع حیات گل کر دی۔ شاعری نے اُس کے ترانے گائے۔ محبت نے اس کی پرستش کی۔ سوسائٹی نے اُس سے انحراف کیا۔ مذہب نے اُسے پر تقصیر گردانا اور جنون آمیز تعصب نے اُسے ہلاک کر دیا باوجود شاہی حکم کے کہ "اُسے زندہ رہنے دو کیونکہ وہ اس قدر جمیل ہے"۔

میں اسے "طاہرہ" کہتا ہوں کیونکہ یہی نام ہے جو اُس نے شاعری میں بطور تخلص اختیار کیا تھا اور تاریخ شاہد ہے کہ اُس نے "طاہرہ" تخلص اختیار کرنے میں غلطی نہیں کی۔ شفیق والدین اُسے "زریں تاج" کہتے تھے۔ عوام اس پر "ماہِ کامل" اور "مہرِ درخشاں" جیسے شیریں القاب نچھاور کرتے تھے لیکن راہرو اُسے "قرۃ العین" سمجھتے تھے ــــ آنکھوں کی ٹھنڈک! اُس کا مشفق اتالیق بھی اپنے خطوط میں اُسے اسی نام سے مخاطب کرتا تھا۔

بمشکل ایک صدی گزری ہے جب اُس نے عالم طفولیت میں قدم رکھا۔ نسیم شباب نے شعلۂ حسن کو مشتعل و فروزاں کیا اور اس حد تک کہ ہر دیکھنے والی آنکھ خیرہ ہونے لگی۔ اس کی ماں نے جو قدیم رسوم کی پابند تھی اُس کی نقل و حرکت کو اب اپنے عالیشان مکان کی چار دیواری میں محدود کر دیا اور اس کے بزرگ و عالم باپ مرزا صالح نے دماغی مشاغل میں اُسے اور زیادہ مصروف کر دیا۔ روز بروز، ماہ بہ ماہ جمالِ نو شگفتہ گہوارۂ علم میں جھولتا رہا ــــ کبھی "اقلیم فلسفہ" میں فتوحات حاصل کر رہا ہے تو کبھی "قربانگاہِ شاعری" پر موتی برسا رہا ہے۔ دو سال کی تعلیم نے اُس کے باپ پر یہ امر واضح کر دیا کہ لڑکی ان حدود سے گزر چکی ہے جو عورت کو خیال و عمل میں مرد کے ماتحت رکھتے ہیں۔ اس کی محیر العقول ذہانت نے جو مختلف ادبی گلشنوں کی گل چینی سے صیقل ہو گئی تھی اُسے ناقابلِ تسخیر بنا دیا ــــ "مساواتِ جنسی" اور "حقوقِ نسوانی" پر مختلف مناظرے میں اُس نے بہت سے مشہور عالموں کو شکست دی۔ اور اُس کے اشعار فارس کے طول و عرض میں تیر آسا تیزی سے اُڑنے لگے۔ ملک میں ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ اور "زریں تاج" و "طاہرہ" ناموں کی کچھ ایسی عزت و توقیر ہونے لگی جس میں رعب بھی شامل تھا۔

طاہرہ کے خیالات کی سرگرم و خطرناک روانی سے خوف زدہ ہو کر اُس کے باپ نے اپنے بھتیجے محمد کے ساتھ جو مشہور و معروف مجتہد اعظم مرزا لقی کا فرزند تھا اس کی شادی کر دی۔ محمد ایک جوانِ رعنا اور عالمِ پرجوش تھا اور طاہرہ سے شادی کا ارمان ایک مدت سے اپنے دل میں رکھتا تھا ——— لیکن طاہرہ ا ——— وہ ایک ایسا گوہر بے بہا تھی جو تصرّف انسانی کے لئے نہ تھا۔

شادی تمام متوقع اور مناسب شان و شوکت کے ساتھ منائی گئی اور یہ عروسِ بے مثل جو پری کا پورا جمال اور دیوی کی جملہ تمکنت رکھتی تھی ایک "انسانِ محض" کو دے دی گئی۔ محمد خوش تھا ——— طاہرہ خوش تھی نہ غمگین۔ محمد اپنے طالع کا شکر گزار تھا ——— طاہرہ کسی سے بیزار تھی نہ خفا ——— محمد کا خیال تھا کہ اب میں طاہرہ کا مالک ہوں۔ طاہرہ کو محسوس ہوتا تھا کہ میں "آزاد" ہوں۔

پہلی ملاقات نے "فریبِ توقعات" کو دو لہا کے سامنے بے نقاب کر دیا۔ اُسے محسوس ہُوا کہ وہ دونوں جدا ہونے کے لئے ملے ہیں! اُن کے خیالات متضاد تھے اور اُن کے مقاصد بعد المشرقین کے حامل ——— وہ ذاتی مسرت اور تسکین کا جویا تھا۔ وہ حیاتِ انسانی کا مقصد ایک عالمگیر مسرت و سکون کی تخلیق سمجھتی تھی ——— محمد نے اپنے جذبات کو فی الحال مخفی رکھا اور طاہرہ کے خیالات کو تدریجاً متاثر کرنا بہتر سمجھا۔

طاہرہ اپنے اوقات کا بیشتر حصہ مطالعہ کتب پر صرف کرنے لگی۔ فارسی کے علاوہ جو اس کی مادری زبان تھی۔ وہ عربی سے بھی واقف تھی اور عربی ادب کو جو مذہب، فلسفہ، تاریخ، معاشیات اور سیاست سے متعلق تھا خاص طور پر دیکھ چکی تھی۔ اب وہ پہلوی زبان کی طرف متوجہ ہوئی جو قبلِ اسلام فارس کی زبان تھی اور چند ماہ کے بعد ہی وہ مزدک کے پیش کردہ مسائلِ انقلاب پر بحث و مباحثہ کرنے لگی جو کبھی حکومت ساسانی کو پریشانی و کشمکش میں مبتلا کر چکے تھے۔ پردے میں رہتے ہوئے جو کچھ خط و کتابت اور بحث و مباحثہ اُس نے علما کے ساتھ جاری رکھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے خیالات میں جمہوریت پسندی کافی حد تک سرایت کر چکی تھی۔ وہ بہت سے لوگوں کو یقین دلا چکی تھی قائل کر چکی تھی لیکن اس وقت تک اُسے کوئی ایسا سرگرم کارکن نہ ملا تھا جس کے ہمراہ وہ باہر نکل کر اپنے ملک میں انقلاب کی تحریک شروع کرتی

اسی زمانے میں علی محمد باب ——— ایک مشہور سیاسی قسمت آزما ——— جس کو "مہدی آخر الزماں" اور ایک طرح سے "تجسّمِ خداوندی" ہونے کا دعویٰ تھا اور جس کے خیالات بڑی حد تک تعلیماتِ مزدک سے متاثر تھے خراساں اور "ماژندران" میں عسکری قوت جمع کر رہا تھا۔ کچھ مدت تک طاہرہ اس کی حرکات و سکنات کو بہ غور دیکھتی رہی لیکن آخر کار ایک ایسا قسمت ساز وقت آیا کہ اُس نے اشتراکِ عمل کے لحاظ سے خود کو اس کا شریکِ قسمت بنا لیا۔ باب سمجھتا تھا کہ طاہرہ کے ساتھ اُس کا اتحاد کیا قیمت رکھتا ہے۔ اس کا جمال۔ اس کی شاعری۔ اُس کی قوتِ تقریر۔ اور اُس کی دولت خاندان، قاچاریہ کو تہ و بالا کرنے میں اُسے بہت کچھ امداد بہم پہنچا سکتی تھی۔

گم کردہ راہ لیکن شریف طاہرہ چاہتی تھی کہ اُس کا شوہر جو اُس کے خیالات کا متحمل رہا تھا اور اُس کی خواہشات کا احترام نہایت وفاداری کے ساتھ کرتا رہا تھا اُس کی تحریک میں شریک ہو جائے۔ اُس نے اشتراکِ عمل کے لئے اُس پر زور دیا لیکن بیکار ——— دونوں نے اپنے اپنے دلائل ختم کر دیئے ——— ایک دوسرے سے ملتجی بھی ہوئے لیکن دونوں میں سے ایک بھی راضی نہ ہُوا۔ اپنی کوششوں میں

مایوس ہوکر وہ اپنے مکان سے باہر لوگوں کو مخاطب کرنے کے لئے نکل آئی جو نماز جمعہ سے فارغ ہوکر قریبی مسجد سے آرہے تھے۔ وہ مسجد کی سیڑھیوں پر چڑھ گئی ـــــــ اُس نے اپنی نقاب اٹھا دی اور اپنی شیریں آواز میں جو کسی نقرئی گھنٹی کی صدا معلوم ہوتی تھی یوں نغمہ ریز ہوئی:-

"دوستو اور اجنبی لوگو!

اس ذات کا واسطہ دے کر جس نے فرزندانِ آدم کے لئے فرشِ زمین اس لئے پھیلایا کہ ایک عام تفرج گاہ کی طرح اس سے حظ اندوز ہوں اور جو بلا قیمت مساوی تقسیم آب و نور سے تمہاری زندگی قائم رکھتی ہے اور انسانوں کے درمیان کسی امتیاز کو گوارا نہیں رکھتی ـــــــ ہاں اُس ذات کا واسطہ دے کر میں تم سے ایک سوال کرتی ہوں! کونسی چیز تمہیں اُس وقت نیشِ اذیت محسوس کرنے سے باز رکھتی ہے۔ جبکہ "شاہ" تمہیں اپنا غلام اور "مجتہد" تمہیں اپنا بندۂ بے دام کہتا ہے؟ اول الذکر کو کیا حق ہے کہ وہ زمین پر ایک خط کھینچے اور کہے کہ "یہ میری ملکیت ہے؟" ـــــــ موخرالذکر کو کیا حق ہے کہ بابِ فردوس میں اپنے ہاتھ پھیلا کر کھڑا ہوجائے اور کہے کہ تمہاری نجات کا انحصار میری رضا پر ہے؟"

سلطنت کسی کی ملکیت نہیں ـــــــ مذہب کسی کی وراثت نہیں۔ یہ زمین اور اس کی پیداوار تمام کائنات کے لئے عام تحائف ہیں اور مذہب انفرادی ضمیر کا معاملہ ہے۔ یہی بات ہے جو رسولِ خدا اور میرا آقا "باب" کہتا ہے۔ وہ زمین پر سلطنتِ خداوندی قائم کرنے اور انصافِ حقیقی پھیلانے کے لئے بھیجا گیا ہے اس کی نسبت جو لوگ میرے ہم خیال ہوں وہ ایک بار "بے شک" کہہ دیں"۔

ایک ہزار آوازیں پکار اُٹھیں ـــــــ "بے شک"!

"میں یہ امر یقین کے ساتھ جاننا چاہتی ہوں کہ تم میں کتنے ایسے ہیں جو اس مقدس و معزز کام کے لئے اپنی زندگی خطرے میں ڈال سکتے ہیں ـــــــ میں تو اپنی زندگی اس کے لئے پیش کر چکی ہوں"۔

"بے شک! بے شک! تمام ـــــــ ہم سب!!"

اُس نے اپنے رومال کا ایک گوشہ ان کی طرف بڑھا دیا اور کہا:-

"تو آؤ ـــ عہد مقدس کریں اور اس پر مضبوطی سے قائم رہیں ـــــــ آؤ ان نازک دھاگوں سے ہم خود کو باہم یوں باندھ لیں کہ موت بھی جُدا نہ کرسکے"۔

ہجوم رومال کو بوسہ دینے کے لئے دیوانہ وار آگے بڑھا۔

"جاؤ ـــــــ اب تم اپنے عزیز و اقارب کے پاس جاؤ اور "زریں تاج" کا مبارک پیغام اُن کے پاس پہنچا دو تاکہ کل وہ بھی اسی جگہ نماز ظہر کے وقت آئیں۔ ممکن ہے تم ہی اپنے خالق کے وہ بندے ثابت ہو جن کو اُس نے دنیا کو از سرِ نو تعمیر کرنے کا کام سپرد کیا ہے"۔

اس طرح اس نے اپنا پہلا تیر چلا دیا اور "زریں تاج زندہ باد!" "قرۃ العین زندہ باد" کے فلک شگاف نعروں کے درمیان اپنے مکان کو لوٹ آئی۔

اُس کے خسر مرزا تقی نے اس کے والد کو بلایا اور اعزہ و اقارب کی "مجلسِ شوریٰ" رات کو منعقد کی گئی۔ طاہرہ کو اپنی روش کی تصریح کے لئے طلب کیا گیا۔ ایک دیوی کی آزمائش ہو رہی تھی ——— پندونصیحت کے لئے کان بے سماعت ہو گئے ——— جبروتشدد ناکام ثابت ہوا ——— طاہرہ ایک چٹان کی طرح مضبوط تھی۔ "سزائے شدید دو تاکہ یہ راضی ہو یا مرجائے" ——— یہ اُس کے باپ کا فیصلہ تھا۔ اور طاہرہ کی وکالت کو کوئی موجود نہ تھا ——— فرشتہ رہینِ سلاسل کر دیا گیا۔ ہاتھ پاؤں جکڑ دیئے گئے اور اُس کو اسی کے کمرے میں ایک ستون سے باندھ دیا گیا۔ "ترکی کنیزوں نے جو رات میں اُس کی حفاظت وخبرگیری کے لئے مقرر کی گئی تھیں اُس سے التجائیں کیں ——— اُس کی منت و سماجت کی۔ اُس کے قدموں پر گر کر آنسو بہائے اور اُس کی زنجیروں پر بوسے دیئے لیکن اُن کی نوجوان بیگم صرف مسکرا دی اور پھر بار بار اُس نے اپنی نگاہیں سوئے فلک اٹھائیں اور قادرِ مطلق سے التجا کی کہ مجھے اپنے مقصد کے پورا کرنے کے لئے کافی قوت مل جائے۔ اُسے اپنی کمزوری اور کام کی دشواری کا اعتراف تھا لیکن اُسے یہ یقین بھی تھا کہ کامیابی آخرکار مجھی کو ہو گی۔

جس وقت اس عالیشان مکان کے پھاٹک پر دربان رات کے بارہ بجا رہا تھا اُس کے کمرے کا دروازہ کھلا اور اُس کا پریشان و غمزدہ شوہر اندر داخل ہوا۔ کنیزوں نے پاسِ ادب سے کمرے کو خالی کر دیا اور دروازہ بند کر دیا۔

طاہرہ نے اپنا سر حتی الامکان اوپر اٹھایا اور اس سے دریافت کیا کہ تم اپنے اور میرے باپ کی طرف سے کیا جدید احکام لے کر آئے ہو۔ محمد ایک منٹ خاموش کھڑا رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زبان کو جنبش دینے کے لئے قوت جمع کر رہا ہے ——— دوسرے ہی لمحے میں اُس نے طاہرہ کی زنجیریں اور بندشیں توڑ ڈالیں۔ طاہرہ ایک آرام چوکی پر تکیہ کے سہارے بیٹھ گئی اور محمد کو جو کمرے سے چل دیا تھا اپنی طرف بلایا۔

"میں تم سے محبت کرتی ہوں ——— میرے معزز شوہر؟"

"لیکن میں تم سے نفرت کرتا ہوں"۔

"کیوں؟"

"اس لئے کہ تم باب کی معتقد ہو۔ وہ شیطان کی طرح تمہارے تصور پر محیط ہے"۔

طاہرہ نے ہنس دیا اور اپنی باہیں محمد کی گردن میں حمائل کر دیں۔

"تم غلطی پر ہو ——— تم ابھی تک مجھے سمجھے نہیں"۔

"کیا عورت کو سمجھنا اس قدر دشوار ہے؟"

"ہاں ——— کیونکہ وہ آوازِ خداوندی سنتی ہے۔ وہ خدا کی بخشی ہوئی جبلت کی پیروی کرتی ہے اور مرد اپنے عارضی مقاصد کے ارشادات کی تعمیل کرتا ہے"۔

محمد۔ "(غور سے دیکھتے ہوئے) تمہارے خیالات اگر ایسے جنوں انگیز نہ ہوتے تو تم ایک شہزادی ہوتیں ——— تختِ طاؤس کے لئے موزون!"

طاہرہ نے اپنے ہاتھ ہٹالئے اور اپنی نشست پر سیدھی بیٹھ گئی۔

"تخت و تاج جھوٹے موتی ہیں ——— بیوقوف کے لئے سامانِ تسکین ——— چالاک اور فتنہ پرداز لوگوں کے لئے آلۂ کار۔ جن لوگوں نے انہیں ایجاد کیا ہے وہ اپنی قوم کے سخت مجرم ہیں۔ دنیا تخت و تاج کے بغیر زیادہ مسرور رہتی"۔

"تم پاگل ہو ——— اخلاق سے گری ہوئی اور فساد انگیز باتیں کرتی ہو۔ عورت کا کام سوسائٹی اور حکومت میں دخل دینا نہیں۔ مردان کاموں سے اچھی طرح واقف ہیں"۔

طاہرہ حالتِ غیظ میں کھڑی ہوگئی۔

"تم جیسے خیالات کے مرد جو عورت کو ایک کھلونے سے زیادہ نہیں سمجھتے جس قدر جلد حکومتِ عالم سے دستبردار ہو جائیں اسی قدر بہتر ہے۔ تم مدت تک "صنفِ لطیف" کے حقوق کو پامال کر چکے ہو۔ مردوں کی آبادی منافقوں کا ایک گروہ ہے۔ تم ہماری پرستش کا اعتراف کرتے ہو لیکن دراصل ہمیں محبوس کرنے کے ساعی ہو اور ہم لاعلمی میں تمہارے فریب کا شکار ہو جاتے ہیں۔ میں تمہاری خود غرضی کی بنا پر تم سے نفرت کرتی ہوں ——— نفرت!"

ایک دور سے آنے والے شور نے طاہرہ کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اُس نے ایک دریچہ کھولا تو دیکھا کہ چاند کی ہلکی روشنی میں ایک زبردست ہجوم "زریں تاج زندہ باد" ——— "قرۃ العین زندہ باد" کے نعروں کے ساتھ مکان کی طرف بڑھتا چلا آرہا ہے۔ طاہرہ کی مصیبت کی خبریں رات میں کسی وقت پہنچ گئی اور نصف شب کے بعد ہی فوراً سارا شہر قزوین جاگ اُٹھا۔ ہجوم مضبوط پھاٹک پر پہنچ گیا۔ اور بالجبر اندر داخل ہونے کی دھمکی دی گئی۔ طاہرہ کی سلامتی و حفاظت کا یقین ملازمینِ مکان نے دلایا لیکن ہجوم کو تسکین نہ ہوئی۔ مرزا تقی نے پولیس طلب کی جو کافی طاقت کے ساتھ آئی اور مرزا کے مکان کو اپنے حصار میں لے لیا۔ لیکن پولیس کی آمد سے پہلے ہی ہجوم میں خوفناک حد تک اضافہ ہو چکا تھا اور خواتین کی پرجوش جماعت طاہرہ کی ذات کی حفاظت کے لئے اندر داخل ہونے پر مصر تھی۔ کوتوال سے مشورہ لے کر مرزا تقی نے عورتوں کو داخلہ کی اجازت دے دی اور مرد حالات معلوم کرنے کے لئے باہر عالمِ بیتابی میں کھڑے رہے۔

طاہرہ نے ان خواتین سے ہال میں ملاقات کی۔ ہال "زریں تاج زندہ باد" کے نعروں سے گونج اُٹھا اور باہر ہجوم نے بھی ان الفاظ کا پرجوش جواب دیا۔

طاہرہ ایسی کم فہم نہ تھی کہ اس موقع کو ہاتھ سے جانے دیتی۔ صبحِ صادق سے پیشتر وہ اپنے ہمدردوں کو مخاطب کرنے کے لئے بیرونی بالاخانے پر ظاہر ہوئی ——— وہ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی داہنی اور بائیں طرف دو مشعل بردار تھے اور خواتین کی ایک جماعت پیچھے ایستادہ تھی۔ نیچے کھڑے ہوئے لوگوں پر وہ لطافتِ کلام کے پھول برساتی ہوئی ایک دیوی معلوم ہوتی تھی ——— جو ستاروں پر حکمران ہو۔

"قزوین کے بہادر فرزندو!

ناانصافی و ظلم کی رات ختم ہوگئی ہے اور آزادی کا آفتاب سامنے پہاڑیوں پر طلوع ہونے کو ہے۔ اس کارِ اہم کے لئے جو خدا نے تمہیں سپرد کیا ہے کمربستہ ہوجاؤ اور انسانیت پر جبر روا رکھنے والوں سے تعلقات قطع کرلو خواہ وہ تمہارے گوشت و پوست ہی سے بنے ہوئے کیوں نہ ہوں ——— "نیکی" اور "بدی" کے درمیان اعلانِ جنگ ہوچکا ہے اور وہ دن آگیا ہے کہ خدا "بدی" کو ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کردے۔

جاؤ اور اپنے آقا باب کی فتوحاتِ خراسان و بلغروش کی لوگوں کو اطلاع پہنچاؤ۔ اس کے ہاتھ میں خدا کی تلوار ہے اور وہ تمہاری نجات کے لئے بسرعت تمام آرہا ہے۔ تیار ہوجاؤ اس سے پہلے کہ وہ مظلومین کی امداد۔ غلاموں کی آزادی اور شیطانی رسوم کی اُن زنجیروں کو ٹکڑے ٹکڑے کردینے کے لئے جنہوں نے صنف نازک کو ازلی غلامی میں پابند رکھا ہے۔ تمہاری حسین وادی میں ایک فرشتہ کی طرح فتوحات کرتا ہوا نمودار ہو۔ وہ اُس زمانۂ منتظر کا پیغامبر ہے جبکہ حضرت مسیح علیہ السلام اور "فرشتۂ امن" خدا کے حکم سے زمین پر آکر ہمیں بہشت دلائیں گے۔ جاؤ اور اُس کی آمد کا اعلان کردو۔ کیونکہ وہ ہادیٔ اعظم ہے ——— مہدی آخر الزماں!"

ایک آواز نے دریافت کیا "مجتہدین کے لئے آپ کا حکم؟"

"زمین کی سلطنت خدا اور اُس کے رسول کی ہے۔ جھوٹے مدعی کافر ہیں اور دنیا جس قدر جلد اُن سے نجات پائے اُسی قدر اچھا ہے۔"

ہجوم "اللہ اکبر" کے شور اور نعرۂ جنگی کے ساتھ رخصت ہوگیا اور اس سے پہلے کہ مشرقی پہاڑیوں سے آفتاب اپنا نورانی چہرہ نکالے شہر قزوین میں ہنگامہ و فساد بپا ہوچکا تھا۔

چھ سات عالم نہایت بے رحمی سے قتل کردیئے گئے۔ طاہرہ کا خسر مرزا تقی قریبی مسجد میں نہایت سنگدلی سے ہلاک کیا گیا اور اُس کے ماں باپ اپنی جانیں بچا کر فرار ہوگئے۔ خود طاہرہ بھی اپنی جوشیلی تقاریر کے نتائج سے خوف زدہ ہوگئی اور بعجلت تمام اُس نے اپنے ذاتی مکان کی حفاظت کے لئے اپنے پیرو کاروں کو جمع کرلیا۔

دوپہر کے بعد قدیم الخیال لوگ بدلہ لینے کے لئے اکٹھے ہوئے اور شاہی فوجوں کی مزید قوت کے ساتھ شام سے پہلے طاہرہ پر ایک پرجوش حملہ کیا۔ بابیوں نے کافی مقاومت کی لیکن رات کے وقت جب حملہ دوبارہ ہوا تو اُن کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ طاہرہ نے اپنے ہمراہیوں کو پیچھے ہٹا لیا اور مشرق کی طرف روانہ ہوگئی۔

کچھ دن بعد طاہرہ اور باب بدیشت میں مل گئے۔ دو حیرت انگیز دماغ اپنے آئندہ منصوبوں پر غور کرنے کے لئے دوش بدوش ہوگئے مہر و ماہ تاریخ ایران میں ایک جدید باب کھولنے کے لئے ساعی ہوگئے۔ وہ جانتے تھے کہ مشرق میں سماجی زندگی مذہبی رسوم کے رشتوں میں بری طرح اُلجھی ہوئی ہے اور اول الذکر کی اصلاح کے لئے موخر الذکر کا پورا پورا استیصال ضروری ہے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ ایک مذہبی جلسہ کیا جائے۔

اگلے جمعہ کو بدیشت میں ایک جم غفیر طاہرہ کے کیمپ میں نظر آ رہا تھا. قریبی دیہات اور خود شہر توتستم سے لوگ "نجات دہندہ" اور اُس کی حسین پیروکار کی زیارت کے لئے آئے تھے. طاہرہ ایک نیلے ریشمی پردے سے لوگوں کو مخاطب کرنے کے لئے برآمد ہوئی۔

"صداقت اور مسرت کے متلاشیو!

قسمت تاریخ انسانی میں ایک جدید باب کا اضافہ کر رہی ہے. ستارے نئے مقامات پر قائم ہونے کے لئے ——— نئی صورت اجتماعی اختیار کرنے کے لئے اور دنیا سے اُس زمانۂ منتظر کا تعارف کرانے کے لئے ڈھیلے چھوڑ دیئے گئے ہیں جب امن کی حکومت ہوگی مسرت و خوشحالی کا زمانہ آگیا ہے اور انسان کا "عہد زریں" اپنی نقاب اٹھا رہا ہے افلاک تم پر اپنی برکتیں برسانے کے لئے مقامات تبدیل کر رہے ہیں ——— زمین تمہارے قدموں پر اپنے پوشیدہ خزانے اُگلنے کے لئے بیتاب ہے. غم و فکر داستانِ پارینہ بن کر رہ جائیگا مفلسی و بدقسمتی کا ذکر اب کبھی سننے میں نہ آئے گا۔ امن و فراغت کا دور دورہ ہوگا ——— ہر مرد بادشاہ ہوگا اور ہر عورت ملکہ۔

"روحِ خداوندی" جو اس "عہدِ زریں" پر حکمرانی کرے گی اپنی آمدِ مقدس سے اس زمین کو مشرف کر چکی ہے ——— یعنی ہمارا آقا سیدنا علی محمد باب جو زمین پر سلطنتِ خداوندی قائم کرنے کے لئے نازل ہؤا ہے"۔

اُس نے "باب" کے سامنے سے پردہ ہٹا دیا جو ایک شاندار تخت پر ریشمی و زرکار شامیانے کے نیچے متمکن تھا" اپنے آقائے مطہر کے سامنے آداب بجا لاؤ جس کے ہاتھ میں کلکِ تقدیر ہے اور جس نے ہماری زمین کو اُس "گلشن عیش و عشرت" میں تبدیل کر دینے کے لئے نزول فرمایا ہے جو خدا نے اولاد آدم کے لئے رکھا ہے"۔ یہ کہتے ہوئے وہ اپنے "آقا" کے سامنے ایک بار جھکی اور تمام مرد عورتیں اور بچے بھی اس کے روبرو زمین پر گر پڑے۔

"اٹھو۔ اے خوش قسمت انسانو! اُٹھو! اور اس کی برتری کا اعلان کرو جس نے تمام پہلے قوانین کو اپنے قانون سے منسوخ کر دیا ہے ——— جس نے دولت و افلاس کے امتیازات کو معدوم کر دیا ہے ——— جس نے غلامی کی زنجیروں کو توڑ ڈالا ہے اور جس نے عورت کو آزاد کر کے مرد کا ہم پایہ بنا دیا ہے۔

آؤ ——— بیعت کرو اور اُس پر استقلال سے قائم رہو"۔

سب نے طاہرہ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور باب کے سامنے از راہِ تکریم گردنیں خم کر دیں اور اس وقت سے وہ "آزاد حکومت" کے ان وفادار عمل میں شامل ہو گئے جن کو زمین پر ایک جنت تعمیر کرنا تھی۔

طاہرہ کی مستعد کُن ترغیبات نے بدیشت اور اُس کے گرد و نواح کو یکسر تبدیل کر دیا. عورتوں نے اپنی نقاب چاک کر ڈالی اور مکان کی چار دیواری کو خیرباد کہہ دی. لڑکوں اور لڑکیوں نے زنجیرِ پابندی کو توڑ ڈالا اور عیش کوشیوں اور حظ اندوزیوں کے دائرے کو وسیع کر دیا. عام طور سے لوگ زیادہ مسرور ——— زیادہ بے فکر نظر آنے لگے. یہی نہیں بلکہ اپنی جدید حاصل شدہ آزادی سے دیوانے

سے ہو گئے آئین و دستورِ دینی منسوخ کر دیئے گئے۔ مساجد بند ہو گئیں اور بزرگوں کے مقابر تفرج گاہوں میں تبدیل کر دیئے گئے۔

باب اور طاہرہ نے اپنی حکمرانی قائم کرنے اور اپنی جدید سلطنت کو مستحکم بنانے کے لئے کل صوبے میں دورہ کیا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ دونوں ایک ہی پالکی میں نئی تعمیرِ حکومت پر بحث و مباحثہ کرتے ہوئے اور مستقبل کے لئے طریقۂ عمل سوچتے ہوئے سفر کیا کرتے تھے۔ اب وہ "حصار جریب" پہنچ چکے تھے جو کہ ایک چھوٹی سی آبادی ہے اور اس سڑک پر واقع ہے جو البرز پر سے ہوتی ہوئی بحیرۂ کیسپین تک جاتی ہے ایک پہاڑی کے دامن میں اونچے مقام پر خیمے نصب کر دیئے گئے تھے۔ اور رات کے لئے تمام آرام دہ سامان کا انتظام ہو چکا تھا۔

رات کا کھانا ختم ہو چکا تھا اور باب اور طاہرہ ادھر ادھر کی باتوں میں مشغول تھے۔ شمع دانوں میں دو شمعیں پاس پاس روشن تھیں۔ ایک خوبصورت پروانہ خیمے میں چپکے سے داخل ہوا اور ایک شمع کے گرد طواف کر کے دوسری شمع کے جانسوز شعلے کی طرف دیوانہ وار بڑھا اور جل کر خاکستر ہو گیا۔ باب کے منہ سے بے اختیار نکلا ——— "بے وفائی!" ——— طاہرہ کانپ گئی۔ جو خواب وہ اکثر دیکھتی تھی وہی اب ایک زندہ مشابہت کے پردے میں اس کی آنکھوں کے سامنے تمثیل کیا گیا تھا ——— فرق صرف اتنا تھا کہ پروانے کے سر پر کوئی "زریں کلغی" نہ تھی اور شمعیں الفاظ "عقل" و "جذبہ" کی حامل نہ تھیں۔ وہ اپنی نشست سے اٹھی۔ باب کے سامنے ایک بار جھکی اور اپنے خیمے میں چلی گئی۔

طاہرہ چارپائی پر لیٹ گئی لیکن دل کی بے چینی کم نہ ہوئی۔ اس نے اپنی پوری زندگی پر ایک نقادانہ نگاہ ڈالی اور اپنے دل کی پنہاں ترین گہرائیوں میں متلاشی نظریں دوڑائیں۔ مگر اسے کوئی ایسا مقام نظر نہ آیا جہاں اس نے ٹھوکر کھائی ہو۔ کیا آزادی و مساوات کے لئے اس کی پُرجوش خواہش غلط تھی؟ ——— کیا باب کے لئے اس کی محبت و پرستاری بیجا تھی؟ دونوں باتیں اس کو عقل پر مبنی نظر آتی تھیں ——— کیا غلطی کہیں اور مضمر تھی؟ ——— وہ کوئی خیال قائم نہ کر سکی۔ ان خیالات سے پریشان ہو کر وہ خیمے سے باہر نکل آئی اور تاریکی میں ادھر ادھر ٹہلنے لگی۔

یکایک اسے نزدیک ہی بندوقوں کی ایک باڑھ سر ہونے کی آواز سنائی دی۔ اور فوراً ہی خیمے میں اس کی شمع گر پڑی اور اس کے دو سنتری مردہ ہو کر رہ گئے۔ دوسرے ہی لمحے میں اس کے خیمے میں آگ لگ چکی تھی اور اس کے سپاہی ایک دست بدست لڑائی میں مشغول تھے۔ وہ ہٹ کر ایک بید کے درخت کے نیچے کھڑی ہو گئی اور خیمے سے اٹھنے والے شعلوں کی روشنی میں لڑائی دیکھنے لگی ——— باب کہیں نظر نہ آتا تھا۔ فوراً ایک سپاہی نے اس کو زرہ بکتر اور تلوار پہنچا دی جن سے آراستہ ہو کر وہ ایک گھوڑے پر سوار ہو گئی اور نہایت سرعت سے باب کے خیمے کی طرف روانہ ہو گئی ——— لیکن دشمن پہلے ہی اس پر قبضہ کر چکے تھے۔ اس نے اپنے گھوڑے کو ایک ایڑ لگائی اور ایک زخمی شیرنی کی طرح عالمِ غیظ میں اپنے دشمنوں پر ٹوٹ پڑی۔ دشمن کے پاؤں لڑکھڑا گئے ——— اس کے آتش زدہ خیمے کی روشنی ایک لمحہ کے لئے اس کے چہرہ پر پڑی اور غائب ہو گئی۔ اس کا گھوڑا تیزی سے گھوما اور ایک خوفزدہ جانور کی طرح بھاگ پڑا جو شخص

اب اُس کے پیچھے بیٹھے ہوئے عنان سنبھالے ہوئے تھا آہستہ سے بولا " آپ محفوظ ہیں "۔ گھوڑا پھر گھوما اور آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ وہ شخص اب نیچے اُتر گیا اور گھوڑے کی باگ پکڑ کر آگے بڑھا ——— وہ ایک دریا کو عبور کر رہے تھے،

طاہرہ کو بچانے والا شخص باب کا معتمد کارپرداز تھا۔ اُس سے طاہرہ کو معلوم ہوا کہ اُس کا " آقا " فرار ہو گیا ہے اور راہِ البرز پر ہولیا ہے۔

اگلے دن طاہرہ نے اپنی ذات اور اپنی مختصر سی سلطنت کی حفاظت کے لئے ایک باقاعدہ فوج رکھنے کی تجویز کی۔ باوفا پیرو کاروں اور شجاع جوانوں نے اس کی فوج کی صفوں کو فولادی دیواریں بنا دیا اور اس کو ناصرالدین شاہ قاچار بادشاہِ ایران کے لئے جس کا پایۂ تخت مشکل سے پندرہ میل دور تھا ایک خوفناک ہمسایہ بنا دیا۔

وہ اب بھی اپنی سلطنت پر اپنے محبوب آقا باب کے نام سے حکومت کرتی تھی جو کہ اس کو " حصارِ جریب " میں چھوڑ گیا تھا۔ وہ اس وقت بھی دین بابی کی تبلیغ کرتی تھی اگرچہ باب نے اُس کی تمام درخواستوں کو مسترد کر دیا تھا اور اس چھوٹی سی ریاست میں واپس نہ آیا تھا۔ جو طاہرہ نے اُس کے لئے قائم کی تھی۔ شاید وہ اس کا مخالف ہو گیا تھا۔ اگر ایسا تھا تو کیوں؟ شاید وہ طاہرہ کو ایک مخدوش عورت سمجھتا تھا اگر اُس کا یہ خیال تھا تو وہ یقیناً غلطی پر تھا۔ طاہرہ کا دل اُس کے لئے بیتاب تھا۔ طاہرہ کی مغموم آنکھیں اُس کی جدائی میں اشکبار تھیں طاہرہ کی زبان کا مرتعش ترنم اس کی یاد میں شیریں نغمے برساتا تھا۔

بابی حکومت کی روز افزوں قوت کو دیکھ کر فارس کا وزیر اعظم خوف زدہ ہو گیا تھا۔ اُس نے مازندراں کے گورنر کو اُس کی غفلت پر سخت سرزنش کی اور حکم دیا کہ طاہرہ کے خلاف فوری کارروائی عمل میں لائی جائے۔ گورنر نے ایک منظم پروپگنڈا شروع کیا اور طاہرہ کو مرزا تقی کے قتل کا ذمہ دار ٹھیرایا جس کو اہل فارس نہایت تعظیم و تکریم کی نظر سے دیکھتے تھے ——— اور بہار کے اوائل میں ایک مضبوط فوج کے ساتھ اس کی ریاست پر جا پہنچا۔ اپنی افواج کی شجاعانہ مقاومت کے باوجود طاہرہ کو کئی بار مسلسل شکست اٹھانا پڑی۔ ایک قلعہ کے بعد دوسرا قلعہ اور ایک ضلع کے بعد دوسرا ضلع اس کے ہاتھوں سے نکلتا گیا۔ اور آخر کار شکست پر شکست کھاتی ہوئی وہ صنوبر کے ایک جنگل میں پہنچ گئی جو کوہ البرز کی ڈھلانوں پر واقع تھا۔ اُس سے وعدہ کیا گیا کہ اگر وہ ہتھیار ڈال دے اور بابی مذہب ترک کر دے تو اُس کی ذات و مال محفوظ ہیں ——— اُس نے انکار کر دیا۔ آخر کار شاہی رسالے کے ایک حملے نے جنگ کو انجام تک پہنچا دیا۔ طاہرہ کا خیمہ برباد کر دیا گیا۔ اس کی فوجیں ہلاک کر دی گئیں اور وہ قید کر لی گئی۔

طاہرہ کی آمد کی خبر سے طہران میں عجب اضطراب تھا۔ بازار لوگوں سے بھرے ہوئے تھے۔ بالاخانے اور مکانوں کی چھتیں جو شاہراہ پر واقع تھیں عورتوں اور بچوں سے پٹی پڑی تھیں۔ ان کے کان طبل و دہل کے شور پر کھڑے ہو گئے اور بیساختہ سب چلائے ——— " وہ آ رہی ہے! " ——— اور وہ ایک زبردست فوجی قوت کے حصار میں داخل ہوئی۔ " شاہ زندہ باد " " مجتہدین زندہ باد " کے شور سے شہر گونج اُٹھا۔

عورتیں چیخیں مار کر اپنے مکانوں میں گھس گئیں۔ دریچے اور بالاخانے ایک بلند آواز کے ساتھ جو نفرت و غصہ کی مظہر تھی بند کر دیئے گئے۔ لوگوں نے دلی کوفت کے باعث اپنا منہ پھیر لیا اور جلوس کو چھوڑ کر قریبی گلیوں میں دوڑ گئے ——— نظارہ انسانیت سوز تھا۔ طاہرہ ایک گھوڑے کے ذریعے گھسیٹ کر لے جائی جا رہی تھی۔ اُس کے خوبصورت بالوں کی لٹیں گھوڑے کی دُم میں بندھی ہوئی تھیں۔ اس کے ہاتھوں میں وزنی زنجیریں پڑی تھیں۔ اُس کے پاؤں برہنہ تھے اور اس کی آنکھیں خونِ کبوتر کی طرح سرخ تھیں۔ نظارہ ایسا تھا کہ دیوتا بھی رو پڑیں لیکن مجتہدین نے یہی حکم دیا تھا اور اُن کی منطق پر اعتراض کرنے کی کس کو ہمت تھی۔

ایک گھنٹہ بعد شکستہ دل اور پژمردہ طاہرہ عدالت میں اپنے محاسبہ کے لئے کھڑی تھی۔ دو حبشی غلام اُس کے داہنے اور بائیں اپنے کندھوں پر برہنہ تلواریں لئے کھڑے تھے اور جب اُس کے مجروح پاؤں لرزنے لگتے تو اس کو سنبھال لیتے تھے۔ مہیب قاضی بیس مجتہدوں کے دائرے میں اپنی نشست پر متمکن تھا۔ عدالت کی حفاظت ایک مضبوط فوجی قوت کے حصار میں تھی۔ شہریوں کے گروہ شور مچا رہے تھے۔

"امان! امان! فریاد! فریاد!!"

قاضی نے مجتہدین کی نیابت پر منظر ثانی کی جو طاہرہ کو کفر و الحاد اور مرزا محمد تقی کے قتل کا ملزم ٹھہراتی تھی۔ قاضی نے اپنی عینک کے اوپر سے دیکھا جو اُس کی ناک پر ڈھیلی رکھی ہوئی تھی اور طاہرہ پر اپنی نظر جماتے ہوئے کہا:۔

"عورت! تیری تاریخ معمور ہے گناہوں سے ——— مذہبی اور سماجی گناہوں سے! کیا اپنی صفائی کے لئے تجھے کچھ کہنا ہے؟"

"کچھ نہیں"

طاہرہ وفورِ ناتوانی سے بیٹھ گئی۔

قاضی مجتہدوں کی طرف مخاطب ہوا ——— "میری رائے ہے کہ ملزمہ کو آرام کی ضرورت ہے جب وہ اپنی صفائی پیش کرنے کے قابل ہو جائے اُس وقت عدالت میں پیش کی جائے"۔

"ملعون روح ——— کافرہ اور علماء و مجتہدین کی قاتلہ کے لئے کوئی آرام نہیں" غضبناک مجتہدین نے جواب دیا "بغیر کسی تاخیر کے اُس کی کھال کھینچ دینی چاہیئے اور اسے آگ میں جھونک دینا چاہیئے"۔

قاضی نے کہا "لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ پھر دین کی طرف رجوع کر لے اور محفوظ رہے"۔

طاہرہ نے اپنا مغرور سر ہلا دیا اور ایک بار پھر کھڑی ہو گئی۔ اور بولی:۔

"دینِ الٰہی سے ناواقف غریب مجتہدو! قاتل کا خنجر اور بیوقوفوں کی بھڑکائی ہوئی آگ ایک عورت کو پرستاری سے باز نہیں رکھ سکتی۔ ضمیر اور محبت کا گلا گھونٹنے کے لئے تعصب کو ابھی اور زیادہ خوفناک عذاب ایجاد کرنا ہونگے۔ قاضی صاحب! اپنا انصاف جاری رکھئے۔ "زریں تاج" کو آرام کی ضرورت نہیں!"

قاضی نے اُس کو "دین باب" ترک کرنے کی ترغیب دی اور اُس کی زندگی کی حفاظت کا وعدہ کیا۔ طاہرہ نے ایک منٹ غور کیا۔ دو بڑے بڑے آنسو اُسکی آنکھوں سے نکل کر چہرے پر سے بہتے ہوئے زمین پر آرہے۔ اُس نے انکار کے لئے سر ہلا دیا ــــــ "نہیں"!

مجتہدوں نے کہا "جلد انصاف کیجئے جناب۔ ایسا نہ ہو کہ خدا کا عذاب آپ پر بھی نازل ہو جائے۔ وہ ایک کافرہ ہے اور قانون اُس کے لئے کوئی رحم و کرم نہیں رکھتا"۔

قاضی نے جواب دیا "میں اُس کو کافرہ قرار نہیں دے سکتا"۔

مجتہدوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا ــــــ اور عدالت میں ایک ہنگامہ بپا ہوگیا۔

ایک شاہی دربان بسرعتِ تمام آتا نظر آیا۔ وہ عدالت کے دروازے پر اپنے رہوار سے کود پڑا۔ داروغہ نے جو دروازے پر موجود تھا اُسے بتایا کہ وقت نکل چکا ہے۔ اور طاہرہ کے جسم کو کھال کھینچ کر شعلوں میں پھینک دیا گیا ہے۔

بادشاہ کا رقعہ جو اُس نے قاضی کو لکھا تھا مندرجہ ذیل تھا:۔

"اُسے زندہ رہنے دو کیونکہ وہ اس قدر جمیل ہے"!

(ماخوذ)

عاصی عثمانی

کوششِ ناتمام

میں اس کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اسے اپنے سینہ سے چمٹاتا ہوں!

میں اُس کی بہار اپنی آغوش میں لینا چاہتا ہوں۔

اُس کے تبسم کے گلہائے رنگیں کو اپنے جلتے ہوئے ہونٹوں سے چُننا چاہتا ہوں!

اُس کی نگاہوں کی شراب اپنی آنکھوں سے پینا چاہتا ہوں!

لیکن آہ! میری کوششیں رائگاں ہیں!

موج کی روانی سمندر سے علیحدہ نہیں کی جا سکتی!

نغمے بربط کے تاروں سے جدا نہیں کئے جا سکتے!!

پھول کی خوشبو قید کرنا ناممکن ہے!!

آسمان کی نیلاہٹ علیحدہ کرنا محال!!!

میں حسن کو اپنی آغوش میں لینا چاہتا ہوں۔ لیکن صرف جسم اپنے بازوؤں کی قید میں پاتا ہوں!

عاجز آ کر تھک کر میں واپس آجاتا ہوں!!

آہ، اس پھول کو جس کی شمیم جانفزا صرف روح کو معطر کر سکتی ہے۔ ہمارے مادّی ہاتھ کس طرح چھو سکتے ہیں؟؟!!

تمنائی!

غزل

راز اُس کا دلِ زار چھپایا نہیں جاتا، لاتا ہوں اگر لب پہ تو لایا نہیں جاتا

حیراں ہوں کہ ہے یہ خلشِ روح فزا کیا گر وہ مری ہستی میں سمایا نہیں جاتا

ناصح ہے اور اُس جانِ تمنا کی برائی جاتا نہیں یہ ذکر خدایا نہیں جاتا!

کیوں شورشِ محشر ہے بپا میری لحد پر اس طرح تو سوتوں کو جگایا نہیں جاتا

جلتا ہے شب و روز دلِ سوختہ میرا جوں شمع سرِ شام جلایا نہیں جاتا

زنہار محبت میں نہ کیجو ہوسِ دوست اس شہد میں یہ زہر ملایا نہیں جاتا

اپنے دلِ مجروح پہ ہنستے ہیں ہمیں آپ اوروں کو بھی رو رو کے رلایا نہیں جاتا

کس منہ سے ترے سامنے آتے مگر آئے ہر چند یہ حالت ہے کہ آیا نہیں جاتا

صورت تری کیا دل میں سمائی نہیں جاتی؟ نقشہ ترا کیا آنکھ کو بھایا نہیں جاتا؟

یہ ناز بہت ہے کہ خطا کار ہیں تیرے سر غیر کی چوکھٹ پہ جھکایا نہیں جاتا

آنکھیں تری آنکھوں سے ملائی نہیں جاتیں سر اب ترے قدموں سے اٹھایا نہیں جاتا

تدبیرِ ملاقات ہو کیا حضرتِ حامدؔ
آتے نہیں وہ، آپ سے جایا نہیں جاتا

حامد علی خاں

بیوفائی

حاجی محمد لطیف قابل

"آخر کیوں۔ سوامی! تم اپنی پتنیا کو کیوں پریشان کرتے ہو۔ تم کھانا کھاتے ہی ایک لفظ کہے بغیر باہر نکل جاتے ہو۔ اور میں انتظار کی پہاڑسی گھڑیاں انتہائی پریشانی اور فکرمندی میں گن گن کر گزارتی ہوں۔ تم اتنی رات گئے کہاں سے آئے ہو؟ تم اب تک کیا کر رہے تھے؟ کس کے ساتھ تھے؟

"نہیں میں تمہیں جھڑک نہیں رہی ہوں۔ بات صرف یہ ہے۔ کہ میں بہت ہی خوفزدہ ہو رہی ہوں۔ میرا دل دھڑک رہا ہے۔ معلوم نہیں کیوں"۔

"نہیں ہنسو نہیں۔ میں جانتی ہوں کہ شہر میں بھیڑیے نہیں ہیں۔ لیکن یہاں ایسے ایسے انسان بستے ہیں جو بھیڑیوں سے زیادہ خونخوار ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ بڑا ہسپتال زخمیوں سے بھرا پڑا ہے اور سپاہی اُن پر جو رات کے دس بجے کے بعد بازاروں اور سڑکوں میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں، گولی چلا دیتے ہیں۔ دس بجے کے بعد باہر رہنا خطرے سے خالی نہیں ہے"۔

"سو رہا کروں؟ تمہاری عدم موجودگی میں؟ اور خصوصاً جبکہ ہر لحظہ خطرے کا امکان ہے۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ بھلا مجھ سے ایسا کیونکر ہو سکتا ہے"۔

"میں نے وقت کیسے گزارا؟ روتے ہوئے، پیارے پتی! اور پرماتما کے حضور پرارتھنا کرتے ہوئے۔ ہنسو نہیں۔ ایسے کلمے زبان سے مت نکالو۔ کہیں پرماتما کا قہر ہم پر نازل نہ ہو۔ پیارے سوشیل کو بستر پر لٹا کر میں نے پرماتما کے سامنے گڑگڑا کر پرارتھنا کی میری پرارتھنا بے سود نہ گئی۔ تم صحیح وسلامت واپس آ گئے ہو ——— تمہیں پیاس لگ رہی ہے . . . . یہ لو پانی پی لو . . . . آہ میں باتیں کرتی چلی جاتی ہوں اور دیکھتی کچھ بھی نہیں! تمہارا چہرہ تو سرخ ہو رہا ہے۔ تم ہانپ رہے ہو اور کیچڑ میں لت پت ہو۔ تمہارے چہرے سے وحشت برس رہی ہے . . . . پیارے پران پتی۔ کچھ خیال ہے کہ آج دن بھر تم نے پیارے سوشیل کو چوما تک نہیں؟ سنگدل پتا! مگر . . . اور پرماتما! . . .

میں نے تو دیکھا ہی نہیں! تم تو زخمی ہو رہے ہو! تمہارا دایاں ہاتھ خون آلودہ ہے"۔

تمہارا خون؟ نہیں! کیا تم پر حملہ کیا گیا تھا؟ تم نے مقابلہ کیا؟ تم نے دشمن پر وار کیا؟ شاید تم نے اسے مار ڈالا؟ چپ کیوں ہو؟ کچھ منہ سے بولو۔ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔ دیکھا نا۔ میری بے چینی اور پریشانی کچھ بے وجہ نہ تھی"۔

"کوئی خوفناک راز۔ اور مجھ سے نہیں کہا جائیگا۔ اچھا۔ تو اب مجھ سے بھی باتیں چھپایا کروگے ——— پھر بھی۔ سوچو تو مجھے بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ تم کیا کر رہے ہو۔ تاکہ میں تمہارے متعلق یونہی شک نہ کرنے لگوں۔ ان دنوں ایک کلمہ۔ ایک غیر دانشمندانہ لفظ پھانسی چڑھوانے یا کالے پانی بھجوانے کے لئے کافی ہے"۔

"میں سمجھ گئی اب۔ میں کہوں گی کہ تم گھر آئے۔ کھانا کھایا اور دس بجے حسبِ معمول سو رہے۔ صرف اگر کسی نے تمہیں اس وقت آتے نہ دیکھا ہو! میں اب سمجھ گئی ہوں۔ کہ کوئی نہایت خطرناک واقعہ ہو گیا ہے ..... تم مجھے ..... اپنی دھرم پتنی کو ہمراز بناتے ہوئے جھجک کیوں رہے ہو؟"

"میں تمہیں دِق کر رہی ہوں! دو برس پہلے تم مجھے ایسی بات ہرگز نہ کہتے۔ ہماری وہ پیار کی باتیں کیا ہوئیں جب ہم شام کے خوشگوار لمحے خوش گپیوں میں صرف کیا کرتے تھے اور سوشیل ہمارے قدموں میں چٹائی پر لوٹ لوٹ کر' اپنے ننھے منے ہاتھ پھیلا کر توتلی زبان سے میٹھی میٹھی باتیں کر کے ہمیں خوش کیا کرتا تھا"۔

"آہ! تم رو رہے ہو۔ تم ان ظالموں کے گروہ میں شامل ہی کیوں ہوئے تھے"۔

"انکار کیوں کرتے ہو۔ مجھے معلوم ہے۔ ایک دن تمہاری جیب سے ایک خط گر پڑا تھا جس پر وہ خوفناک سیاہ مُہر لگی ہوئی تھی۔ تم کس بات کی تیاری کر رہے تھے۔ یہ میں نہ جانتی تھی۔ مگر میں اتنا جانتی ہوں۔ کہ جو شخص اس پُراسرار گروہ کا نام سُنتا ہے۔ اس کا مارے خوف کے رنگ زرد پڑ جاتا ہے۔ آواز بھرّا جاتی ہے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے اردگرد دیکھنے لگتا ہے۔ اس کے علاوہ جب سے تم ان لوگوں کی صحبت میں بیٹھتے اُٹھتے ہو میں نے تمہیں کبھی ہنستے نہیں دیکھا۔ تم خیالات میں کھوئے سے رہتے ہو۔ اور ہمیشہ اداس نظر آتے

ہو۔ تم کتابیں پڑھتے ہو۔ جن میں آزادی۔ انصاف اور عوام کی بہتر حالت کا تذکرہ ہوتا ہے لیکن جو ارتکاب جرم کا مشورہ دیتی ہیں"۔

"ممکن ہے میں یہ بات نہ سمجھ سکتی ہوں۔ میں نے اتنی کتابیں نہیں پڑھیں جتنی تم نے۔ میں صرف یہ کہتی ہوں کہ مذہب یہی باتیں نرمی اور پیار سے سکھاتا ہے۔ ناراض کیوں ہوتے ہو . . . . اگر ساری دنیا مذہب کے اصولوں پر چلے تو مجھے یقین ہے کہ دنیا کے بہت سے مصائب کم ہو جائیں۔ قانون سختی سے نہیں بلکہ آشتی سے بدلے جا سکتے ہیں"۔

"مجھے دنیا کی کیا پروا ہے؟ میری دنیا تو تم اور سوشیل ہو۔ اور بس۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب تم مجھے اکیلے چھوڑ کر چلے جاتے ہو تو میں گھبرا اٹھتی ہوں۔ ممکن ہے میری خوشی خود غرضی سے آلودہ ہو۔ لیکن مجھے اس کی بھی پروا نہیں۔ تم میرے سامنے قسم کھاؤ کہ اپنی زندگی کو خطرے میں نہیں ڈالو گے۔ بہت سے ایسے لوگ ہیں جن کے نہ بیوی ہے نہ بچے۔ پہلے انہیں اپنی جانیں قربان کرنے دو"۔

"نہیں سب امیر لوگ بُرے نہیں ہوتے۔ وہ دیکھو۔ وہ چھوٹا سا کھلونا گھوڑا، جو آج سوشیل کو تحفۃً ملا ہے!"

"کون؟ بتاؤ تو بھلا۔ اچھا لو۔ میں بتائے دیتی ہوں۔ یہ تحفہ راجکمار نے دیا ہے"۔

"ہاں راجکمار نے خود . . . مگر تمہاری یہ حالت کیوں ہو رہی ہے۔ تم مجھے ایسی متجسس نگاہوں سے کیوں گھور رہے ہو؟ کیا تم بھول گئے کہ میری ماموں زاد بہن بملا محل میں استانی ہے؟ آج جب ہم باہر سیر کو گئے تو وہ باغ میں مل گئی اور اصرار کیا کہ چلو تمہیں راجکمار کے خاص کمرے دکھاؤں گی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ سارا دن باہر رہے گا لیکن وہ معمول سے پہلے واپس آگیا اور سیدھا بڑے کمرے میں جہاں ہم تصویروں اور منقش پردوں کو دیکھنے میں محو تھے، چلا آیا۔ مگر ناخوش ہونے کے بجائے وہ ہمارے ساتھ کمال اخلاق اور مہربانی سے پیش آیا۔ سوشیل نے اپنی پیاری باتوں سے اسے فوراً موہ لیا۔ اس نے اُسے گود میں لے کر پیار کیا۔ اس کی موہنی صورت کی تعریف کی اور یہ بھی کہا کہ ایک پانچ سال کے بچے کا ایسا تندرست و توانا ہونا بہت مسرت خیز ہے"۔

"میرے اس کھلونے کو قبول کرنے پر تمہیں کیوں اعتراض ہے جو اس نے اس قدر مہربانی سے عنایت کیا تھا؟ انکار ملالِ خاطر کا باعث ہوتا"۔

"وہ ایک جابر و ظالم حاکم دکھائی دینے کے بجائے یقیناً شریف طبع معلوم ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ بہت سے بُرے فعل جن کا وہ کبھی مرتکب نہیں ہوتا اسے بدنام کرنے کے لئے یونہی اس سے منسوب کر دیئے جاتے ہیں"۔

"ہائیں۔ مارا گیا؟ کب؟ کس طرح؟ کس نے مارا؟ یہ تمہارے ہی خوفناک گروہ کے کسی آدمی کا کام ہوگا۔ جلد یا بدیر قاتل ضرور گرفتار ہوگا اور کیفرِ کردار کو پہنچے گا"

"کیا کہا۔ وہ وطن کی محبت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھنے کے لئے تیار ہے؟ تو پھر تمہیں معلوم ہوگا کہ وہ کون ہے؟ تمہارا کوئی دوست ہوگا۔ افسوس۔ مگر... میں کیسی بیوقوف ہوں! یہ تمہاری ناقابلِ توضیح غیر حاضری۔ یہ راز جس کے افشا کرنے کی تمہیں جرأت نہیں پڑتی۔ یہ تمہارے ہاتھوں پر خون کے دھبے.... آہ.... میں برباد ہوگئی"۔

"وہ ہزار بُرا تھا۔ پھر بھی اسی پرماتما کا پیدا کیا ہوا تھا۔ تمہیں اس کی جان لینے کا کوئی حق نہ تھا۔ آہ! ہم پر کوئی بڑی مصیبت آنے والی ہے"۔

. . . .

"ہاں حضور۔ میں ہی ان کی دھرم پتنی ہوں۔ مگر جناب میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں بالکل نہیں سمجھ سکی کہ مجھے کیوں پکڑ کر یہاں لے آئے ہیں۔

آج صبح جب میں بستر سے اٹھی تو پولیس نے نہایت بے رحمی سے ہمارے چھوٹے سے گھر کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ وہ زبردستی ہمیں پکڑ کر لے گئے اور حوالات میں بند کر دیا۔۔۔۔ میرے پتی کو، مجھے، اور اس معصوم بچے کو جو اس وقت آپ کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا ہے۔

اس میں ضرور کوئی غلطی ہے۔ میں جانتی ہوں کہ حضور نہایت انصاف پسند اور مہربان ہیں اور مجھے امید واثق ہے کہ حضور ہمیں رہا کر دیں گے"۔

"وہ جرم جس کا ارتکاب آج رات ہوا ہے؟"

"راجکمار قتل کر دیا گیا؟ اُف ظلم! میں نے ابھی کل اسے دیکھا ہے۔ وہ کیسا خوش مزاج اور شریف انسان تھا"۔

میں نے اسے اس طرح دیکھا کہ ماموں زاد بہن محل میں استانی ہے کل وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ راجکمار نے میرے ننھے کو ایک کھلونا تحفۃً دیا تھا۔ افسوس! یہ ہمارے شہر کی سخت بدقسمتی ہے۔ امید ہے کہ قاتل اب تک گرفتار ہو چکے ہوں گے"۔

"میرے پتی پر شبہ کیا جاتا ہے؟ مگر یہ سخت ناقابلِ اعتبار بات ہے حضور۔ اس ایسا امن پسند اور ایماندار شخص ایسے سنگین جرم کا مرتکب کیسے ہو سکتا تھا"۔

"حضور کہتے ہیں کہ حضور کو اس کے متعلق جو اطلاعات پہنچی ہیں وہ بھی اس بات کی تائید کرتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ کچھ لوگ ایسے ہیں جو اس سے عداوت رکھتے ہیں اور اس کو آزار پہنچانے کے لئے موقع کے متلاشی رہتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ خوددار ہے اُن کی صحبت میں بیٹھنا پسند نہیں کرتا اور اس لئے کہ وہ اپنے گاڑھے پسینے سے روزی کماتا ہے اور کسی سے بے سبب نہیں ڈرتا۔ علاوہ اس کے حضور غور تو فرمائیں! حضور کہتے ہیں کہ قتل آدھی رات اور ایک بجے کے درمیان ہوا۔ میرا پتی اس وقت سو رہا تھا"۔

"مجھے یقین ہے؟ کیوں نہیں۔ میں اس کے قریب ہی تو سو رہی تھی"۔

"حضور کہتے ہیں۔ میری شہادت ناقابلِ قبول ہے! ہاں اس کی تصدیق کرنے والا واقعی کوئی نہیں۔ ہمارا گھر دوسرے گھروں سے الگ تھلگ ہے اور ہم بہت تھوڑے لوگوں کو جانتے ہیں۔ بہرحال یہ تو یقینی امر ہے کہ کسی نے اسے اس رات باہر جاتے یا آتے نہیں دیکھا۔

"حضور یہ میرا بیٹا ہے۔ یہ اس وقت سو رہا تھا علاوہ بریں یہ اس قدر خورد سال ہے۔ یہ بھلا کیا جان سکتا ہے۔ سوشیل! ان کی بات کا جواب دو۔ کیا تم اپنے پتا جی کو پیار کرتے ہو؟"

"کل رات؟ خاموش۔ سوشیل! تو بڑا بیوقوف ہے۔ تو نہیں جانتا کہ تو کیا کہہ رہا ہے"۔

"حضور۔ اس کی بات نہ سنیں۔ یہ مفت میں آپ کا مغز چاٹ لے گا"۔

"یہ غلط کہتا ہے حضور۔ بالکل غلط کہتا ہے۔ بچے نے یہ سب کچھ اپنی زبان سے گھڑ لیا ہے۔ تم پاگل ہو سوشیل!"

"میری نیت اسے ڈرانے یا دھمکانے کی ہرگز نہیں حضور۔ مگر آپ خود دیکھ سکتے ہیں کہ یہ جھوٹ بک رہا ہے۔ میں کیسے یہ کہہ سکتی تھی کہ "خدایا! آدھی رات ہوگئی ہے اور وہ ابھی تک نہیں آیا" جبکہ وہ میرے قریب ہی سو رہا تھا؟ ہے ایشور! میں کہتی ہوں وہ سو رہا تھا۔ گہری نیند سو رہا تھا۔"

"نہیں۔ آپ ایسا نہیں کر سکتے۔ آپ کو ایک بچے کی بات کا ہرگز یقین نہیں کرنا چاہیئے حضور یقیناً اس کے بیان پر اعتبار نہ کریں گے۔ اسے اکثر دھوکا بھی لگ جایا کرتا ہے اور رات کو ڈراؤنے خواب بھی دیکھا کرتا ہے ——— اور کل۔ اب مجھے یاد آگیا ہے۔ اسے بخار سا چڑھا ہوا تھا۔ یہ جو کچھ اس نے آپ کے سامنے بنایا ہے سب خواب میں دیکھا ہے۔ آہ پرماتما! یقین جانیئے اس کو وقت کا صحیح اندازہ بالکل نہیں۔ کل یا گزشتہ ہفتہ اس کے لئے ایک ہی بات ہے۔ خاموش سوشیل! ہاں۔ ہاں۔ ہاں۔ تمہیں معلوم ہے۔ تم بیمار ہو۔ . . . مگر وہ بار بار وہی بات دہرائے جاتا ہے! آہ۔ بچے بھی عجیب ہوتے ہیں۔ اور حضور جانتے ہیں بعض اوقات نادانستہ بڑی سے بڑی مصیبت کا باعث بن سکتے ہیں۔ مگر اس کی بات کا یقین نہ کیجئے حضور۔ اس کی بات کا ہرگز یقین نہ کیجئے!"

"آہ پرماتما۔ ہم بے گناہ ہیں! انصاف کرو۔ ہم پر ظلم نہ کرو۔ آپ کے پاس کوئی ثبوت نہیں! آپ ایسے بے رحم نہیں ہو سکتے کہ ایک نادان بچے کے کہے کی بنا پر 'جو نہیں جانتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے' ہمیں مجرم ٹھہرائیں۔ میں ہاتھ جوڑتی ہوں حضور۔ آپ کی بیوی ہے بچے ہیں۔ سوشیل! بدقسمت بچے! جج صاحب کے پاؤں پڑ کر التجا کرو۔ کہ تمہارے پتا جی تمہیں واپس دے دیں۔"

"آہ! ہماری ایک نہیں سنی جاتی! ہم برباد ہوگئے! او پرماتما! میں آج سے تیرے رحم اور انصاف کی قائل نہیں ہوں کہ تو نے ایک بچے کو اجازت دے دی۔ کہ اپنے پتا کے ساتھ 'بیوفائی' کرے ۔"

(جیکس کانسٹینٹ)

عبدالکریم مرادپوری
(بی۔ اے)

اے دوست

کل صبح سے بے چین تھا کچھ ایسا دل | میں کیا کہوں کس طرح دھڑکتا تھا دل

کیا جانئے ہوگئی تھی کیا بیماری | دنیا کی ہر ایک شے سے تھی بیزاری

کچھ کل ہی نہیں، ہُوا ہے اکثر ایسا | جس دن سے کہ ساتھ میرا تیرا چھوٹا

گھنٹوں اُلجھن کا سامنا رہتا ہے | پہروں مرا دل بجھا بجھا رہتا ہے

ہاں ذکر یہ تھا کہ کل بھی ایسا ہی ہوا | بے چینی سے پھر سکون دل کا بدلا

خورشید فروغ اس طرف پاتا تھا | یہ آپ ہی آپ ڈوبتا جاتا تھا

شام آتے ہی درد میں ہوئی افزونی | دن ڈھلتے ہی ہوگئی اُداسی دونی

مایوسیٔ دل کا کچھ عجب عالم تھا، | اتنے میں ترا خیال مجھ کو آیا

پھر یک بہ یک آئی یاد اک رات مجھے | کاہیکو خیال ہوگا اس شب کا تجھے

وہ تیری جھکی ہوگی نگاہوں کی رات | وہ میری طویل و سرد آہوں کی رات

وہ صحن چمن کی رات بھینی بھینی | خوشبو تری اِس طرف، اُدھر پھولوں کی

وہ دیکھنا تیرے رخ کو گم سم میرا | تاروں کی وہ چھاؤں میں تبسم تیرا

افسانۂ عمر کا یہ باب عشرت | دل پر لایا عجیب ہی اک آفت

اب تجھ سے یہ التجا ہے جس طرح بنے | تدبیر وہ کر کہ دل کی حالت بدلے

کافر یہ اگر نہیں ہے ممکن تجھ سے
تو یاد بھی ان باتوں کی واپس لے لے

زیبا

مرزا حسرت

انسانی شہرت کی بنیاد بھی کس قدر کمزور ہے! کل جس کا طوطی بولتا تھا آج کوئی اس کا نام لیوا بھی نہیں۔ شاعری اس کلیہ سے مستثنےٰ نہیں۔ جو لوگ کبھی اقلیم سخن میں کوس لمن الملکی بجا چکے تھے اب ان کا پوچھنے والا بھی کوئی نہیں۔ مرزا جعفر علی حسرت کا شمار بھی انہیں ہستیوں میں ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ میر حسن نے لکھا ہے "کثرت شاگردانش چناں کہ در صورت شناسی ہم حیران است" یا آج یہ حالت ہے کہ ناظرین میں سے اکثر کے لئے ان کے تعارف کی ضرورت ہوگی۔ داستان عبرت ناک ہے مگر نئی نہیں۔

مرزا حسرت کے والد کا نام ابوالخیر اور پیشہ عطاری تھا۔ جہان آباد کی مردم خیز اور سخن نواز خاک سے ان کا خمیر ہوا تھا۔ ابتدائی زمانہ وہیں گزرا۔ سلطنت مغلیہ کا آفتاب لب بام آچکا تھا۔ اکبر و شاہجہاں کے جانشین سیاسی اقتدار کھو چکے تھے۔ دہلی کی سلطنت برائے نام سہی مگر اقلیم سخن کی عنان حکومت ہی کے ہاتھ میں تھی۔ تخت طاؤس زینت ایران بن چکا تھا۔ مگر اردوے معلّیٰ کا نشیمن ظل الٰہی اب بھی ارباب کمال کا ملجا و ماویٰ تھا۔ حسرت بھی چندے شاہ عالم کے دربار سے وابستہ رہے لیکن تا بکے؟ سموم انقلاب نے زمانہ کا ورق پلٹا اور کور نمک غلام قادر نے آفتاب کی آنکھوں کا نور چھین لیا۔ بڑے بڑے مستقل مزاجوں کے قدم اکھڑ گئے۔ مرزا رفیع نے بھی کبھی شجاع الدولہ کی طلبی کا جواب یہ رباعی لکھ کر دیا تھا۔

سودا پئے دنیا تو بہر سو کب تک؟ — آوارہ ازیں کوچہ بآں کو کب تک؟
حاصل یہی اس کا ہے کہ دنیا ہووے — بالفرض ہوا یوں بھی تو پھر تو کب تک؟

اب وہ بھی دہلی کو خیرباد کہنے پر مجبور ہو گئے۔ جب یہ حال ہوا تو حسرت بھی نکل کھڑے ہوئے۔ اس زمانہ میں دہلی کے آفت رسیدہ باکمالوں کے لئے دو ٹھکانے تھے فیض آباد اور حیدر آباد۔ حیدر آباد کالے کوسوں تھا۔ ناچار فیض آباد کا رخ کیا اور نواب شجاع الدولہ کے حضور میں ایک قصیدہ نذر گزرانا۔ بعدہٗ جب آصف الدولہ سریر آرائے ریاست ہوئے تو ان کی مدح میں بھی قصیدہ لکھا۔ کچھ عرصہ لکھنؤ میں اپنے آبائی شغل سے واسطہ رکھا پھر جہاندار شاہ کے ملازم ہو گئے۔ آخر میں علائق دنیوی سے کنارہ کش ہو کر گوشہ نشینی اختیار کی۔

فن سخن میں رائے سرب سنگھ دیوانہ سے استفادہ کیا تھا لیکن میر حسن کا قول ہے کہ آخر میں ان سے منحرف ہو گئے تھے۔ فارسی سے بھی ذوق تھا اور اس میں مرزا فاخر مکیں سے مشورہ کرتے تھے۔

ارباب فضل و کمال اکثر اپنے معاصرین کے محسود ہو جاتے ہیں کسی نے سچ کہا ہے کہ "اے روشنیٔ طبع تو برمن بلا شدی" حسرت کو بھی اس کا خمیازہ اٹھانا پڑا۔ ہندوستانی طبائع میں شرافت و کمال کا معیار نرالا ہے کسی معمولی پیشہ کا اختیار کر لینا انسان کی تمام قدر و منزلت کو

ضائع کر دیتا ہے اور جوہر ذاتی کو خاک میں ملا دیتا ہے۔ مرزا حسرت کے بدر کمال میں اک ہی داغ تھا کہ وہ پیشہ کے لحاظ سے عطار تھے چنانچہ مرزا رفیع السودا نے ان کی ہجو لکھی اور عطاری کا خاکہ اڑایا۔ انشا نے اپنی مشہور تصنیف دریائے لطافت میں ایک میر صاحب اور کسی کا فرضی مکالمہ لکھا اور اس میں اپنے معاصرین پر خوب خوب چوٹیں کیں یہاں تک کہ خود اپنی ذات کو بھی نہ چھوڑا۔ اس میں بھی مرزا حسرت کے پیشہ پر تعریض کی گئی ہے۔ آخر میں مولانا آزاد نے "آبِ حیات" کو مرزا حسرت کی شہرت کے لئے جامِ زہر بنانے کی کوشش کی۔ حاشیہ پر تین سطروں میں ان کا ذکر کیا اور وہ بھی اس انداز سے "حسرت بھی نامی شاعر تھے مگر اصل پیشہ عطاری تھا۔ دیوان موجود ہے پھیکے شربت کا مزا آتا ہے"۔ وہی پیشہ کا رونا!! خدا معلوم آزاد کو حسرت کا ذکر کرنے کی ضرورت ہی کیا محسوس ہوئی تھی۔ شاید اس وجہ سے کہ "حسرت بھی نامی شاعر تھے۔"

بہرحال دنیا منصف مزاجوں سے خالی نہیں مصحفی نے لکھا "در قصیدہ و غزل ید طولیٰ دارد" میر حسن اور نواب شیفتہ کی صحت ذوق کی قسم کھانی چاہیئے ان دونوں بزرگوں کی رائے خود ان کی زبان سے سن لیجئے۔ نواب صاحب فرماتے ہیں "در سلامت عبارت و سلامت فکر مشہور زمانہ" میر حسن رطب اللساں ہیں:۔

"طبعش از چمنِ خوبی بشکل طوبیٰ برخاستہ و درج فطرتش رشتہ سخندانی از جوہر معانی آراستہ شربت عذب بیانش رافوام عالی . . . جولانی طبعش از حد گزشتہ قصیدہ ہا در زمینِ مشکل گفتہ، فکر ہر کس بقدرِ ہمت اوست . . . غرض مثل او پیدا نیست۔ خدایش سلامت دارد۔"

یا للعجب! میر حسن کہتے ہیں "شربت عذب بیانش را قوام عالی" اور آزاد کو ان کے دیوان میں "پھیکے شربت کا مزا آتا ہے" اختلاف مذاق کی یہ لطیف مثال نقادانِ ادب کے لئے دلچسپی کا باعث ہوگی۔

حکیم عبدالحی اور لالہ سری رام دونوں نے آزاد کے قول کی تردید کی ہے۔ صاحب خمخانۂ جاوید کی لائبریری میں حسرت کا کلیات موجود تھا (جو غالباً اب بنارس ہندو یونیورسٹی کے پاس ہے) چنانچہ انہوں نے آزاد کی رائے کی توضیح کرنے کی کوشش کی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"راقم الحروف (لالہ سری رام) کے نزدیک مولانا (آزاد) کا یہ قول قابلِ تسلیم نہیں غالباً ان کی نظر سے صرف ان کا دیوان دوم گزرا ہے اور اسی پر انہوں نے مذکور الصدر رائے قائم کی ہے جو ایک حد تک صحیح ہے اگر پورا کلیات ان کے سامنے ہوتا تو یقیناً وہ حسرت کے لئے اس سے بہتر رائے قائم کرتے کیونکہ فی الواقع اس میں اکثر جگہ بہت کچھ نمکینی اور چاشنی موجود ہے۔ یہ امر مسلم ہے کہ کسی عمدہ سے عمدہ کہنے والے کا بھی تمام کلام یک رنگ ہونا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے۔"

لالہ سری رام کا خیال صحیح معلوم ہوتا ہے اس سلسلہ میں شاید یہ بات دلچسپی سے پڑھی جائے کہ آزاد نے آبِ حیات کے صفحہ ۲۴۲ پر یہ مطلع

ہے کس کا جگر جس پہ یہ بیداد کروگے ۔۔۔ لو ہم تمہیں دل دیتے ہیں کیا یاد کروگے

جرأت سے منسوب کیا ہے اور میر حسن، نواب شیفتہ، حکیم عبدالحی اور لالہ سری رام سب بالاتفاق اس مطلع کو حسرت کا بتاتے ہیں۔

حسرت کا کلیات ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ انجمن ترقی اردو کی بدولت اثر اور یقین وغیرہ کے دیوان تو چھپ چکے ہیں مگر ابھی حسرت کی نوبت نہیں آئی۔ ہاں اُن کے ہمنام مولانا حسرت موہانی نے ایک مختصر انتخاب ان کی غزلوں کا ضرور شائع کر دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اُن کے کلیات میں جملہ اصناف سخن کے نمونے موجود ہیں۔ ان کا بڑا کارنامہ ایک مبسوط مثنوی "طوطی نامہ" ہے راقم الحروف نے اس کو دیکھا ہے اس میں رزم اور بزم دونوں کا امتزاج ہے۔ شاعرانہ لحاظ سے بری نہیں مگر نہ معلوم کیوں کسی تذکرہ میں اس کا ذکر نہیں ؎ قبول خاطر و لطف سخن خداداد است۔

حسرت کی غزل گوئی کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ جمہور شعرا کے خلاف آپ کی غزلیں اکثر مسلسل ہوتی ہیں مطلع سے لے کر مقطع تک ایک ہی مضمون ہوتا ہے اور جو غزلیں مسلسل نہیں ہوتیں ان میں سے بھی بیشتر قطعات پر ختم ہوتی ہیں آپ کی تقلید میں آپ کے شاگرد رشید شیخ قلندر بخش جرأت اور ان کے تلامذہ نے بھی مسلسل غزلیں لکھیں اردو شاعری کے لئے یہ طرز سخن غالباً بہت مفید ثابت ہوتا لیکن بعد کو اسے ترک کر دیا گیا۔ قدما کے طرز پر آپنے اکثر ایک ایک زمین میں کئی کئی غزلیں لکھی ہیں اور ایسی صورت میں اکثر پہلی غزل کے مقطع سے دوسری غزل کی تقریب کا کام لیا ہے مثلاً

سخن کی نازگی میں کوئی نہیں ہے تجھ غزلخواں سا ــــــ سوا ان سات شعروں کے غزل پڑھ اور اے حسرت

میر حسن کے قول کے مطابق حسرت نے مشکل مشکل زمینوں میں قصائد لکھے ہیں لیکن غزلوں میں یہ دقت پسندی نمایاں نہیں ہے کہیں کہیں بعض غزلوں کی ردیفیں مشکل ضرور ہیں لیکن عام طور پر مفرد ردیفیں استعمال کی ہیں شاہ نصیر اور شیخ ذوق کی سی سنگلاخ زمینیں نہیں ہیں۔

میرا خیال ہے کہ نواب مرزا داغ جس سلسلہ کی آخری کڑی تھے اس کی ابتدا حسرت سے ہوئی تھی ان دونوں بزرگوں کی شاعری میں بڑی مشابہت پائی جاتی ہے فرق صرف نقش اول اور نقش آخر کا ہے۔ حسرت نے اس رنگ سخن کو شروع کیا جرأت نے اس کو چمکایا اور داغ نے اس کو جلا دے کر کچھ ایسا دلفریب بنا دیا کہ مدتوں لوگوں کی نگاہوں میں اس کے سامنے کوئی دوسرا رنگ نہ جچا۔ حسرت کی شاعری میں فلسفہ ہے نہ تصوف وہ مجاز کے قائل ہیں اور انہوں نے سادہ پیرایہ میں عشق مجاز کی واردات کو نظم لیا ہے جس کو معاملہ بندی کہیئے یا مصوری جذبات نام دیجئے۔ سلاست عبارت کے ساتھ ساتھ سادگی خیال بھی ہے تخیل میں گہرائی نہیں۔ شوخی ہے لیکن رکاکت نہیں اور یہ بہت غنیمت ہے تصنع اور ناگوار رعایت لفظی سے کلام پاک ہے۔ سوز و گداز سے خالی نہیں تشبیہات سادہ ہیں۔ ترکیبیں عمدہ اور سہل ہیں۔ کہیں کہیں فارسی محاروں کے خوشنما ترجمے بھی ملتے ہیں حسرت کے یہاں اُن کے معاصرین کی نسبت متروکات زیادہ ملتے ہیں۔ یہ مطلب نہیں کہ جس زمانہ میں حسرت لکھ رہے تھے وہ الفاظ اور ترکیبیں متروک تھیں مقصود یہ ہے کہ انہوں نے اس قسم کے الفاظ استعمال کئے جو بعد میں زیادہ تر متروک قرار پائے۔ ولی اردو کے قدیم ترین شاعروں میں سے ہیں لیکن ان کے کلام میں کافی حصہ ایسا ہے جو جوں کا توں زبان میں ہے حالانکہ ان کے معاصرین بلکہ متاخرین میں بھی اکثر شعرا ایسے ہیں جن کے یہاں یہ بات نہیں پائی جاتی۔ حسرت کے معاصرین اور حسرت کی مثال اس باب میں ولی اور معاصرین ولی کی سی ہے۔ بندشیں بھی کہیں کہیں چست نہیں ہیں اور "آہ" "ادریاں" کے سے بھرتی کے الفاظ سے مصرعے پورے کئے گئے ہیں۔

حسرت کی شاعری کے متعلق ممتاز نقادوں کی اس قدر متضاد رائیں پڑھنے کے بعد ناظرین حیران ہونگے کہ واقعی کلامِ حسرت کو کیا سمجھیں۔ اس موضوع پر زیادہ خامہ فرسائی کرنے سے یہ بہتر ہے کہ کلامِ حسرت کا ایک حصہ ناظرین کے سامنے پیش کر دیا جائے اور وہ فی الفور رائے قائم کریں چنانچہ ادارۂ "ہمایوں" نے حسرت کی چند غزلوں کو شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے :-

(۱)

کانوں سے تو سنے تھے فسانے عجب عجب
آنکھیں لگیں تماشے دکھانے عجب عجب

گر جیب چاک کرتے ہیں گھونٹتے ہیں سر
لاتے ہیں رنگ تیرے دِوانے عجب عجب

گہ زلف شانہ کرنا لگانا کبھی حنا
کرتا ہے مجھ سے شوخ بہانے عجب عجب

زنجیر کوئی پہنے ہے زنار ہے کوئی
ہیں تیرے عاشقوں کے بھی بانے عجب عجب

بن آئی کی تھے بات سبھی ہم سے اے میاں
اب تم لگے ہو باتیں بنانے عجب عجب

اوس گھر میں ہم سے آگے کوئی بولتا نہ تھا
لوگ اب لگے ہیں بول سنانے عجب عجب

مطرب جو عشق کا ہے سنو اس کے تم اگر
نغمے عجب عجب ہیں ترانے عجب عجب

یا گھر میں مے فروش کے یا تنگدی میں ہو
پیدا کئے ہیں تم نے ٹھکانے عجب عجب

کم دھوم کچھ مچائی تھی فرہاد و قیس نے
حسرت گزر گئے ہیں زمانے عجب عجب

(۲)

ابرو کہیں ہیں تیغِ جفا کا نہیں علاج
مژگاں کہیں ہیں تیرِ قضا کا نہیں علاج

قامت کہے ہے فتنہ کا چارہ کہیں نہیں
زلفیں کہیں ہیں آہ کا بلا نہیں علاج

بچ جاوے دل تو غمزۂ سفاک سے بچے
پر ناوکِ نگاہِ حیا کا نہیں علاج

مارا ہوا ستم کا تو جیتا ہے لطف سے
یہ لطف ہے کہ لطف و ادا نہیں علاج

آتش لگے جگر کو تو پانی چھڑک دے شک
نالوں کی آہ گرم ہوا کا نہیں علاج

گر چاک جیب ہووے تو بارے رفو بھی ہو
جوں گل تمام چاک قبا کا نہیں علاج

ماریں ہیں جان سے جو مسلمان کو بتاں
حسرت اب آہ قہرِ خدا کا نہیں علاج

(۳)

ہم جی اٹھے مطرب ہے ترے ساز میں اعجاز
ہر تار میں آواز ہے آواز میں اعجاز

ہر آن میں افسون ہے ہر غمزے میں جادو
ہر بات میں اک ناز ہے ہر ناز میں اعجاز

اول نگہِ لطف ہے آخر نگہِ قہر
انجام میں اتمام ہے آغاز میں اعجاز

کیا منہ میں زباں خوب ہے کیا لب میں سخن خوب
افسون میں افسوں ہے اعجاز میں اعجاز

دولت سے ترے عشق کی اے عیسیٔ مریم
ہر سینہ میں اک راز ہے ہر راز میں اعجاز

مرتے ہیں تو جی اٹھتے ہیں پھر تیرے نگہ سے
جادو کہوں یا چشم فسوں ساز میں اعجاز

حسرت سبھی کہتے ہیں سخن میرے کو سن کر
ہر طرز میں جادو ہے ہر انداز میں اعجاز

(۴)

تمہاری چشم کے مستوں کو میخانے سے کیا نسبت
یہ آنکھیں اک غضب ہیں انکو پیمانے سے کیا نسبت

کہاں لیلیٰ کہاں مجنوں ہاں تم تھی یہاں ہم ہیں
جو اہلِ درد ہیں ان کو ہے افسانے سے کیا نسبت

جلایا عشق نے جس کو خبر اس کی نہ پھر پائی
مثل مشہور ہے بلبل کو پروانے سے کیا نسبت

سوا منصور کے کوئی چڑھا بھی دار پر جا کر
محبت ہے یہاں اپنے کو بیگانے سے کیا نسبت

ازل سے لے ابد تک ہم یہاں کے تھمے ہیں
مقیموں کو یہاں کے جانے اور آنے سے کیا نسبت

ہر اک کی چشم کی زینت ہے میری چشم کا گوہر
گہر ہے پر اس کو آب اور ملنے سے کیا نسبت

ہمارے پاس ناصح بیٹھ کر سمجھانے گا تو
دِوانے عقلمندوں کو ہے دیوانے سے کیا نسبت

وہاں آرا چلا سر پر یہاں خنجر چلے لاکھوں
ہمارے سینۂ صد چاک کو شانے سے کیا نسبت

نہیں انسان وہ حسرت جو خوابِ خور میں رہتے ہیں
کہ تن پرور جو ہیں سو ان کو غم کھانے سے کیا نسبت

محمد اظہار الحسن

یہ کس کی ابدی خوابگاہ ہے!

دے جواب اس کا دہانِ گور سے اے ہمصفیر
تجھ کو اس خاکی قفس میں کر دیا کس نے اسیر

چٹکیاں لیتے ہیں دل میں ہمکلامی کے مزے
کس طرح بھولوں میں تیری خوش خرامی کے مزے

یاد ہے مجھ کو وہ تیری جامہ زیبی آہ آہ
وہ ادائے جانفزا وہ دلفریبی آہ آہ،

اُف وہ باتیں پیار کی پہلو بہ پہلو بیٹھ کر
اب بھی ہے لذت فروشِ دل ترا تیرِ نظر

خندہ ہائے زیرلب کی شان اب تک یاد ہے
یاد ہے تیری ظرافت مجھ کو بے شک یاد ہے

پان تیری طرح اے ہمدم لگائے کون اب
برمحل ہنس ہنس کے مجھ کو بھی ہنسائے کون اب

جاذبیت شرم میں، شوخی میں اک دلبستگی
وہ تبسّم فاتحانہ وہ شکست آمادگی

آہ وہ کچھ دیر باہم باتوں باتوں میں بگاڑ
اُف وہ تجدیدِ محبت کے لئے پھر چھیڑ چھاڑ

ہم مذاقی کے مزے تھے صرف تیری ذات تک
شرط بدکر جاگنا وہ آدھی آدھی رات تک

خواب آلودہ نگاہوں کا وہ منظر یاد ہے
یاد ہے تیری ادائے سحر پرور یاد ہے

اب نہ وہ میں ہوں نہ وہ عہدِ نشاط انگیز ہے
تو تصور میں مگر اب تک تبسم ریز ہے

قبر میں تنہا اُدھر تو میں اکیلا ہوں ادھر
ہمنشیں تجھ سا ملے گا اب کہاں؟ جاؤں کدھر

علی منظور حیدرآبادی

آخری کارنامہ

شہر میں ایک بوڑھا تھا جس نے اپنے مکان کا بالائی حصہ تو دو بہنوں کو کرایہ پر دے رکھا تھا اور زیریں حصے میں خود رہتا تھا۔ دونوں لڑکیوں کو مصوری سے انتہائی شغف تھا اور اتفاق کی بات ہے کہ بڑے میاں بھی اس میں دلچسپی لینے لگے۔ یونہی خاکے بناتے۔ اُن میں رنگ بھرتے اور پھر اپنے "عظیم الشان" کارناموں کو ان بہنوں کے پاس دکھانے کے لئے لاتے۔ وہ ان کو دیکھ کر بے اختیار ہنس دیتیں۔ "بڑے میاں دیکھو تو اس گھوڑی کی ٹانگیں اپنی ہیں یا اونٹ سے مانگ کرلایا ہے! اور واہ صاحب! کبھی تالاب میں پانی زرد بھی ہوا کرتا ہے؟ آخر اصلیت کا بھی تو کچھ خیال ہونا چاہیئے۔ یہ دیکھئے آپ ہماری تصویر! دیکھا! ہے نہ منہ سے بول رہی! اسے کہتے ہیں تصویر بنانا"۔ بڑے میاں کے چہرے سے افسردگی کے آثار ظاہر ہوتے لیکن اپنے جذبات کو قابو میں لاتے ہوئے استادانہ انداز میں فرماتے "بچیو! ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن تو ہوئے تمہیں تصویریں بناتے، اور کیفیت یہ ہے کہ ہمارا منہ چڑا رہی ہو۔ ہماری تو عمر ہی اس فن کے کمال کی تحصیل میں بیت گئی۔ کیا کہیں۔ خیر ہم ایک تصویر بنارہے ہیں جو ایسی لاجواب ہوگی کہ تم بھی اش اش کر اٹھوگی اور تمہاری یہ سب تصویریں جن پر اتنا اترا رہی ہو۔ اُس کے سامنے دھری کی دھری رہ جائیں گی! اور میں تو کہتا ہوں اسی تصویر سے میرا نام رہتی دنیا تک سلامت رہیگا!"

بوڑھے کی اس خودستائی پر دونوں بہنوں کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پیدا ہوتی لیکن اُس کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے چپ ہو رہتیں۔

خزاں کے موسم میں بڑی بہن کو ایک روز بخار ہوگیا۔ سان نگمان ظالم نے دفعتہً آن دبایا اور مجبوراً اسے اپنی تصویر کو نامکمل چھوڑ کر بستر پر دراز ہونا پڑا۔ اس کے بستر کے قریب کی کھڑکی ہر وقت کھلی رہتی تھی۔ سامنے کی دیوار پر عشق پیچاں کی بیل چڑھی تھی جس کی آخری کونپل عین کھڑکی کے سامنے تھی۔ اس میں تین خزاں زدہ پتے لٹک رہے تھے اور پیہم یہی دھڑکا تھا کہ اب گرے کہ اب گرے۔ بخار طول کھینچتا گیا۔ چھوٹی بہن اور بوڑھے نے تیمارداری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ مگر صحت کے آثار نظر نہ آتے۔ بڑی بہن بے انتہا لاغر اور ضعیف ہوگئی۔ آس پاس کے لوگ عیادت کو آئے تو ٹھنڈی آہ بھر کر دل میں کہتے "اب تو بیچاری چند دنوں کی مہمان ہے!"

چھوٹی بہن اکثر رات کو اُس کے پاس رہتی۔ ایک شب زور زور سے بڑبڑانے کی آواز جو اس کے کان پڑی وہ فوراً اُٹھ بیٹھی۔ "وہ سامنے تین پتے لٹک رہے ہیں۔ کل ایک گرے گا۔ خزاں دوسرے کو بھی گرادیگی اور جب تیسرا نہ رہے گا تو ہم بھی نہ ہوں گے"۔ "کیا ہوا آپ کو؟ ایسی بھی متوہم طبیعت کیا۔ اب تو آپ بفضلِ خدا رو بہ صحت ہیں۔ کیوں ایسی بہکی بہکی باتیں کررہی ہیں؟" اُس نے کھڑکی کو بند کرنا چاہا مگر بہن کے اصرار کی وجہ سے اپنے ارادہ پر عمل نہ کرسکی۔ دوسرے دن چھوٹی بہن نے بوڑھے کو سارا ماجرا کہہ سنایا۔ اس نے مریضہ کو بہت تسلی دی اور مشفقانہ انداز سے ملامت بھی کی۔ مگر اُس کے دل سے وہم کو نہ جانا تھا نہ گیا!

ہاؤلی کا تھانہ

اپنا ہرکارہ بنا لیجئے حضور! رحم کیجئے۔ بڑی مہربانی ہوگی چھ روپے تنخواہ مقرر ہو جائے۔ صاحب آخر کروں کیا۔ تین چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ ان بیچاروں کو کبھی پیٹ بھر کے کھانا بھی نہیں ملا۔ ادھر غلے کا بھاؤ اب بیس سیر بھی نہیں رہا۔ میں ہرکارے کا کام اس عمدگی سے سرانجام دوں گا کہ حضور دن بھر مجھ سے خوش رہا کریں گے اور جب سال ختم ہوگا تو ایک بڑی انعام دیں گے۔ میں اسٹیشن کی تمام سڑکوں سے واقف ہوں اور مجھے بہت کچھ معلوم ہے۔ صاحب میں ہر کام نہایت ہوشیاری سے کیا کرتا ہوں۔ اس سے پہلے میں پولیس میں تھا۔ بُرے چال چلن کا شبہ اور میری نسبت!؟ توبہ۔ توبہ۔ توبہ۔ ضرور کسی دشمن نے یہ قصہ گھڑا ہے۔ میں نے کبھی کسی سے نمک حرامی نہیں کی صاف دل آدمی ہوں۔ میرے ایک ایک لفظ میں سچائی ہوتی ہے۔ جب میں پولیس میں تھا۔ سب لوگ جانتے تھے کہ میں کیسا آدمی ہوں۔ میری نسبت عام طور پر لوگ کہا کرتے تھے کہ افضل خاں بڑا سچا آدمی ہے۔ اس کی بات پر بھروسا کیا جا سکتا ہے۔ صاحب میں دہلی کا پٹھان ہوں! دہلی کے تمام پٹھان شریف ہوتے ہیں۔ کیا جناب نے بھی دہلی دیکھی ہے؟ ہاں یہ بات واقعی درست ہے کہ دہلی کے پٹھانوں میں غنڈے بھی ہو سکتے ہیں صاحب! آپ تو بہت دانا معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کی نظروں سے تو کوئی بات پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ آپ خود ہی ضرور مجھے اپنا ہرکارہ بنا لیں گے۔ میں تمام نوٹ چپکے چپکے بغیر کسی کو دکھائے لے جاؤں گا؟ نہیں صاحب خدا گواہ ہے کہ میرے دل میں کوئی بُری بات نہیں۔ مدت سے تمنا تھی کہ کبھی کسی آپ جیسے نیک صاحب کی نوکری کروں۔ اکثر نوعمر صاحب تو بڑے شیطان اور منہ پھٹ ہوتے ہیں۔ میں کبھی ان کی نوکری نہ کروں چاہے میرے چھوٹے چھوٹے بچے بھوکوں مر جائیں۔

میں پولیس میں کیوں نہ رہا؟ سب بات سچ سچ کہہ سناؤں گا۔ واقعہ یوں ہوا کہ تھانے پر ایک بہت بڑی مصیبت ٹوٹ پڑی۔ رام بخش حوالدار۔ مولا بخش۔ جگت رام بھیم سنگھ اور سورج بل بھی اس مصیبت میں گرفتار ہو گئے۔ رام بخش اور مولا بخش اب تک قید خانے میں ہیں۔

گوگرلال کی طرف جو سڑک جاتی ہے اس پر ہاؤلی کا تھانہ ہے۔ اس کے ارد گرد ڈکیتی زوروں پر ہے۔ ہم تمام کے تمام بہت بہادر آدمی تھے۔ اس لئے ہمیں اس تھانے میں بھیج دیا گیا جو تھانہ نمبر ۲ سے آٹھ میل کے فاصلے پر تھا۔ تمام دن اور تمام رات ہم ڈاکوؤں کی تاڑ میں رہے۔ صاحب آپ کیوں ہنستے ہیں؟ میں بھی تو یہ بات مانتا ہوں کہ ہمارے مقابلے میں ڈاکو بہت ہی عیار نکلے۔ معاملے کی نزاکت کو بھانپ کر ہم نے خواہ مخواہ اور زیادہ تکلیف اٹھانی مناسب نہ سمجھی۔ گرمی کا موسم تھا گرمیوں میں بھلا آدمی کر ہی کیا سکتا ہے؟ اب حضور کتنے بشہ زور ہیں لیکن کیا اس گرمی میں حضور بھی اپنے آپ میں کچھ طاقت محسوس کرتے ہیں؟ ہم نے صرف امن و امان کی خاطر

ڈاکوؤں سے سمجھوتا کر لیا۔ یہ سب کام حوالدار کا تھا جو بڑا موٹا تھا۔ دُنبے کا دُنبا۔ ہے ہے! صاحب اب وہ جیل میں چپاتیاں بُن بُن کر دبلا ہو رہا ہوگا۔ وہ ڈاکوؤں سے کہنے لگا۔ تم ہمیں کچھ تکلیف نہ پہنچانا اور ہم تمہیں کچھ نہ کہیں گے۔ ہم تمہارے اور تم ہمارے۔ جب فصلوں کی کٹائی ہو چکے تو جج صاحب کے سامنے پیش کرنے کے لئے ایک آدمی پھنسا دینا۔ کسی کوڑ مغز کو بھیجنا جس پر دھوکا دینے کا مقدمہ چلایا جا سکے۔ اس طرح ذرا ہم تھانے والوں کی عزت رہ جائے گی۔ ڈاکو یہ بات مان گئے اور تھانے میں ہماری تکلیفیں بھی ختم ہوئیں۔ اب ہم تمام دن چارپائیوں پر بیٹھے مزے سے خربوزے کھاتے رہتے۔ صاحب ہاوُلی کے خربوزوں کا کچھ نہ پوچھیئے۔ وہ گنّے سے بھی زیادہ میٹھے ہوتے ہیں۔

اس ضلع میں ایک نائب کمشنر بھی تھا اُسے نیکم صاحب بھی کہتے تھے۔ توبہ توبہ!! بڑا مضبوط آدمی تھا۔ میرے صاحب جیسا مضبوط جو منزور ابھی مجھے اپنے سایہ میں جگہ دینے والے ہیں۔ صاحب! نیکم صاحب کی دو نہیں کئی آنکھیں تھیں۔ وہ بڑی پھرتی سے ضلع بھر کا چکر لگا لیا کرتا تھا۔ لوگ اُسے شیرِ گوکرال کہتے کیونکہ وہ قصورواروں کو شیر کی طرح چیر پھاڑ ڈالتا تھا۔ تیس تیس میل کے فاصلے تک کے تحصیلدار اس کے ہاتھوں روتے تھے۔ اس کی آمد یا روانگی کی کسی کو خبر نہ ہوتی تھی اور نہ اس کا کوئی کیمپ ہی تھا۔ جب اس کا گھوڑا تھکا ہوتا تو وہ ایک "بھوت گاڑی" پر سوار ہو جاتا۔ جانے میری بلا وہ لوگ خود اس گاڑی کو کیا بولتے ہیں۔ بس وہ لیسی تھی کہ صاحب چپکے سے چاندی کے تین پہیوں کے درمیان بیٹھ جاتا اور وہ چلنے لگتی۔ جب چلتی تو ہماری گاڑیوں کی طرح اس کے پہیوں سے چڑچڑ کی آواز بالکل نہ نکلتی۔ وہ اسے ٹانگوں سے چلاتا تھا حضور! کچھ پتا نہ چلتا کہ صاحب کہاں گیا ہے۔ بس دانہ کھلا کھلا کر پالے ہوئے گھوڑے کی طرح کودتا پھاندتا ایک دم یہ جا وہ جا۔ اڑتے ہوئے باز کا سایہ بھی کھیت پر اتنا چپ چاپ نہیں پڑتا جتنی بے آواز یہ نیکم صاحب کی گاڑی تھی۔ ابھی یہاں ہے، ابھی وہاں ہے اور ابھی غائب پلوں میں رپورٹ مکمل ہوئی اور لوگوں کی سختی آئی۔ صاحب! کسی دن ذرا روہتری کے تحصیلدار سے پوچھیئے کہ مرغیوں کی چوری کیسے پکڑی گئی تھی!

ایک رات کا ذکر ہے کہ تھانہ حسبِ معمول شام کا کھانا کھا کر اور حقّہ وغیرہ پی کر چارپائیوں پر سو گیا۔ جب ہم صبح اٹھے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ہماری چھ رائفلوں میں سے ایک بھی نہیں رہی۔ سب کسی نے چرا لی ہیں اور پولیس کی کتاب بھی جو حوالدار کے چارج میں تھی غائب ہے۔ یہ گڑبڑ دیکھ کر ہم بہت ڈرے۔ ہم نے دل میں کہا ڈاکو بھی بڑے بے مروّت ثابت ہوئے کمبخت رات کو آکر کیا غضب ڈھا گئے۔ ہمارے لئے یہ واقعہ بڑی شرمندگی کا باعث تھا۔ رام بخش حوالدار کہنے لگا "چپ رہو! معاملہ بڑا نازک ہو گیا ہے لیکن اب بھی اس کا علاج خوب ہو سکتا ہے۔ کوئی تجویز سوچتے ہیں۔ . . . . اچھا! کہیں سے بکری کا ایک بچہ پکڑ لاؤ اور میری تلوار بھی لیتے آؤ۔ ہو تو فوراً کیا دیکھ رہے ہو؟ جلدی کرو! یاد رکھو گدھے کے لئے لاٹھی اور نادان آدمی کے لئے اشارہ!"

ہم فوراً سب بات سمجھ گئے۔ ہمیں برطرفی کا بڑا خطرہ تھا۔ جلدی سے کسی کا ایک بکروٹا پکڑ لائے اور اُسے اندر کے کمرے میں

دھکیل دیا اور حوالدار کی بات غور سے سننے لگے :-

"بیس ڈاکو تھے۔ سخت مقابلہ ہوا۔ ہمارے سب آدمی زخمی ہو گئے کوئی زخموں سے خالی نہ رہا۔ کھڑکی کی سیخیں توڑ دی گئیں۔

"سورج بل تم ذرا یہ کام سنبھالو! بہادر سخت جلدی کرو کیونکہ ابھی ہمیں شیر گو کرال کو خبر دینے کے لئے بھی ایک آدمی بھیجنا ہے"۔ میں حوالدار کی گھوڑی خربوزوں کے کھیت میں لے گیا اور اُسے ہنٹر مار مار کر کھیت میں خوب نچایا یہاں تک کہ گھوڑی کے سُموں سے تمام بیلیں اچھی طرح پامال ہو گئیں۔ اب تمام کھیت میں گھوڑوں کے سموں کے نشان ہی نشان نظر آتے تھے۔

یہ کام پورا کر کے میں تھانے واپس آ گیا۔ بکری کا بچہ ذبح کر دیا گیا۔ دیواروں کے کئی حصے آگ جلا کر سیاہ کر دیئے گئے اور ہر آدمی نے اپنے کپڑوں پر تھوڑا تھوڑا بکری کا خون لگا لیا۔ ہاں صاحب! میں آپ کو ایک بات بتاؤں۔ یہ صاحب لوگ ایسے چالاک ہوتے ہیں کہ اگر کوئی آدمی خود اپنے آپ کو زخمی کر کے اُن سے یہ کہے کہ کسی دوسرے آدمی نے مجھے زخمی کیا ہے تو فوراً معلوم کر لیتے ہیں کہ یہ آدمی دھوکا دے رہا ہے یا سچ کہتا ہے۔ اس احتیاط کے لئے ہم نے خود اپنے آپ کو زخمی نہ کیا بلکہ حوالدار نے اپنی تلوار لے کر ہم میں سے ایک کے بازو پر آہستہ سے ایک چرکا دیا۔ جو کھال کو چیرتا ہوا چربی تک جا پہنچا۔ ایک دوسرے آدمی کو لات پر تیسرے کو ہاتھ کی اُلٹی جانب۔ پس اسی طرح ہم میں سے ہر ایک کو اُس نے کسی نہ کسی جگہ سے زخمی کر دیا اور ہمارے زخموں سے لہو بہنے لگا۔ ہم میں سے سورج بل سب سے زیادہ شوقین نکلا۔ اس نے کئی جگہ سے اپنے آپ کو زخمی کرا لیا۔ آہا ہا ہا! صاحب کسی نے کبھی ایسا مکمل انتظام نہیں کیا ہوگا۔ اگر مجھے معلوم نہ ہوتا تو میں بھی قسم کھا کر یہ کہنے کو تیار تھا کہ سچ مچ ڈاکوؤں نے تھانے کی بہت بُری گت بنائی ہے۔ ہر جگہ بہت دُھواں پھیلا ہوا تھا۔ زمین پر جگہ جگہ خون کے قطرے نظر آتے تھے اور سامنے پامال کئے ہوئے کھیت موجود تھے۔

حوالدار کہنے لگا "مولا بخش! اب گھوڑے پر زین کس کر صاحب کے گھر جاؤ اور ڈاکے کی خبر دو۔ افضل خان! ساتھ تم بھی جاؤ لیکن یاد رکھو اپنے آپ کو پسینے میں خوب شرابور کرنے کی کوشش کرنا نہیں تو کپڑوں سے لہو سوکھ جائے گا۔ میں یہاں ہی رہوں گا اور سیدھی ڈپٹی صاحب کو اطلاع دوں گا اور گاؤں کے لوگوں کو بھی تیار کر رکھوں گا تاکہ ڈپٹی صاحب کے آنے تک سب کچھ ٹھیک ہو جائے۔

مولا بخش گھوڑے پر سوار ہو گیا میں ساتھ ساتھ دوڑتا گیا اور ہم دونوں نہایت ہی بُری حالت بنا کر رومینری کی تحصیل میں شیر گو کرال کے سامنے پہنچے۔ صاحب ہماری کہانی لمبی تھی اور سچی تھی کیونکہ ہم نے ڈاکوؤں کے نام تک بتا دیئے تھے۔ لڑائی کا تمام حال سنا کر ہم نے اُسے چلنے کے لئے کہا لیکن شیر ہماری کہانی سُن کر ذرا بھی متاثر نہ ہوا صرف مُسکرا پڑا جیسا کہ عام طور پر صاحب لوگ اس وقت کرتے ہیں جب اُن کے دلوں میں عیاری چھپی ہوتی ہے۔ وہ ہم سے کہنے لگا قسم کھا کر کہتے ہو کہ سچی رپورٹ دے رہے ہو۔ ہم نے جواب دیا۔

"آپ کے غلام سب کچھ قسمیہ عرض کر رہے ہیں۔ لڑائی کا لہو بھی ابھی ابھی ہمارے کپڑوں سے خشک ہوا ہے۔ آپ خود دیکھ لیجئے کہ کیا آپ کے غلاموں کا لہو نہیں؟" وہ کہنے لگا "ٹھیک! ٹھیک! تم نے خوب کیا ہے" لیکن نہ تو اس نے گھوڑا لانے کے لئے کہا اور نہ پہلے کی طرح اپنی بھوت گاڑی منگائی۔ اس کے بعد کہنے لگا "ابھی آرام کرو اور کھانا کھاؤ۔ تم تھک گئے ہو گے۔ میں ڈپٹی صاحب کا انتظار کروں۔

حوالدار کا قانونی فرض ہے کہ وہ تمام ڈاکوؤں کی خبر سیدھی ڈپٹی کو دے۔ چنانچہ دوپہر کے وقت وہ بھی آگیا۔ ڈپٹی کیا تھا ایک موٹا سا بوڑھا کھوسٹ۔ بڑا مغرور اور غصّے والا معلوم ہو رہا تھا۔ لیکن ہمیں اس سے کب ڈر آتا تھا۔ سب سے زیادہ خوفناک تو شیر گوکرال کی خاموشی تھی۔ ڈپٹی کے ساتھ رام بخش حوالدار اور کچھ دوسرے آدمی تھے۔ جو گاؤں کے دس آدمیوں کو گرفتار کئے ہوئے تھے۔ ان تمام آدمیوں کا چال چلن ہماری نظروں میں اچھا نہ رہا تھا اور ہماری پولیس انہیں قید کرانے لائی تھی ان کے ہاتھ زنجیروں سے بندھے تھے اور وہ رحم کے لئے منتیں کر رہے تھے۔ ان دس غنڈوں میں امام بخش کسان بھی تھا۔ اس نے اپنی بیوی کو ہمارے حوالدار کے پاس آنے جانے سے منع کر دیا تھا۔ ان غنڈوں کی ہمیں لوگوں نے رپورٹ کی تھی اور انہیں خوب پھنسایا تھا۔ حوالدار اپنی اس چالاکی اور بہادری پر پھولا نہ سماتا تھا لیکن ڈپٹی صاحب اسسٹنٹ صاحب سے سرگرمی نہ دکھانے پر ناراض ہو گئے اور اسے جیسا کہ صاحب لوگوں کی عادت ہے ڈیم ڈیم کہنے لگے اور حوالدار کی تعریف کرنے لگے۔

نیکم صاحب اپنی لمبی سی کرسی پر چپ چاپ بیٹھے تھے انہوں نے پوچھا" ان لوگوں سے قسمیں لے لی ہیں؟" ڈپٹی صاحب کہنے لگے "ہاں اور دس بدمعاشوں کو بھی پکڑ لیا ہے۔ ابھی اور بھی ہوں گے گھوڑا لو اور سرکار کے نام پر روانہ ہو جاؤ"۔ نیکم صاحب کہنے لگے ہاں یقیناً" اور بھی ہوں گے لیکن گھوڑے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آؤ سب آدمی میرے ساتھ"۔

میں نے امام بخش کے ٹخنے پر ایک نشان دیکھا اُسے سزا دے دی گئی تھی جو سزا اُسے ملی تھی شاید آپ اُس کے عذاب سے واقف نہیں ہیں۔ بہت سخت ہوتی ہے۔ میں نے شیر گوکرال کا چہرہ غور سے دیکھا اس پر شرارت اور مسکراہٹ تھی۔ میں اُس کے پیچھے کھڑا ہو کر انتظار کرنے لگا کہ دیکھیں اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ صاحب میں نے خوب ہی کیا جو پیچھے کھڑا رہا۔ نیکم صاحب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی اور اس نے سامنے کے غسل خانے کا دروازہ کھول دیا۔ صاحب کیا کہوں ساتھ ہی میرا منہ بھی کھلے کا کھلا رہ گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ اندر چھ کے چھ رائفل اور تھانہ ہاؤلی کی پولیس کی کتاب پڑی ہے۔

معلوم ہوا کہ وہ رات کو بھوت گاڑی پر جو بلی کی طرح بے آواز ہے تھانے آیا۔ ہم سو رہے تھے۔ وہ ہمارے نزدیک پھرتا رہا اور جاتی دفعہ رائفلیں اور کتاب اٹھا لے گیا۔ دو دفعہ تھانے آیا اور ہر بار تین تین رائفلیں لیتا گیا۔ یہ دیکھ کر حوالدار کا جگر تو پانی پانی ہو گیا۔ وہ نیکم صاحب کے بوٹوں پر گر پڑا اور مٹی میں اپنا سر رگڑ رگڑ کر چلانے لگا ——— "حضور بندے پر رحم کیجئے! حضور بندے پر رحم کیجئے!!"

اور میں؟ صاحب میں تھا دہلی کا پٹھان چھوٹے چھوٹے بچوں کا نوجوان باپ۔ حوالدار کی گھوڑی صحن میں بندھی تھی میں لپک کر اس پر ہو بیٹھا اور ہوا ہو گیا۔ سرکار کے آدمی میرا پیچھا کر رہے تھے۔ میں نہ جانتا تھا کہ کدھر جاؤں۔ آخر ایک جگہ ایسی آئی جہاں میری گھوڑی گر کر مر گئی۔ مجھے ایک اور گھوڑی مل گئی۔ میں اس پر سوار ہوا اور اللہ تعالےٰ کی مہربانی سے جو بے شک ہمیشہ دیانتدار آدمیوں کا ساتھ دیتا ہے میں ان کے پنجے سے بھاگ نکلا لیکن حوالدار اور دوسرے آدمی اب تک جیل میں ہیں۔

میں غنڈا ہوں؟ اب جیسا حضور کہہ لیں۔ اگر حضور مجھے اپنا غلام بنالیں گے تو خدا حضور کو بہت بڑا حاکم بنادے گا اور حضور کی شادی پری جیسی خوبصورت اور بہت امیر میم صاحب سے ہو گی اور حضور کے بڑے بڑے موٹے تازے بیٹے پیدا ہونگے۔ بہت سے۔ خدا حضور کا ہمیشہ مددگار رہے اب تو صرف ایک کام باقی رہ گیا ہے ابھی میں شہر جاؤں گا اور اپنے بچوں کو اس محل جیسے عمدہ بنگلے میں لے آؤں گا اور اس کے بعد ———— بس حضور ہی میرے مائی باپ ہونگے اور میں ————

افضل خاں حضور کا غلام۔

(رڈیارڈ کپلنگ) مہدی علی خاں کرم آباد

خزاں

راحت کے دن خوشی کا زمانہ کہاں ہے اب
دن جا چکے بہار کے عہدِ خزاں ہے اب

اک آنکھ کے جھپکنے میں سب کچھ بدل گیا
اک خارزار ہے وہ گلستاں کہاں ہے اب

مرجھا کے پھول خاک پہ بکھرے ہیں ہر طرف
اے عندلیبِ نغمہ سرا تو کہاں ہے اب

خاموش ہو چکے ہیں وہ نغمے بہار کے
افسردگی و یاس یہاں نوحہ خواں ہے اب

بیگانگی سی چھا گئی کل کائنات پر،
اب وہ زمیں رہی ہے نہ وہ آسماں ہے اب

وہ دل بھی مٹ گیا وہ تمنا بھی مٹ گئی
اجڑے ہوئے چمن میں مرا آشیاں ہے اب

تھی جس کے ذرہ ذرہ سے دلبستگی مجھے
مجھ سے چھٹا ہوا وہ مرا آستاں ہے اب

وہ دل مسرتوں سے جو لبریز تھا کبھی،
اس دل میں ایک درد بھری داستاں ہے اب

"تنہا"

بہار کے آخری دن

دلکش و دلفریب ہے دشت بھی رہگذار بھی
باغ بھی ہیں ہرے بھرے پھولوں پہ ہے نکھار بھی
کیا کروں میں بہار کو دل پہ ہو اختیار بھی
رخصتِ سیر دے مجھے صدمۂ انتظار بھی

آئے نہ وہ بہار میں بیت چلی بہار بھی

دل کی کلی نہ کھل سکی میرے لئے بہار کیا
نزہتِ لالہ زار کیا نکہتِ مشکبار کیا
اُن کے بغیر آسکے جی کو مرے قرار کیا
کہتی ہیں سچ سہیلیاں "مرد کا اعتبار کیا"

آئے نہ وہ بہار میں بیت چلی بہار بھی

جشن رہا پڑوس میں جتنے دنوں جھڑی رہی
میرے لئے پہاڑ سی ہجر کی ہر گھڑی رہی
دن کو تو انتظار میں جانبِ در کھڑی رہی
رات کو منہ لپیٹ کے بیدلی سے پڑی رہی

آئے نہ وہ بہار میں بیت چلی بہار بھی

موت پہ بس نہیں مرا۔ دل نہیں اختیار میں
یہ نہ خبر تھی دکھ مجھے سہنے پڑیں گے پیار میں
عیش و طرب کے تھے یہ دن کٹ گئے انتظار میں
بیت چلی بہار بھی آئے نہ وہ بہار میں

آئے نہ وہ بہار میں بیت چلی بہار بھی

وقار انبالوی

میر کے مرثیے

اردو نظم کی قریب قریب تمام اصناف کی ابتدا دکن میں ہوئی اور اس لئے مرثیے بھی سب سے پہلے وہیں کہے گئے۔ ابتدائی دور کے مرثیوں سے لے کر ولی تک کے مرثیے دو مختلف دوروں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔ بالکل ابتدائی مرثیے محض مذہبی عقیدتمندی کے اثر سے کہے گئے اور اُن میں اثر اور درد نام کو بھی نہیں۔ دوسرے دور کے مرثیے جو غزل کے علاوہ مربع صورت میں بھی ہیں بمقابلۃً مسلسل اور با اثر ہیں۔ ان میں زبان کی صفائی، ادبیت اور مرثیے کے دوسرے عنصر بھی بہت بڑی حد تک پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ ندیم۔ ہاشم اور رضی وغیرہ کے مرثیوں میں جہاں تسلسل، روانی اور ادبیت ہے وہاں درد اور اثر بھی بے حد ہے اور اسی درد اور اثر کو بڑھانے کے لئے ان مرثیہ گویوں نے واقعات کا انتخاب بھی یہ دیکھ کر کیا ہے کہ کونسا واقعہ زیادہ دردناک ہے۔ یوں تو کربلا کا خونیں واقعہ شروع سے آخر تک درد سے بھرا ہوا ہے لیکن حضرت علی اصغر اور قاسم کی شہادت پر جن مخصوص وجوہ سے ماتم کیا جاتا ہے اُن میں درد کا عنصر نسبتاً زیادہ غالب ہے۔

ولی کے دور کے بعد مرثیہ گوئی کا ایک دوسرا دور شروع ہوا۔ اس دور میں مرثیوں نے بہت سی حیثیوں سے ترقی کی۔ سودا نے مرثیے کو جتنے مختلف طریقوں، شکلوں اور زبانوں میں اور جتنے التزامات کے ساتھ کہا اس کی تفصیل ایک مستقل مضمون کی محتاج ہے۔ لیکن یہاں صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ انہوں نے مفردہ سے لے کر مسدس بلکہ مثمن تک ہر شکل میں مرثیے کہے اور ہر موقع پر اپنا زور شاعری دکھایا۔ اس لئے درد جیسا کچھ چاہیئے اُن کے مرثیوں میں موجود نہیں۔ البتہ ان کے ہمعصروں میں سکندر[1] اور افسردہ[2] دو ایسے مرثیہ گو گزرے ہیں جن کا ایک ایک مرثیہ ہمارے سامنے ہے اور ان میں سے ہر ایک میں اتنا درد اور اثر ہے کہ سودا کے سارے مرثیوں میں اُن کا جواب نہیں۔ سکندر کا مرثیہ تو اب تک مجلسوں میں پڑھا جاتا ہے اور لوگ انیس اور دبیر کے مرثیے سننے کے بعد بھی اس پر سر دھنتے ہیں۔ افسردہ کے مرثیے میں بھی درد۔ اثر تسلسل اور روانی کے علاوہ حد درجہ کی ادبیت ہے۔

میر بھی اسی زمانے کے مرثیہ گو ہیں۔ اُن کے مرثیے اُن کے مطبوعہ دیوان میں موجود نہیں ہیں اس لئے لوگ عام طور پر اس غلط فہمی میں

---

[1] میاں سکندر کے متعلق اکثر تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ وہ میر اور سودا کے عہد کے مرثیہ گو تھے۔ شاکر ناجی کے شاگرد تھے۔ اُن کا ایک مسدس مرثیہ اب تک بہت مشہور ہے ع ہے روایت شتر اسوار کسی کا اٹھار سول

[2] افسردہ کے متعلق مرزا جعفر علی خاں اثر نے زمانہ ستمبر ۱۹۳۱ء میں لکھا ہے کہ وہ میر اور سودا کے ہمعصر تھے اور اسی سلسلے میں ان کا ایک مرثیہ نقل کیا ہے اُس کا ایک بند لکھا جاتا ہے ؎

جب کہ عباس کی دریا پہ سواری آئی ؛ بعد لشکر کے علمدار کی باری آئی
رو رو فرمایا کہ اب مرگ ہماری آئی ؛ قتل کرنے کو ہمیں فوج پیاری آئی
اپنے خالق سے دعا کی کہ مری بات رہے
جائے سر ہاتھ سے میدان مرے ہاتھ رہے

مٹتا ہیں کہ میر کے مرثیے ان کے مرتبے سے گرے ہوئے ہیں۔ ان میں "مرثیت" اور ادبیت کچھ بھی نہیں۔ اور وہ سودا کے مرثیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ لیکن میر کے مرثیے پڑھنے کے بعد ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہیں کہ اس قسم کی تنقیدوں اور رایوں میں حقیقت کا عنصر بہت کم ہے ؛

میر کے جو مرثیے اب تک ملے ہیں[1] اُن میں ایک سلام ہے اور باقی مرثیے۔ ان مرثیوں میں سے سات مرثیے مربع ہیں اور ایک مسدّس۔ ان سب مرثیوں کے پڑھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کوئی ادبی خدمت سمجھ کر نہیں کہے گئے۔ اُن کا مطمح نظر صرف نجات ہی۔ غم حسین میں جہاں خود اُن کی آنکھیں روتی ہیں وہ چاہتے ہیں کہ ان پر درد داستانوں سے اہل بیت اور شہدائے کربلا کے شیدائیوں کی آنکھیں بھی خون بہائیں اور یہ آنسو اُن کی نجات کا ذریعہ بن جائیں۔ ایک مرثیہ کے آخر میں یہ تمنا اس طرح کرتے ہیں ؎

بعد از نماز و سجدہ کرے در پہ التماس	کاے شاہ بندہ پرور و قدر گہر شناس
مقصود میرا یہ ہے کہ اب ترک کر لباس	جوں زائران خاک گریبانِ کربلا
ہندوستاں سی قطرہ زن آوے چلا ہوا	مانند ابر . . . بھرے دل بھرا ہوا
تو ملتفت ہوا کہ یہ مطلب روا ہوا	دیوے گا پھر نہ ہاتھ سے دامانِ کربلا

ظاہراً یہی وجہ ہی کہ میر کے مرثیوں میں درد، اثر، روانی، تسلسل جذبات نگاری، ادبیت اور زبان کا لطف صفائی ہونے کے باوجود بھی وہ بات نہیں جو ان کی غزلوں میں ہے۔ میر کے مرثیے بھی سودا کے اکثر مرثیوں کی طرح بین ہیں اور اس کے لئے بلا کوشش کے بھی ان میں درد اور اثر پیدا ہو گیا ہی۔ ایک جگہ کہتے ہیں :۔

زینب کے لب سی حرف نکلتے تھے شکوہ ناک	آشفتہ ہو وہ سر میں کھڑی ڈالتی تھی خاک
کہتی تھی تا سپہر یہ کیا اے خدائے پاک	جاتی نہیں ہے نالہ و افغانِ کربلا
شاید غبار رکھتے ہیں چشمان مہر و ماہ	احوال پر ہمارے نہیں مطلقاً نگاہ
پردہ رہے جو گر پڑے گردونِ روسیاہ	ہیں سر برہنہ خاک نشینانِ کربلا
بادِ شمالِ ظلم ادھر کو جو آ گئی ،	ایک ایک کرکے دین کی شمعیں بجھا گئی
دِل داغ سارے کر گئی سینے جلا گئی	سب اُڑ گئی ہے ہے خوبیٔ ایوانِ کربلا

ان بندوں میں علاوہ درد اور اثر کے تسلسل اور روانی بھی موجود ہے۔ جملوں کی بندش بھی کس قدر چست ہے۔ لفظ جڑے ہوئے نگینے معلوم ہوتے ہیں خصوصاً تیسرے بند میں بے حد زور ہے۔

میر کے مرثیوں میں درد اور اثر کا اندازہ کرنے کے لئے دو چار بند اور ملاحظہ کیجیے حضرت زینب فرماتی ہیں ؎

آنکھوں کو جس کی رہ میں بچھایا کئے ہیں ہم	منت سے جس کے ناز اُٹھایا کئے ہیں ہم

[1] مطبوعہ رسالہ اُردو جنوری ۱۹۳۱ء۔ ان مرثیوں کے علاوہ جناب عشرت رحمانی نے نیرنگ کے تیر نمبر میں ایک مخمس مرثیہ کا بھی ذکر کیا ہے۔

مسند پہ نازکی سے بٹھایا کئے ہیں ہم   سو خاک میں پڑا ہے وہ سلطانِ کربلا

درد اور اثر پیدا کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ انسان کی دو متضاد حالتوں کا ذکر ایک ساتھ کیا جائے۔ پچھلی خوشیوں کا احساس موجودہ غم کو اور زیادہ شدید بنا دیتا ہے۔

میرؔ کے رنگ کا ایک بند سنئے۔ پڑھ کر کتنا اثر ہوتا ہے ؎

ہوئے خوشی کسو کو تو ہوئے شگفتہ رو   شادی ہو جان کو تو کرے ہنس کے گفتگو

تھی رونے کی جگہ کہ بہ خود ہم نہ تھے نہ تو   لب ہائے زخم تھے لبِ خندانِ کربلا

بیکسی کی کس قدر دردناک تصویر ہے۔ بند کے پہلے شعر کو حقیقت کے رنگ نے درد اور اثر سے بھر دیا ہے۔ میرؔ کے نشتروں کی آبداری مرثیوں میں بھی اپنا جلوہ دکھا رہی ہے۔

اس ورد کے سلسلے کو صرف ایک مثال کے بعد ختم کرتا ہوں ؎

اصغر کے لئے بانوِ المناک پھرے گی   آنکھوں سے لہو روتی جگر چاک پھرے گی

فریاد کناں منہ کو ملے خاک پھرے گی   سننے کا نہیں بات کوئی جان جلی کی

واقعہ نگاری اور محاکات سے میرؔ نے بند میں اثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں شک نہیں کہ جب پڑھنے والا اس دردناک منظر کا تصوّر کرتا ہے تو آنکھیں خون رونے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اسی سلسلہ میں میرؔ کے مسدس مرثیہ کا ایک آدھ بند بھی پیش کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ اندازہ ہو سکے کہ مربع اور مسدس مرثیوں کے درد و اثر میں کتنا فرق ہے ؎

سکینہ جب کرے ہے باپ کو یاد   قیامت ایک ہو جاتی ہے بنیاد

اُٹھے ہے ہم اسیروں سے جو فریاد   تو یہ کہتے ہیں اَظلم اور ایجاد

کہاں مقدور یہ اس ناتواں کا،

کہ ہووے پیش رو اس کارواں کا،

سکینہ کا گنہ کیا ہے بتا دیں   پدر مردہ کو کس خاطر کڑھا دیں

کہاں فریاد لے کر جاویں   کسے یہ ماجرا سارا سنا دیں

جفا ہر لحظہ ہم سب پر نئی ہے

حیا اک رسم تھی سو اٹھ گئی ہے

میرؔ کے مسدس مرثیے میں قریب قریب سارے بند اسی انداز کے ہیں اور ان کے پڑھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں بھی درد و

اثر قریب قریب اتنا ہی ہے جتنا اور مرثیوں میں۔ بلکہ کہیں کہیں تو مربع مرثیے اس حیثیت سے زیادہ ممتاز ہیں۔ میر کے ہمعصروں میں سکندر اور افسردہ کے مسدس مرثیوں میں مقابلتہً کہیں زیادہ اثر اور درد ہے۔

ان مراثی میں میر نے ایک خاص بات یہ کی ہے کہ بین شروع کرنے سے پہلے۔ براعت الاستہلال کے طریقہ پر غم حسین کا ذکر اپنے آپ کرتے ہیں اور اس طرح دل کو پُر درد بین سننے کے لئے پہلے سے طیار کر لیتے ہیں اسے بھی ایک قسم کی تمہید سمجھنا چاہیئے۔ یہ تمہید بعض بعض مرثیوں میں کافی طویل ہے اور میرے نزدیک یہی وہ چیز ہے جس نے آئندہ دور میں چل کر چہرہ کی مستقل شکل اختیار کر لی۔ اس تمہید میں میر عموماً واقعات کربلا اور اس کے مجموعی اثر کا بیان نہایت دردانگیز پیرائے میں کرتے ہیں اور پھر گریز کر کے بین کی طرف رجوع ہو جاتے ہیں۔ ایک مرثیے کی ابتدا یوں کرتے ہیں ؎

سنو یہ قصۂ جانکاہِ کربلائے حسینؑ ، رکھو ادھر کو بھی ٹک گوش از برائے حسینؑ

جہاں سے واسطے اُمت کے جیسے جائے حسینؑ ہزار حیف کہ اُمت نہ ہو فدائے حسینؑ

امتیوں کو اس طرح مخاطب کر کے دوسرے ہی بند میں حسینؑ کی مصیبت اور بربادی کا حال لکھنا شروع کر دیتے ہیں ؎

حسینؑ آ کے مدینہ سے خانماں سو گیا حسینؑ تشنہ گرسنہ ہو اس جہاں سے گیا

حسینؑ بے کس و بے یار اپنی جاں سے گیا جگر ہو سنگ کا سننے کو ماجرائے حسینؑ

اس کے بعد کے چار بندوں میں مسلسل اسی غم و مصیبت کا ذکر کرنے کے بعد گریز کرتے ہیں ؎

جو تعزیہ کی ہو مجلس بکا کرو یارو غم حسینؑ میں چپکے رہا کرو یارو

بجائے چشم بھی اب گوش وا کرو کہ سرگزشت کہے ہی سرِ جدائے حسینؑ

اس کے بعد خود حسینؑ سے مخاطب ہو کر گفتگو کرنے لگتے ہیں ؎

حسینؑ کشتہ ہوں تیرے ثبات پا کا ہائے حسینؑ تو ہی تھا شائستہ اپنی جا کا ہائے

ترا ہی کام اٹھانا تھا اس بلا کا ہائے کیا ہے ایسا جگر کن نے تجھ سوائے حسینؑ

یہ انداز کئی بندوں تک جاری رہتا ہے لیکن چونکہ مرثیے کا اصل حصہ بین ہیں اس لئے اس طرف رجوع ہوتے ہیں اور دونوں حصوں میں ربط پیدا کرنے کے لئے اس سلسلہ کے آخری بند کہتے ہیں ؎

حرم کے لوگ ..... تھے مُو پریشاں سب برہنہ پا و سرا و نٹوں پہ تھے نمایاں سب

برشتہ سوختہ اس واقعے سے حیراں سب زباں پہ ہائے حسینؑ اور لب پہ ہائے حسینؑ

یہ مرثیہ بتیس بند کا ہے اور میر نے بین سولھویں بند سے شروع کئے ہیں۔ اس سے پہلے کے پندرہ بندوں میں ابتدا گریز، تخاطب اور رجوع

ان سب چیزوں میں جس لطف سے تعلق اور تسلسل پیدا کیا ہے اُس سے میر کی قادر الکلامی کا پتا چلتا ہے۔ اتنے مختصر سے مرثیے میں میر کو پانچ جگہ اپنا موضوع بدلنا پڑا لیکن پڑھنے والا ذرا دیر کو بھی یہ محسوس نہیں کرتا۔ ہر دو ٹکڑے ایک دوسرے سے اس لطف سے ملائے گئے ہیں کہ ہمیں اُن میں تعلق پیدا کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

باقی مرثیے بھی اسی قسم کے ہیں۔ البتہ تمہید کسی مرثیے میں اتنی طویل نہیں۔ لیکن اُن سب میں یہ بات ضرور ہے کہ تمہید اور بین اس طرح دست و گریباں ہیں کہ تسلسل میں کمی نہیں آنے پاتی اور اس لئے واقعہ اور زیادہ فطری معلوم ہونے لگتا ہے۔

میر کے جو مرثیے بین نہیں وہ بیانیہ ہیں۔ اور اُن میں میر نے واقعات کربلا کو ایک ناظر کی حیثیت سے بیان کیا ہے۔ ایسے مرثیوں میں عموماً اُن کا انداز ایک پیش بیں کا سا ہوتا ہے۔ وہ واقعے کی تصویر اُس کے گزر جانے کے بعد ہمارے سامنے نہیں پیش کرتے۔ بلکہ ان واقعات کو اپنے ذہن میں رکھ کر انہیں اس طرح بیان کرتے ہیں گویا وہ باتیں صرف اُنہیں کو معلوم ہیں اور جس طرح وہ آئندہ پیش آنے والی ہیں اُس کی اطلاع لوگوں کو دے رہے ہیں۔ اس طریقہ میں ایک خاص لطف یہ پیدا ہو جاتا ہے کہ بیان کرنے والا تفصیل کی دقتوں سے بچ جاتا ہے۔ وہ کسی واقعہ کی تفصیل نہیں بیان کرتا لیکن اس کی اس روش پر کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ اس لئے کہ پیشین گوئیاں عموماً مبہم لفظوں میں بیان کی جاتی ہیں اور ان میں اصل واقعہ کے مجموعی تصوّر کے سوا اور کوئی بات نہیں بتائی جاتی۔ ممکن ہے کہ میر نے یہ انداز اسی نکتہ کو ذہن میں رکھ کر اختیار کیا ہو۔ اگر ایسا نہ بھی ہو تو اُن کی اس تخلیق کے مرتبہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

ایک دوسرا نفسیاتی یا شاعرانہ پہلو اس بات سے یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ انسان ہونے والے واقعہ کی خبر سُن کر جو اثر محسوس کرتا ہے وہ اُس کے گزر جانے کے بعد بھی محسوس نہیں ہوتا وقتیکہ خود آنکھوں نے یہ منظر نہ دیکھا ہو۔ میر کے مرثیوں میں اس طرح کے دو مرثیے ہیں ایک کا پہلا بند ہے ؎

فلک قتل سبط پیمبر ہے کل — یہ ہنگامہ ہونا مقرر ہے کل
سحر شام تیرہ سے بدتر ہے کل — بلا کل مکل ہے کہ محشر ہے کل

دوسرا یوں شروع ہوتا ہے ؎

اے ہے یہ شب قتل حسین ابن علی کی — رخصت ہے سحر عزت والائے نبی کی
کٹ جائیگی سب آل رسول عربی کی — برہم نہ ہوئی جان کو صحبت یہ کبھی کی

ان مرثیوں کو پڑھ کر میر کی ایک شاعرانہ نزاکت کا اور اندازہ ہوتا ہے۔ انہوں نے واقعات کو بجائے گزشتہ کے آئندہ تصوّر کر کے ان کا بیان جس طرح کیا ہے اُس سے پڑھنے والے کے تصوّر کو اصل واقعہ کی ذہنی تصویر قائم کرنے کے لئے زیادہ منزلیں طے کرنی پڑتی ہیں اور اس سے اُسے خاص ذہنی لطف محسوس ہوتا ہے۔ جس کا اندازہ بھی صرف احساس سے ممکن ہے انہیں مرثیوں میں ایک بند ہے ؎

اصغر کے لئے بانو الم ناک پھرے گی — آنکھوں سے لہو روتی جگر چاک پھرے گی
فریاد کناں منہ کو ملے خاک پھرے گی — سننے کا نہیں بات کوئی جان جلی گی

اگر اسی مضمون کو اس طرح بیان کیا جاتا کہ "اصغر کے لئے بانو الم ناک پھری۔ اُس کی آنکھوں میں خون کے آنسو تھے۔ اُس کا جگر چاک تھا، سر پر خاک۔ اور اُس جان جلی کی کوئی بات تک نہ سنتا تھا" تو شاید اتنا اثر ہونا ممکن نہیں تھا جتنا موجودہ صورت میں ہوتا ہے۔

اس قسم کی مسلسل نظموں کا ایک خاص جزو واقعہ نگاری ہے۔ اس لفظ نے بھی ادب میں بہت سے مختلف مفہوم اختیار کر لئے ہیں اور اب تک خدا جانے اس سے کیا کیا سمجھا جاتا ہے لیکن اس موقع پر واقعہ نگاری سے میری مراد صرف یہ ہے کہ کسی واقعہ کو لفظوں کے ذریعے سے ہمارے سامنے اس طرح پیش کیا جائے کہ اُس کی سچی تصویر ہماری نظروں کے سامنے پھرنے لگے۔ البتہ بعض بعض جگہ ایک یا دو بند یا کہیں کہیں ایک ہی شعر سے واقعہ نگاری کا لطف پیدا کیا ہے۔ صرف تین مثالیں لکھتا ہوں:-

اب سب ہی خاک و خوں میں وہی ہیں لٹے پڑے — اشجارِ نونہال ہیں سارے کٹے پڑے
دل ہیں فگار و سینے ہیں سب کے پھٹے پڑے — مسلخ سے کم نہیں وہ گلستان کربلا

سکینہ کہے گی پدر کیا ہوا — کرے دل دہی جو گلے سے لگا
نہ کلثوم کے پاس ہوگی ردا — نہ زینب کے تارک پہ معجر ہو کل

حرم کے لوگ۔۔۔ تھے مو پریشان سب — برہنہ پا و سر او نٹوں پہ تھے نمایاں سب
برشتہ سوختہ اس واقعہ سے حیراں سب — زباں پہ ہائے حسین اور لب پہ ہائے حسین

اس قسم کی اور بہت سی مثالیں مرثیوں میں موجود ہیں لیکن ان میں صحیح معنوں میں واقعہ نگاری نہیں۔ البتہ اسے واقعہ نگاری کی داغ بیل ضرور کہا جا سکتا ہے۔

میر کے مرثیوں میں کردار نگاری کی بھی جھلک ہے۔ حضرت امام حسینؑ کی صفات کا بیان ہر موقع پر طرح طرح سے کیا ہے اور اُن کی بلند فطرت کو ہمارے سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ اُن کے ایثار۔ جوانمردی۔ ہمت۔ صدق و صفا۔ راہ وفا میں قدم کی استواری صبر و سکون اور علوئے ہمت کی تصویریں مختلف موقعوں پر شاعرانہ انداز میں پیش کی ہیں۔ ایک آدھ مثال ملاحظہ ہو ؎

برسا کی تیغ لیکن تو نے سپر نہ رکھی — دریا بہا کیا پر تو نے نظر نہ رکھی
کیا کہیے جب توجہ ہی جان پر نہ رکھی — کشتہ ہیں اس وفا کے تجھ کو سلام پہنچے

تسلیم کا رضا کا دیکھا ترا عجب ڈھب — وقت بریدن سر سجدہ میں تھا مؤدب
یہ بندگی الٰہی۔ یہ انکسار یا رب — اے شوق کش خدا کے تجھ کو سلام پہنچے

میر نے مرثیوں میں کوئی روایت نہیں نظم کی۔ البتہ سلام میں ایک روایت کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

مجلس میں گر پڑا تھا گرم آش کا پیالہ — چھینٹیں پڑیں جو تجھ پر سہما وہ لانے والا
غصہ کو کھا گیا تو منہ سے نہ کچھ نکالا — اے صاحب حیا کے تجھ کو سلام پہنچے،

اس بند سے ظاہر ہے کہ حسین کے کردار کا ایک پہلو نمایاں کرنے کے لئے یہ روایت کی گئی ہے۔

میر کے مرثیوں میں بلاغت کی مثالیں بھی کثرت سے ملیں گی لیکن اُن سے یہ توقع رکھنا کہ وہ انیس یا دبیر کے مرثیوں کی طرح بلند ہوں گی کچھ بے معنی سا ہے۔ اس لئے کہ یہ ایک چیز کی ابتدا تھی اور وہ انتہا ذیل کے بندوں میں نسوانی فطرت کی مصوری ملاحظہ ہو:۔

کوئی کہے تھی کہ اکبر کو مرنہ جانا تھا — نہ جنگ گاہ میں عباس کو بلانا تھا
پچا کے ساتھ نہ قاسم کو آہ لانا تھا — کوئی رہا نہ جسے ہم کو سونپ جائے حسین

خصوصاً یہ بند ؎

بہن سے کہتی تھی رو رو کے زینب ای کلثوم — چلا تھا بھائی مدینے سے کیسے وقت شوم
شتابی راہ جو کرتا تھا قطع تھا معلوم، — کہ سر کا مارے ہی جانا تھا مدعائے حسین

اہل بیت کے غم اور بین کے جو مرقعے زیادہ تر مرثیہ گویوں نے ہمارے سامنے پیش کئے ہیں اُن پر خود ہماری فطرتوں کا رنگ غالب ہے اور اس کا مقصد محض یہ ہے کہ ان نالوں کو اپنا سمجھ کر ہم اُن سے متاثر ہوں اور آنسو بہائیں لیکن میر نے کہیں کہیں نہایت لطف سے ان کی ان فطرتوں کی مصوری کی ہے جو صرف انہیں کے لئے مخصوص ہو سکتی ہیں سنئے :۔

کوئی کہے تھی کہ یہ بھی خدا کی باتیں ہیں — کبھو کے دن ہیں بڑے اور کبھو کی راتیں ہیں

ہم دنیا کے غموں میں رو رو کر جانیں دے دیں تو کچھ نہیں لیکن اہل بیت کا ہماری طرح گریہ کرنا کچھ غیر فطری سا معلوم ہوتا ہے۔ اس کا احساس میر نے جس طرح کیا اُس کا عکس کس قدر دلفریب ہے ع

کوئی کہے تھی کہ یہ بھی خدا کی باتیں ہیں

مسدس مرثیے کے بین بھی بے حد فطری ہیں۔ بلاغت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے ؎

ریاست کے لئے شبیر مارا، — بھلا یوں اُس کی تھی تقدیر مارا
سبھوں کو کیوں نہ بے تقصیر مارا — علی اصغر کے کیوں پھر تیر مارا
چھپائیں عورتوں کی کیوں روئیں
روا کاہیکو۔ رکھیں یہ جفائیں

سوالوں نے انداز بیان کو اور زیادہ فطری بنا دیا ہے۔

اس کے بعد دو تین بند بھی اتنے ہی لطیف اور موثر ہیں ؎

سکینہ کا گنہ کیا ہے بتاویں ۔۔۔ پدر مردہ کو کس خاطر کڑھاویں

کہاں فریاد لے کر آہ جاویں ۔۔۔ کسے یہ ماجرا سارا سناویں

جفا ہر لحظہ ہم سب پر نئی ہے

حیا اک رسم تھی سو اٹھ گئی ہے

حسن تو تھا خلیفہ جس کو مارا ۔۔۔ گنہ قاسم کا کیا جو اس کو مارا

کہوں میں کب تلک کس کس کو مارا ۔۔۔ ستم سے جور سے جس جس کو مارا

رہا وارث نہ غیر از عابدیں کے

پڑے ہیں خاک میں ارکان دیں کے

میر کے مرثیوں کے متعلق ایک ضروری بات جو انہیں پڑھتے وقت ذہن میں آتی ہے یہ ہے کہ انہیں فطرت اور مناظر فطرت سے بیحد دلچسپی تھی۔ چنانچہ ان مرثیوں میں جا بجا اس کی جھلک موجود ہے۔ میر کے زمانے میں مرثیے اول تو چھوٹے چھوٹے لکھے جاتے تھے دوسرے ان کی روح رواں اعتقاد پسندی تھی اس لئے مرثیوں میں ایسے عناصر زیادہ بھرے جاتے تھے جن سے رونے رلانے کا مشغلہ زیادہ آسانی سے پورا کیا جا سکے۔ ایسی صورت میں ان میں مناظر فطرت کی نقاشی کرنا ممکن نہ تھا لیکن میر کی فطری صلاحیت نے اس کے لئے ایک نیا طریقہ نکال لیا۔ وہ جا بجا ایسی تمثیلوں کو کام میں لائے جو آسانی سے مرثیوں میں فطرت کا دلکش رنگ بھی بھر سکیں۔ چنانچہ بعض بعض جگہ تو صرف ایک ہی بند میں استعارے یا تشبیہ کے طور پر گل و بلبل یا نخل کا ذکر کیا ہے لیکن ایک مرثیے میں گلستان کے مراعات کو شروع سے آخر تک نہایت لطف سے جمع کیا ہے مرثیہ کا پہلا بند یہ ہے ؎

اس گل باغ امامت کے ہیں پھول ۔۔۔ آبیاری جن کی کرتی تھی بتول

سو تن نازک یہ ان کے خاک دھول ۔۔۔ دیدنی ہے رنگ صحبت یا رسول

اسی مرثیہ کے دو بند محض یہ دکھانے کے لئے لکھتا ہوں کہ میر نے آگے چل کر مراعات کو کس طرح نباہا ہے ؎

اب نہیں ہے برگ و بار و بر کا نام ۔۔۔ خار غنچہ ہو رہے ہیں کام کام

سیر کر تک جور کے پیشوں کا کام ۔۔۔ کچھ نہ چھوڑا کیا فروغ و کیا اصول

پھر گئی کیا آہ یک بارہ ہوا ۔۔۔ اڑ گئے سب طائران خوش نوا

کیا زمانے نے ستم رکھا روا ۔۔۔ جائے بلبل زاغ بیٹھے پھول پھول

غرض، ابتدا وں کا پورا مرثیہ اسی رنگ میں ہے اور کسی جگہ آورد نہیں معلوم ہوتی۔

میر کے مرثیوں میں سے مختلف جگہوں کی اتنی مثالیں پڑھنے کے بعد جہاں ہمیں اُن کی مرثیت، درد، اثر حسن ترتیب تسلسل اور روانی کا اندازہ ہوا۔ وہاں دوسری طرف ان کا یہ بھی اثر پڑا کہ ان مرثیوں کی زبان سادہ ہونے کے باوجود بھی جا بجا رنگیں اور پُرلطف ہے۔ صفائی ان کے کلام پر شروع سے آخر تک چھائی ہوئی ہے اور اس کی وجہ سے اثر میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا ہے بعض جگہ زبان کی چاشنی اور صفائی میں اس قدر لطف ہے کہ اُن کے مصرعے یاد کرنے کو جی چاہتا ہے۔ صرف دو ایک مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں۔ ع

خزاں نے لوٹے ہیں کیا پات پات کر گلزار

یا ؎ کوئی کہے تھی کہ یہ بھی خدا کی باتیں ہیں — کبھو کے دن ہیں بڑے یاں کبھو کی راتیں ہیں

یا ؎ نہیں بھائی بھتیجوں کا ٹھکانا — میسر سب کو آیا جی سے جانا

یا یہ شعر تو ضرب المثل ہونے کے قابل ہے ؎

ہوئے خوشی کسو کو تو ہوئے شگفتہ رو — شادی ہو جان کو تو کرے ہنس کے گفتگو

اس قسم کی مثالیں اِن تھوڑے سے مرثیوں میں کافی تعداد میں موجود ہیں۔

زبان کے لطف کے علاوہ میر کے مرثیوں کی دوسری دلچسپی اُن کی رنگینی اور لطیف تشبیہیں ہیں۔ ملاحظہ ہو ؎

جراحتوں سے تھا یا قوت رنگ خوں جاری — حسین ہائے تری اٹھ گئی سبھا ساری

لڑی سی ٹوٹ گئی موتیوں کی یکباری — ملے ہیں خاک میں کیا لعل پارہ ہائے حسین

جہاں میر نے رنگینی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے وہاں کلام میں زور بھی بہت پیدا ہو گیا ہے اور زبان کا انداز اُن کے عام فطری انداز سے کسی قدر علیحدہ ہو گیا ہے۔ اس قسم کی مثالیں اوپر دیئے ہوئے بندوں میں اکثر میں موجود ہیں۔ اس لئے اُن کا دہرانا فضول ہے لیکن یہ کہہ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس زور اور شوکتِ بیان کے باوجود بھی مرثیت باقی رہتی ہے اس بات کے ظاہر کرنے کے لئے صرف ایک مثال دہراتا ہوں ؎

شاید غبار رکھتے ہیں حیرانِ مہر و ماہ — احوال پر ہمارے نہیں مطلقاً نگاہ

پردہ ہے جو گرد پڑے گردونِ روسیاہ — ہیں بے پناہ خاک نشینانِ کربلا

اس کے باوجود بھی میر کو اگر کوئی مرثیہ گوئی سے بے بہرہ کہے تو ستم ہے۔ اُس کے مرثیوں میں سکندرا اور افسردہ کے مسدس مرثیوں کی سی شان نہ ہو۔ لیکن وہ کم از کم ایسے گئے گزرے نہیں کہ انہیں پوچ کہہ کر ٹالا جا سکے۔ اُن میں سودا کی سی بلندیٔ تخیل نہیں لیکن درد۔ اثر اور سوز و گداز ہر جگہ موجود ہے اور اسی میں میر کے مرثیوں کی کامیابی کا راز پوشیدہ ہے۔

اندازِ بیان چند جگہوں کو چھوڑ کر بالکل سادہ اور فطری ہے۔ لفظوں میں درد اور مصرعوں میں گداز ہے اور اس لئے بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ میر مرثیہ گوئی میں بھی مجموعی حیثیت سے اپنے ہمعصروں کے برابر ہے۔ اس نے صرف چند مرثیے کہے۔ لیکن خود جگر سوختہ تھا اس لئے جو کچھ کہا اُس میں اثر اور تڑپ ہے۔

سید وفا عظیم

غزل

تغافل کیش پر الزام کیا ہو کج ادائی کا
عجب پردہ ہے پردہ شیوۂ دیر آشنائی کا

میں ڈرتا ہوں قصور اے دل نہ اپنا ہی نکل آئے
گلہ کرنے کو تو کرتا ہوں اُس کی بیوفائی کا

دلِ آتش نفس تو آپ اپنے کو جلائے گا،
نتیجہ اور کیا ہوگا تری آتش نوائی کا

کہیں ظالم اُبھر آئیں نہ میرے داغ پنہاں بھی
کہ بے حد تجھ کو لپکا پڑ گیا ہے خود نمائی کا

مگر ہے نسبتِ باہم کہ شہرہ ہے زمانے میں
تری رنگیں ادائی کا مری رنگیں نوائی کا

ترے عشاق سے اک بانکپن کی شان پیدا ہے
انہوں نے بھی اڑایا رنگ تیری خود نمائی کا

خط اُن کو کیا لکھوں وحشتؔ نہ لکھ دوں مصرعِ غالبؔ
کہ حسرت سنج ہوں عرضِ ستم ہائے جدائی کا

وحشتؔ

نوجوان شاعر

ایک مزاحیہ افسانہ

اختر نوجوان شاعر اور ادیب، چار مدیروں اور ناشروں سے ملاقات کے بعد مایوسی اور افسردگی کے عالم میں اپنی جائے قیام پر واپس پہنچا۔ اور کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے کھانے کی میز اور الماری کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا اور دل میں کہا "اگر وہ لوگ جنہیں قدرت نے شعر و ادب کا ذوق ودیعت کیا ہے میرے جواہر ریزوں کی قدر نہیں کرتے تو اس ہوٹل کے مالک کی سرد مہری پر مجھے کیا شکایت ہوسکتی ہے"۔ ایک لمحہ تامل کرنے کے بعد کہا "آہ میں کس قدر بھوکا ہوں۔ جب تک کچھ کھا نہ لوں میں ٹریجڈی کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے نہیں بیٹھ سکتا۔ یہ بھی خوش قسمتی ہے کہ میں آج کل ٹریجڈی لکھ رہا ہوں اگر کوئی کامیڈی زیر تصنیف ہوتی تو تنگ آکر آج ضرور تلف کردیتا۔ آہ دو روز سے فاقہ ہے"۔ یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنی جیب سے مدیران رسائل اور ناشروں کے مسترد کردہ مسودوں کا پلندا نکالا اور میز کی طرف گیا۔ اُسے معلوم ہوا کہ اُس کے بعض کاغذات گم تھے۔ پانچ ایکٹ کی ایک ٹریجڈی کے چار ایکٹ اور نظموں کا ایک پلندا غائب ہوچکا تھا۔ وہ اس واقعہ پر اپنی حیرت کا پورے طور پر اظہار بھی نہ کرنے پایا تھا کہ ہوٹل کا مالک کمرے میں داخل ہوا۔

اختر چلایا "میری ٹریجڈی۔ میری ٹریجڈی"۔

ہوٹل کے مالک عبداللہ نے کہا "ہاں میرے ہی پاس ہے"۔

اختر نے کہا "تم نے کیونکر یہ جرأت کی۔ لاؤ مجھے واپس دو"۔

جواب ملا "پہلے میرے بل ادا کرو۔ میں نے تمہاری نظمیں بھی نکال لی ہیں اور تم نے اپنے چچا کی جو ہجو لکھی ہے وہ بھی میرے پاس ہے۔ میری رقم ادا کردو اور یہ چیزیں لے لو"۔

شاعر نے اضطراب انگیز حالت میں بازو ہلاتے ہوئے کہا "کیا واہیات باتیں کررہے ہو۔ میں کوئی ٹکسال تو نہیں ہوں۔ روپے کہاں سے لوگے۔ تم میرے چچا کو کیوں نہیں لکھتے۔ میرے بل وصولی کے لئے ان کے پاس بھیج دو نا"۔

عبداللہ نے کہا۔ ایک مرتبہ بل بھیج کر دیکھ چکا ہوں۔ تمہارے چچا اب تمہاری رقم کیوں ادا کرنے لگے جبکہ تم نے اس بات پر کہ انہوں نے تمہارا خرچ بند کردیا۔ اُن کی سخت ہجو لکھی ہے"۔

اختر نے تردد آمیز لہجہ میں کہا۔" افسوس ہے میں نے خواہ مخواہ یہ ہجو تمہیں سنائی۔ میں نے تمہیں دوسرے ہوٹل والوں سے جن کے بل مجھے ادا کرنے ہیں زیادہ فہمیدہ اور تعلیم یافتہ سمجھا اس لئے یہ جرأت کی۔ دیکھو عبداللہ میں ایک دن ضرور مشہور اور کامیاب ادیب بنوں گا۔ کیا تمہارے پاس کچھ کھانے کے لئے موجود ہے"؟

عبداللہ نے کہا۔" کیوں نہیں۔ بہت کچھ ہے لیکن اگر تمہیں پیٹ بھرنا منظور ہے تو دام نکالو"۔

" اجی زیادہ باتیں بنانے سے کیا فائدہ۔ تمہیں علم ہے کہ میں ایک زبردست ٹریجڈی لکھ رہا ہوں۔ آہ آج کس قدر سردی ہے۔ کوئلہ کی انگیٹھی تو فالتو ضرور ہوگی"؟

عبداللہ نے جواب دیا۔" ہاں لیکن آپ کے لئے نہیں"۔ آپ کی ٹریجڈی اور نظمیں میرے پاس محفوظ ہیں جس وقت جناب میرے بل ادا فرمائیں گے یہ چیزیں واپس مل جائیں گی۔ ورنہ مجھے ان کو فروخت کرنا ہوگا"۔

اختر نے کہا۔" یہ محض تمہارا خیال ہی ہے۔ ان کے قدر دان ہیں کہاں۔ اچھا اگر تم ان کو واقعی واپس نہیں دیتے تو میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ ٹریجڈی کے تیسرے ایکٹ کا ضرور بہ غور مطالعہ کرنا اور مجھے مطلع کرنا کہ تمہاری اس کے متعلق کیا رائے ہے"۔

عبداللہ نے کہا۔" کیوں نہیں ضرور پڑھوں گا"۔

اختر نے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔" اچھا اب میں اپنے دوست مصور کے پاس جاتا ہوں۔ اگرچہ وہ خود مفلوک الحال اور میری طرح سے ابنائے زماں کی ناقدری کا شکار ہے تاہم دیکھوں تو اس کے پاس اس وقت کچھ کھانے کے لئے ہے یا نہیں۔ عبداللہ اگر کوئی شخص یہاں مجھ سے ملاقات کے لئے آئے تو اُسے میرے دوست مصوّر کے ہاں بھیج دینا"۔

" ضرور۔ میں اُس سے کہوں گا کہ ایک برخود غلط شاعر جس کا دماغ مختل ہو رہا ہے ایک ناکام مصوّر کے پاس بھیک مانگنے کے لئے گیا ہے حالانکہ اس مصوّر کے پاس خود پھوٹی کوڑی تک نہیں اور اُس نے بھی میرے بل ابھی تک ادا نہیں کئے"۔

دس منٹ کے بعد نوجوان ادیب نئی اُمنگوں کے ساتھ مصور کے مکان پر پہنچ گیا۔ جونہی وہ کمرے میں داخل ہوا اُسے بھنی ہوئی مچھلی کی اشتہا انگیز خوشبو آئی۔ اختر کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ مصور اور اُس کے چار ادیب دوست کمرے میں موجود تھے لیکن وہ اُس وقت حسب معمول فاقہ زدہ معلوم نہ ہوتے تھے۔ اختر کا دل ڈوبنے لگا۔ اُس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا۔" میں پوچھتا ہوں بھنی ہوئی مچھلی کہاں ہے"

" ہم کھا بھی چکے"۔ یہ مصور کا اطمینان آمیز جواب تھا۔

اختر خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد کہا۔" تو۔ تو کیا تم میں سے کوئی شخص مجھے کچھ پیسے قرض دیگا"؟

مصوّر نے جواب دیا۔" ہمارے پاس اس وقت مجموعی سرمایہ صرف ساڑھے تین پیسے باقی بچا ہے۔ افسوس کہ تم دیر سے پہنچے"۔

اختر نے کہا۔" میں نے کئی دن سے کچھ نہیں کھایا اور عبداللہ نے میری ٹریجڈی، ہجو اور نظمیں رکھ لی ہیں"۔

مصوّر نے کہا "بہت ہوشیار انسان ہے۔ مجھے بھی اُس کی کچھ رقم ادا کرنی ہے اور وہ میری سترہ تصویریں بطور ضمانت اپنے پاس رکھے ہوئے ہے۔"

اختر نے کہا "میرا خیال ہے وہ خود بھی ہجو لکھ سکتا ہے۔ اُس کا قول ہے کہ "ایک حقیقی شاعر یا مصور کو بھوکا ہی مرنا چاہیئے"۔

مصور نے جواب دیا "واقعی ان لوگوں کی ہمارے متعلق بہت بری رائے ہے۔ اب اُس سامنے والے قصاب کو دیکھو نا کمبخت نے صرف مجھے قرض دینا ہی بند نہیں کیا بلکہ میرے بل میں گوشت کی ایک فالتو ران لکھ دی جو مجھے ہرگز نہیں ملی۔"

اختر نے کہا "ہاں میں بھی اُسے جانتا ہوں۔ بہت ناپسندیدہ شخص ہے (کچھ سوچ کر) کیا واقعی تم سے ایک ران کے دام زیادہ وصول کر لئے۔"

"صریحاً لیکن میں اس گوشت کے ٹکڑے کی ملکیت سے تمہارے حق میں دست بردار ہوتا ہوں"۔

اختر نے کہا "آہ اگر واقعی اس وقت یہ گوشت کا ٹکڑا مجھے مل جائے۔ تو میں بھوکا کیوں مروں"۔

مصوّر بولا "جس طریق پر یہ کاروباری لوگ ہمارے آرٹ کو کچل رہے ہیں سخت ناقابلِ برداشت ہے"۔

باقی دوستوں نے کہا "انتہائی ظلم ہے"۔ ایک نے کہا "میرے خیال میں ہم سے چار اشخاص کے لئے اس دنیا میں رہنا بالکل غیر ضروری ہے"۔

مصوّر نے پوچھا "اور باقی کون دو زندہ رہیں"۔

جواب ملا "تم اور اختر"۔ کیونکہ تم دونوں غیر معمولی شہرت کے مالک ہو اور تمہارے نام شہرتِ دوام پانے کے مستحق ہیں"۔

اختر نے کہا "آہ میں بھوک سے مر رہا ہوں۔ کیا یہ رومان انگیز نہیں؟ دیکھو میرے چچا نے میرے خرچ کی رقم اس لئے بند کر دی کہ میں ان کے منشا کے مطابق اُن کے پاس آسٹریلیا نہ گیا۔ اور اب یہاں کلکتہ والے چچا نے مجھ سے اس بات پر منہ پھیر لیا کہ میں نے شاعری کو چھوڑنا گوارا نہ کیا۔"

مصوّر نے کہا "واقعی تمہارے آسٹریلیا والے چچا نے تم سے بہت بُرا سلوک کیا ہے"۔ یہ کہتے ہوئے اس نے کاغذ پر آسٹریلیا والے چچا کا کارٹون بنایا جس پر سب خوب ہنسے لیکن اختر بھوک سے بیتاب ہو رہا تھا۔ فوراً وہاں سے نکلا۔ بازار میں پہنچا۔ سامنے قصاب کی دکان نظر پڑی۔ گوشت کے ٹکڑے لٹک رہے تھے۔ اختر سوچنے لگا "یہ میرا دوست مصور ہی ہے جو مجھ سے ہمیشہ عملی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔ دیکھو نا اُس نے ابھی ابھی وہ گوشت کا ٹکڑا کس فیاضی کے ساتھ مجھے منتقل کر دیا۔ (تھوڑی دیر تامل کے بعد) اُس ران پر جو سامنے قصاب کی دکان پر لٹک رہی ہے میرا ہر طرح سے حق ہے۔ میں کیوں نہ اسے اچک لوں"۔

یہ کہہ کر اختر لپکا ہوا گیا اور گوشت کا ٹکڑا اٹھا کر بھاگ نکلا۔ قصاب فوراً دکان چھوڑ کر شور مچاتا ہوا تعاقب میں گیا۔ ایک پولیس کا جوان بھی قصاب کے ساتھ بھاگنے لگا۔ اختر نہایت تیزی کے ساتھ دوڑ رہا تھا۔ ٹریم کاروں۔ بسوں اور موٹروں میں سے راستہ کاٹتا ہوا وہ چند

منٹوں میں دو تین بازار آگے نکل گیا۔ جب اختر نے بھاگتے ہوئے محسوس کیا کہ اس سے زیادہ دوڑنے کی طاقت نہیں رہی تو ادھر ادھر دیکھا عقب سے ایک نفیس موٹر کار آرہی تھی۔ جونہی اُس کے برابر پہنچی اختر اُس کے پائیدان پر کھڑا ہو گیا۔

اس موٹر کار میں ایک ادھیڑ عمر کے رئیس سوار تھے۔ انہیں پہلے تو اختر کی اس جرأت پر غصّہ آیا لیکن زندہ دل اور معاملہ فہم انسان واقع ہوئے تھے۔ اختر کو وحشت کی حالت میں گوشت کی ران ہاتھ میں پکڑے ہوئے دیکھ کر مسکرائے اور کار کا دروازہ کھول کر کہا "اندر آؤ"۔ اختر اُن کے بالمقابل بیٹھ گیا۔ گوشت کے ٹکڑے نے نفیس ایرانی پاانداز کو خراب کرنا شروع کیا تو اختر نے کھسیانے ہو کر اس کو اپنے کوٹ کے نیچے چھپانے کی کوشش کی لیکن اپنے کپڑوں کا ستیاناس کر لیا۔ وہ رئیس جواب تک خاموش بیٹھے ہوئے اختر کی حرکات کا جائزہ لے رہے تھے بے اختیار ہنس دیئے۔ اختر اور بھی خفیف ہُوا۔

رئیس نے دریافت کیا "تم کون ہو۔ کہاں سے آئے ہو۔ ماجرا کیا ہے؟" اختر نے اپنی حکایت من وعن سنادی اور کہا "میرا دوست مصور کہتا ہے میں بہت بڑا شاعر ہوں۔ میں ایک کامیاب ٹریجڈی لکھ رہا ہوں۔ بہت شہرت پائے گی۔ یہ ایڈیٹر اور ناشر لوگ بہت قدر ناشناس ہوتے ہیں۔ تمام بڑے بڑے شعرا مفلوک الحال ہی ہوتے ہیں۔ میں بھی دو روز سے بھوکا ہوں"۔ رئیس کو اختر کے ساتھ کچھ دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اُس نے کہا "واقعی زمانہ قدر نہیں کرتا۔ آہ علم و ادب کے درخشندہ ستاروں کی یہ حالت!! دوسروں کے لئے روشنی اور زندگی کا سامان مہیا کرنے والے خود گرمیٔ حیات سے محروم ہیں"۔ اختر سے مخاطب ہو کر "لیکن یہ گوشت کا ٹکڑا آپ کہاں لئے جا رہے ہیں"۔ اختر نے تمام قصہ دہرایا اور بتایا کہ اس نے کیوں اپنے آسٹریلیا والے چچا کی ہجو لکھی ہے۔ پھر بولا "میں آپ کو ضرور سناتا لیکن وہ عبداللہ ہوٹل والے نے رکھ لی ہے۔ میری نظمیں اور ٹریجڈی بھی اسی کے پاس ہے۔ رئیس کو لڑکے کی داستان بہت دلچسپ معلوم ہوئی۔ دوران گفتگو میں اختر نے اپنے آسٹریلیا والے چچا کا نام لیا تو رئیس چونکنا ہو گیا اور معنی خیز انداز میں اختر کی طرف دیکھا۔ اتنے میں موٹر ایک ہوٹل کی سربفلک عمارت کے سامنے جا کر رکی۔ رئیس نے اختر سے گوشت کا ٹکڑا لے لیا اور اختر کو ساتھ لے کر ہوٹل میں داخل ہُوا۔ رئیس نے کہا "اسی ہوٹل میں میری بھانجی اور میرے بہنوئی مقیم ہیں۔ ہوٹل میں اس گوشت کے کباب بنوائیں گے اور ہم سب آپ کے مہمان ہونگے۔ اختر نے کہا "ضرور ضرور"۔ اور دونوں ہوٹل میں داخل ہوئے۔ خدمتگاروں نے آسٹریلیا کے رئیس کو آتے ہوئے دیکھا تو جھک کر سلام کیا اور پلیٹ پیش کی۔ رئیس نے کہا "ہٹ جاؤ آگے سے۔ دیکھو صاحب یہ سب ہم سے گوشت چھین لینا چاہتے ہیں"۔ کمرے میں پہنچ کر رئیس نے اختر کو آتشدان کے پاس ایک آرام کرسی پر بٹھایا اور کہا کہ میں آپ کے آسٹریلیا والے چچا سے خوب واقف ہوں اور ہمارے آپس میں گہرے تعلقات قائم ہیں۔ رئیس نے خدمتگار کو آواز دے کر حکم دیا کہ چائے اور نفیس بسکٹ لائے۔ اختر سے کہا "آپ چائے اور بسکٹ سے دل بہلایئے۔ میں اس ساتھ والے کمرے میں اپنے بہنوئی اور اپنی بھانجی سے کچھ باتیں کر لوں۔ رئیس کے جانے کے بعد چائے پہنچ گئی اور اختر کے کام و دہن کے ساتھ شکم کی تواضع بھی شروع ہوئی۔ مرجھایا ہُوا چہرہ کھل گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد رئیس اپنی بھانجی

کو ساتھ لے کر آئے اور اختر سے جمیلہ کا تعارف کرایا۔ اختر جس میں اب تازگی عود کر آئی تھی جمیلہ سے جو ہر طرح کی دلکشی سے متصف تھی بہت جلد مانوس ہو گیا اور اس کے ساتھ خوب باتیں کرنے لگا۔ جمیلہ کے دل میں بھی اختر کی سادگی بہت جلدی گھر کر گئی۔ اختر نے کہا "میں آپ کو وہ ہجو ضرور سناتا اگر میرے پاس ہوتی۔ دیکھو نا ایک ادیب اور شاعر کو تجارت سے کیا تعلق۔ میں کیونکر آسٹریلیا جانا گوارا کر لیتا۔ پر انہیں اگر خرچ بند کر دیا۔ میں نے بھی تو ایسی سخت ہجو لکھ ڈالی"۔

جمیلہ نے کہا "لیکن تمہارے چچا تو بُرے آدمی نہیں۔ میں انہیں اچھی طرح سے جانتی ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں تو انہیں بہت پسند کرتی ہوں"۔

اختر نے کہا۔ "تو پھر تم نے پہلے کیوں نہ مجھے بتایا۔ واقعی اب میں بھی یہ محسوس کرتا ہوں کہ میرے چچا اتنے بُرے آدمی نہیں (جمیلہ کی طرف دیکھ کر) نیز آسٹریلیا جانا بھی بُری بات نہیں"۔

جمیلہ نے کہا "اور انہیں یہ کب معلوم تھا کہ تمہارے کلکتہ والے چچا نے بھی تمہیں چھوڑ دیا ہے ورنہ وہ تمہارا خرچ کبھی بند نہ کرتے۔ میں تو انہیں اتنا چاہتی ہوں کہ ہمیشہ انہی کے پاس رہتی ہوں"۔

اختر نے سوچتے ہوئے کہا۔ "اب میرا بھی یہی خیال ہے کہ اُن کے حکم کی تعمیل کروں اور اُن کے حسبِ منشا آسٹریلیا جا کر اُن کا کاروبار سنبھال لوں۔ وہ مجھ سے یقیناً خوش ہو جائیں گے۔ ٹھیک ہے نا"۔

جمیلہ نے کہا۔ "بے شک"۔

خدمتگاروں نے میز پر کھانا چنا۔ رئیس نے ساتھ والے کمرے سے جمیلہ کے والد کو آواز دی۔ اُن کا نام سننے پر اختر کے کان کھڑے ہوئے۔ ادھر جمیلہ بے تاب ہو رہی تھی۔ اب زیادہ ضبط نہ ہو سکا۔ بولی "اختر پیارے اختر"۔ اختر کے منہ پر اس اچانک انکشاف سے گویا خاموشی کی مہر لگ گئی۔ وہ خوش تھا۔ جمیلہ کے والد کمرے میں داخل ہوئے اور اپنے بھتیجے کو گلے لگا لیا ؎

احسن علوی لدھیانوی

(چربہ)

اب بھی وقت نہیں گزرا۔ اٹھو اور کامیاب ہو جاؤ!

غزل

تنہا ہجومِ یاس میں کچھ سوجھتا نہیں، کوئی مجھے بتاؤ کہ میں ہوں بھی، یا نہیں؟

حافظ خدا ہو اب دلِ امیدوار کا یہ خوگرِ کشاکشِ بیم و رجا نہیں

تو اپنے دل کو چھوڑ کے مرہونِ غیر ہے تو بے وفا ہے، اور کوئی بے وفا نہیں

جتنا غنی ہوا کوئی، محتاج تر ہوا زنہار، دوست! فقر سے بڑھ کر غنا نہیں

پائے گدا کو ملکِ خدا تنگ ہی کہاں یاں قیدِ باسیائی برگ و نوا نہیں

تخلیقِ جلوہ دیدۂ نظارگی سے جان جز خوابِ دل حقیقتِ حسن و ادا نہیں

ٹوٹا خودی کا آئنہ ہر ریزہ بول اٹھا ناداں کیا مثیل ترے جا بجا نہیں

دشمن ہوئے ہیں درپئے آزار اس طرح گویا ہمارے سر پہ ہمارا خدا نہیں

خود بیں ہوں، بے ہنر ہوں، تن آساں ہوں سب درست! جو کہیے میں وہی ہوں، خدا جانے کیا نہیں

بزمِ عدو میں اب بھی ہے حامد کا ذکرِ خیر
وہ مر چکا ہے، آپ نے شاید سنا نہیں،

حامد علی خاں

خانہ نشین ہو چکا تھا۔ اُس کی رائے دریافت کی گئی تو اس نے معذوری کا اظہار کیا اور پھر کہا کہ "مارکوئس نے محض وقتی رجحانِ طبیعت کو محبت کا موجب قرار دیا ہے لیکن اگر آپ مجھ سے پوچھتے ہیں تو مجھے ایک ایسی محبت کا علم ہے جو توقف کے ایک دن کے بغیر مسلسل پچپن برس تک قائم رہی اور آخر موت ہی نے اُس کا خاتمہ کیا۔

مارکوئس کی بیگم نے جوش سے تالی بجا کر کہا "واہ وا! ایسی محبت کسی کی قسمت میں ہو تو اُسے اور کیا چاہیئے۔ پچپن سال تک گہری اور پر جوش محبت کی فضا میں رہ کر زندگی گزارنا کتنا خوشگوار ہے۔ وہ شخص بھی کیسا خوش نصیب ہو گا جس سے اس طرح محبت کی گئی۔"

ڈاکٹر نے ہنس کر کہا "مادام! آپ نے خوب کہا جس سے اس طرح محبت کی گئی، واقعی وہ ایک مرد تھا۔ آپ اُسے جانتی ہیں۔ میری مراد قصبے کے دوا فروش ایم شو کے سے ہے۔ باقی رہی عورت، سو اُسے بھی آپ جانتی ہیں۔ وہی کرسیاں بننے والی جو ہر سال آپ کے محل میں آیا کرتی تھی۔ سنیئے میں یہ داستان ذرا کھول کر بیان کرتا ہوں"۔

خواتین جس اشتیاق سے یہ داستان سننے کو آمادہ ہو رہی تھیں یکایک فرو ہو گیا۔ ترش چہروں پر شکنیں پڑیں اور سب "اونہہ" کہہ کر خاموش ہو گئیں۔ گویا طبقۂ اعلیٰ کے سوا کہ وہی مہذب لوگوں کے اعتنا کا مستحق ہے کسی دوسرے طبقے میں محبت کے جذبات کا پیدا ہونا قابلِ نفرت تھا۔

ڈاکٹر نے گفتگو جاری رکھی اور کہا "تین مہینے گزرے، جب یہ بوڑھی عورت بسترِ مرگ پر پڑی تھی، اُس نے مجھے اپنے پاس بلایا۔ وہ گزشتہ ہی شام اپنے چھکڑے پر واپس آئی تھی جسے وہ لدّو گھوڑا کھینچتا تھا جسے آپ سب بار ہا دیکھ چکے ہیں اُس کی معیت میں دو بڑے بڑے سیاہ کتے بھی تھے جو اُس کے رفیق بھی تھے اور محافظ بھی۔ اس کا چھکڑا ہی اس کا گھر بھی تھا۔

"قصبے کے پادری صاحب مجھ سے پہلے اس کے پاس پہنچ چکے تھے۔ بڑھیا نے ہم دونوں کو اپنا وصی مقرر کیا اور اپنی آخری خواہشات کی اہمیت واضح کرنے کے لئے ہمیں اپنی زندگی کی داستان سنائی۔ سچ یہ ہے کہ میں نے اس سے زیادہ عجیب اور دلگداز قصہ آج تک نہیں سنا۔

"اُس کا باپ پرانی کرسیاں بُنا کرتا تھا اور اُس کی ماں بھی یہی کام کرتی تھی۔ اُسے کبھی اینٹ گارے کے زمین پر بنے ہوئے مکان میں رہنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ بچپن میں وہ غلیظ چیتھڑے لگائے اپنے ماں باپ کے ساتھ جگہ جگہ پھرتی رہتی تھی۔ یہ لوگ دہات کا چکر لگایا کرتے تھے اور ہمیشہ گاؤں سے کچھ فاصلے پر اترا کرتے تھے۔ یہاں وہ درختوں کے پاس اپنی گاڑی کھول دیتے۔ گھوڑا گھاس چرتا پھرتا۔ کتا اپنے پنجوں پر ناک رکھ کر سو رہتا، ننھی بچی گھاس پر ادھر اُدھر کدکتی پھرتی اور اس کے ماں باپ گھنے درختوں کے سائے میں بیٹھے بیٹھے گاؤں بھر کی پرانی کرسیاں بُن ڈالتے۔ اس خانہ بدوش کنبے میں باتیں بہت کم

ہوتی تھیں ۔ دوہی چار لفظوں میں یہ فیصلہ کرنے کے بعد کہ کون گاؤں میں پھر کر "کرسیاں بنوالو" کی بار بار دہرائی ہوئی صدا لگائے وہ ایک دوسرے کے روبرو یا دوش بہ دوش بیٹھ کر بید چھیلنے لگتے ۔ جب بچی کھیلتے کھیلتے بہت دور نکل جاتی یا گاؤں کے کسی بچے لڑکے سے واقفیت پیدا کرنے لگتی تو اسے اپنے باپ کی تند آواز سنائی دیتی "واپس آتی ہے یا نہیں ؟ نامراد ! مہربانی کے صرف یہی لفظ اُس کے کانوں میں پڑے تھے ۔

"جب وہ ذرا بڑی ہوئی تو ماں باپ اسے بھی ٹوٹی ہوئی کرسیاں جمع کرنے کے لئے بھیجنے لگے ۔ ان دنوں اسے گاؤں کے لڑکوں سے تھوڑی بہت شناسائی پیدا کرنے کا موقع ملتا لیکن اب اس کے نئے دوستوں کے والدین اپنی اولاد کو سختی سے واپس بلا لیتے : "ٹھہر تو سہی آوارہ گرد ! انہیں چنڈالوں سے باتیں کرنے کا مزا چکھائیں !" بعض اوقات چھوٹے بچے اس پر پتھر پھینکتے ، اور عورتیں رحم کھا کر اسے تانبے کے کچھ سکّے دے دیتیں جنہیں یہ بہ احتیاط اپنے پاس جمع رکھتی ۔

"گیارہ برس کی عمر میں ایک مرتبہ جب وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ یہیں اتری ہوئی تھی ، اُس نے قبرستان کے پیچھے ننھے شو کے کو روتے ہوئے پایا کسی ہمجولی نے اُس کی دو ادھیاں چرالی تھیں ۔ ایک امیر آدمی کے بیٹے کو روتے ہوئے دیکھ کر جن کے متعلق اس کے فرومایہ دماغ کا تصور یہ تھا کہ وہ ہمیشہ مطمئن اور خوش رہتے ہیں ، وہ ہکا بکا سی رہ گئی ۔ قریب جا کر اُس نے لڑکے سے رونے کا سبب دریافت کیا اور اپنی تمام جمع کی ہوئی پونجی ، سات ادھیاں اُس کے ہاتھ پر رکھ دیں ۔ لڑکا پیسے لے کر خوش ہوگیا اور اس نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے ۔ اس پر لڑکی کی والہانہ مسرت نے اُس کی جرأت بڑھا دی اور اُس نے آگے بڑھ کر لڑکے کا منہ چوم لیا ۔ بچہ اپنے حاصل کئے ہوئے سکّوں کے خیال میں کچھ کھویا سا گیا تھا ۔ اس لئے وہ مزاحم نہ ہُوا ، اور لڑکی نے جب دیکھا کہ نہ وہ پٹی ہے اور نہ دھتکاری گئی ہے تو اس نے لڑکے کے گلے میں باہیں ڈال لیں ، دل کھول کر اس کا منہ چوما اور پھر بھاگ گئی ۔

"چھوکری کے دل پر معلوم نہیں کیا اثر ہُوا ۔ خدا جانے وہ کیوں اس لڑکے کو چاہنے لگی ؟ شاید اس لئے کہ اُس نے اس پر اپنی تمام مفلسانہ دولت نثار کر دی تھی یا شاید اس لئے کہ اُس نے اسی کو اپنی محبت کا پہلا بوسہ دیا تھا ۔ بہرحال خدا جانے کیوں ؟ یہ چیتیاں بچپن سے لے کر بڑھاپے تک یونہی قائم رہتی ہے ۔ مہینوں وہ قبرستان کے اُس گوشے اور اس لڑکے کے خواب دیکھتی رہی ۔ اُس سے دوبارہ ملنے کی امید پر وہ اس کے لئے اپنے ماں باپ سے چوری چوری سکّے جمع کرنے لگی ۔ کچھ کرسیوں کی بُنائی میں سے رکھ لیتی اور کچھ سودے سلف کی قیمت میں سے دبا لیتی ۔ چنانچہ دوسری مرتبہ واپسی پر اس کی جیب میں دو فرانک تھے لیکن افسوس کہ لڑکے سے ملنا آسان نہ تھا ۔ اسے ننھے دوا فروش کی بمشکل ایک جھلک نظر آئی ۔ وہ اپنے باپ کی دکان کی کھڑکیوں میں سے ایک قرمزی مرتبان کے قریب جس میں مختلف قسم کے کیچوے بھرے ہوئے تھے کھڑا نظر آیا ۔ اس صاف ستھری فضا میں لڑکے

کو اُجلے لباس میں ملبوس دیکھ کر غریب لڑکی کے دل میں نفاست کا ایک عجیب احساس پیدا ہوا۔ رنگین پانی اور چمکتے ہوئے بلّور کو دیکھ کر وہ مسحور اور از خود رفتہ ہوگئی اور لڑکے کو اور زیادہ چاہنے لگی۔

"اس لڑکے کی یاد کا ایک امٹ نقش اس کے دل پر بیٹھ گیا چنانچہ جب وہ دوسرے سال لوٹی تو وہ اُسے کتب میں اپنے ہمجولیوں کے ساتھ کھیلتا ہوا نظر پڑا۔ بے اختیار اس سے لپٹ گئی اور اتنے جوش سے اس کا منہ چومنے لگی کہ وہ خوف سے چلانے لگا۔ اس کو خاموش کرنے کے لئے لڑکی نے اپنا اندوختہ جو تین فرانک سے کچھ زائد تھا اُسے دے دیا اور لڑکا اس بیش قرار رقم کو حریصانہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ روپیہ لینے کے بعد اس نے کسی قسم کی مزاحمت نہ کی اور لڑکی کو جی بھر کر پیار کر لینے دیا۔

"مزید چار سال کی مدت تک وہ اپنا تمام اندوختہ اُسے نذر کرتی رہی اور وہ دانستہ بہت بہت سے بوسوں کے عوض اسے قبول کرتا رہا۔ ایک دفعہ تیس آدھیاں تھیں اور ایک دفعہ دو فرانک اور ایک دفعہ بارہ آدھیاں (وہ ہراس، افسوس اور خفت کے احساس سے رو پڑی لیکن یہ سال ہی بُرا تھا) آخری مرتبہ پانچ فرانک تھے ـــــ ایک بہت بڑا گول سکّہ جسے دیکھ کر لڑکے کا چہرہ مسرت سے چمک اٹھا۔

"وہ اس لڑکی کی دلچسپیوں کا تنہا مرکز بن چکا تھا اور وہ خود بھی کسی قدر بے صبری سے لڑکی کا انتظار کیا کرتا تھا اور جب اسے دیکھتا تو دوڑتا ہوا اس سے ملنے کے لئے آگے بڑھتا۔ یہ دیکھ کر ننھی بچی کا دل خوشی سے بلّیوں اچھلنے لگتا۔

"ایک دفعہ جب وہ اس گاؤں میں آئی تو لڑکے کو یہاں نہ پا کر بہت پریشان ہوئی لیکن اس نے جلد ہی ادھر ادھر سے باتوں باتوں میں معلوم کر لیا کہ شو کے سکول بھیج دیا گیا ہے۔ آخر طرح طرح کے حیلوں بہانوں سے اس نے اپنے ماں باپ کا کاروباری راستہ بدلنے کی کوشش شروع کی اور انہیں فرصت کے دنوں میں لڑکے ہی کے شہر میں ٹھہرانے کی طرح ڈالنی چاہی۔ خدا خدا کر کے وہ اس میں کامیاب تو ہوئی لیکن سال بھر کی مدت اِس ادھیڑ بن ہی میں گزر گئی۔

"اب لڑکی کو اُس سے ملے ہوئے دو سال ہونے کو آئے تھے۔ اس اثنا میں وہ بالکل بدل چکا تھا۔ بلند و بالا، خوبصورت اور پھر چمکتے بٹنوں والا کوٹ پہنے ہوئے وہ بہت بارعب معلوم ہوتا تھا۔ لڑکی کو اُسے پہچاننے میں بھی دقّت ہوئی اور لڑکا یوں ظاہر کر کے گویا اِسے دیکھا ہی نہیں، پرغرور انداز میں پاس سے گزر گیا۔ اُس کا یہ طرزِ عمل دیکھ کر وہ دو دن روتی رہی اور اِس کے بعد ایک مستقل عذاب میں گرفتار ہوگئی۔

"ہر سال وہ واپس آتی اور اُس کے پاس سے صاحب سلامت تک کی جرأت کئے بغیر گزر جاتی۔ اُدھر وہ اس پر نظر تک ڈالنے کا روادار نہ ہوتا لیکن لڑکی کی محبت جنون کی حد کو پہنچ چکی تھی۔

"وہ کہتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کسی دوسرے شخص پر آنکھ تک ڈالنا میرے لئے ممکن نہ تھا۔ سچ یہ ہے کہ میری نظروں کے لئے اور کوئی

آدمی موجود تھا ہی نہیں۔

"ماں باپ کے مرنے کے بعد اُس نے کرسیاں بُننے کا کام جاری رکھا اور ایک کے بجائے دو خوفناک کتے پال لئے جن کا سامنا کرنے کی کسی کو ہمت نہ پڑتی۔

"ایک دن جب وہ اس گاؤں میں جو اُس کی محبت کا مرکز تھا واپس آئی تو اُس نے اپنے محبوب کو ایک عورت کے بازو میں بازو ڈالے دواخانے سے نکلتے دیکھا۔ یہ اُس کی بیوی تھی۔ اس کی شادی ہو چکی تھی۔ اُسی شام غریب لڑکی ٹاؤن ہال کے تالاب میں کود پڑی لیکن کچھ دیر کے بعد ایک شرابی اُدھر سے گزرا تو اسے نکال کر دوا فروش کی دکان پر لے گیا۔ دوا فروش کا لڑکا ڈریسنگ گاؤن پہنے اس کے علاج کے لئے نیچے اترا لیکن اپنے چہرے سے شناخت کے آثار ظاہر نہ ہونے دیئے۔ پھر اس کے کپڑے اتار کر مالش کی اور درشت لہجے میں کہا "تم دیوانی ہو۔ تمہیں یہ بیوقوفی نہیں کرنی چاہیئے" لڑکی کی شفایابی کے لئے یہی الفاظ کافی تھے۔ اس ہمکلامی کی خوشی سے وہ ایک عرصے تک مطمئن رہی۔ اُس نے نہایت آرزومندی سے معالجہ کی فیس ادا کرنی چاہی لیکن شوکے نے قبول نہ کی۔

"اسی طرح اس کی زندگی گزری۔ بیچاری کرسیاں بُنتی اور شوکے کے خواب دیکھتی رہتی۔ ہر سال یہ اُسے دکان کی کھڑکیوں میں سے دیکھنے کے لئے آیا کرتی۔ رفتہ رفتہ اس نے دواخانے سے چھوٹی چھوٹی دوائیں بھی خریدنی شروع کر دیں۔ اس بہانے سے یہ اُس کے نزدیک بھی جا سکتی تھی، اُس سے بات بھی کر سکتی تھی اور اُسے مزید روپیہ بھی دے سکتی تھی۔

"یہ تو میں ابھی بتا چکا ہوں کہ وہ اسی سال موسم بہار میں مر گئی۔

"اپنی دردناک کہانی سنانے کے بعد اُس نے مجھ سے التجا کی کہ میری عمر بھر کا اندوختہ اُس شخص کو پہنچا دیا جائے جس سے میں نے اس استقلال سے محبت کی ہے، کہنے لگی "میں اب تک دنیا میں محض اُسی کے لئے کام کرتی رہی ہوں۔ پیٹ پر پتھر باندھ کر بھی میں اُس کے لئے روپیہ جمع کرتی تھی تاکہ مجھے یقین ہو سکے کہ مرنے کے بعد کم از کم ایک دفعہ ضرور میرا خیال اس کے دل میں آئے گا۔ یہ کہہ کر اُس نے دو ہزار تین سو ستائیس فرانک میرے حوالے کئے۔ اس کا دم نکلنے پر میں نے ستائیس فرانک تو جنازے کے مصارف کے لئے پادری صاحب کو دے دیئے اور باقی ساتھ لے کر چلا آیا۔

"دوسرے دن میں شوکے کے گھر پہنچا۔ یہ موٹے تازے، سرخ و سفید، مطمئن اور بھاری بھر کم لوگ میز کے گرد ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے دوپہر کا کھانا ختم کر رہے تھے۔ چاروں طرف دواؤں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ انہوں نے میری آؤ بھگت کی اور مجھے بٹھایا۔ اس کے بعد میں نے درد بھرے لہجے میں اپنی داستان سنانی شروع کی۔ مجھے پوری توقع تھی کہ وہ اسے سن کر رونے لگیں گے۔

"لیکن جونہی شوکے کو معلوم ہوا کہ اُس سے یہ آوارہ حال، یہ کرسیاں بُننے والی، یہ رہگذر کی مشتِ خاک محبت کرتی رہی ہے تو جھلائی ہوئی بلی کی طرح فرطِ غضب سے اُس کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ گویا غریب عورت نے اُس کے وقار، اس کے نام نیک

اور مہذب لوگوں کی نگاہوں میں اس کی حیثیتِ عرفی پر چھاپا مار کر اس کے نازک مقدس اور جان سے عزیز تر احساسات کو سخت صدمہ پہنچایا ہے۔ اُدھر بیگم شو کے اپنے تیسے میں آپ ہی مری جاتی تھی۔ رہ رہ کر یہ الفاظ اس کی زبان سے نکلتے "توبہ! یہ فقیرنی! یہ کنگلی! توبہ!" شو کے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور میز کے پرے اُس نے اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر ایک تانا بانا لگا رکھا تھا۔ ٹوپی سر پر ایک طرف ترچھی پڑی تھی اور منہ سے بات تک نہ نکلتی تھی۔ آخر منہ ہی منہ میں بصد دقت بڑبڑایا "دیکھا ڈاکٹر صاحب آپ نے! انسان پر بھی اس زندگی میں کیسی کیسی خوفناک افتاد پڑ سکتی ہے۔ آدمی کرے تو کیا کرے؟ کاش مجھے اُس کی زندگی میں یہ بات معلوم ہو جاتی تو میں پولیس سے کہہ کر اسے گرفتار کرا دیتا اور خدا کی قسم وہ عمر بھر بڑے گھر کی ہوا کھاتی رہتی۔

"میں اپنے مخلصانہ اقدام کا ایسا نتیجہ دیکھ کر بھونچکا سا رہ گیا۔ میں حیران تھا کیا کہوں، کیا کروں لیکن مجھے اپنا فرض ادا کرنا تھا۔ اس لئے میں اپنی داستان کہے گیا: "اُس نے مجھے ہدایت کی تھی کہ اُس کا تمام اندوختہ جو دو ہزار تین سو فرانک کی رقم کے مساوی ہے آپ کو پہنچا دوں لیکن چونکہ میری کہی ہوئی باتیں آپ کو بے حد ناگوار گزری ہیں اس لئے شاید اس رقم کا بہترین مصرف یہ ہو کہ غریبوں میں تقسیم کر دی جائے" میاں بیوی دونوں حیرت کے پتلے بن کر میری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے جیب سے رقم نکالی۔ یہ ہر ملک اور ہر ٹکسال کے طلائی اور نحاسی سکوں کا ایک فقیرانہ مجموعہ تھا۔ میں نے دریافت کیا "آپ کا فیصلہ کیا ہے"؟

پہلے بیگم شو کے کے نطق کو جنبش ہوئی: "خیر! چونکہ یہ اس عورت کی آخری خواہش تھی۔۔۔ میں سمجھتی ہوں ہمارے لئے اس کی تعمیل سے انکار کرنا دشوار ہوگا" شوہر کسی قدر کھسیانا ہو کر بولا "ہم اس رقم سے وقتاً فوقتاً بچوں کے لئے کوئی چیز خرید سکتے ہیں۔"

"میں نے روکھا سا منہ بنا کر کہا "جیسی آپ کی مرضی" وہ پھر بولا "اچھا خیر! چونکہ اس نے آپ سے کہا تھا۔ اس لئے یہ رقم ہمیں دے دیجئے۔ ہم جب چاہیں اس کا کوئی نہ کوئی مناسب مصرف تجویز کر سکتے ہیں"۔

"میں نے روپیہ اُن کے حوالے کیا اور خدا حافظ کہہ کر چلا آیا۔

"دوسرے دن علی الصباح شو کے مجھے ڈھونڈتا ہوا آیا اور نہایت اکھڑپن سے کہنے لگا "اُس عورت کی گاڑی یہاں پڑی ہے۔ اسے آپ کیا کریں گے"۔

"میں نے کہا "کچھ بھی نہیں۔ آپ چاہیں تو لے جا سکتے ہیں" کہنے لگا "مت خوب! بہت خوب! یہی میں چاہتا تھا۔ میں اس سے اپنی ترکاری کی کھیتی پر سائبان ڈالوں گا"

"میں نے اسے جاتے جاتے آواز دے کر واپس بلایا اور کہا "اُس کا بوڑھا ٹٹو اور دو کتے باقی ہیں۔ شاید آپ کو ان کی بھی ضرورت ہو"؟

"وہ کچھ ٹھٹک کر رہ گیا اور بولا "نہیں نہیں۔ میں اُن کو کیا کروں گا۔ آپ جس طرح چاہیں اُن کے متعلق فیصلہ کر لیجئے"۔

"پھر اس نے ہنستے ہوئے اپنا ہاتھ بڑھا کر مجھ سے مصافحہ کیا۔ آپ جانئے ایک ہی علاقے کے ڈاکٹر اور دوا فروش میں زیادہ ان بن رہنا ممکن نہیں۔

"کتے میں نے رکھ لئے اور پادری صاحب جن کے گرجے کے ساتھ وسیع رقبہ ملحق ہے گھوڑا لے گئے۔ شو کے نے گاڑی کی لکڑی سے اپنی کھیتی پر سایہ کیا اور روپے سے ریلوے کمپنی کے پانچ تمسک خرید لئے۔

"میں نے اپنی زندگی میں سچی محبت کی یہی ایک مثال دیکھی ہے"۔

اس کے بعد ڈاکٹر خاموش ہو گیا

مارکوئس کی بیگم نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ کہا "آہ سچ ہے۔ محبت کرنا عورت ذات ہی کا حصہ ہے"!

مَاپَساں

(ترجمہ از حامد علی خاں)

شکوۂ دل

عام کس کس پہ بھلا آپ کا احسان نہیں؟ — موردِ لطف ملائک نہیں؟ انسان نہیں؟
چشمۂ فیض سے شاداب گلستان نہیں؟ — کھیتیاں تر نہیں؟ سرسبز بیابان نہیں؟

التجاؤں پہ مری حکم ہے امکان نہیں،
ایک مشکل یہی مشکل ہے کہ آسان نہیں

جس جگہ چاہیں وہیں عیش کا ساماں کر دیں — وادیٔ ودشت کو گلزار بہ داماں کر دیں
کوہساروں سے عیاں رنگ بہاراں کر دیں — پتہ پتہ کو جو دیں آب گلستاں کر دیں

التجاؤں پہ مری حکم ہے امکان نہیں
ایک مشکل یہی مشکل ہے کہ آسان نہیں

حکم سے آپ کے مربوط نظامِ خاور — منسلک رشتۂ باہم میں جہانِ اختر
دورِ آفاق میں گرداں ورقِ شام و سحر — جلوہ زا دہر میں نیرنگیٔ چرخِ اخضر

التجاؤں پہ مری حکم ہے امکان نہیں
ایک مشکل یہی مشکل ہے کہ آسان نہیں

بھاپ بن بن کے اڑے بحر سے جب فرمادیں — اودی اودی سی گھٹاؤں سے فضا کو چھا دیں
لہلہاتے ہوئے کھیتوں پہ انہیں برسا دیں — یعنی بچھڑے ہوئے پانی کو وطن پہنچا دیں

التجاؤں پہ مری حکم ہے امکان نہیں
ایک مشکل یہی مشکل ہے کہ آسان نہیں

خشک دانہ کو کریں سبز زمیں کے اندر — پردۂ خاک سے کونپل کو نکالیں باہر
ننھی کونپل سے بنا دیں اسے ذی شان شجر — اس میں پھر پھول لگیں پھول سے بن جائیں ثمر

التجاؤں پہ مری حکم ہے امکان نہیں
ایک مشکل یہی مشکل ہے کہ آسان نہیں

عبدالوحید خاں غازی

میں کہاں کہاں رہتا ہوں؟

تخیل ہوں، پرافشاں میں ہوا کے ساتھ رہتا ہوں
چمن میں سُو بہ سُو بادِ صبا کے ساتھ رہتا ہوں

کبھی رقصاں نظر آتا ہوں صحرا کے بگولوں میں
کبھی پرّاں شمیمِ جانفزا کے ساتھ رہتا ہوں

کبھی ظلمات کی آوارگی منظور ہے مجھ کو،
کبھی چاند اور سورج کی ضیا کے ساتھ رہتا ہوں

کبھی تحت الثریٰ کی پستیوں میں سر پٹکتا ہوں
کبھی رفعت پہ میں ربِ اعلیٰ کے ساتھ رہتا ہوں

قدم اپنے جو مہر و ماہ پر رکھتے ہیں چلنے میں
تصوّر ہی میں اُن کے نقشِ پا کے ساتھ رہتا ہوں

کبھی سرگشتہ ہوں میں سرحدِ ادراک سے آگے
رسائی سے گریزاں منتہا کے ساتھ رہتا ہوں

زمین و آسماں جب ڈھونڈتے ہیں اپنے خالق کو
میں اُن کی بے بسی کی انتہا کے ساتھ رہتا ہوں

بیابانِ عدم بھی ایک جولاں گاہ ہے میری
فنا سے دُو بدُو ہو کر بقا کے ساتھ رہتا ہوں

امانت ہوں خدائے پاک کی میں قلبِ شاعر میں
اور اُس کی رُوح میں مہر و وفا کے ساتھ رہتا ہوں

ازل سے تا ابد پھیلا ہے میداں میری ہمّت کا
قدم انداز پائے نارسا کے ساتھ رہتا ہوں

ح ر ب

محفلِ ادب

دو بھیک ہمیں یارانِ وطن

(از جناب پنڈت آنند نرائن صاحب مُلّا ایم اے ایل ایل - بی)

(۱۵ فروری کو خاتونانِ لکھنؤ نے مسز آنند نرائن ملا کے زیرِ اہتمام مصیبت زدگانِ بہار کی امداد میں ایک ورائٹی شو دکھایا تھا اور پنڈت آنند نرائن ملا صاحب نے اس کے لئے ایک خاص ڈرامیٹک نظم لکھی تھی جو ذیل میں ہدیۂ ناظرین ہے :-)

(سین شہر کی ایک سڑک، مصیبت زدہ بہاری فقیرانہ لباس پہنے ہوئے آتا ہے)

مصیبت زدہ بہاری :- دو راہِ خدا میں بھیک مجھ کو، یارانِ وطن، یارانِ وطن
امداد کرو یارانِ وطن، ایثار کرو شایانِ وطن

شہری عورت (ایک مکان سے نکلتی ہے) پورب کے مسافر کچھ تو بتا، کیا تجھ پہ مصیبت آئی ہے؟
ٹوٹی تجھ پر کون بلا، جو ایسی شکل بنائی ہے؟
تیرے ہمدرد و احباب کہاں ہیں، تیرے دوست عزیز کہاں

بہاری :- سب خاک کے تودوں میں ہیں نہاں، سب خاک کے تودوں میں ہیں نہاں
اب اُن کے خون کی گل کاری سے رنگیں ہے دامانِ وطن
دو بھیک مجھے یارانِ وطن، دو بھیک مجھے یارانِ وطن

عورت :- تیرے کھیتوں میں غلہ ہے، باغوں میں ڈالی پھلتی ہے؟
مینھ برساتی ہے کالی گھٹا، چمکیلی دھوپ نکلتی ہے؟
آیا ہے جہاں سے تو اُس جا کچھ خلقِ خدا بھی بستی ہے؟

بہاری :- اب مٹی زہر اُگلتی ہے، اب اُس جا آگ برستی ہے،
اِک وقت میں تھا گلزارِ وطن، اب ہے دشتِ ویرانِ وطن
دو بھیک مجھے یارانِ وطن، دو بھیک مجھے یارانِ وطن

عورت :- تیرے شہروں میں کیسے کیسے پہلے جلسے ہوتے تھے،

ارمان بھرے دل کن کن اُمیدوں کی گود میں سوتے تھے
ہنس ہنس کر باتیں کرتے تھے آیندہ کی بیخوف و خطر

بھاری:- اب نالے ہیں دنیائے سخن، اب آنسو ہیں دنیائے نظر
بے گور و کفن ہر گھر کے کھنڈر میں ہے نعشِ عریانِ وطن
دو بھیک مجھے یارانِ وطن، دو بھیک مجھے یارانِ وطن

عورت:- سڑکوں کے کنارے پیسہ والوں کے گھر تھے اونچے اونچے
رہتے تھے جہاں آرام سے وہ اُن کے ساتھی بیوی بچے
ہوتی ہے بسر کیسے اُن کی! سوتے ہیں کہاں رہتے ہیں کہاں

بھاری:- چھوٹے سے خیمے کی وقعت محلوں سے سوا ہے آج وہاں
بستر ان کا اب خاکِ وطن، گھر اُن کے ہیں میدانِ وطن
دو بھیک مجھے یارانِ وطن، دو بھیک مجھے یارانِ وطن

عورت:- نادار ہوئے ہیں یوں، پیسہ یا جنس کچھ اُن کے پاس نہیں
دن رات کی محنت کرنے پر بھی ملنے کی کچھ آس نہیں
کرتے ہیں گزر کیسے اپنی! کیا کھاتے ہیں کیا پیتے ہیں

بھاری:- کھانے پینے کا ذکر ہی کیا دن کاٹتے ہیں اور جیتے ہیں
کیچڑ ہے بجائے آبِ وطن، پتھر ہے بجائے نانِ وطن
دو بھیک مجھے یارانِ وطن، دو بھیک مجھے یارانِ وطن

عورت:- بھونچال آتے تھے پہلے بھی آئی یہ نئی آفت کیسی
آناً فاناً ہی جس نے اینٹ سے اینٹ بجا دی شہروں کی
کیا اپنی جان بچانے کی بھی کر نہ سکے تدبیر کوئی

بھاری:- ماؤں کو ننھے بچوں تک کے لینے کی فرصت نہ ملی
جو سوتے تھے سوتے ہی رہے سینوں میں لئے ارمانِ وطن
دو بھیک مجھے یارانِ وطن، دو بھیک مجھے یارانِ وطن

عورت:- محتاج تھے ہم، مظلوم تھے ہم، مغرور نہ تھے غدار نہ تھے
ہم صحنِ گلستاں میں اپنے حصہ تک پر مختار نہ تھے
یوں ہی کیا کم مجبور تھے ہم، نازل جو ہوا یہ قہرِ خدا

بہاری:- ہم نے تو چمن بندِ عالم کو اکثر یہ کرتے دیکھا
پھولوں کے لئے غیروں کے چمن، کانٹوں کے لئے دامانِ وطن
دو بھیک مجھے یارانِ وطن، دو بھیک مجھے یارانِ وطن

عورت:- کیا تجھ سے کہوں تیرا قصہ سن کر کیا جی کا حال ہوا
لے یہ رکھ کر دو پیسے دیتی ہے افسوس زیادہ میرے پاس نہ اس دم مال ہوا
کیا اور مدد دوں اس کے سوا مظلوم مسافر مجھ کو بتا

بہاری:- آ میرے ساتھ بھکارن بنکر ہر در پہ آواز لگا،
دیکھیں حس ہوتی ہے کہ نہیں کس خون کے ہیں یارانِ وطن
دو بھیک مجھے یارانِ وطن، دو بھیک مجھے یارانِ وطن

(دونوں آگے بڑھ کر اور ساتھ ساتھ کہتے ہیں)

بہاری اور عورت

دو راہِ خدا میں کچھ ہم کو یارانِ وطن، یارانِ وطن،
امداد کرو یارانِ وطن، ایثار کرو شایانِ وطن
قیدی کیا زور لگائے گا۔ اس کو مضبوط تو ہونے دو
پہلے اس کی بیڑی کاٹو، پھر ٹوٹے گا زندانِ وطن

دو بھیک ہمیں یارانِ وطن!
دو بھیک ہمیں یارانِ وطن!!

"زمانہ"

بیمے کی ترقیاں

اگلے دن ایک شخص میری زندگی کا بیمہ کرنے کے خیال سے میرے پاس آیا۔ ادھر میرا یہ حال ہے۔ کہ مجھے بیمہ ایجنٹوں سے نفرت ہے۔ وہ ہمیشہ یہ دلیل پیش کرتے ہیں۔ کہ اگر آپ کا انتقال ہو جائے تو اس سے آپ کے بال بچوں کو بڑی مدد مل سکتی ہے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ میں نے بیسیوں ہی بیمے کرائے ہوں گے۔ لیکن ابھی تک مجھے مرنے کا اتفاق نہیں ہوا۔

چنانچہ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اس شخص کو اسی کے پھندے میں پھنساؤں گا۔ چنانچہ میں بالکل خاموش رہا۔ تاکہ اس کی گفتگو کا سلسلہ جاری رہے۔ یہاں تک کہ وہ میرے پاس ایک ورق چھوڑ گیا جس پر کچھ سوالات چھپے ہوئے تھے اور جن کا مجھے بحیثیت درخواست کنندہ جواب دینا تھا۔ اسی کا میں انتظار کر رہا تھا۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ اگر یہ کمپنی میرے حالات معلوم کرنا چاہتی ہے۔ تو اسے ضرور معلوم ہونے چاہئیں۔ چنانچہ میں نے سوالات والا ورق اپنے سامنے پھیلا لیا۔ اور ایسے جوابات وضع کئے جن سے مجھے امید تھی کہ میری زندگی کا بیمہ کرنے کے متعلق جتنے شکوک ان کے دل میں ہیں سب رفع ہو جائیں گے۔

سوال۔ آپ کی عمر کیا ہے۔؟ **جواب**۔ مجھے اچھی طرح معلوم نہیں۔ **سوال**۔ آپ کی چھاتی کا ناپ کیا ہے؟ **جواب** اُنیس اِنچ۔ **سوال**۔ چھاتی کس قدر پھیلتی ہے؟ **جواب**۔ آدھا اِنچ۔ **سوال**۔ آپ کا قد کتنا ہے؟ **جواب**۔ چھ فٹ پانچ انچ لیکن جب میں چلنے میں ہاتھوں سے بھی مدد لیتا ہوں، تو کچھ کم ہوتا ہے۔ **سوال**۔ کیا آپ کے دادا کا انتقال ہو چکا ہے؟ **جواب** عملی طور پر۔ **سوال**۔ اگر انتقال ہو چکا ہے تو موت کا باعث کیا تھا؟ **جواب**۔ اگر انتقال ہو چکا ہے۔ تو مخبوط الحواسی **سوال** کیا آپ کے والد کا انتقال ہو چکا ہے؟ **جواب**۔ ہاں دنیا کے لئے وہ مر چکے ہیں۔ **سوال**۔ موت کا باعث؟ **جواب**۔ ہلکان۔ **سوال**۔ آپ کے والد کہاں رہتے ہیں؟ **جواب**۔ جہان آباد میں۔ **سوال**۔ آپ کبھی کسی بیماری میں مبتلا ہوئے ہیں؟ **جواب** بچپن میں مجھے سل ہو گئی تھی۔ اور کوڑھ اور نقرس۔ بڑے ہو کر کالی کھانسی، دردِ شکم اور جنون۔ **سوال**۔ کیا آپ اپنی کسی ایسی عادت یا میلانِ طبیعت سے واقف ہیں جس کی وجہ سے آپ کی عمر کے کم ہونے کا اندیشہ ہو؟ **جواب**۔ میں واقف ہوں۔ میں شراب پیتا ہوں۔ حقہ پیتا ہوں۔ ویزلین کھاتا ہوں۔ اور چرس پیتا ہوں۔ انگور کھاتے کھاتے ان کے بیج نگل جاتا ہوں اور ورزش بالکل نہیں کرتا۔

جب میں نے فہرست کو تمام کر لیا تو تین مہینے کی قسطوں کا ایک چک ساتھ ٹانک کر کمپنی کے نام بھیج دیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ لوگ کبھی میرا بیمہ منظور نہیں کریں گے اور یہ چک ضرور واپس آ جائے گا۔ لیکن چند روز کے بعد کمپنی کی طرف سے مندرجہ ذیل خط دیکھ کر میں حیران رہ گیا:-

جنابِ من۔ آپ کی درخواست اور پندرہ روپے کا چک موصول ہوا۔ شکریہ موجودہ معیارِ صحت سے نہایت اچھی طرح مقابلہ کرنے کے بعد ہم نے آپ کی صحت کو بہترین پایا ہے۔ اور آپ کی درخواست منظور کر لی گئی ہے۔

"ادبی دنیا"

مطبوعات

تاریخِ شہر لاہور (پنجابی) یہ کرنل بھولا ناتھ آئی۔ ایم۔ ایس ریٹائرڈ کی کتاب ہے جس کے متعلق ہم ایک اشاعت میں سرسری اشارات لکھ چکے ہیں۔ افسوس ہے کہ ہمیں اس سے قبل یہ کتاب پڑھنے کا موقع نہ ملا اور ہم اس رائے کا اظہار نہ کر سکے کہ یہ کتاب کسی معقول شخص کے پڑھنے کے قابل نہیں۔ کرنل صاحب روشن خیال آدمی ہیں اور سینکڑوں مسلمان معززین سے اُن کے ذاتی تعلقات ہیں۔ اس کے باوجود انہوں نے اس کتاب میں اسلام کے متعلق نہایت بیباکی سے بالکل بے اصل اور دلآزار خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ ایک تعلیم یافتہ شخص کے لئے اس قسم کی غلط گوئی کسی طرح روا نہیں سمجھی جا سکتی۔ کرنل صاحب کو اس دلآزار کتاب کے متعصبانہ حصے حذف کر دینے چاہئیں ورنہ مسلمانوں کی حکومت سے یہ درخواست بے جا نہ ہوگی کہ وہ اس کتاب کو ضبط کر لے۔

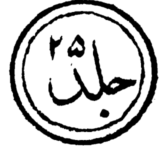
مضامینِ فرحت۔ یہ مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب کے مضامین کا حصۂ چہارم ہے۔ مرزا صاحب کو اردو ادب میں [illegible] بے نظیر شہرت حاصل ہوگئی ہے کہ اب وہ روپوش ہونے کی فکر میں ہیں۔ چنانچہ اس کتاب میں آپ نے اس ارادے کا اظہار فرمایا ہے۔ دعا ہے کہ وہ اس میں کامیاب نہ ہوں۔ اس کتاب میں کل سولہ مضامین ہیں اور ۲۸۵ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ مرزا صاحب کے اندازِ تحریر کی خوبیاں عالم آشکارا ہیں۔ ناظرین ہمایوں بارہا اُن کے مضامین سے لطف اندوز ہو چکے ہیں۔ اس لئے ہمیں اپنی طرف سے کسی اظہار رائے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی قیمت عہ/۸ مع محصولڈاک لارپورٹ مشین پریس۔ جام باغ حیدر آباد دکن سے منگوائیے۔

قانون۔ یہ قانونی رسالہ حاجی رحیم بخش صاحب وکیل کی ادارت میں لاہور سے شائع ہوا ہے۔ پہلے نمبر سے اندازہ ہوتا ہے کہ "قانون" ایک اہم ضرورت کو پورا کریگا۔ اس میں قانونی مضامین اور قانونی خبریں بہت محنت سے جمع کی گئی ہیں اور اس دلچسپ انداز سے مرتب کیا گیا ہے کہ غیر قانون داں اصحاب بھی لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ حجم ۴۶ صفحات ہے اور چندہ سے ۳ روپے سالانہ۔ دفترِ قانون۔ پیسہ اخبار بازار۔ انارکلی لاہور سے منگوائیے۔

سیر الصحابہ حصہ ہفتم۔ حجم ۲۲۵ صفحات مطبوعہ مطبعِ معارف اعظم گڑھ قیمت سے علاوہ محصول۔ پورے سٹ کا دام جس میں دس جلدیں شامل ہیں رعایتی صہ علاوہ محصولڈاک یہ مولوی شاہ معین الدین احمد ندوی رفیق دار المصنفین کی کتاب ہے جس میں ایسے ایک سو پچاس صحابہ کے حالات تحقیق و تفتیش کے بعد درج کئے گئے ہیں جنہوں نے فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کیا یا اس سے پہلے شرف بہ اسلام ہوئے لیکن ہجرت نہ کر سکے یا عہدِ رسالت میں صغیر السن تھے کتاب بہت دلچسپ اور بصیرت افروز ہے۔ کتابت طباعت اور کاغذ کے اعتبار سے بھی نہایت نفیس ہے دفترِ معارف اعظم گڑھ سے منگوائیے۔

سرشکِ اخلاص۔ یہ طویل نظم مرزا احسان احمد صاحب بی اے ایل ایل بی وکیل اعظم گڑھ نے مولانا محمد علی مرحوم کی وفات کی تقریب پر لکھی تھی اور اب مطبع معارف اعظم گڑھ نے سولہ صفحات پر کتابی صورت میں شائع کی ہے۔ نظم پر درد اور پر اثر ہے اور مولانا محمد علی مرحوم کی سیرت پر بہت خوبی سے روشنی ڈالتی ہے۔ اشعار میں روانی اور جوش ہے قیمت ۸ مطبع معارف اعظم گڑھ سے مل سکتی ہے۔

فہرستِ مضامین



"ہمایوں" بابت ماہِ مئی سنہ ۱۹۳۶ء



تصویر:- فرعون کا جنونِ عشق اور ناکام قاصد

چندہ سالانہ چھ روپے ششماہی ۳ روپے (مع محصول) فی پرچہ ۸ آنے

بزمِ ”ہمایوں“

”ہمایوں“ اپنی عمر کا تیرھواں سال گزار رہا ہے۔ اس وقت تک ہمارے معاونین نے اس خالص ادبی خدمت میں ہماری جو حوصلہ افزائی کی ہے اس کے لئے ہم اُن کے ممنون ہیں۔ ابتدا میں ہم نے رسالے کی پابندیٔ وقت اور اس کے ظاہری و معنوی محاسن کا جو معیار مقرر کیا تھا خدا کا شکر ہے کہ ہم اس کے قائم رکھنے میں کامیاب رہے ہیں۔ بلکہ اگر ہم اسے اپنے نقادوں کا حُسنِ ظن نہ سمجھیں تو ان کا یہ قول پیش کر سکتے ہیں کہ ”ہمایوں“ نے ہر شعبے میں روز بروز آگے ہی کی طرف قدم بڑھایا ہے اپنی خامیوں کے احساس کے باوجود کم از کم اتنا تو ہم بھی کہہ سکتے ہیں کہ تیرہ سال کے عرصے تک کسی رسالے کا اتنی باقاعدگی سے شائع ہونا کہ کبھی ایک دن کا توقف بھی نہ ہو اردو صحافت میں شاید پہلی مثال ہے ہمیں مسرت ہے کہ ”ہمایوں“ کا علمی و ادبی معیار ملک کے ہر گوشے میں اپنے ہزارہا مداح پیدا کر چکا ہے بلکہ اس کی ترتیبِ مضامین کا انداز اتنا مقبول ہوا ہے کہ عہدِ حاضر کے تقریباً تمام جدید رسائل اس کی تقلید ضروری سمجھتے ہیں۔ باوصف اس کے ہم خود ہنوز مطمئن نہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم اپنے نصب العین سے ابھی بہت دُور ہیں۔ ہماری تنہا کوشش ہمیں منزلِ مقصود تک نہیں پہنچا سکتی۔ اس کے لئے نہ صرف ”ہمایوں“ کے قلمی معاونین کی بیش از بیش سرگرمی کی ضرورت ہے بلکہ رسالے کی توسیعِ اشاعت بھی بحد ناگزیر ہے۔

اردو رسائل کا کچھ عرصے سے یہ دستور ہو گیا ہے کہ سال میں کئی کئی ”خاص نمبروں“ کا اعلان کرتے ہیں۔ یہ ”خاص نمبر“ غریب رسالے کے لئے بلائے جان ہو جاتا ہے کیونکہ اسے شائع کرنے کے لئے یا تو عام نمبروں کا حجم کم کر دیا جاتا ہے یا اس سے ایک ماہ قبل اور ایک ماہ بعد کا پرچہ شائع ہی نہیں ہوتا گویا تین پرچے ایک سرورق میں ملفوف ہو کر ”خاص نمبر“ بن جاتے ہیں اور خریدار بیچارہ جو سال بھر کا چندہ دے چکا ہوتا ہے ”خاص نمبر“ کی الگ قیمت ادا کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے بعض رسائل ”خاص نمبر“ کی وبا کا اس قدر شکار ہو جاتے ہیں کہ اُن کا کوئی ”عام نمبر“ بمشکل ہی نظر آتا ہے سال میں صرف تین ”خاص نمبر“ نکل کر گرمیٔ بازار کا سامان بن جاتے ہیں۔

”خاص نمبروں“ سے خریداروں کو جو شکایت ہو گی اسے تو وہ جانیں۔ یہ ان کا کام ہے لیکن ایک شکایت اردو کے بہی خواہ ہونے کی حیثیت سے ہمیں بھی ہے۔ وہ یہ کہ ان میں ادب کا کوئی معیار پیشِ نظر نہیں رکھا جاتا اور عموماً ناکارہ مضامین کا ایک انبار زریب سرورق میں لپیٹ کر ہدیۂ ناظرین کر دیا جاتا ہے۔ اس طریقِ کار نے ایک اور ستم ڈھایا ہے یعنی حشرات الارض کی طرح اتنے ادیب پیدا کر دیئے ہیں کہ اب ادب اور ”بے ادبی“ میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہا۔

سب فرق مٹ چکا ہے حلال و حرام کا

معلوم نہیں اسے زبان کی خدمت کہیئے یا بیخ کنی؟ مدیروں کی ادب نوازی سیکڑوں بے مایہ ادیب پیدا کر رہی ہے ایک طرف مخالف قوتیں اردو کو مٹانے کی کوشش میں مصروف ہیں اور دوسری طرف یہ ”موافق“ قوتیں اپنے طور پر اس کی رسوائی کا سامان بہم پہنچا رہی ہیں جب مخالفینِ اردو ہمارے رسائل میں بے معنی، بے مقصد اور بے مغز سفیہانہ مضامین دیکھتے ہونگے تو یہ زبان کس قدر بدنام ہوتی ہو گی۔

ہم چاہتے ہیں کہ انگریزی جاننے والے شعرا انگریزی کی مختصر ”افسانوی“ نظموں کے منظوم تراجم ”ہمایوں“ کے لئے بھیجیں۔ تراجم دلکش اور واضح ہونے چاہئیں۔ ممکن ہوا تو یہ نظمیں ”ہمایوں“ کے اُس حصے کے کام آ سکیں جو منتخب افسانوں کے لئے مخصوص کیا گیا ہے۔

جہاں نما

شادی کے نقائص

(ایک یورپین کنواری کا نقطۂ نظر)

شادی میں ایک بہت بڑا نقص ہے جس سے ہر شخص واقف ہے کم از کم ہر متاہل جوڑا میری مراد وحدتِ زوج یعنی صرف ایک مرد یا ایک عورت سے شادی کرنے کے نقص سے ہے۔

بات یہ ہے کہ شوہر میں بہت سے اوصاف کی تلاش ہوتی ہے اور یہ سب اوصاف بجائے خود بہت ضروری ہوتے ہیں لیکن ان سب کا ایک ہی فرد میں جمع ہوجانا محال ہے۔ ہر لڑکی جب اپنے آئندہ شوہر کا تصور کرتی ہے تو اپنی واقفیت میں ہر مرد کے بہترین اوصاف لے کر ایک فرد میں جمع کر لیتی ہے اور کہتی ہے کہ جب یہ مثالی فرد مجھے حقیقی زندگی میں مل گیا تو میں اس سے شادی کروں گی لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُسے اس قسم کا شخص کبھی نہیں ملتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر وہ اتنی احمق نہ ہو کہ کنواری ہی مرنے کا فیصلہ کرلے تو وہ کسی ایسے چند نے جس میں ضروری اوصاف میں سے صرف چند موجود ہوتے ہیں شادی کر لیتی ہے اور باقی عمر اس حسرت میں گزار دیتی ہے کہ کاش میں نے کسی اور سے شادی کی ہوتی۔

یہ صورت بلاشبہ افسوسناک ہے لیکن ایک ایسی تہذیب میں جو وحدتِ زوج کو نیکی قرار دے اس سے کوئی مفر بھی نہیں ہیں تو چاہتی ہوں شادی کے موجودہ نظام کو کالعدم قرار دیا جائے اور اس کے بجائے تعدّدِ ازدواج کی رسم جاری کی جائے۔ میں اس نئی تحریک کی رہنما بننے کو تیار ہوں۔ اس طرح میں ایک گلی سڑی کنواری کے بجائے (جو میں اب ہوں) ایک کامیاب بیاہی ہوئی عورت بن جاؤنگی۔ میں کنواری کیوں رہی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ میں اُن چار آدمیوں میں سے ہر ایک کے کسی نہ کسی حصے سے شادی کرنا چاہتی ہوں جنہوں نے مجھے اپنے دل وجان کا ہدیہ پیش کیا ہے۔ یہ بھی ممکن نہیں کہ ان میں سے کسی ایک کے ساتھ میں اس کی موجودہ حالت میں شادی کرسکوں۔

اب ہنری کو لو وہ ایک پیدائشی شوہر اور باپ ہے۔ کیسا شریف ہے کیسا قابلِ اعتماد ہے کیسا وجیہہ ہے۔ اگر میری اس سے شادی ہوجاتی تو مجھے یقین ہے کہ ہر مشکل میں میری وہ مدد کرتا۔ بلکہ ممکن ہے کہ وہ کوئی مشکل پیدا ہونے ہی نہ دیتا لیکن کیا ایسی یکساں زندگی آخر مجھے اکتا نہ دیتی؟

دل بہلانے کے لئے اس وقت مجھے پیارے پانگو کی ضرورت محسوس ہوتی۔ وہ کیسا خوش طبع مسخرا اور ابیفکرا آدمی ہے جب باتیں کرنے کو جی چاہے تو اس سے بہتر رفیق نہیں مل سکتا لیکن جب آدمی خاموش رہنا چاہے تو اس کی صحبت بہت صبر آزما ہو جاتی ہے میں کہ وقت پانگو کے ساتھ رہنا نہیں برداشت کرسکتی اگرچہ اکثر اوقات بجز اس کے کسی اور کی صحبت گوارا بھی نہیں ہوتی اور پھر وقت یہ ہے۔ کہ ہنری یا پانگو دونوں میں سے کسی کے پاس بھی روپیہ نہیں۔ ہنری اگرچہ خاصی رقم کما لیتا ہے لیکن روپیہ خرچ کرنے میں وہ بہت محتاط ہے اور ہر مہینے ضرور کسی قدر رقم پس انداز کرنا چاہتا ہے۔ وہ پانگو کی طرح عمدہ اور نفیس چیزوں پر روپیہ

خرچ کرنا اسراف سمجھتا ہے لیکن پانگو کے پاس خرچ کرنے کے لئے روپیہ ہی نہیں ہوتا۔ وہ کبھی کوئی کام مستقل طور پر نہیں کرتا اور اس کی نفاست پسند اور سخی طبیعت اس شخص کے لئے جو اس کے جمع خرچ کی نگرانی کرتا ہو، بہت کڑے امتحان کا موجب ہو سکتی ہے۔

ایسے موقع پر تھیوڈور کا خیال کیسا خوشگوار معلوم ہوتا ہے اس کے پاس روپیہ ہی روپیہ ہے اور مجھ پر روپیہ خرچ کرنے سے اسے مسرت حاصل ہوتی ہے۔ وہ مجھے بیش قیمت سے بیش قیمت تحائف خرید کر دیتا ہے۔ اعلیٰ درجے کے تھیٹروں میں لے جاتا ہے۔ مجھے لعل و جواہر سے لادنے میں خوشی محسوس کرتا اور نفیس موٹر کاروں میں بٹھا کر ہوٹلوں میں لے جاتا ہے لیکن تھیوڈور ذرا بڈھا سا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ امیر آدمی ہمیشہ بڈھے ہی ہوتے ہیں اور اگر وہ جوان ہوں تو پھر وہ اپنی ذات ہی پر روپیہ خرچ کرنے کو ترجیح دیتے ہیں جب میں تھیوڈور کے ساتھ شاندار ایوانوں میں جہاں صرف وہی مجھے لے جا سکتا ہے ناچتی ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ ناچنے سے نفیس چنگ ساز کے نغمے ضائع ہو رہے ہیں۔ دیکھئے نا! وہ ذرا موٹا سا ہے۔ ناچنے کے لئے ہلیری سب سے زیادہ موزوں ہے اور ناچنے کا مجھے اتنا شوق ہے کہ میں چاہتی ہوں میرا ایک ایسا شوہر ہو جو بہت اچھی طرح ناچ سکے۔ ناچنے کے لئے ہلیری سے بہتر آدمی ملنا مشکل ہے میرا خیال ہے کہ ہلیری میں ضرور عبرانی خون کی آمیزش ہوگی کیونکہ ایک فوق العادت "ناچ" ہونے کے علاوہ وہ ایک حیرت انگیز عاشق بھی ہے۔ اس کی واقفیت اس سے قبل ضرور سینکڑوں عورتوں سے رہ چکی ہوگی اور ان سب سے اس نے اظہارِ عشق بھی کیا ہوگا لیکن اس کے معاشقہ کا انداز اتنا مسحور کن ہے کہ میں اس کے اظہارِ محبت کی دل سے خواہشمند ہوں۔

اب دیکھئے میں ان سب سے شادی کرنا پسند کرتی ہوں۔ اگرچہ ان میں سے کسی ایک سے عمر بھر کے لئے جکڑا جانا مجھے پسند نہیں میں چاہتی ہوں کہ شہر میں تھیوڈور کے ساتھ میرا ایک عالی شان مکان ہو، اور گاؤں میں پانگو کے ساتھ ایک چھوٹا سا جھونپڑا ہو جہاں ہم دونوں نادان بچوں کی طرح اچھلتے کودتے پھریں۔ تھیوڈور مجھے تھیٹروں اور ضیافتوں میں لے جایا کرے اور اس کے بعد رقص میں ہلیری میرا رفیق ہو اور وہی مجھے گھر لے جائے۔

باقی رہا ہنری؟ سو وہ بچوں کی پرورش کیا کرے۔

ٹرکی کا عہدِ جدید

ڈاکٹر سید محمد سنہا ٹرکی کی موجودہ حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ٹرکی نے مصطفےٰ کمال پاشا کی قیادت میں حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ کیا ترکی جمہوریت قائم رہیگی؟ کیا مصطفےٰ کمال اس طرز حکمرانی پر قائم رہیگا؟ کیا وہ کمالی خاندان کی سلطنت کی داغ بیل نہ ڈالیگا؟ یہ اور اس قسم کے دوسرے سوالات جو ایک زمانے میں اہم سمجھے جاتے تھے اب اپنی اہمیت بہت کچھ کھو چکے ہیں۔

کمال عروج پسند ہونے کے باوجود وطن کی خدمت کا شائق ہے۔ اگر وہ چاہتا تو ایک مدت قبل عثمانی تختِ سلطنت پر جو خالی ہو چکا تھا

قبضہ کر کے سلطان بن جاتا لیکن وہ اس سے محترز رہا اور قوم کو اپنی قسمت کا راستہ صاف کرنے کا موقع دیتا رہا۔ وہ سال جمہوری نظام حکومت نے اس کے ہموطنوں کے دل میں اس کے تدبر کی عظمت پیدا کر دی ہے۔ انہیں مصطفےٰ کمال پر پورا اعتماد ہے اس نے ایک مردہ قوم کو دوبارہ زندہ کر کے مشرق کی آئندہ غلامی کا سدِباب کر دیا ہے! البتہ یہ خطرہ ہے کہ آئندہ ایسا اعلیٰ درجے کا قائد ملیگا یا نہیں لیکن اس باب میں بھی مایوس ہونے کی ضرورت نہیں! ایک پوری قوم نئی نئی تجربات کی روشنی میں پرورش پا رہی ہے۔ ایک نئی تہذیب ترک قوم کی زندگی کو نئی نئی شاہراہوں پر ڈال رہی ہے۔ یہی جدید ٹرکی کا قدیم ٹرکی سے مابہ الامتیاز ہے، جو اُس کے روشن مستقبل کا ضامن ہے

اردو اور ہندی

ایک ہندو انگریزی رسالے نے ایجوکیشنل ریویو کے حوالے سے اردو اور ہندی کے متعلق عجیب غریب اظہار خیال کیا ہے۔ نواب مہدی یار جنگ نے عثمانیہ یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد کے خطبے میں کہا تھا کہ اردو ہی ایک ایسی زبان ہے جو ہندوستان کی عام زبان قرار دی جا سکتی ہے" ایجوکیشنل ریویو لکھتا ہے کہ "اردو حکمران طبقے کے چند افراد کی زبان تو ہے لیکن باقی حیدرآبادیوں کی زبان یہ نہیں ہے"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عثمانیہ یونیورسٹی نے اردو کو ذریعۂ تعلیم قرار دے کر غلطی کی ہے۔ جریدۂ مذکور لکھتا ہے "حیدرآباد کی اصل زبانیں تلیگو، مرہٹی اور کناری ہیں! اردو کے ذریعۂ تعلیم بننے سے رعایا کے ایک حصہ کو ترجیح حاصل ہو جاتی ہے اور باقی حصے سے انصاف نہیں ہوتا" جریدۂ مذکور اس کے ساتھ ہی یہ بھی لکھتا ہے کہ "نواب صاحب نے ہندی کا ذکر تک نہیں کیا۔ غالباً نواب صاحب اس کے وجود ہی کو تسلیم نہیں کرتے لیکن اردو کو ملکی زبان بنانے سے پہلے انہیں شمالی ہندوستان کے کروڑوں آدمیوں سے اردو کا حق تسلیم کرانا ہوگا! اردو اور ہندی کے درمیان آہستہ آہستہ ایک وسیع خلیج حائل ہو رہی ہے اور ان کے ایک ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ عام بول چال میں ہم ایک مشترکہ بولی کا نام ہندوستانی رکھ لیں"۔

اس اقتباس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ جریدہ چاہتا ہی نہیں کہ ملکی زبان ایک ہو بلکہ اس امید کو ناممکن ثابت کر کے مطمئن ہوتا ہے اور عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو کے ذریعۂ تعلیم بننے کا اس لئے مخالف ہے کہ دکن میں کناری تلیگو اور مرہٹی زبانیں بولی جاتی ہیں! اس مخالفت سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کناری مرہٹی اور تلیگو تینوں زبانیں ذریعۂ تعلیم قرار دی جائیں لیکن یہ بعید از عقل خیال جریدۂ مذکور کے دل میں یقیناً نہیں ہو سکتا مطلب یہ ہے کہ ہندی زبان عثمانیہ یونیورسٹی کا ذریعۂ تعلیم بنے اور ہندوستان کی ملکی زبان بھی یہی ہو لیکن کیا اس صورت میں تلیگو کناری مرہٹی اور بیسیوں زبانیں بولنے والوں کی حق تلفی نہ ہوگی اور شمالی جنوبی مشرقی مغربی ہندوستان کے "کروڑوں آدمیوں" سے کسی قسم کا "حق" تسلیم کرانا نہ پڑیگا۔ ع توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر می کنند

حیدرآباد دکن کی موجودہ ترقی

"انڈین ریویو" نے "سندھ آبزرور" میں کسی حیدرآبادی ہندو کے مضمون کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ جب موجودہ شہریارِ دکن نے عنانِ سلطنت ہاتھ میں لی تو بہت سا کام اُن کے پیشِ نظر تھا! ان کے عہدِ حکومت کے گذشتہ بائیس سال مسلسل عمل اور ترقی کے آئینہ دار ہیں۔ حکومت کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں حضور نظام نے اصلاح نہ کی ہو۔ تعلیمی، معاشرتی، اقتصادی شعبوں میں اعلیحضرت نے جو کام کیا ہے اس پر وہ بجا فخر کر سکتے ہیں اور بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ حیدرآباد اُن کے عہدِ حکومت میں غیر معمولی ترقی کرنے لگا ہے۔ حیدرآباد کی ایک اور بات قابلِ ذکر ہے۔ یہاں ہندو مسلمانوں کے درمیان برادرانہ تعلقات ہیں کسی قسم کا لڑائی جھگڑا نہیں۔ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اعلیحضرت کی مساعی سے حیدرآباد اُن اقتصادی مشکلات سے بالکل بچا رہا ہے جنہوں نے دنیا کو آج کل گھیر رکھا ہے۔

فرعون کی محبوبہ

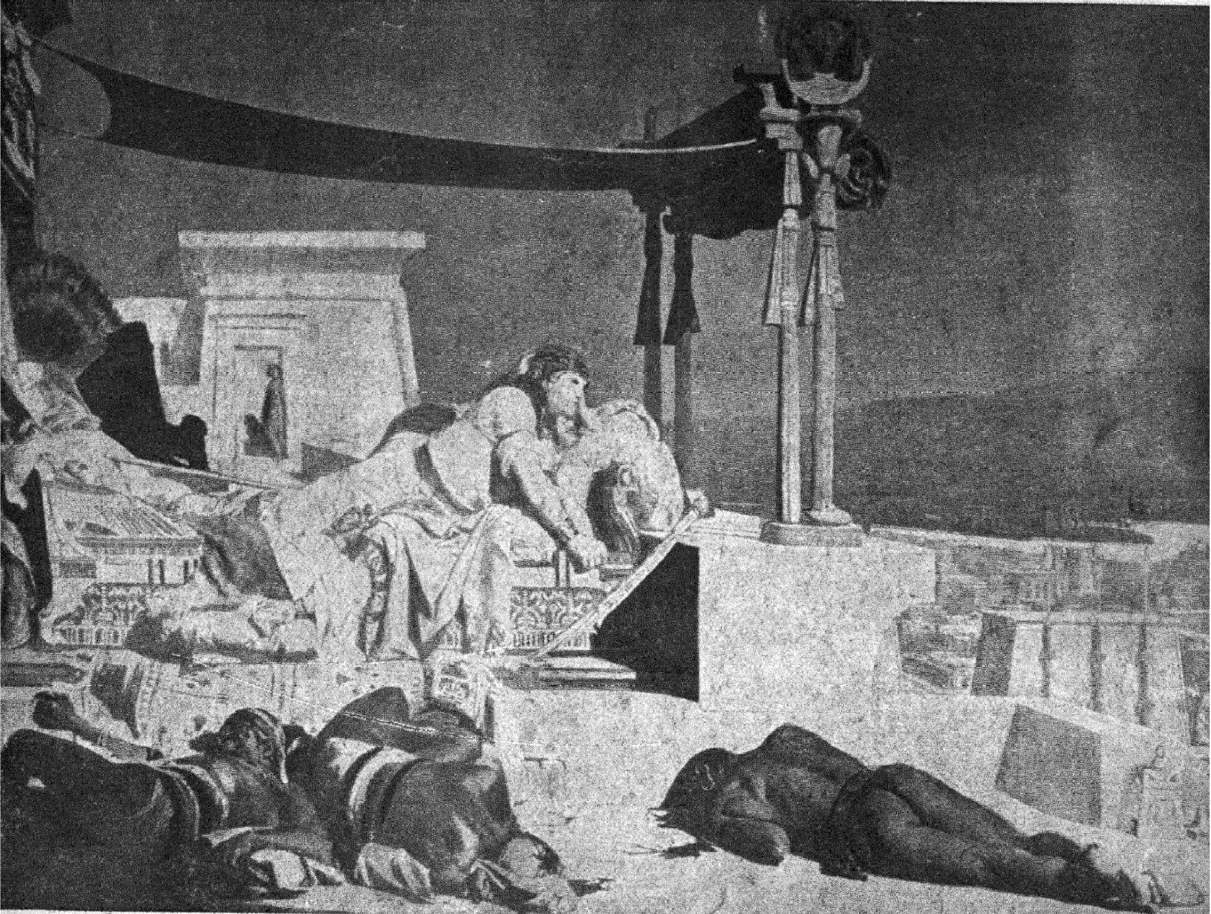
ایچ۔ بی سمتھ نے ۱۹۲۵ء میں فرعون کے متعلق یہ دلچسپ مضمون شائع کیا تھا:-

کیا طوتنخامن ہی وہ مشہور فرعون ہے جس سے حضرت موسٰی کو سابقہ پڑا؟ بعض ماہرین اس سوال کا جواب اثبات میں دیتے ہیں۔ اگر طوتنخامن کی لاش مل گئی تو شاید اس مسئلہ کا قطعی حل ہو سکے۔ فی الحال ہم یہ سوال چھوڑ کر اس خاص واقعے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ آج سے تقریباً ستر سال پہلے اسی "وادیٔ ملوک" میں مصر کی اس ملکہ کی ممی ملی تھی جو فرعون کے بعد تخت نشین ہوئی۔

اس حقیقت کا انکشاف تعجب انگیز ہوگا کہ یہ ملکہ شاہی نسل سے نہ تھی بلکہ افرادِ رعایا ہی میں سے ایک نوجوان لڑکی تھی جسے فرعون دیوانہ وار چاہتا تھا اور جسے بالآخر اس نے اپنا وارث قرار دے دیا۔ یہ پوری داستان قدیم مصری کاغذ پر لکھی ہوئی اس ملکہ کے کفن سے برآمد ہوئی تھی۔ کم از کم گوتیے کی کتاب "ممی کی کہانی" (Le Roman de la Momie) میں یہی مذکور ہے۔ گوتیے کا یہ افسانہ جس میں قدیم مصر کے مناظر حیرت انگیز تفصیل کے ساتھ دکھائے گئے ہیں ادبی معنوی کا ایک شاہکار ہونے کے اعتبار سے بھی قابلِ توجہ ہے۔

گرمی کا ایک دن تھا مصر کے اسقفِ اعظم کی یتیم لڑکی طہوسر غم و حرماں کا مجسمہ بنی محل کے ایک کمرے میں بیٹھی ہوئی بڑی اعتنائی سے اپنی باندیوں کے گیت سن رہی تھی۔ اس کی کرسی کی مطلّا چوب کاری کے نقوش میں دلفریب سرخ رنگ جھلملا رہا تھا اور بازوؤں کی کندہ کاری دو شیروں کی مورتیں دکھا رہی تھی۔ کرسی کے قرمزی گدیلوں پر زریں ستارے ٹنکے تھے۔ سامنے چھوٹی سی میز پر کنول کے پھولوں کے ایک گلدستے اور ہاتھی دانت کے پائے پر کانسے کے خوبصورت آئینے کے علاوہ ایک تابہ کمر برہنہ لڑکی کا مجسمہ عطر دانوں کا ڈبا اس طرح سنبھالے ہوئے تھا گویا کوئی تیرتی ہوئی جل پری اپنے صندوق کو پانی سے اوپر اٹھائے ہوئے ہے۔

طہوسر کا چہرہ خالص مصری وضع کا تھا۔ ہلکے سنہرے اور گلابی رنگ کی آمیزش نے اس کی سانولی زردی کو جلا دے کر ایک جگمگاہٹ سی پیدا کر رکھی تھی۔ اس کی بڑی بڑی اداس آنکھیں جن کے ابروؤں پر کاجل کے سیاہ خط کھنچے تھے اور پپوٹوں پر غازے کا رنگ چڑھا تھا، روشن ستاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ انار کی کلیوں کے سے سرخ، کھلے ہوئے ہونٹوں کے



فرعون کا جنون عشق اور ناکام قاصد

درمیان ایک نیلگوں موتی کی نمناک چمک نظر آتی تھی۔ ناک جس کا نچلا حصہ خفیف سا جھکاؤ دکھا رہا تھا کسی دیوتی کے مجسمے کی ترشی ہوئی ناک کی طرح ستواں اور خوبصورت معلوم ہوتی تھی۔ ٹھوڑی کی گولائی میں عاج کی سی چمک تھی اور بالوں کی سیاہ تاب تجلّی پر ایک پرستش تھی ——— ایک ٹوپی جو ایک چنیا بطخ سے بنائی گئی تھی۔ بطخ کے بازو اس کی کنپٹیوں کے وسط تک پھیلے ہوئے تھے، جانور کا خوبصورت سر اس کی پیشانی پر اور اس کی ستارہ کار دُم اس کی گردن کو مس کرتی ہوئی نیچے چلی گئی تھی۔ کانوں میں بڑے بڑے طلائی بالے تھے اور سینے پر عقیق اور سونے کا ایک جڑاؤ لٹکن، جس کی سُرخی اور سفیدی اس کے مہین لباس میں سے جھمجھما رہی تھی۔ طلا و لاجورد کی تین تین مرصّع چوڑیاں اس کی نازک کلائیوں کے گرد حلقہ زن تھیں اور وہ بالائی کی طرح نرم اور سفید چمڑے کا جوتا پہنے اپنے نازک پاؤں پیودار کی ایک سرخ و سبز مینا کار چوکی پر رکھے ہوئے تھی۔

یوں وہ اُداس بیٹھی تھی۔ ایک اسرائیلی نوجوان پوسری کی محبت نے جسے محض اُس نے دیکھا تھا اس کے دل میں دنیا کی طرف سے بیزاری پیدا کر رکھی تھی۔ اُسی صبح شہر میں فاتح جنگ کی حیثیت سے فرعون کا جلوس نکلنے والا تھا۔ طوسر نے بھی کچھ دیر کے لئے اپنی خیالی دنیا کو چھوڑا اور سہیلیوں کو ساتھ لے کر یہ نظارہ دیکھنے کے لئے باہر نکل آئی۔ جلوس لامتناہی شان و شکوہ کے ساتھ اُس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ سازندوں کے پاس گورخر کے چمڑے کے تنبورے اور کانسے کے عجیب و غریب ساز تھے۔ پیچھے پیچھے کاٹھ کی ہنسلیاں پہنے ہوئے قیدیوں کی لمبی لمبی قطاریں تھیں، جن کے ساتھ ہی سانولے چہروں والی لونڈیاں اشک آلود آنکھوں کے باوجود ناز و ادا سے چلتی نظر آتی تھیں۔ ہر طرف باز کی مقدس تصویر والے علم بلند تھے اور حاؤش پکار پکار کر مالِ غنیمت کی تفصیل بیان کر رہے تھے۔ اس کے بعد ہاتھیوں، زرافوں اور چیتوں کے غول اور پھر فرعون کی ہیبت کے سامنے جڑاؤ اگردان اور شترمرغ کے پروں کے اُجلے اور براق پنکھے ایک پُرشکوہ انداز میں حرکت کرتے نظر آئے۔ وہ ایک جواہر نگار پالکی میں بیٹھا تھا اور اس کے قدموں میں ایک پالتو شیر لیٹا تھا۔ ہاتھوں میں شاہی نشانات تھے۔ اس کے ترشے ہوئے سانولے اور پیلے خد و خال دیکھ کر اس پر کسی دیوتا کے سنگین بت کا گمان ہوتا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں گرد و پیش سے بالکل بے خبر ایک ابوالہول کی آنکھوں کی طرح زمانے کی انتہا پر جمی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔

لیکن یہ پُراسرار آنکھیں طوسر کو دیکھ چکی تھیں۔ یہ ایک نظر تقدیر کا فیصلہ کر دینے والی تھی۔ فرعون کے دل میں محبّت کا تیر ترازو ہو چکا تھا۔ دوسرے دن اُس نے طوسر کے گھر میں محبت کے تحائف ——— لعل و جواہر، زربفت و کمخواب اور

طلائی زیور بھیجے، لیکن اس کے غلام مایوس لوٹے۔ طھوسر غائب ہو چکی تھی۔
ان ممالک میں خون خون نہیں ہوتا، آگ ہوتا ہے۔ وہ اپنی جنوں انگیز محبت سے مجبور ہو کر اپنے غلاموں تک کو اطلاع دیئے بغیر پوٹری کے دہاتی قصر کی طرف نکل گئی تھی اور وہاں جا کر بربط نواز کی خدمت پر مامور ہو گئی تھی۔ اس کا فقط اتنا کام تھا کہ اپنی خنیاگری سے رات کو سوتے وقت پوٹری کی آنکھوں کو نیند کا نشہ پلا دیا کرے۔ لیکن اس دلنواز خدمت میں بھی ایک مصیبت آ پڑی۔ پوٹری خود ایک عبرانی پری پیکر کو دل دے چکا تھا اور وہ ہر شام اس سے ملنے چلا جاتا۔ ایک شب طھوسر نے اپنی رقیب کو دیکھنے کے لئے پوٹری کے پیچھے پیچھے جانے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت نیل کو عبور کرنے کے لئے صرف ایک ہی کشتی مل سکی جسے لے کر پوٹری روانہ ہو گیا۔ طھوسر نے ہمت نہ ہاری اور اس کے پیچھے پیچھے تیرنے لگی۔ ادبیات میں بہت کم منظر اتنے سحر انگیز ہوں گے کہ ایک بے خبر عاشق چپو مارتا اپنی محبوب لڑکی کی طرف جا رہا ہے اور وہ لڑکی جو خود اس پر جان دیتی ہے چاندنی رات میں اس کے پیچھے آہستہ آہستہ تیرتی چلی آتی ہے اور ڈرتی ہے کہ کہیں پانی کی آواز اس کے محبوب کے کانوں تک نہ پہنچ جائے۔

وہ نیم مدہوش اور نیم جاں ہو کر کنارے پر پہنچی لیکن اس پر بھی جوشِ جنوں نے اسے پوٹری کے پیچھے پیچھے راحیل کے مکان تک پہنچا دیا اور وہ خوش و خرم عاشق و معشوق کو جھانک کر دیکھنے میں کامیاب ہو گئی۔ پوٹری کے جانے کے بعد وہ راحیل کو دہلیز پر گری ہوئی ملی۔ راحیل اُسے اٹھا کر اندر لے گئی اور اس کی خبر گیری کرتی رہی جس سے اس کی جان بچ گئی۔ دوسری شام کو پوٹری جب ہاں آیا تو وہ اپنی بربط نواز کو راحیل کی تحویل میں دیکھ کر سخت حیران ہوا۔ لیکن جلد ہی وہ حقیقت کی تہ تک پہنچ گیا۔ شاہی دربار کا ایک رکن ہونے کی حیثیت سے وہ جانتا تھا کہ فرعون کے جاسوس بھوکے شیروں کی طرح طھوسر کی تلاش میں لگے ہیں۔ راحیل کی بوڑھی ملازمہ تامر بھی معاملے کو بھانپ گئی اور فرعون کو اطلاع دینے کے لئے چپکے سے اُٹھ دوڑی۔

یہاں ایک عجیب منظر تھا۔ فرعون اپنے محل کی چھت پر بیٹھا ساعت بہ ساعت قاصدوں کا انتظار کر رہا تھا کہ کہیں سے طھوسر کے ملنے کی خبر آئے۔ وہ خاموش اور بے حس و حرکت بیٹھا سیاہ پتھر کا ایک مجسمہ معلوم ہوتا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک شہر غدار اپنی تمام عظمت و شوکت کے ساتھ پھیلا ہوا تھا۔ دریائے نیل کی آئینہ پوش سطح پر کھجور کے درختوں کے پنکھے جنبش کر رہے تھے۔ چاروں طرف ہزار ہا ابوالہول اور جا بجا قدیم معبدوں کے بلند گنبد نظر آتے جن کو مس کرتے ہوئے خود زمانہ بھی اپنا نقش چھوڑے بغیر یوں گزر جاتا جیسے پانی کا قطرہ سنگ مرمر کی سطح پر سے پھسل جائے۔ مقدس پرندوں کے مجسمے آسمان کے گہرے نیل کے بالمقابل کہیں اپنے جادو دانی پر پھیلائے دکھائی دیتے تو کہیں ایک ٹانگ پر بے حس و حرکت کھڑے نظر آتے لیکن ان تمام چیزوں

کا مالک ایک لڑکی کے لئے جو اُسے نہ ملتی تھی درد و کرب کی حالت میں تنہا بیٹھا تھا۔ وقتاً فوقتاً جب کوئی پیادہ ناکامی کی بار بار دہرائی ہوئی خبر لے کر پہنچتا تو اِس سنگین مجسمے کا ایک سنگین ہاتھ اُٹھتا اور عصائے شاہی شعلۂ برق کی طرح سوختہ بخت قاصد کے سر پر گر کر طرفۃ العین میں اُس کی لاش کو سنگین فرش پر پٹ گرا دیتا۔

آخر بوڑھی چڑیل ثامر اپنی اطلاع لے کر وہاں پہنچی۔ دفعتہً پتھر کا بادشاہ زندہ ہو کر اچھل پڑا اور لپک کر اپنی رتھ میں سوار ہو گیا۔ وہ سرپٹ گھوڑے دوڑاتا ہوا راحیل کے گھر پہنچا جہاں اس نے طھوسر کو چیختے چلّاتے اپنے بازوؤں میں اُٹھا لیا اور پلوٹو کی طرح جو پراز پینا کو اپنی زیر زمیں مملکت کی طرف لے بھاگا تھا وہ طھوسر کو رتھ میں رکھے گرجتا گونجتا "کڑکڑا" "گڑگڑاتا" دارالسلطنت کے بازاروں میں سے گزر گیا۔

محل میں پہنچ کر اُس کے جذبات میں نرمی پیدا ہوئی اور اس نے طھوسر سے کہہ دیا کہ میں تم پر اس وقت تک اپنا کسی قسم کا دعویٰ نہ سمجھوں گا جب تک تم مجھے محبت کی نشانی کے طور پر کنول کا یہ پھول لوٹا نہ دو۔

اسی وقت فرعون ایک عجیب و غریب بڈھے آدمی کو باریاب کرنے کے لئے رخصت ہوا۔ یہ بڈھا آدمی موسےٰ تھا۔

اس کے بعد انجیل کی کہانی شروع ہوتی ہے مصر پر مصائب ٹوٹتے ہیں اور بنی اسرائیل وہاں سے رخصت ہو جاتے ہیں۔

فرعون جو بچوں کے قتلِ عام کے دوران میں اپنے اکلوتے بیٹے کو بھی کھو چکا تھا یاس و قنوط اور قہر و غضب کی حالت میں طھوسر کو اپنا جانشین مقرر کر کے سپاہیوں کی چھ سو رتھیں لئے سمندر کے پانیوں کی درمیانی شاہراہ پر اُن کا تعاقب کرتا ہوا پہنچا ہے

بنی اسرائیل میں سے کچھ آخری افراد جن میں پوسری، راحیل اور ثامر شامل تھے اپنے آپ کو تقریباً کھو چکے تھے لیکن دفعتہً موسیٰ نے ایک اشارہ کیا جس پر رتھوں کے پہیے نکل کر گر پڑے اور پانی کی دو عظیم الشان دیواریں دونوں طرف سے اٹھ کر باہم ٹکرائیں۔ اس کے بعد سمندر پھر اپنی جگہ چلا گیا اور گاڑیاں گھوڑے اور آدمی طوفانی موجوں میں تنکوں کی طرح اچھلتے نظر آئے۔ صرف فرعون اپنی تیرتی ہوئی رتھ میں تن کر بیٹھا تھا تکبّر اور طیش میں آپے سے باہر ہو کر وہ ساحل پر اترتے ہوئے دشمن کو اپنے تیروں کا نشانہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب وہ آدھا ڈوب چکا تو اس نے اپنے دہنے ہاتھ سے کہ اب وہی پانی کے اوپر رہ گیا تھا اپنا نیزہ سنبھالا اور اپنی بے چارگی کے باوجود نہایت دلیری سے اٹھا کر اُسے نامعلوم خدا کے خلاف دے مارا۔

اس طرح طھوسر مصر کی ملکہ بن گئی ؎

حامد علی خاں

کبیر کے دوہے

کون ہے جو کبیر داس کی شخصیت سے ناواقف ہو، میں تو جانوں شاید ہندوستان کے عرض و بسیط میں کوئی بھی ساعت اُن کے نام اور کلام سے محروم نہ رہی ہوگی، گو وہ زندگی میں ہی اپنی معجز بیانی کے سبب سے بہت کچھ شہرت حاصل کر چکے تھے، مگر کمال یہ ہے کہ رفتارِ زمانہ کے ساتھ ان کا پیچھا ہونے پر اس شہرت میں بتدریج اضافہ ہوتا گیا، حتیٰ کہ آج کل تراجم کا لباس بدل بدل کر ان کے ترانے چار دانگ عالم میں گونج رہے ہیں۔

اس بات پر جتنا کچھ بھی تعجب کیا جائے بجا ہے، کہ ایسی عظیم الشان ہستی کے قابلِ اعتبار حالاتِ زندگی ملک کی کسی زبان میں نہیں ملتے، یوں ہی کچھ عقیدتمندانہ روایتیں چلی آتی ہیں، جو تاریخی معیار پر پوری نہیں اُترتیں۔

لیکن اس خیال سے کہ شاید بعض حضرات کبیر داس کی سوانحعمری معلوم کرنے کے مشتاق ہوں، ان کا کلام پیش کرنے سے پہلے اُن کی سیرت پر بھی روشنی ڈالی جاتی ہے، پھر تو مضمون تشنہ نہ رہے گا۔

کاشی جی میں "نورا" نامی ایک جولاہا اور اس کی بیوی نعمان رہتے تھے، ایک بار وہ کسی شادی میں گئے، واپس آتے وقت راستہ کی دوڑ دھوپ اور سورج کی گرمی سے انہیں سخت پیاس لگی، آگے چل کر "لہرا تالاب" ملا، جونہی وہ کنارے پر پہنچے، تو کنول کے پتوں پر ایک ننھا سا بچہ پڑا دکھائی دیا۔

اس نظارہ سے انہیں بڑا اچنبھا ہوا، کہ ارے اس جنگل بیابان میں آدمی کا بچہ کہاں سے آیا، پھر کسی قدر ردّ و کد کے بعد دونوں میں صلاح ہوئی کہ اپنا کوئی بال بچہ بھی نہیں، خدا نے بن مانگی مراد دی، اسے گھر لے چلیں، پل گیا تو نام چلے گا۔

بس نورا جولاہا تالاب میں اُتر کر اس بچہ کو نکال لایا، نعمان نے گود میں لیا، چھاتی سے لگایا اور میاں بیوی خوش ہوتے ہوئے کاشی میں آئے۔

یہ واقعہ ۱۴۵۵ء کا بتایا جاتا ہے جبکہ محمود تغلق تختِ دہلی پر متمکن تھا۔

نورا جولاہے نے اس بچہ کا نام "کبیر" رکھا اور اپنی حیثیت بموجب پرورش کرنے لگا۔

بقول شخصیکہ "پوت کے پانوں پالنے میں نظر آتے ہیں"۔ آثار کہہ رہے تھے کہ یہ بچہ آگے چل کر بڑا آدمی ہوگا' چنانچہ زندگی کی پانچویں منزل میں قدم رکھتے رکھتے کبیر کے دل میں ایک خاص قسم کی لہریں اٹھنے لگیں' جو کسی روحانی رہنما کی جستجو پر اکسا رہی تھیں۔

ان دنوں سوامی رامانندجی کاشی والے کے گیان دھیان کا بڑا شہرہ تھا' کبیر نے جو یہ چرچا سنا' بے اختیار ان کی طرف رجحان ہونے لگا' چاہا کہ ان ہی سے دیکھشا دیکھت لیں' جب اس غرض سے ان کے دروازے پر گئے' تو ایک جولاہے کا بچہ سمجھ سوامی جی کے چیلے بری طرح پیش آئے' نیز سوامی جی نے بھی انہیں ٹال دیا۔

اپنی ناکامی پر کبیر کو بڑا افسوس ہوا' اسی دھیان میں رات ہوگئی' خیالات کی الجھن کے سبب سے نیند نہ آئی' کروٹیں بدلتے پچھلا پہرہ ہوگیا' آخر انہوں نے ایک محویت کے سے عالم میں گنگاجی کے دشاشومیدہ گھاٹ کا راستہ لیا' اور چپکے سے سیڑھیوں پر جا لیٹے۔

سوامی جی کا دستور تھا' کہ بلاناغہ گنگاجی کے اسی گھاٹ پر چار بجے رات کے اشنان کو جاتا کرتے تھے' حسب دستور جب وہ اشنان کرنے آئے تو بے خبری میں ان کی کھڑاوں کبیرداس پر پڑگئی' بہانہ پاکر کبیرداس نے فوراً بلبلا بلبلا کر رونا شروع کردیا۔ ایک رقیق القلب انسان ہونے کی وجہ سے' رونے کی آواز سے سوامی جی کا دل ہل گیا' انہوں نے حال معلوم کئے بغیر رونے والے کو جلدی سے گود میں اٹھالیا' اس کے سر پر دست شفقت پھیرا اور چمکار کر کہا :۔

بچہ! رام رام کہہ!!

یہ سن کر کبیرداس کی جان میں جان آئی' اسی وقت سے رام نام کو گرمنتر (اسم اعظم) سمجھ کر وظیفہ بنایا اور باقاعدہ تلک بھی لگانے لگے۔

کیونکہ ایک مسلمان بچہ کا ایسی ہیئت میں رہنا کچھ عجیب سا معاملہ تھا' بہت جلد مشہور ہوگیا کہ سوامی جی نے نورا جولاہے کے بچہ کو اپنا چیلہ بنایا ہے' ہر جگہ چہ میگوئیاں ہونے لگیں' چھوت چھات کی پابند ہندو برادری میں کھلبلی مچ گئی' یہاں تک کہ یہ خبر سوامی جی تک پہنچی اور انہوں نے کبیرداس کو اپنے روبرو بلا کر دریافت کیا :۔

ہم نے کب تجھے چیلا بنایا ؟

کبیرداس۔ اسی رات جب آپ دشاشومیدہ گھاٹ پر اشنان کرنے گئے تھے اور آپ کی کھڑاوں لگنے سے میں رو رہا تھا' تو آپ نے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر دیکھشا دی تھی کہ بچہ رام رام کہہ' اب میں ہر وقت رام رام جپا کرتا ہوں' آپ میرے گرو ہیں میں آپ کا چیلا۔

اس بات پر بجائے ناراض ہونے کے سوامی جی بڑے پرسن ہوئے اور کہنے لگے :۔ "دھن ہے (آفرین) اسے کہتے ہیں

دُرڑھ بشواس (یقین کامل) جس کو رام نام سے ایسا پریم ہو' اُسے چیلا بنانے میں کیا ہرج ہے۔

جب لگی لپٹی نہ رہی سوامی جی نے کھلے خزانہ اقرار کرلیا' تو کبیرداس سب کے سامنے اُن کی صحبت میں آنے جانے لگے' اس نشست و برخواست سے چیلے کو تو جو کچھ فیض پہنچا ہوگا وہ جانے' لیکن چیلے نے ضرور گرُو کی طبیعت بدل دی' کہاں تو سوامی رامانند مسلمانوں اور نیچ قوم کے ہندوؤں کو چھونا گناہ سمجھتے تھے' کہاں کبیرداس کے زیر اثر یہاں تک نوبت پہنچی کہ انہوں نے گنگاطوائف' ریداس چمار اور سدنا قصائی کو اپنے چیلوں میں داخل کرلیا۔

کبیرداس نے جن جن عجیب طریقوں سے اپنے گرُو کی اصلاح کی ان میں سے ایک درج کیا جاتا ہے :۔

کنوار کے مہینہ یعنی کرناگت کے دنوں میں' جب گرو رامانند اپنے گرو رگھو آنند سرگ باشی کا شرادہ کرنے لگے' تو چیلوں کو حکم دیا کہ جاؤ اہیروں سے دودھ مانگ لاؤ!

حسب الحکم تمام چیلے لوٹے لے لے کر اہیروں کے گھروں پر گئے اور دودھ لے آئے' مگر کبیرداس نہ پلٹے۔ جب اُن کے آنے میں امید سے زیادہ دیر ہوئی' تو گرُو جی نے چیلوں سے دریافت کیا' کبیرا کہاں ہے؟ وہ ابھی تک دودھ نہیں لایا!

چیلوں نے کہا' مہاراج! وہ کسی اہیر کے گھر نہیں گیا' جنگل میں ایک جگہ ہڈیوں کے ڈھیر پر بیٹھا نہ جانے کیا کر رہا ہے۔

اس پر گرو جی بولے :۔

خوب! اچھا ذرا لاؤ تو اس کو ہمارے سامنے!

چیلے دوڑے گئے اور کبیرداس کو بلا کر لے آئے۔

انہیں دیکھتے ہی گرو جی نے برہم ہو کر کہا :۔

مسخرے وہاں بیٹھا کیا کر رہا تھا' دودھ نہیں لایا؟

کبیرداس۔ مہاراج آپ نے فرمایا تھا' کہ گرو جی سرگ باشی کے شرادہ کو دودھ چاہیئے' تو میں نے سوچا کہ جب مُردے دودھ پیتے ہیں' تو ضرور مری گائیں بھی دودھ دیتی ہوں گی' اس واسطے اُن کی ہڈیوں سے دودھ مانگ رہا تھا' مگر افسوس کامیابی نہ ہوئی۔

یہ جواب سن کر گرو رامانند دنگ رہ گئے' کہ لو بھئی یہ بات تو کہیں کی کہیں جا پڑی۔

اس دوران میں کہ گرو رامانند سے ست سنگ (فیض صحبت) کا سلسلہ جاری تھا' کبیرداس کپڑا بُن بُن کر اپنے ماں باپ کا پیٹ

پالتے تھے، بسا اوقات ایسا بھی ہُوا ہے، کہ وہ تھان فروخت کرنے جا رہے ہیں، یا بیچ کر آ رہے ہیں، راستے میں کوئی سادھو یا فقیر مل گیا اور اس نے سوال کیا تو سب کچھ اس کو دے کر خالی ہاتھ پلٹ آئے۔

جب ایک عرصہ تک یوں ہی ہوتا رہا اور کبیرداس کی دریادلی سے ماں باپ تنگ آگئے تو ایک روز کہنے لگے:۔

بیٹا! کہاں تک پیٹ پر پتھر باندھیں، اب ہم میں فاقے کرنے کی سکت نہیں ہے۔

کبیرداس نے نہایت تحمل سے جواب دیا:۔

خدا پر نظر رکھو، فقیر فقرا کی خدمت کرنے والا کبھی روٹی کپڑے کا محتاج نہیں رہتا۔

ابھی بات منہ میں تھی، خدا کی شان، نہ جانے کہاں سے کوئی شخص آیا، اور بہت سا نقد وجنس پیش کر کے چلا گیا، کبیرداس نے وہ تحفہ والدین کے قدموں پر رکھ کر کہا:۔

یہ دیکھو قدرت کے کھیل!

دنیا کا بھی کچھ عجیب ہی حال ہے، جہاں کسی کی طرف چار آدمی رجوع ہوئے اور لوگوں کے پیٹ میں پانی، کہ جس طرح ہو اس شخص کو اکھاڑنا چاہیئے اور لگیں طرح طرح کی سازشیں ہونے۔

جونہی کبیرداس کی شہرت ہوئی، ہر مذہب و ملت کے خواص و عوام پنڈت اور علما نے ہجوم کیا، جا بجا شاستر ارتھ اور مناظرہ وغیرہ چھڑے۔ لیکن جس طرح اولوالعزم انسان دنیا میں کامیاب ہوتے آئے ہیں، کبیرداس کی آواز بلند سے بلند تر ہوتی گئی۔

جب کچھ زور نہ چلا تو حکومت کی آڑ پکڑی گئی۔ دربار میں باریاب ہو کر مخالفین نے بادشاہ سے گزارش کی کہ یہ شخص لوگوں کو گمراہ کر رہا ہے، اگر فوری تدارک نہ کیا گیا، تو رعایا لامذہب ہو کر سخت فساد کرے گی۔

مقربوں کے کہنے سننے سے بادشاہ نے (سکندر لودھی) کبیر کو حضور میں طلب کر کے گفتگو کی تو معلوم ہُوا ناحق ان پر بہتان باندھا گیا ہے، اس واسطے ان کو بری کرنا چاہا، لیکن درباریوں نے لگائی بجھائی کر کے انہیں قید کرا دیا اور زنداں میں سخت اذیتیں پہنچائیں، حتیٰ کہ کسی حکمت سے انہیں ہاتھی کے پیروں تلے رندھوانے کا حکم بھی حاصل کر لیا۔

جس وقت کبیرداس کو ہاتھی کے پیروں تلے رندھوانے کو لے چلے، تو انہوں نے بادشاہ سے کہا:۔

سلطان! غور کا مقام ہے کہ خاصانِ خدا حضرت منصور حلاّج اور حضرت شمس تبریزی رحمتہ اللہ علیہم کو ستانے کا کیا نتیجہ ہُوا تھا، خدا کے قہر سے ڈرنا چاہیئے، اس کی لاٹھی میں آواز نہیں۔

کبیرداس کے الفاظ نے بادشاہ اور درباریوں کے دلوں پر تیر دلنشتر کا کام کیا، اور وہ آزاد کر دیئے گئے۔

اس کے بعد بھی مخالفین شرارتوں سے باز نہ آئے' جہلا اور غنڈوں کو ان کے پیچھے لگا دیا' جنہوں نے گالی۔ گلوچ' پھبتی' پھکڑ کی بارش کر دی۔ گلی کوچوں میں آوازے کستے اور بہروپ بھر بھر کر ان کے شبدوں کو بری صورتوں میں منتقل کرکے گلی کوچوں میں گاتے پھرتے تھے۔ اس قدر مخالفتوں کے باوجود یہ عالم ہوا کہ روز بروز دشمنوں سے زیادہ فدائیوں کی تعداد بڑھتی گئی اور زندگی ہی میں کبیرداس کا پنتھ دُور دُور پھیل گیا۔

کبیرداس کے اقوال سے معلوم ہوتا ہے' کہ نہ وہ ہندو تھے نہ مسلمان' بلکہ موحد تھے' اور ان کے پیتھی (اتی) بھی بہت کچھ بے تعصب موحد ہوتے ہیں' کبیرداس نے عمر بھی خوب پائی یعنی ایک سو بیس سال کے ہو کر بمقام "مگھر" انتقال کیا۔

یہ تو کبیرداس کے مختصر حالات زندگی تھے' جو کچھ ایسے بعید العقول نہیں' اب ذرا ان کے کلام کا نمونہ ملاحظہ فرمایئے کہ کس آسانی سے مختصر الفاظ میں حقائق و معارف' جذبات' معاملات' محاکات' اور واردات ادا کرتے ہیں۔

حمد

انتریامی ایک توں سب جگ کو آدھار ــــ جو توں چھانڈے ہاتھ سوں کون اتارے پار

اے دلوں میں بسنے والے! تو ہی سارے جہاں کا سہارا ہے' جو کہیں تو نے ہی مجھے چھوڑ دیا تو پھر کون پار اتارے گا۔

سائیں میں گن بہت ہیں' اوگن کو نا نہہ ــــ جب کھوجوں من آپنو' سب اوگن مجھ مانہہ

وہ مالک سراپا خوبی ہی خوبی ہے' اس میں کوئی بھی خرابی نہیں' جب میں نے اپنے دل کا جائزہ لیا' تو مجھ میں ہی عیب نکلے'

جا کی پونجی سوانس ہے' چھن آوے چھن جائے ــــ تاکوں ایسو چاہیئے' رہے نام لو لائے

جس کی کل جمع پونجی صرف وہ سانسیں ہوں' جن کا کچھ اعتبار نہیں کہ ثانیہ میں آتی ہیں اور ثانیہ میں جاتی ہیں' اس کو چاہیئے کہ خدا کے نام کی لو لگائے۔

لنبا مارگ' دور گھر' بکھٹ پنتھ' بٹ مار ــــ کہیں کبیر کیوں پایئے' صاحب کو دیدار

فاصلہ زیادہ' منزل دور' اور راستہ نہایت سخت جس میں رہزن لگے ہوئے ہیں' اے کبیر! مالک کا دیدار کس طرح ہو؟

توصیف مرشد

گورو' گووند' دووَ کھڑے' کون کے لاگوں پائے ــــ میں بلہاری' گورو' آپ کے' گووند دئے لکھائے

اس وقت مرشد اور خدا دونوں موجود ہیں' اب کس کے قدم لوں' قربان جاؤں مرشد کے جنہوں نے خدا کا دیدار کرا دیا۔

کبیرتے نر زندہ ہیں' گرو کوں کہتے اور ــــ ہر روٹھے تو ٹھور ہے' گرو روٹھے نہیں ٹھور

کبیر داس وہ اندھے ہیں جو مرشد کا مرتبہ نہ پہچان کر کچھ کا کچھ کہتے ہیں' ارے ایک دفعہ کو خدا ناراض ہو جائے تو کچھ گنجائش نکل سکتی ہے، لیکن مرشد کی خفگی کے بعد کہیں ٹھکانا نہیں۔

جہاں نہ کو ؤ جاے سکے' برہما' وشنو' ہیش ۔ تھاں کبیرا چڑھ گیو' ست گُرُ کے اُپدیش

جہاں تک برہما وشنو اور مہیش جیسی قوتوں کی رسائی نہیں، مرشد کے طریق پر عمل کر کے کبیر اس مقام ارفع واعلیٰ پر جا پہنچا۔

ست گرُ محل بنائیو' پریم گلا وا دین ۔ صاحب درشن کارنے شبد جھر کا کین

مرشد صادق نے محبت کے گارے سے ایک محل تعمیر کیا' جس میں دیدار خداوندی کے لئے اسم اعظم کا روزن رکھا۔

عشق

جا گھٹ پریم نا سنچرے' تا گھٹ جان مسان ۔ جیسے کھال لوہار کی، سوانس لیت بن پران

جس قالب میں محبت نہیں بستی، اس کو مرگھٹ جانو' وہ ایسا ہے جیسے لوہار کی دھونکنی' جو بغیر جان کے سانس لیتی ہے۔

پریم چھپاے نا چھپے' جا گھٹ پر گھٹ ہوے ۔ جو پے مُکھ بولے نہیں' نین دیت ہیں روے

محبت چھپائے نہیں چھپتی، جس قالب میں سما جائے' اس کا مارا اگر زبان سے کچھ نہ کہے تو آنکھیں رونے لگتی ہیں۔

پریم پیالہ سو پیئے' سیس دکھشنا دے ۔ لوبھی سیس نا دے سکے' ناؤں پریم کو لے

جام محبت وہی پی سکتا ہے' جو اپنا سر قربان کر سکے' بوالہوس سر تو دے نہیں سکتا' ناحق محبت کا نام لیتا ہے۔

گھائل کی گتی اور ہے اور رن کی گت اور ۔ پریم بان ہردے لگیو' رہیو کبیرا ٹھور

محبت کے زخم خوردہ کا معاملہ دوسرا ہے' اوروں کا دوسرا' کبیر داس کے دل پر جو خدنگ عشق لگا' تو وہ وہاں کا وہیں رہ گیا۔

فراق

مانس گیو' پنجر رہیو' تا کن لاگے کاگ ۔ صاحب اَبہوں ناہیں آئے مند ہماری بھاگ

گوشت پوست گھل گھلا کر نرا پنجر رہ گیا ہے' کوّے ہمیں تاک رہے ہیں' وائے کم نصیبی ہماری کہ وہ ابھی تک نہیں آئے۔

برہ تیج تن میں تپے' انگ سبھی اُکلائے ۔ گھٹ سونوں جیو پیو میں' کال ڈھونڈھ پھر جائے

تن میں آتش فراق بھڑک رہی ہے' جس کے اثر سے سارا جسم سخت بیقرار ہے' میری جان دوست میں پڑی ہے' خاکی

تا اب دیکھ دیکھ کر قضا پھر پھر جاتی ہے۔

نام بیوگی، بکل تن، تا سے نہ چینے کوئے ۔۔۔ تبنولی کو پان جیوں، دن دن پیرو ہوئے

فرقت زدہ مضطرب ہیں انہیں کوئی نہیں پہچانتا، جس طرح تبنولی کا پان روز بروز زرد پڑتا جائے۔

تن من جوبن جرگیو، برہ اگن گھٹ لاگ ۔۔۔ برہن جانے پیر کوں، کیا جانے گی آگ

جدائی کی وہ آگ لگی، جس سے تن من اور حسن شباب سب کچھ خاک سیاہ ہو گیا، فرقت زدہ دل سے اس درد کا حال پوچھئے۔ . . آگ کیا جانے۔

پیا بن جیا ترست رہے، پل پل برہ ستائے ۔۔۔ رین دوس موسے کل نہیں سسک سسک جیا جائے

دوست بغیر جی ترستا رہتا ہے، ہر لحہ مفارقت ستاتی ہے، دن رات مجھے چین نہیں، آہ سسک سسک کر جان نکل رہی ہے۔

عاشق کا ارمان

نینن کی کر کوٹھری، پتلی پلنگ بچھائے ۔۔۔ پلکن کی چک ڈارکیں، پیو کوں لیوں رجھائے

آنکھوں کی کوٹھری بناؤں، اور اس میں پتلیوں کی سیج بچھا کر پلکوں کی چق ڈال دوں، پھر اپنے محبوب کو لبھاؤں۔

اپنے اپنے چور کوں، سب کوئ ڈارے مار ۔۔۔ میرو چور موہے ملے، تو سربس ڈاروں وار

سب تو اپنے اپنے چور کو قتل کر دیتے ہیں، جو کہیں میرا چور مجھے مل جائے، تو میں اس پر اپنا سر وار دوں۔

سائیں میرو ایک توں اور نہ دوجو کوے ۔۔۔ دوجو سائیں کیا کروں، تجھ سم اور نہ ہوے

میرا مطلوب صرف تو ہے، کسی اور کو کیونکر اپنا مالک سمجھوں، جب تیرا کوئی ثانی نہیں۔ بقول حضرت آزاد انصاری:۔

تیرا عدیل کوئی تیرے سوا نہ ہوگا ۔۔۔ تجھ سا کہاں سے لاؤں تجھ سا ہوا نہ ہوگا

بالکل مضمون لڑ گیا، صرف زبان کا فرق ہے۔

ایسو دن کب ہوئگو جب گرو گہیں گے بانہہ ۔۔۔ اپنو کر بیٹھار ہیں چرن کنول کی چھانہہ

ہائے وہ دن کب آئے گا، جب میرے مرشد دستگیری فرمائیں گے اور مجھے اپنا سمجھ کر کنول کے تلووں والے قدموں کی چھاؤں میں جگہ دیں گے۔

بے ثباتی

آج کال کے بیچ میں جنگل ہوئیگو باس ۔۔۔ اوپرے اوپرے ہل چلیں، ڈھور چریں گے گھاس

غافل! آج کل آج کل کرتے، ایک روز جنگل میں بسیرا ہو جائے گا، جہاں اِدھر اُدھر ہل چل رہے ہونگے اور مویشی گھاس چرتے پھریں گے۔

اُس پاس جودھا کھڑے سبئی بجاویں گال — منجھ محل سے لے چلیو۔ کسو کال کڑال

بڑے بڑے بہادر محافظت پر اُس پاس کھڑے ہیں، مگر سوائے چبڑچبڑ کرنے اور فضول باتیں بنانے کے کچھ نہیں کر سکتے دیکھ قضا کیسی زبردست ہے، کہ تجھے بیچ محل سے نکال کرلے چلی۔

آئے ہیں سو جائیں گے، راجہ، رنک، فقیر — ایک سنگھاسن چڑھ چلے، ایک بندھے زنجیر

بادشاہ، وزیر اور فقیر غرض جو دنیا میں آیا ہے، ایک روز یہاں سے جائیگا، فرق صرف اتنا ہے، کہ کوئی تخت شاہی پر بیٹھ کر اور کوئی زنجیروں میں جکڑا ہوا۔

بات چھپرتا یوں کہئے، سنو تردر بن رائے — اب کے بچھڑے ناہیں ملیں، دور پڑیں گے جائے

پت جھڑ صورت حال سے کہتا ہے اے بیاباں درخت جنگل کے سردار سنتے ہو! اب کے بچھڑے پھر نہیں ملنے کے دُور جا پڑیں گے۔

ہوا و ہوس

مایا مرے نا من مرے مر مر جات سریر — آشا ترشنا نا مرے، کہہ گئے داس کبیر

یہ کمبخت نہ دنیا طلبی جائے، نہ حریص دل کی آرزوئیں ختم ہوں۔ حتیٰ کہ جسم فنا ہو جاتا ہے، مگر بقول کبیرؔ اس انسان کی ہوس نہیں جاتی

پانچن کے بس من پرو من کے بس نہیں پانچ — جت دیکھوں ہاتت دَول لگے جت بھاجوں تت آنچ

حواس خمسہ کے قابو میں دل آگیا ہے، دل کے بس میں حواس نہیں، اب کہاں جاؤں، جدھر دیکھتا ہوں جنگل میں آگ لگی ہوئی ہے جس طرف بھاگوں آگ کے سوائے کچھ نہیں۔

منوا تو پنچھی بھئیو، اڑ چلو آکاس — اوپر سے گر پڑ من مایا کے پاس

میرا دل پرندہ بن کر آسمان پر اڑا، لیکن جوں ہی دنیا کی دلفریبیاں دیکھیں فوراً ہوا و ہوس میں گرفتار ہو کر اس بلندی سے اس پستی میں گر پڑا۔

من کے کتنے رنگ ہیں، چھن چھن بدلے سوئے — ایک رنگ میں جو رہے، برلا ایسو ہوئے

دل کی گوناگوں کیفیات ہیں، جو ہر لحظہ بدلتی رہتی ہیں، شاذ کوئی دل ایسا ہوتا ہے، جو ایک رنگ میں یکسوئی سے قائم ہو جائے۔

وقت کی قدر

مارگ چلتے جو گرے، تاکوں ناہیں دوس | کہیں کبیر بیٹھا رہے، تا سِر کرّے کوس

اگر کوئی راہ چلتا ٹھوکر کھا کر گرے، تو قابلِ طعن نہیں، البتہ بقول کبیر جو نکما بیٹھا بیٹھا رہ جائے اس کے سر جدوجہد کا بڑا بار ہے۔

گانٹھی ہوئے سو ہاتھ کر ہاتھ ہوئی سو دے | آگے ہاٹ نا بانیا، لینو ہوئے سو لے

جو کچھ تیری گانٹھ گرہ میں ہے نکال اور خدا نام پر دے، اس دارالعمل میں نیک اعمال کا سودا کر لے ورنہ یاد رکھ آگے چل کر پچھتانا پڑے گا۔

ایسے مہنگے مول کو ایک سوانس جو جائے | چودہ[1] لوک پٹتر نہیں، تو کیوں دھول ملائے

ان بے بہا سانسوں کو رائیگاں کیوں کرتا ہے، جن میں سے ایک ایک سانس کی قیمت چودہ عالم ادا نہیں کر سکتے۔

ایثار

ترور پھلیں نہ آپ کوں، ندی پیئے نا نیر | پرمارتھ کے کارنے سنتن دھرو شریر

جیسے درخت اپنے لئے نہیں پھلتے اور ندی خود پانی نہیں پیتی، اسی طرح خدا کے نیک بندوں نے رفاہ عام کے لئے جسم اختیار کیا ہے۔

متفرقات

سکھیا سب سنسار ہے، جو کھاوے اور سوئے | دکھیا داس کبیر ہے، جو جاگے اور روئے

دنیا والے سکھ میں ہیں، مزے سے کھاتے ہیں اور سوتے ہیں، ایک کبیر دکھیا ہے، جو جاگتا ہے اور روتا ہے۔

ایک سادھے سب سدھیں، سب سادھے سب جائے | مالی سینچے مُول کوں پھولے پھلے اگھائے

استقلال سے ایک کام کیا جائے تو تمام کام درست ہو جاتے ہیں، اور تلون مزاجی سے یہ کیا وہ چھوڑا وہ لیا یہ چھوڑا کرنے سے کچھ نہیں بنتا، جس طرح مالی صرف درخت کی جڑ کو پانی دیتا ہے، تو درخت پھولتا پھلتا اور سرسبز ہوتا ہے۔

ایسو کوئی نا ملو جا سوں رہیئے لاگ | سب جگ جلتو دیکھیو اپنی اپنی آگ

افسوس! دنیا میں ایسا کوئی نہ ملا جس کے ہو رہیئے، ہر ایک کو اپنی اپنی آگ میں جلتا پایا۔

پانی ملے نہ آپ کوں، اورن بخشیں شیر | آپن مَن نشچل نہیں، اور بندھاوت دھیر

خود کو پینے کے لئے پانی نہیں ملتا، دوسروں کو دودھ پلاتے ہیں، اپنے دل کو سکون نہیں، اوروں کو ڈھارس بندھاتے ہیں۔

مُورکھ کوں سمجھاوتے، گیان گانٹھ کو جائے | کوئلہ ہوئے نا اوجرو، سو مَن صابن لائے

---

[1] ہفت طبقات زمین و ہفت طبقات آسماں۔

جاہل کو سمجھانے سے اپنی عقل ماری جاتی ہے، پھر بھی وہ نہیں سمجھتا جس طرح سون صابن لگانے پر بھی کوئلا اُجلا نہیں ہو سکتا ہے۔

گگن سور برسے اَمی گھر بادل گنبھیر،   چھونڈس دکمے دامنی بھینجے داس کبیر

گھنا بادل گھر کر آبِ حیات برسا رہا ہے، چہار سمت بجلیاں کوندتی ہیں، اور کبیر داس کھڑا بھیگ رہا ہے۔

کام کتھا سنو نہیں، سُن کر اُپجے کام   کہیں کبیر، بچار کیں، بسر جات ہے نام

بدچلنیوں کے قصے نہ سنا کرو، کیونکہ اُن کے سننے سے وسوسات نفسانی اٹھتے ہیں۔ کبیر داس جانچ کر کہتے ہیں کہ پھر خدا کا نام یاد نہیں رہتا۔

آٹھ پہر چونسٹھ گھڑی مَن میں یہی اندیس   یانگری پریتم بسے، میں جانوں پردیس

شبانہ روز مجھے فکر لگی رہتی ہے، گو میرا مطلوب اسی بستی (دل) میں آباد ہے، اور میں نادانی سے اُسے پردیس میں سمجھتا ہوں۔

کبیر توں کاہے ڈرے سر پر سُرجن ہار،   ہاتھی چڑھ کر ڈولئے، کوکر بھونک ہزار

کبیر جب تیرے سر پر خدا کا سایہ ہے، تو تجھے کس کا ڈر، مزے سے ہاتھی پر بیٹھا پھر، کتے ہزار بھونکا کریں تیرا کیا بگاڑیں گے۔

بھلی بھلی سب کوڈ کہے، بھلو چھما کو رُوپ   جاکے من میں چھما نہیں، سو بُوڑ گیو بھو کوپ

بھلی بھلی سب کہتے ہیں، یہ نہیں جانتے کہ بھلی خطا بخشی کی شان ہے، جس میں درگذر کا جوہر نہیں وہ دنیا کے کنوئیں میں ڈوب گیا۔

سر راکھے سر جات ہے، سر کاٹے سر سوے   جیسے باتی دیپ کی کٹی اجاری ہوے

سر کی خیر مانگنے سے آدمی مارا جاتا ہے اور قربانی سے سرفراز ہوتا ہے، جس طرح چراغ کی بتی کٹ کر اندھیرے میں روشنی کرتی ہے۔

کبیر وا دن یاد کر، پگ اوپر تل سیش   مرتیو لوک میں آے کیں، بھول گیو جگدیش

اے کبیر وہ دن یاد کر جب رحم مادر میں سر نیچے ٹانگیں اوپر تھیں، دنیائے فانی میں آکر خلاق عالم کو بھول گیا۔

جو جَن برہی نام کے سدا مگن من ماہنہ   جیوں درپن کی سندری کنہو پکری ناہنہ

عاشقانِ خدا ہر وقت دل میں مسرور رہتے ہیں، جس طرح آئینہ میں معکوس حسینہ کو کوئی نہیں پکڑ سکتا۔

آس پاس جو پھرت رہیں نپٹ پسا ہیں سوے   کیلا سوں لاگو رہے، تاکوں نکھن نا ہوے

ادھر اُدھر بھرنے والے دانے چکّی میں بالکل پس جاتے ہیں، مگر جو دانہ کلّی سے لگا رہ جاتا ہے، اس پر آنچ نہیں آتی۔

ایسی کرنی کیوں کری جو پاچھے پچھتائے — بووے پیڑ ببول کو آم کہاں سے کھائے

ایسے اعمال کیوں کئے جو اب پچھتاتا ہے۔ جو ببول کا درخت بوے وہ آم کیسے کھا سکتا ہے۔

بڑے بڑائی نا تجیں، چھوٹا بہو اِترائے — جب پیادہ فرضی بھیا، ٹیڑھا ٹیڑھا جائے

بڑے اپنی بڑائی نظرانداز کرکے کبھی اوچھا پن نہیں کرتے، شطرنج کا پیادہ جب فرضی بنے تو ٹیڑھا چلتا ہے۔

مور تور کی جیوری، بٹ باندھو سنسار — داس کبیرا کیوں بندھے، پایو ناؤں آدھار

من و تو کی رسّی میں دنیا جکڑی ہوئی ہے، کبیر داس کیونکر بندھے جس کو خدا کا سہارا مل گیا۔

میں اپرادھی جنم کو، نکھ سکھ بھرے وکار — تم داتا دکھ بھنجنا، میری کرو سنبھار

میں سارا کا گنہگار ہوں، میرے ہر ناخون میں برائیاں بھری ہیں، الٰہی! تو دُکھ درد دُور کرنے والا ہے۔ مجھے سنبھال۔

کبیر داس کی ساکھیاں لاتعداد ہیں جن کا شمار بھگت مال کے مصنف نابھاجی نے تو اربوں کھربوں تک پہنچا دیا ہے، تاہم اس غلو سے قطع نظر، اور علاوہ سینہ بہ سینہ کے ویسے بھی مطبوعہ کلام اور قلمی مجموعے جو ان کے پنتھیوں میں وراثتہً چلے آتے ہیں صحیح طور پر یا باقاعدہ شمار نہیں کئے جاسکتے، میں نے صرف ۱۵۸۳ ساکھیوں میں سے یہ کلام انتخاب کرکے تحت اللفظ ترجمہ کردیا ہے، تشریح نہیں کی، کہ آپ خود غور کرکے مزا لیں اور معلوم کریں کہ اس سادگی میں کیسی بلاغت ہے۔

میرزا فہیم بیگ فہیم چغتائی

ہے نام ترا مطلعِ دیوانِ تمنّا
تو وجہِ تمنّا ہے تو ایمانِ تمنّا

دنیا میں فقط ایک تمنّا ہے ہماری
سو تیری سلامت ہو وہ اے جانِ تمنّا

مصلحانِ قوم

مصلحانِ قوم میں ہزاروں خوبیاں ہیں اور ایک سے ایک بڑھ کر ہے مگر ایک خوبی اُن میں ایسی ہے (اور یہ سب میں ہے) کہ باقی سب خوبیاں بقرعید کے بکرے (گائے نہیں بکرے، اس ملک میں بقرعید بکرا عید ہے) کی طرح حلال ہو کر (نہیں، حرام ہو کر) رہ جاتی ہیں۔ مگر اِس خوبی کو بیان کرنے سے پہلے یہ بقرعید کا قصہ ختم کر لوں۔ بقر کی یا بکرے کی تو عید ہوتی نہیں۔ جہاں تک ان بے زبانوں کا تعلق ہے اس تہوار کا نام بقر قتل ہونا چاہیئے۔ عید تو ان کی ہوتی ہے جو بکرے بیچتے ہیں، یا جو نمازیں پڑھاتے ہیں یا جو مفت کا گوشت کھاتے ہیں۔ آمدم برسرِ مطلب۔ وہ کیا خوبی ہے جو باقی خوبیوں کو ڈائن بن کر کھا جاتی ہے، بیسیوں ننھی ننھی نیکیوں کا کلیجہ نکال لیتی ہے؟ وہ خوبی یہ ہے کہ ہر مصلحِ قوم کو یقین ہے کہ اس کے بھائی کا تجویز کردہ فلاحِ قوم کا نسخہ غلط ہے اور اس کا اپنا دستاندہ دوامی طور پر شفا بخش ہے۔ مصلح چاہے وہ ہجرت کا بندہ ہو کہ تنظیم کا آقا اس یقین کے بغیر مصلح ہو نہیں سکتا کہ اس کا اپنا رستہ ہی واحد صراط المستقیم ہے اور باقی سب لوگ چالباز ہیں۔ قوم باری باری سب پر ایمان لے آتی ہے یعنی باری باری قوم کو ہر ایک مُصلح سے انحراف کرنا پڑتا ہے اور تجربہ یہ بتاتا ہے کہ مصلحانِ قوم راستی پر ہیں اگر وہ یہ گلہ کریں کہ ان کی تجاویز پر پورا عمل نہیں ہوتا۔

کیا قوم اپنے مصلحان کو اس منتشر کن فلاحی پروگرام سے روک سکتی ہے؟ مجھے یقین ہے کہ قوم کامیاب ہو سکتی ہے۔ اگر مصلحانِ قوم یہ کہنا شروع کر دیں کہ تعلیم مت حاصل کرو، دولت مت جمع کرو، قرض خوب لو اور ادامت کرو تو ممکن ہے کہ قوم کی انحراف کی عادت اسے مجبور کر دے کہ وہ شائستہ، متمول اور شاندار زندگی میں جا گھسے۔ اِس ترکیب میں دو فائدے ہیں۔ ایک تو یہ کہ مصلحانِ قوم کے آبائی پیشہ میں فرق نہ آئے گا اور دوسرے یہ کہ قوم غلط رستے چل کر صراط المستقیم سے نہ بھٹکے گی گویا سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے گی۔

"فلک پیما"

دو غزلیں

(۱)

ابھی چھوٹی تمنّاؤں کی تابانی نہیں جاتی
وہی حسرت ہے دل میں آہ نادانی نہیں جاتی

گیا نقدِ دل و جاں لے کے اُس کی رونمائی کو
مری حیراں نگاہوں کی پشیمانی نہیں جاتی

تجھے مجھ سے چھپے صدیاں ہی گزریں آج تک لیکن
نظر کی بیکسی، دل کی پریشانی نہیں جاتی

وہ آنکھیں یوں بدل جائیں گی، یوں مجھ کو دغا دیں گی
یقینی بات ہے اے دل مگر مانی نہیں جاتی

نہ تو بدلا نہ میں بدلا مگر یہ کیا قیامت ہے
کہ اب مجھ سے تری صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

ملیں دو دل بہم یا رب تو شورِ الاماں کیسا
جہانِ فتنہ گر کی فتنہ سامانی نہیں جاتی

مرے تن میں نہیں اب روح لیکن یہ غضب کیا ہے
کہ مرنے پر بھی تکلیفِ گراں جانی نہیں جاتی

ابھی اُس کی جفائے ظاہری کو دل نہیں بھولا
ابھی یادِ نوازش ہائے پنہانی نہیں جاتی

ترے نغمے بدل کر ہو گئے نالے یہ دن آئے
مگر حامد تری مشقِ غزل خوانی نہیں جاتی

حامد علی خاں

(۲)

محبت کو یہاں ہم نے ہلاکِ بُغض و کیں دیکھا — جسے دیکھا اُسی کو دشنہ زیرِ آستیں دیکھا

اُدھر تیرے دلِ مظلوم کی بیچارگی دیکھی — اِدھر اپنے دلِ مرحوم کو اندوہگیں دیکھا

نگاہِ عشق میں وہ حُسن ہے، میں کیا کہوں تجھ سے — نہ اپنے سا حسیں پایا، نہ تجھ سا نازنیں دیکھا

وہ دل جو حُسن کا مسکن تھا اب الفت کی منزل ہے — خدا کا شکر ہے، تجھ کو جہاں کھویا وہیں دیکھا

مری اقلیم پر دارا و جم بھی رشک کرتے ہیں — جھکایا سر جہاں، افلاک کو زیرِ نگیں دیکھا

خمستاں میں اِدھر زاہد کو قرآں در بغل پایا — حرم میں اُس طرف رندوں کو بُت در آستیں دیکھا

شرابِ عشق مجھ کو اُس بلندی پر اُڑا لائی — کہ میں نے عرش کو بھی مثلِ دُردِ تہ نشیں دیکھا

بسا تُو ہی تصوّر میں تو ذکرِ ماسوا کیسا — تجھی کو ہر کہیں ڈھونڈا، تجھی کو ہر کہیں دیکھا

کہاں وہ جوہری حامد کہ پرکھے نقدِ معنی کو

میں کیسا ہوں، ابھی تک آئنہ میں نے نہیں دیکھا

حامد علی خاں

مانی

ٹیگور کا ایک عبرتناک افسانہ

(۱)

"ممانی!"

"سونے کی کوشش کرو جوتن! بہت رات ہو چکی ہے"

"اگر رات ہو چکی ہے تو اس کا خیال نہ کیجئے۔ اب میری زندگی کے چند روز اور باقی رہ گئے ہیں۔ ہاں مگر میں یہ سوچ رہا تھا کہ مانی کو اپنے میکے چلا جانا چاہیئے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اس کا باپ آج کل کہاں ہے؟"

"سیتارام پور میں!"

"ہاں سچ کہتی ہیں آپ! سیتارام پور۔ اس کو وہاں بھیج دیجئے۔ اس کو ایک مریض کے پاس زیادہ نہ ٹھہرنا چاہیئے۔ وہ خود بھی بہت نحیف اور لاغر ہے"۔

"مگر سنو تو بیٹے! تم کو ایسی حالت میں چھوڑ کر جانا وہ کیسے گوارا کر سکتی ہے؟"

"کیا اسے معلوم ہے کہ ڈاکٹروں نے کیا ——؟"

"لیکن وہ خود دیکھ سکتی ہے۔ کل کہیں اس کے کان میں یہ بات پڑ گئی کہ اسے اپنے میکے جانا پڑے گا تو روتے روتے اس کا برا حال ہو گیا"۔

دراصل مانی کے اس بیان میں سچائی کا شائبہ تک نہ تھا۔ مانی اور ممانی میں جو گفتگو ہوئی تھی وہ ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

"میری بیٹی! میرا خیال ہے کہ شاید میکے سے تمہارے پاس کوئی اطلاع آئی ہے کیونکہ مجھے خیال ہوتا ہے جیسے میں نے تمہارے چچازاد بھائی اننت کو یہاں دیکھا ہے"!

"ہاں، آئندہ جمعہ کو میری چھوٹی بہن کی کھیر چٹائی[1] کی رسم ہے۔ اس لئے میں سوچ رہی ہوں ——"

"بہت اچھا میری پیاری، اس کو ایک طلائی چمچا کیوں نہ بھیج دو۔ اس کو دیکھ کر تمہاری والدہ بہت خوش ہوں گی"۔

"نہیں میں خود جانے کے متعلق سوچ رہی ہوں کیونکہ میں نے اپنی چھوٹی بہن کو کبھی نہیں دیکھا اور اب اس کے دیکھنے کے لئے دل بے قرار ہے"۔

"اس سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ کیا تم جوتن کو تنہا چھوڑ کر چلی جاؤ گی؟ کیا تم نے سنا نہیں کہ ڈاکٹر نے اس کے متعلق کیا کہا ہے؟"

"لیکن اس نے کہا ہے کہ ابھی کوئی خاص سبب ——"

"اگر اس نے کہا بھی تو کیا ہوا تم خود جوتن کی حالت نہیں دیکھتیں؟"

---

[1] یہ وہ رسم ہے جس میں دودھ پینے والے بچے کو سب سے پہلی مرتبہ کھیر چٹاتے ہیں اس کے بعد رفتہ رفتہ دوسری چیزیں کھلاتے ہیں۔

"تین بھائیوں کے بعد یہ ایک لڑکی پیدا ہوئی ہے وہ بہت زیادہ ماں باپ کی چہیتی ہے' میں نے سنا ہے کہ اس کی کھیر چٹائی کی تقریب بہت دھوم دھام سے ہوگی۔ اگر میں نہ جاؤں تو اماں جان بہت ـــــــ؟"

"ہاں، ہاں میں تو تمہاری والدہ کا مزاج نہیں جانتی۔ البتہ یہ ضرور جانتی ہوں کہ اگر تم اس وقت جوتن کو چھوڑ کر چلی جاؤ گی تو تمہارے والد تم سے بہت ناراض ہوں گے"

"آپ اُن کو ایک خط لکھ دیجئے کہ یہاں پریشانی کی کوئی خاص وجہ نہیں ہے اور اگر میں وہاں جاؤں بھی تو ـــــــ"

"تمہارا کہنا صحیح ہے، اگر تم چلی بھی جاؤ تو دراصل کوئی بڑا نقصان نہ ہوگا۔ لیکن یہ خوب سمجھ لو کہ اگر میں تمہارے والد کو خط لکھوں گی تو جو کچھ میرے دل میں ہے سب کچھ صاف صاف بیان کردوں گی"۔

"تو پھر آپ کو لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے میں اپنے شوہر سے اجازت مانگ لوں گی اور وہ یقیناً ـــــــ"

"سن، او نادان لڑکی! میں نے تیرے سارے ناز نخرے اُٹھائے، سب باتیں صبر اور خاموشی سے برداشت کیں لیکن یہ حرکت تو لمحہ بھر گوارا نہ کروں گی۔ تیرا باپ مجھ سے خوب واقف ہے تو اس کا دھوکا نہیں دے سکتی"۔

جب ممانی اُس کے پاس سے چلی گئی تو ماتی بہت برگشتہ خاطر ہوگئی اور منہ لپیٹ کر اپنے بستر پر پڑ گئی۔

اس اثنا میں اس کی ہمسائی اور سہیلی آئی اور اُس نے اس افسردگی اور اضطراب کا سبب دریافت کیا۔

"اجی کیا بتاؤں؟ ـــــ ذرا دیکھو تو سہی، کہ کتنی بڑی شرم کی بات ہے کہ میری ایک ہی تو چھوٹی بہن ہے اب اس کی کھیر چٹائی کی تقریب ہونے والی ہے تو گھر کے لوگ مجھے اس میں شریک ہونے کے لئے نہیں جانے دیتے"۔

"ایں؟ میں تو سمجھتی تھی کہ تم جانے کا خیال تک نہ کررہی ہوگی، مگر اب معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا ارادہ کچھ اور ہی ہے، کیا شوہر کو ایسی نازک حالت میں چھوڑ کر چلی جاؤ گی ـــــــ؟"

"میں یہاں رہ کر بھی اُن کی کوئی خدمت نہیں کرتی اور اگر میں نے کبھی اس کی کوشش بھی کی تو بھی نہ کرسکی؛ اس گھر کی فضا اس قدر ناخوشگوار اور بے کیف ہے کہ میں تم سے سچ کہتی ہوں کہ ایک لمحہ بھی مجھے یہاں رہنا گوارا نہیں ہے"۔

"تم بھی عجیب عورت ہو۔!"

"عجیب سہی، لیکن میں تم لوگوں کی طرح بہانہ نہیں کرسکتی۔ میں حیلہ سازی کے فن سے بالکل ناواقف ہوں، اور ہمیشہ خاموش رہتی ہوں۔ کہ کہیں لوگ میری طرف سے کوئی بُرا خیال دل میں نہ پیدا کرنے لگیں"۔

"تو اچھا۔ اپنا منشا تو بتاؤ؟"

"میرا جانا بہت ضروری ہے اور مجھے جانے سے

کوئی روک نہیں سکتا۔"

"اُدئی۔ تم بھی عجیب شاہانہ دماغ کی عورت ہو!"

(۲)

محض یہ سن کر کہ مانی اپنے میکے بھیجے جانے کے خیال سے زار و قطار روئی۔ جوتن بہت بے قرار ہو گیا۔ بستر پر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ تکیہ کھینچ کر اس پر ٹیک لگائی اور پھر بولا۔ "مانی اس کھڑکی کو ذرا سا کھول دیجئے اور اس لیمپ کو یہاں سے لے جایئے۔"

کھڑکی کے باہر ہر طرف تاریکی اور سکوت چھایا ہوا تھا۔ تارے کھڑکی میں سے جھانک رہے تھے۔ جو سالہا سال سے بےشمار موت کے مناظر دیکھتے چلے آ رہے تھے۔

جوتن کو رات کے تاریک پردہ پر مانی کا درخشاں چہرہ منقوش نظر آیا اور اس نے دیکھا کہ مانی کی دونوں بڑی، بڑی، سیاہ اور خوبصورت آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان آنسوؤں میں ساری دنیا غرق ہو کر رہ جائے گی۔

مانی کو جوتن کا یہ سکون اور یہ خاموشی دیکھ کر کسی قدر اطمینان ہو گیا اور اس نے سمجھا کہ شاید وہ سو گیا ہے۔

یکایک وہ چونک پڑا اور بولا۔ "مانی آپ سب لوگوں نے یہ خیال کیا تھا کہ مانی اس قدر تنک مزاج ہے کہ وہ ہمارے گھر میں کبھی شاد اور مسرور نہیں رہ سکتی لیکن اب آپ دیکھتی ہیں ———"

"ہاں! میں اب دیکھ رہی ہوں، میرے بیٹے ——— میں غلطی پر تھی ——— لیکن امتحان سے آدمی کی حقیقت معلوم ہو جاتی ہے۔"

"مانی جان؟"

"پیارے بیٹے، سونے کی کوشش کرو۔"

"بہت اچھا، مگر سنیئے۔ جب میں یہ سوچا کرتا تھا کہ میں مانی کے دل پر فتح نہیں پا سکتا تو آخر ایک دن میں نے صبر سے اپنی اس ناکامی کے خیال کو برداشت کر لیا لیکن آپ ———!"

"نہیں پیارے، میں تم کو ہرگز یہ کہنے کی اجازت نہ دوں گی کہ میں نے نہیں برداشت کیا۔ تمہارے خیال سے میں نے بھی برداشت کر لیا تھا۔"

"ہمارے دماغ آپ جانتی ہیں کہ تو دۂ گِل نہیں ہیں جن کو زمین پر سے اُٹھا کر آسانی سے قبضہ میں کر لیا جائے میں نے اس بات کو محسوس کیا ہے کہ مانی کو خود اپنے دماغ کا حال معلوم نہیں اور ایک دو کسی شدید سانحہ ———"

"ہاں، جوتن تمہارا کہنا صحیح ہے۔"

"اس لئے میں نے پھر کبھی اس کے ضدی مزاج کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی۔"

مانی ایک سرد آہ ضبط کرتی ہوئی خاموش ہو گئی۔ اس نے ایک مرتبہ نہیں بلکہ بارہا یہ امر دیکھا تھا کہ جوتن رات رات بھر، بارش سے بھیگے ہوئے برآمدہ میں ٹہلتا رہتا ہے اور خوابگاہ میں نہیں جاتا۔ اکثر اوقات وہ سر کے درد سے مغلوب ہو کر لیٹ جاتا اور اس بات کا آرزومند ہوتا کہ اس کی مانی جانتی

تھی) کہ مانی آکر اس کا سر دبائے لیکن عین اسی وقت وہ سیر و تفریح اور تھیٹر میں جانے کی تیاریاں شروع کر دیتی تھی۔ اس پر بھی جب مانی پنکھا جھلنے جاتی تو وہ اس کو وہاں سے ہٹا دیتا۔ وہ اس سوزش قلب سے آشنا تھی جو جوتن کے سینہ میں مستور تھی اُس نے کئی بار جوتن سے یہ کہنے کی کوشش کی تھی۔ کہ "میرے پیارے لڑکے اس نادان لڑکی کے لئے اپنا دل اس قدر نہ کڑھاؤ۔ اس میں خود مانگنے کی خواہش پیدا ہونے دو۔ اس میں محبت کرنے کا جذبہ پیدا ہونے دو۔ اس کو چیزوں کے لئے رونا اور لسورنا سیکھنے دو۔" لیکن یہ باتیں کہی نہ جاسکتی تھیں۔ ممکن تھا کہ ان باتوں کو سمجھنے میں غلطی پیدا ہو جائے۔ جوتن نے اپنے من میں پریم کا ایک مندر تعمیر کیا تھا۔ اور اس مندر کی دیوی تنہا مانی تھی۔ اس کو اس خیال سے سخت تکلیف ہوتی تھی کہ اس کی قسمت میں محبت کا جو حصہ لکھا ہے۔ اُس سے وہ محروم کر دیا گیا ہے وہ بدستور اس کی پرستش اور پوجا کرتا رہا۔ قربانی کی گئی۔ اور اس طرح آرزو بر آنے کی توقع کبھی دل سے معدوم نہ ہوئی

مانی نے پھر ایک بار سوچا کہ شاید جوتن سو گیا ہے لیکن وہ یکایک پھر چیخ اُٹھا۔

"میں جانتا ہوں، آپ نے محسوس کیا تھا کہ میں مانی کے ساتھ راحت کی زندگی نہیں بسر کر رہا ہوں اس لئے آپ اُس سے ناراض ہو گئی ہیں لیکن مانی جان زندگی اُن ستاروں کے مانند ہے جو اس وقت آسمان پر پھولوں کی طرح رقصاں ہیں، وہ تمام تاریکی کو اپنے نورانی دامن میں نہیں

چھپا سکتے۔ بیچ بیچ میں خلا رہ جاتا ہے۔ ہم بھی زندگی میں غلطی کا ارتکاب کرتے ہیں اور غلط فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں اور پھر بھی اُس کے درمیان ایسے خلا رہ جاتے ہیں جن سے صداقت کی شعاعیں گزر کر ہم تک پہنچتی ہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہاں سے اس قدر مسرت اور شادمانی کے جذبات آگئے ہیں جن سے میرا دل آج رات معمور ہو گیا ہے۔"

مانی نے آہستہ آہستہ جوتن کا سر دبانا شروع کر دیا۔ اس کے آنسو تاریکی کا نقاب پہنے ہوئے تھے۔

"میں سوچ رہا تھا مانی، کہ وہ ایسی الھڑ اور کمسن ہے کہ معلوم نہیں اس وقت کیا کرے گی جب میں ——؟"

کمسن کہتے ہو جوتن؟ وہ خاصی سیانی اور سمجھ دار ہے میں بھی بہت کمسن تھی، جب میری زندگی، مسرت اور راحت کا دیوتا مجھ سے چھین لیا گیا تھا۔ لیکن وہ میرے من میں ہمیشہ کے لئے بس گیا تھا۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا یہ میرے لئے کوئی نقصان تھا؟ اس کے علاوہ کیا مسرت انسان کے لئے کوئی ضروری شے ہے؟"

"مانی جان —— ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب مانی کے دل میں بیداری کے آثار ہویدا ہوتے ہیں تو مجھے ——"

"جوتن۔ اُس کے لئے اپنا دل نہ دکھاؤ۔ کیا صرف اتنا کافی نہیں ہے کہ اس کے دل میں بیداری پیدا ہو جائے بیداری اور احساس!"

یکایک جوتن کو ایک بہاتی گیت یاد آگیا۔ جو اُس نے بہت عرصہ قبل سنا تھا۔

"او میرے دل! جب میرا پریم پجاری میرے آستانہ پر آیا تو تو بیدار نہ ہوا اور جب وہ واپس ہونے لگا تو تو اس کے قدموں کی آہٹ سن کر ہوشیار ہو گیا۔ آہ۔ تو تاریکی میں بیدار ہوا؟"

"مانی جان! کیا وقت ہے؟"

"نو بجے ہیں۔"

"ابھی نو ہی بجے ہیں' ـــ کیوں؟ میں تو سوچ رہا تھا کہ شاید دو یا تین بجے ہوں گے۔ آپ کو معلوم ہے کہ میری نصف شب' مغرب سے شروع ہوتی ہے' لیکن آپ مجھے سُلانا کیوں چاہتی ہیں؟"

"کیوں ـــ؟ تم کو معلوم ہے کہ تم کل رات کتنی دیر تک باتیں کرتے رہے تھے۔ اس لئے آج تم کو جلد سو جانا چاہیئے"

"کیا مانی سو گئی ہے؟"

"اونہہ ـــ وہ تمہارے لئے شوربا تیار کر رہی ہے"۔

"آپ مذاق کر رہی ہیں مانی! کیا واقعی وہ ـــ؟"

"یقیناً۔ تعجب کی کونسی بات ہے وہی تو تمہارے لئے ہر قسم کی چیزیں پکاتی ہے' وہ تو ایک چھوٹی سی' ہر وقت کام کاج میں مشغول رہنے والی عورت ہے"۔

"میرا خیال تھا کہ شاید آپ اس قابل نہیں ہے کہ ـــ"

"ایک عورت کو یہ تمام باتیں' سیکھنے کے لئے زیادہ وقت درکار نہیں ہوتا' ضرورت پڑے تو سب کچھ خود ہی آ جاتا ہے۔"

"صبح کو مچھلی کا شوربہ جو میں نے پیا اس قدر مزہ دار تھا کہ میں نے خیال کیا شاید آپ نے تیار کیا ہو گا"۔

"نہیں میرے بیٹے ـــ کیا تم خیال کرتے ہو کہ مانی مجھے تمہارے لئے کچھ کرنے دیتی ہو گی۔ وہ تو خود ہی تمہارے کپڑے بھی دھوتی ہے کیونکہ وہ جانتی ہے کہ تم کو میل اور غلاظت سے نفرت ہے' اگر تم اس قابل ہوتے تو دیکھتے کہ وہ تمہاری نشست گاہ کو کس قدر صاف ستھرا رکھتی ہے۔ اگر میں اس کو تمہارے کمرے کے گرد چکر لگانے دوں تو شاید وہ تمہارے لئے اپنی جان ہی دے دے لیکن دراصل وہ اسی آرزو میں مری جا رہی ہے"

"کیا مانی کی تندرستی ـــــ؟"

"ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ اسے بہت زیادہ تمہارے کمرے میں آنے کی اجازت نہ دینی چاہیئے۔ کیونکہ اس کا دل بہت نازک ہے' اور ذرا سی ٹھیس سے بھی چور چور ہو سکتا ہے"

"لیکن مانی جان! آپ اُسے یہاں آنے سے کس طرح روکتی ہیں؟"

"اس طرح کہ وہ میرے حکم کی تعمیل میں پس و پیش نہیں کرتی لیکن میں' اس کو ذرا ذرا دیر کے بعد تمہاری حالت کی خبر پہنچاتی رہتی ہوں"۔

ستارے آسمان میں قطرہ ہائے اشک کے مانند لرزاں تھے؛ جو تن نے اُس زندگی کا شکریہ ادا کرنے کے لئے' اپنا سر جھکا لیا' جواب اُس سے رخصت ہونے والی تھی۔

اُس نے ایک سرد آہ کھینچی اور کسی قدر بے صبری

سے کہا۔" مانی۔ اگر مانی ابھی جاگ رہی ہو تو کیا میں —— صرف ایک ؟"

"بہت اچھا بیٹے۔ ذرا صبر کرو۔ میں ابھی جا کر اس کو بلائے لاتی ہوں۔"

"میں اس کو بہت دیر تک اپنے پاس نہ روکوں گا۔ صرف پانچ منٹ کے لئے۔ مجھے اس سے ایک بہت ضروری بات کہنی ہے۔"

مانی آہ بھرتی ہوئی اٹھی اور مانی کو بلانے کے لئے چلی گئی۔ اس اثنا میں جوتن کی نبض تیز ہو گئی اور اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ بخوبی جانتا تھا کہ اس نے کبھی مانی سے اپنا رازِ دل کہنے کا موقع نہ پایا تھا۔ دونوں رباب ایک دوسرے سے مختلف تھے اور ان کو ہم آہنگ کرنا آسان نہ تھا۔ بارہا جوتن کے دل میں اس وقت رشک کے جذبات پیدا ہو جاتے تھے جب وہ مانی کو اپنی سہیلیوں کے ساتھ ہنستا ہوا اور کوئل کی طرح کوکتا ہوا، سنتا تھا۔ جوتن اپنے ہی سر اس کا الزام دھرتا تھا —— وہ سوچتا تھا کہ ان نادان لڑکیوں کی طرح 'ذرا' ذرا سی غیر مربوط اور دلچسپ باتیں میں کیوں نہیں کر سکتا ؟ یہ بات نہ تھی کہ اس میں ایسی باتیں کرنے کی صلاحیت نہ تھی، کیونکہ وہ اپنے ہم عمر دوستوں میں ہر قسم کے موضوع پر بہت آزادانہ گفتگو کر سکتا تھا۔ لیکن وہ مختصر گفتگو جو مردوں کی تفریح کا باعث ہوتی ہے۔ عورتوں کے لئے ایک سرے سے بے کیف اور غیر موزوں ثابت ہوتی ہے، تم ایک فلسفیانہ تقریر کو دیر تک جاری رکھ سکتے ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اپنے غیر متوجہ قارئین کی بھی زیادہ فکر نہ کرو۔ لیکن مختصر گفتگو میں کم سے کم دو زبانوں کے اتحاد کی ضرورت ہوتی ہے —— شام کے وقت جب جوتن مانی کے ساتھ کھلے ہوئے برآمدہ میں بیٹھا کرتا تھا تو اکثر اس امر کی کوشش کرتا تھا۔ کہ کوئی دلچسپ اور مسلسل گفتگو اس سے کرے لیکن اس کو کبھی اس امر میں کامیابی نہ ہوئی۔ اس کی گفتگو کا تار ہمیشہ ٹوٹ جاتا تھا۔ یہاں تک کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شام کی خاموشی کو بھی اس ندامت کا احساس ہے جوتن کو یہ یقین ہو گیا تھا۔ کہ میرے پاس بیٹھ کر گفتگو کرنے میں مانی کا دل نہیں لگتا اور وہ وہاں سے اٹھ کر چلے جانے کے لئے بے چین رہتی ہے اس لئے وہ چاہتا تھا کہ کوئی تیسرا شخص اُن کے پاس آ جائے کیونکہ بہ نسبت دو کے تین آدمیوں میں گفتگو آسانی سے ہوتی ہے۔ اس وقت وہ یہ سوچ رہا تھا۔ کہ جب مانی میرے پاس آئے گی تو وہ میں کیا کہونگا لیکن اس قسم کی مصنوعی اور سوچی ہوئی باتوں سے اس کی تسکین نہ ہوتی تھی۔ وہ اس امر سے ڈر رہا تھا کہ کہیں آج کی یہ پانچ زریں ساعتیں بھی رائیگاں نہ جائیں۔ تاہم اس کے لئے رازدارانہ گفتگو کر لے کے لئے صرف چند لمحات اور باقی رہ گئے تھے۔

(۳)

"یہ کیا ہے میری بیٹی ؟ تم کہیں جا تو نہیں رہی ہو کیوں —— ؟"

"ہاں۔ میں سیتا رام پور جا رہی ہوں"۔

"کیا کہہ رہی ہو؟ تم کو کون لے جائے گا۔؟"

"آنا تھ!"

"آج نہیں بیٹی۔ پھر کسی روز!"

"لیکن ریل کا کمپارٹمنٹ محفوظ کرا لیا گیا ہے"۔

"اس سے کیا ہوتا ہے، یہ نقصان تو آسانی سے برداشت کیا جا سکتا ہے۔ کل چلی جانا۔ صبح بالکل تڑکے"۔

"ممانی صاحبہ۔ میں آپ کے اچھے اور برے شگون میں یقین نہیں کرتی۔ آج جانے میں کیا نقصان ہے؟"

"جوتن تم سے کچھ کہنا چاہتا ہے"۔

"اچھا تو ابھی بہت وقت ہے۔ میں جا کر "ان" کو دیکھے آتی ہوں۔

"بہت خوب میں یہ نہ کہوں گی لیکن میں وہاں زیادہ دیر تک نہ ٹھہروں گی۔ کیونکہ کل میری بہن کی "کھیر چٹائی" ہے اور مجھے آج ہی جانا ضروری ہے"۔

"آہ میری بیٹی! خدا کے لئے ذرا میری یہ بات مان لو۔ اپنی عجلت اور پریشانی کو ضبط کر کے تھوڑی دیر کے لئے اس کے پاس بیٹھ جاؤ۔ تمہاری حرکتوں سے اس کو معلوم نہ ہونے پائے کہ تم جا رہی ہو"۔

"اس کے لئے میں کیا کر سکتی ہوں۔ ریل میرا انتظار تھوڑا ہی کرے گی۔ آنا تھ دس منٹ میں واپس آتا ہو گا میں اتنی دیر تک "ان کے پاس بیٹھ سکتی ہوں"

"نہیں صرف اتنا کافی نہ ہو گا۔ کسی قدر برہم ہو کر: میں تجھے ایسی پریشانی کی حالت میں ہرگز اس کے پاس نہ جانے دوں گی۔ چڑیل کہیں کی۔ ارے جانتی بھی ہے کہ جس آدمی کی روح کو تو اس بے دردی کے ساتھ اپنی بے پروائی سے زخمی کر رہی ہے وہ بہت جلد اس دنیا سے رخصت ہونے والا ہے۔ میں تجھے آگاہ کئے دیتی ہوں کہ تو مرتے دم تک آج کا دن یاد رکھے گی! خدا سب کچھ دیکھتا ہے، خدا سب کچھ دیکھتا ہے۔ تجھے ایک روز معلوم ہو جائے گا"۔

"ممانی! آپ کو ایسا تو نہ چاہیئے کہ مجھے اس طرح کوسیں"۔

"آہ میرے پیارے بیٹے۔ میرے لخت جگر۔ تو کیوں اس طرح جی رہا ہے؟ اس گناہ کی کوئی حد نہیں ہے، پھر بھی میں اس کو روک نہیں سکتی"۔

تھوڑی دیر کے بعد ممانی مریض کے کمرے میں واپس آئی اس کو توقع تھی کہ جوتن سو گیا ہو گا۔ لیکن اس کے قدم رکھتے ہی جوتن نے حرکت کی، ممانی نے داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔ "تم نے اس کی حرکت سنی؟"

"کیا ہوا؟ — کیا مانی نہیں آئی۔ ممانی جان آپ نے اتنی دیر کہاں لگا دی؟"

"میں نے یہاں سے جا کر دیکھا کہ وہ زار و قطار رو رہی ہے، کیونکہ اس کی غفلت سے تمہارے پینے کا سارا دودھ جل گیا تھا۔ میں نے اس کو تسلی دیتے ہوئے کہا کہ تم روتی کیوں ہو۔ دودھ تو اور بہت سا مل سکتا ہے لیکن وہ اس خیال سے بہت برہم ہے کہ وہ اس قدر بے پروا واقع ہوئی ہے کہ تمہارے پرہیزی کھانے کی احتیاط بھی نہیں کر سکتی۔ بڑی

مشکلوں دشواریوں کے بعد کہیں جا کر میں نے اس کو چپ کرایا ہے اور لے جا کر بچھونے پر لٹا دیا ہے اس لئے آج میں اس کو تمہارے پاس نہیں لائی۔ اس کو سو جانے دو"

جوتن مانی کے جلد واپس نہ آنے سے بے چین ہو رہا تھا لیکن اس کی باتوں سے اُس کو کسی قدر قرار حاصل ہو گیا وہ قدرے اس امر سے ڈر بھی رہا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جب مانی کا زندہ پیکر اُس کے سامنے آئے تو اس کے دل میں مانی کا جو مجسمہ ہے مجروح ہو جائے۔ ایسے واقعات اس کی زندگی میں پہلے بھی پیش آ چکے تھے —— اس خیال سے' اس کا دل مسرت سے لبریز ہو گیا کہ مانی کو اس کے بیٹے کا دودھ جل جانے سے بہت تکلیف ہوئی۔

"مانی جان!"

"کہو بیٹا۔ کیا ہے؟"

"مجھے بالکل یقین ہو چلا ہے کہ میری زندگی کے لمحات ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ لیکن مجھے اس سے کوئی تکلیف اور رنج نہیں ہوتا۔ آپ میرے لئے اپنا دل نہ دکھائیں۔ رنج مت کریں۔"

"نہیں پیارے میں اپنا دل نہ دکھاؤں گی۔ مجھے اس بات میں ذرا بھی یقین نہیں ہے کہ صرف ایک "زندگی" ہی اچھی چیز ہے' اور "موت" نہیں!"

"مانی! میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ موت سب سے لطیف اور شیریں ہے"۔

جوتن نے آسمان کی تاریک وسعتوں کو دیکھتے ہوئے محسوس کیا کہ جیسے مانی ہی موت کے بھیس میں اُس کے پاس آ رہی ہے' اس کا شباب غیر فانی نظر آ رہا تھا۔ اور ستارے دعاؤں کے پھول تھے جن کو ادر گیتی نے اُس کے اوپر بکھیر دیا تھا۔ ایسا معلوم ہونے لگا جیسے ایک بار پھر اس نے اپنی عروسِ نو کا چہرہ تاریکی کی چادر میں دیکھا[1] ہے۔

رات کی بے پناہ تاریکیاں' مانی کی سیاہ اور نورانی آنکھوں کی محبت پاش تنویروں سے معمور ہو گئیں۔ مانی اس گھر کی دلھن' ایک چھوٹی الھڑ لڑکی' ایک دنیاوی مجسمہ میں تبدیل ہو گئی۔ جوتن نے اپنا ہاتھ اٹھا کر کہا "آخر کار نقاب اُٹھ گیا۔ اس گہری سیاہی میں' تیرا پردۂ راز چاک چاک ہو گیا آہ! سندر مورت تو نے کتنی دفعہ اپنی یاد سے میرے دل کو سلا ہے لیکن شاید اب تیری یاد مجھے زیادہ نہ تڑپا پائے گی۔

(۴)

"مجھے تکلیف ضرور ہے مانی! لیکن ویسی نہیں جیسی آپ خیال کرتی ہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے میرا تمام درد' دکھ' میری زندگی سے الگ ہو رہا ہے —— جیسے ایک بار بردار کشتی' جو کثرتِ بار کی وجہ سے بہت آہستہ آہستہ چلتی ہے' جب کسی اُتار پر پہنچ جاتی ہے تو تمام بوجھ کے ساتھ' انتہائی تیزی سے بہنے لگتی ہے —— اسی طرح میری تکلیف اور دکھ کی گھڑیاں بھی بہت تیزی سے بہی چلی جا رہی ہیں' تاہم میں ان گھڑیوں کو دیکھ سکتا ہوں' لیکن اب ان پر میرا بس نہیں چل سکتا —— لیکن مانی میں نے مانی کو دور روز سے نہیں دیکھا۔"

---

[1] "جلوہ" کی رسم میں' دولھا اور دولھن کو ایک چادر اڑھا دیتے ہیں۔ اور اس کے اندر دولھا اپنی دولھن کا منہ آئنہ میں دیکھتا ہے۔

"جوتن مجھے دوسرا تکیہ اپنے سرہانے رکھنے دو۔"

"ایسا معلوم ہوتا ہے ممانی! کہ مانی نے بھی مجھے اس کشتیٔ غم واندوہ کی مانند چھوڑ دیا ہے جو بہاؤ پر بہی جا رہی ہو۔"

"بیٹے یہ ذرا سا انار کا عرق تو چوسو۔ تمہارا حلق سوکھ گیا ہوگا۔"

"میں نے کل ایک وصیت لکھی ہے، کیا وہ میں نے آپ کو دکھائی ہے؟ مجھے تو یاد نہیں پڑتا۔"

"مجھے دکھانے کی کیا ضرورت ہے جوتن؟"

"جب میری والدہ کا انتقال ہوگیا تو میرے پاس کچھ نہ تھا۔ آپ نے میری پرورش کی، مجھے پروان چڑھایا اس لئے میں کہہ رہا تھا ——"

"بیکار باتیں نہ کرو بیٹے۔ میرے پاس صرف یہی مکان اور تھوڑی سی جائداد تھی، اور باقی سب تم نے کمایا ہے۔"

"لیکن یہ مکان ——؟"

"اب وہ کہاں، کیونکہ تم نے اس میں اس قدر اضافہ کردیا ہے کہ اب اس بات کا پتہ لگانا دشوار ہوگیا ہے کہ میرا مکان کہاں واقع تھا۔"

"مجھے پورا یقین ہے کہ مانی کے دل میں آپ کی درحقیقت جو محبت ہے ——"

"ہاں۔ ہاں میں جانتی ہوں جوتن مگر اب تم سوجاؤ تو اچھا ہے۔"

"گو میں نے ساری جائداد مانی کے نام لکھ دی ہے لیکن ممانی جان عملی طور پر وہ سب آپ ہی کی ہے۔ وہ کبھی آپ کے حکم کی تعمیل میں عذر نہ کرے گی۔"

"پیارے بیٹے تم اس کے لئے کیوں اس قدر پریشان ہوتے ہو؟"

"میرے پاس جو کچھ ہے وہ آپ ہی کی بدولت مجھے حاصل ہوا ہے جب آپ میری وصیت دیکھیں تو ہرگز ایسا خیال دل میں نہ لائیں کہ ——"

"کیا کہہ رہے ہو جوتن تم؟ کیا تمہارا خیال ہے کہ تم اپنی ساری متاع مانی کو دے دوگے تو میں اس سے رنجیدہ ہوجاؤنگی؟ نہیں بیٹے۔ مجھے اس قدر کم ظرف نہ سمجھو!"

"لیکن آپ کو بھی ——"

"ادھر دیکھو جوتن! میں تم سے ناراض ہوجاؤں گی۔ تم روپیہ سے میری تسلی کرنا چاہتے ہو!"

"آہ۔ ممانی، میں کیا بتاؤں میری خواہش کیا ہے، کاش میں آپ کو روپیہ سے زیادہ قیمتی چیز دے سکتا۔"

"وہ تم دے چکے جوتن ——— کافی سے زیادہ دے چکے کیا صرف اتنا ہی میرے لئے کافی نہیں ہے کہ تم نے آکر میرے ویران گھر کو آباد کیا؟ تم نے مجھے اتنا دے دیا ہے کہ اگر اب وہ کبھی ختم بھی ہوجائے تو مجھے تم سے کوئی گلہ نہ ہوگا۔

ہاں، ہاں، پیارے سب کچھ مانی کے نام پر لکھ دو۔ اپنا گھربار، روپیہ، پیسہ، گاڑی، زمین، غرض جو کچھ اب موجود ہے۔ میں اب اس قدر بھاری بوجھ کی متحمل نہیں ہوسکتی۔"

"در اصل مجھے معلوم ہے کہ اب زندگی سے لطف اندوز

ہونے کا جذبہ آپ میں فنا ہو چکا ہے۔ لیکن مانی اس قدر کم عمر ہے کہ ــــــ"

"نہیں نہیں تمہیں زبان سے ایسی باتیں نہ نکالنی چاہئیں۔ اگر تم اس کو اپنا سارا مال اور جائداد دینا چاہتے ہو تو دے دو لیکن، جہاں تک لطف اٹھانے کا تعلق ہے ــــــ"

"کیا ہرج ہے ممانی؟ اگر وہ لطف اٹھاتی رہے؟"

"نہیں نہیں۔ اس کے لئے لطف اٹھانا ناممکن ہو جائے گا اس کا حلق سوکھ کر کانٹا بن جائیگا اور یہ سب چیزیں اس کو خاک اور راکھ کے برابر نظر آئیں گی۔"

جوتن خاموش ہو گیا۔ وہ اس امر کا فیصلہ نہ کر سکتا تھا کہ یہ سچ ہے یا نہیں، اور آیا یہ ایک قابلِ تاسف امر ہے یا نہیں کہ اس کے بغیر دنیا مانی کے لئے بے کیف اور بے مزہ ہو جائے گی۔ ستارے اس کے دل میں یہ کہتے ہوئے معلوم ہوئے "درحقیقت یہ صحیح ہے۔ ہم ہزاروں بلکہ بے شمار برسوں سے اس بات کو دیکھتے چلے آ رہے ہیں اور جانتے ہیں کہ دنیا کی تمام رنگینیاں، تمام سامانِ عیش و طرب بے سود اور عارضی ہیں۔

جوتن نے آہ سرد بھر کر کہا۔ "درحقیقت جو کچھ دینے کے قابل ہے اس کو ہم اپنے پیچھے چھوڑ کر نہیں جا سکتے"

"جو کچھ تم دے رہے ہو بیٹے، یہ کچھ کم نہیں ہے میری تو یہ دعا ہے کہ جو کچھ تم اس کو دے کر جا رہے ہو وہ اس کی قدر کرنا سیکھ جائے۔"

"ممانی ذرا انار کا عرق دو۔ مجھے پیاس معلوم ہو رہی ہے کیا مانی کل میرے پاس آئی تھی؟"

"ہاں وہ آئی تو تھی لیکن تم سو رہے تھے۔ وہ تمہارے سرہانے بیٹھ کر بہت دیر تک پنکھا جھلتی رہی اور پھر تمہارے کپڑے دھونے چلی گئی۔"

"کس قدر تعجب کی بات ہے مجھے یقین ہے کہ میں ابھی وقت خواب میں دیکھ رہا تھا کہ مانی میرے کمرے میں داخل ہونے کی کوشش کر رہی ہے۔ دروازہ ذرا سا کھلا ہوا تھا اور وہ اس کو دھکا دے رہی تھی لیکن وہ کھل نہ رہا تھا۔ تاہم ممانی آپ کو چاہئیے تھا کہ اس کو کم سے کم یہ دیکھ لینے دیتیں کہ میں اب مر رہا ہوں۔ ورنہ میری موت کی خبر اس کے لئے سخت ناقابلِ برداشت صدمے کا باعث ہو گی۔"

"بیٹے، یہ دوشالہ اپنے پیروں پر ڈال لو۔ تمہارے بہت ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔"

"نہیں ممانی، میں اپنے جسم پر اس قسم کی کوئی چیز نہیں ڈال سکتا۔"

"جانتے بھی ہو جوتن! یہ دوشالہ تمہارے لئے مانی نے بنایا ہے۔ جب اس کے سونے کا وقت ہوتا تھا تو وہ اس کو لے کر بیٹھ جاتی تھی۔ اور بنا کرتی تھی اور یہ کل ہی بن کر ختم ہوا ہے"

جوتن نے دوشالہ لے لیا اور بہت آہستہ آہستہ اس کو اپنے ہاتھوں سے مس کیا۔ اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس دوشالے میں وہ لطافت اور نزاکت ہے جو مانی میں موجود ہے اور اس کے خیالاتِ محبت اس دوشالے کے تاروں کے ساتھ ساتھ لمبی متواتر راتوں کی بیداری میں بُن دیئے گئے ہیں۔ وہ

صرف اُون کا بنا ہُوا نہ تھا بلکہ اس میں مانی کے ہاتھوں کے مَس کرنے کی لطافت بھی شامل تھی۔ اس لئے جب ممانی نے دوشالہ اس کے پیروں پر ڈال دیا تو اس کو ایسا محسوس ہونے لگا جیسے گزشتہ متعدد راتوں تک مانی نے بیٹھ کر اس کے تھکے ہوئے پیروں کو اپنے نازک نازک ہاتھوں سے دبایا ہو۔

"لیکن ممانی، میں خیال کر رہا تھا کہ مانی کو بُننا نہیں آتا"

"کوئی کام سیکھنے میں زیادہ وقت نہیں لگتا۔ اس میں شک نہیں کہ میں نے اس کو سکھایا ہے تاہم اس میں بہت سے نقائص رہ گئے ہیں۔"

"رہنے دیجئے نقائص۔ ہم اس کو پیرس کی نمائش میں تو بھیجنے جا نہیں رہے ہیں۔ یہ اپنے نقائص کے باوجود میرے پیروں کو گرم رکھے گا"

اب جونؔ نے دماغ میں مانی کا تصوّر سما گیا کہ وہ آتش کو بیٹھی ہوئی دوشالہ بُن رہی ہے۔ یہ کس قدر لطف آمیز اور ساتھ ہی ساتھ تکلیف دہ کام تھا۔ اس کے بعد پھر اُس نے انتہائی محبت سے اس دوشالہ کو اپنی انگلیوں سے آہستہ آہستہ مَس کیا۔

"ممانی کیا ڈاکٹر نیچے موجود ہے؟"

"ہاں وہ آج رات یہیں ٹھہرے گا۔"

"لیکن براہِ کرم اُس سے کہہ دیجئے کہ مجھے خواب آور دوا دینے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اس سے مجھے راحت نصیب نہیں ہوتی، بلکہ میری تکلیف میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ مجھے بس آج جاگتا ہی رہنے دیجئے۔ جانتی ہیں آپ ممانی کہ میری شادی بیساکھ کی چودھویں رات کو ہوئی تھی۔ کل وہی دن ہوگا اور اُسی رات کے تارے کل آسمان پر چمک رہے ہوں گے۔ شاید مانی اس کو بھول گئی ہو۔ میں آج اُس کو اُس روز کی یاد دلانا چاہتا ہوں۔ ذرا اس کو ایک منٹ کے لئے بلایئے تو . . .

آپ خاموش کیوں بیٹھی ہیں؟ میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر نے آپ سے کہہ دیا ہے کہ میں اس قدر کمزور اور نحیف ہوں کہ ذرا سے ہیجان سے ——— لیکن میں آپ سے سچ کہتا ہوں، ممانی۔ اگر آج مجھے صرف چند منٹ مانی سے باتیں کرنے کو مل جائیں تو مجھے پھر کسی خواب آور دوا کی حاجت نہ ہوگی۔ ممانی! اس طرح نہ رویئے۔ میں بالکل اچھا ہوں۔ آج میرا دل جذبات سے لبریز ہو گیا ہے ایسا میری زندگی میں کبھی نہیں ہوا۔ اسی لئے تو میں آج مانی کو دیکھنے کے لئے بیتاب ہوں ——— نہیں نہیں ممانی میں آپ کو اشکبار دیکھ کر تاب نہیں لا سکتا۔ آپ چند روز سے بہت ہی خاموش رہنے لگی ہیں۔ آج رات آپ کو کیوں اس قدر تکلیف اور بے چینی ہے؟"

"آہ جونؔ۔ میں سمجھتی تھی کہ اشکباری کرتے کرتے تمام آنسو ختم ہو چکے ہوں گے لیکن میں دیکھ رہی ہوں کہ ابھی ایک دریا اور موجزن ہے۔ میں اب ان آنسوؤں کو ضبط کرنے سے معذور ہوں۔"

"مانی کو بلایئے۔ میں اس کو اپنی شادی کی رات یاد دلاؤں گا۔ تاکہ کل وہ ———"

"میرے بیٹے میں جا رہی ہوں۔ شمبھو دروازے پر بیٹھا رہیگا اگر کسی بات کی ضرورت ہو تو اس کو پکار لینا۔"

ممانی مانی کے بچھونے کے پاس گئی اور زمین پر بیٹھ کر رونے لگی اور کہنے لگی۔ "آہ۔ آجا۔ آجا۔ صرف ایک مرتبہ آجا۔ او سنگدل لڑکی! اُس کی آخری آرزو تو پوری کرنے۔ جس نے سب کچھ تجھ کو دے ڈالا ہے ——— آہ جو خود ہی جاں لب ہو رہا ہے اس کو مارنے سے کیا حاصل؟"

جوتن نے قدموں کی چاپ سُن کر چونکتے ہوئے کہا۔

"مانی ———!"

"میں شمبھو ہوں۔ کیا سرکار نے مجھے پکارا ہے؟"

"اپنی مالکہ کو یہاں بھیج دے۔"

"کون مالکہ ———؟"

"ارے اپنی مالکہ کو ———!"

"وہ ابھی واپس نہیں آئیں!"

"واپس؟ کہاں سے؟"

"سیتارام پور سے!"

"وہ وہاں کب گئیں؟"

"تین دن ہوئے ان کو جاکر۔"

یہ سُن کر جوتن کا سارا جسم بے حس ہو گیا اور سر چکرانے لگا۔ وہ تکیوں پر سے نیچے سرک گیا اور اُس دوشالے کو ٹھوکر مار کر زمین پر گرا دیا جو اُس کے پیروں پر پڑا ہوا تھا۔

جب بہت دیر کے بعد ممانی واپس آئی تو جوتن نے مانی کا نام تک نہ لیا۔ اور ممانی کو یہ گمان ہوا کہ شاید وہ مانی کے متعلق سب کچھ بھول گیا ہے۔

یکایک جوتن بول اٹھا "ممانی کیا میں نے آپ سے اپنا وہ خواب بیان کیا جو میں نے کل رات کو دیکھا تھا؟"

"یہ کون سا خواب؟"

"وہی جس میں مانی دروازے کو دھکا دے رہی تھی۔ اور دروازہ ایک انچ سے زیادہ کھلنے کا نام نہ لیتا تھا اور وہ اندر نہ آسکنے کی وجہ سے باہر ہی کھڑی تھی۔ اب مجھے معلوم ہو گیا کہ میرے مرنے تک مانی باہر ہی کھڑی رہے گی۔"

ممانی خاموش رہی۔ اُس نے محسوس کیا کہ وہ جھوٹی باتوں سے جوتن کے لئے جو نیا آسمان تیار کر رہی تھی وہ زمین پر گر چکا ہے ——— اگر رنج و الم کی گھٹا کسی پر چھاتی ہے تو اس پر صبر کرنا مناسب ہے ——— جب خدا کا قہر نازل ہوتا ہے تو اس سے نجات ملنا محال ہے۔

"ممانی جس محبت کا آپ نے میرے ساتھ اظہار کیا ہے وہ میرے سات جنم تک مجھے یاد رہے گی۔ میں نے اپنی زندگی کی فضاؤں کو اس محبت کے نور سے معمور کر لیا ہے۔"

"سچ کہتے ہو میرے بچے! لیکن تم جانتے ہو کہ میں ایک عورت ہوں اور اس لئے مجھ میں کمزوریاں بھی موجود ہیں۔ میں نے اپنی ساری زندگی اس کوشش میں صرف کر دی کہ تم کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے لیکن پھر بھی میں اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوئی۔"

"ممانی جان! افسوس ہے کہ مجھے زندگی نے اتنا موقع نہ دیا کہ جو کچھ میں نے یہاں سیکھا تھا اس پر عمل کرتا۔ لیکن دوسرے جنم میں اس کی تکمیل ہو جائے گی۔ اُس وقت میں آپ کو دکھاؤں گا کہ ایک آدمی کیا کر سکتا ہے۔ میں نے صحیفۂ حیات میں یہ سبق بھی پڑھا ہے کہ کسی شخص کی محبت میں

ستی ہونا بہت بڑا فریب اور دھوکا ہے۔"

"خواہ تم کچھ بھی کہو۔ میرے پیارے بیٹے۔ مگر تم نے خود کبھی کسی بات کو نہیں سمجھا۔ بلکہ ہمیشہ دوسروں پر چھوڑ دیا کہ وہ سمجھ لیں۔"

"ممانی صاحبہ پھر بھی میں ایک بات پر بجا طور پر ناز کر سکتا ہوں کہ میں نے اپنی مسرتوں کے حصول کے لئے کبھی کوئی غیر منصفانہ رویہ اختیار نہیں کیا اور نہ کبھی اپنے حقوق منوانے پر سختی سے زور دیا۔ کیونکہ جھوٹ اور تصنع سے میری تسکین اور تشفی ناممکن تھی۔ کون ہے ممانی ــــــــ؟

وہ کون ہے؟"

"کہاں ــــــــ؟ جوتن وہاں تو کوئی نہیں ہے۔"

"ممانی جان، جاکر دوسرے کمرے میں دیکھئے تو ــــــــ میں نے خیال کیا کہ میں ــــــــ"

"نہیں پیارے مجھے تو کوئی نظر نہیں آتا۔"

"لیکن مجھے تو صاف طور پر یہی معلوم ہوا کہ ــــــــ"

"نہیں جوتن۔ کچھ نہیں ہے۔ تم چپ رہو۔ دیکھو ڈاکٹر صاحب آرہے ہیں۔"

ڈاکٹر نے داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "ادھر دیکھئے۔ آپ کو مریض کے پاس اتنا نہ بیٹھنا چاہیئے۔ آپ کی وجہ سے ان کے جذبات میں ہیجان اٹھتا ہے آپ جاکر سو جائیے۔ میرا مددگار ان کے پاس رہے گا۔"

"نہیں ممانی میں آپ کو نہ جانے دوں گا۔"

"اچھا بیٹا ــــ تو میں اُس کونے میں چپ چاپ بیٹھی رہوں گی۔"

"نہیں، نہیں، آپ کو میرے پاس بیٹھنا چاہیئے میں آپ کا ہاتھ نہ چھوڑوں گا آپ ہی کے ہاتھوں میں پرا ان چڑھا اور آپ ہی کے ہاتھوں سے خدا مجھے لے گا۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "بہت اچھا۔ آپ ٹھہر سکتی ہیں لیکن جوتن بابو آپ کو ان سے باتیں ہرگز نہ کرنی چاہئیں، ہاں اب دوا پینے کا وقت ہوگیا ہے پی لیجئے۔"

"میرے دوا پینے کا وقت؟ یہ بالکل لغو اور فضول بات ہے اس کا وقت ختم ہو چکا۔ اب مجھے دوا پلانا محض دنیا کو دھوکا دینا ہے۔ اس کے علاوہ میں موت سے ذرا بھی نہیں ڈرتا ممانی جان۔ موت اپنے کام میں لگی ہے آپ کیوں ایک ڈاکٹر کی شکل میں مزید تکلیف اور بے چینی کا سامان کر رہی ہیں؟ ــــ اس کو یہاں سے دور کیجئے۔ باہر نکال دیجئے اس وقت بس مجھے تنہا آپ کی ضرورت ہے اور کوئی نہ چاہیئے ــــ آپ کے سوا کوئی نہیں۔ زیادہ دروغ کی ضرورت نہیں ہے ــــــــ"

"میں ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے یہ کہنا چاہتا ہوں۔ کہ اس ہیجانِ جذبات سے آپ کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔"

"تو جائیے ڈاکٹر صاحب مجھے زیادہ پریشان نہ کیجئے ــــــــ ممانی کیا ڈاکٹر چلا گیا ــــــــ

بہت اچھا ہوا۔ ہاں اب آیئے اور میرا سر اپنی گود میں لے لیجئے۔"

"بہت اچھا بیٹے! مگر اب تم سو جاؤ۔"

"نہیں ممانی جان۔ اگر میں سو جاؤں تو پھر کبھی بیدار نہ ہونگا۔ مجھے اب تھوڑی دیر تک بیدار رہنے کی ضرورت ہے۔ کیا آپ کو کوئی آواز نہیں سنائی دیتی؟ —— کوئی شخص آرہا ہے!"

(۵)

"بیٹا جوتن۔ ذرا اپنی آنکھیں تو کھولو۔ دیکھو وہ آگئی ہے۔ آنکھیں ایک مرتبہ کھول کر دیکھو!"

"کون آگیا ہے؟ —— یہ بھی خواب ہے شاید؟"

"خواب نہیں لال! مانی اپنے والد کے ساتھ آ گئی ہے!"

"تم کون ہو؟"

"کیا اتنا بھی نہیں دیکھ سکتے۔ یہ دیکھو تمہاری مانی ہی!"

"مانی —— ؟ کیا دروازہ کھل گیا ہے؟"

"ہاں بیٹے۔ وہ تو پورا کھلا ہوا ہے!"

"نہیں ممانی جان وہ دوشالہ ہے وہ دوشالہ ہے یہ محض ایک فریب ہے۔"

"یہ دوشالہ نہیں ہے جوتن! یہ تمہاری مانی ہے جو تمہارے قدموں پر پڑی ہوئی ہے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اس کے لئے دعا کردو۔ مانی اس طرح مت روؤ۔ اس وقت چند لمحوں کے لئے خاموش رہو۔ رونے کے لئے ایک عمر پڑی ہے!"

(ٹیگور) —— محشر عابدی

روداد محبّت

میں نے ہنگام صبح، اے دنیا!! | تیرے گلشن سے پھول اک توڑا
اپنے پہلو میں دی جگہ اُس کو | چُبھ گیا دل میں لیکن اک کانٹا
شام ہوتے ہی میں نے یہ دیکھا | گل تھا پژمردہ، درد باقی تھا

حسن و خوشبو میں اک سے اک بڑھ کر | اور بھی ہوں گے تجھ میں گل پیدا
میری گل چینیوں کا وقت مگر —— | ایک مدت ہوئی کہ ختم ہوا

اور اب جب کہ رات طاری ہے
گُل نہیں پاس، درد باقی ہے

(ٹیگور) —— مجاز ردولوی

ضمیر انتقام گیر

یہ کیسا ستم ہے یہ کیسی جفا ہے — یہ کیا ظلم مجھ پر ارے ہو رہا ہے

کلیجے میں چرکے یہ کیوں لگ رہے ہیں — جگر کون بیٹھا ہوا داغتا ہے

خدا جانے نشتر چبھوتا ہے کوئی — کہ ناگوں نے دل کو مرے ڈس لیا ہے

گلے میں کسی نے لگا دی ہے پھانسی — مرا دم بھی اللہ گھٹنے لگا ہے

یہ رہ رہ کے آرا چلاتا ہے کوئی — کہ تیزاب سر پر مرے پڑ گیا ہے

مجھے ہائے کروٹ بھی لینی ہے دوبھر — مرے روئیں روئیں میں کانٹا چبھا ہے

کسی نے پپوٹوں میں بھر دی ہیں مرچیں — کہ آنکھوں پہ جلتا دیا دھر دیا ہے

رگوں میں مری بجلیاں دوڑتی ہیں — لہو بھی مرا ہائے کھولا ہوا ہے

درندے مجھے پھاڑ کھاتے ہیں شاید — مرے تن کی بوٹی سے بوٹی جدا ہے

بھیانک سی شکلیں نظر آ رہی ہیں — جدھر دیکھیے قہر کا سامنا ہے

کوئی تیز خنجر اُٹھاتا ہے مجھ پر — کوئی سر پہ تلوار سونتے کھڑا ہے

مجھے مار ڈالو مجھے ختم کر دو — اذیّت کی لوگو کوئی انتہا ہے

وہ توپوں پہ توپیں کہیں دغ رہی ہیں — ابھی میں نے کڑکے پہ کڑکا سُنا ہے

وہ دیکھو وہ دیکھو بھڑکتے ہیں شعلے — جہنم کا شاید دہانہ کھُلا ہے

حذر الحذر اے تغافل کے بندے — سبق لے سبق لے یہ عبرت کی جا ہے

عازی آف گوردھا

دکن میں آریاؤں کا داخلہ

اس عنوان سے جنوری ۱۹۳۴ء کے ہمایوں میں مولوی محمد حسین صاحب ادیب کا ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ اس پر جناب اگستیہ سنیاسی نے اپنا تبصرہ بھیجا ہے جو ہم بجنسہٖ ذیل میں درج کر رہے ہیں۔ اس تبصرہ پر مولوی محمد حسین صاحب ادیب نے بھی اظہار خیال کیا ہے یہ مضمون بھی مسٹر اگستیہ سنیاسی کی تنقید پر ایک نظر" کے عنوان سے موجودہ مضمون کے بعد شائع ہو رہا ہے۔ "ہمایوں"

پیارے ایڈیٹر جی۔

آپ کے رسالہ ہمایوں کے سالگرہ نمبر میں ایک مضمون بنام "دکن میں آریاؤں کا داخلہ" شائع ہوا ہے۔ اُس کے متعلق اور مضمون زیر بحث کے متعلق۔ ساتھ والے چند خیالات ارسال کرتا ہوں۔ امید ہے میرے اردو پر زیادہ دھیان نہ دیتے ہوئے درج رسالہ فرما دیں گے۔

مجھے آپ کو تکلیف دینے کی ضرورت اس لئے محسوس ہو رہی ہے کہ عام طور پر جو یہ خیال زور پکڑے ہوئے ہے کہ ہندوستان میں مختلف نسل ہا اور مختلف مذہب ہا کے لوگ، آباد ہیں۔ وہی ہماری آپس کی منافرت کا بڑا سبب ہے۔ سکولوں میں و دیگر ہر جگہ ہم کو ہر روز یہی سبق پڑھایا جاتا ہے۔ حالانکہ ہم سب ایک ہی نسل سے ہیں اور ہمارے مذاہب بھی ایک ہی درخت کی مختلف شاخیں ہیں۔ کاش کہ ہم کو معلوم ہو جائے کہ ہم سب کے اندر ایک ہی آریہ خون رواں ہے تو اس اصول کے مطابق کہ خون پانی سے گاڑھا ہوتا ہے ہم بہت جلد ایک ہو جائیں

اگر اس مضمون میں لکھی گئی کسی بات کے متعلق کسی حوالہ کی ضرورت ہو تو میں ہر وقت حاضر ہوں۔ آپس میں وچار کرنا فرض ہے تاکہ سچائی پر پہنچا جاوے۔

مولوی محمد حسین صاحب ادیب نے اپنے مضمون میں رامائن کو تو ایک فرضی قصہ کہانی کہہ کر ٹال دیا ہے اور پانی نی رشی کی گرامر سے تاریخ جغرافیہ کے متعلق ثبوت پیش کرنے کی کھینچا تانی کی ہے۔ خیال رہے کہ جو لوگ رامائن کو قصہ بتانے لگے ہیں۔ اُن کا ایسا کہہ دینا کوئی ثبوت نہیں مانا جا سکتا۔ خاص کر جب کہ تمام پرانا سنسکرت لٹریچر واقعات رامائن کی تصدیق کرتا ہے۔ اور رام۔ راون۔ اگستیہ۔ وغیرہ ہستیوں کی زندگی کے واقعات کو صحیح ثابت کرتا ہے۔ ہندو جاتی اور ہندو تہذیب پر اس سے بڑھ کر اتیاچار اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس کے بزرگوں کی ہستی سے ہی انکار کیا جا رہا ہے۔

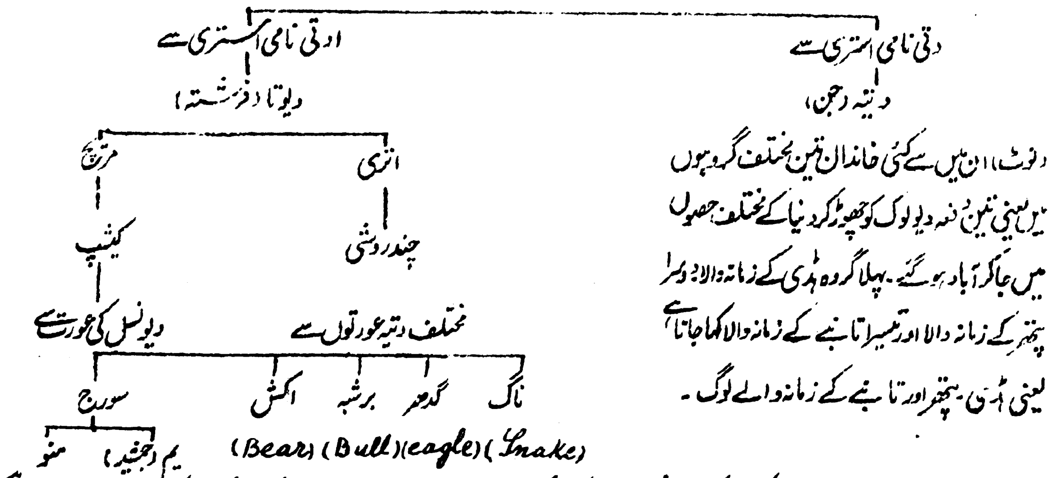
یاد رہے پانی نی رشی کی گرامر کوئی تاریخ یا جغرافیہ کی کتاب نہیں ہے اور اس میں دکن کی ریاستوں کا ذکر ہونا ضروری نہ تھا دکن میں سنسکرت رائج نہ تھی، اس لئے سنسکرت کی گرامر میں اس علاقہ کا ذکر کیوں ہوتا۔ پانی نی قندھار کا رہنے والا تھا۔ اس نے دکن کی یاترا نہ کی ہوگی۔ البتہ اگر وہ کوئی جغرافیہ یا تاریخ کی کتاب تصنیف کرتا اور اس میں دکن کا ذکر نہ کرتا۔ تب تو یہ کہنا ٹھیک بھی ہوتا۔ کہ اس کے زمانہ میں دکن میں آریہ لوگوں کا دخل نہ ہوگا۔ لہٰذا پانی نی کی گرامر کا اس بارہ میں ذکر کرنا محض کھینچا تانی ہے۔ پانی نی نے دریاؤں یا پہاڑوں یا ریاستوں کی کوئی فہرست نہیں دی ہے۔ راقم مضمون کو معلوم ہونا چاہیئے کہ کاتیائن اور کوٹلیہ دو مختلف آدمی ہوئے ہیں۔ پانی نی کی گرامر پر وارتکا لکھنے والا رشی کاتیائن تھا اور چندر گپت موریا کو سلطنت دلانے والا اور ارتھ شاستر لکھنے والا شخص کوٹلیہ تھا جس کا اصلی نام چانکیہ ہے۔ کوٹلیہ تو خطاب ہے۔ ان کو ایک سمجھ کر زمانہ کا تعین کرنا کس طرح ٹھیک ہو سکتا ہے۔ اس ایک غلطی سے تمام مضمون بے جان ہوتا ہے۔

آریہ اور غیر آریہ

اس مضمون کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے سب سے پہلے یہ جان لینا چاہیئے کہ آریا اور غیر آریا کی تمیز محض غلط ہے۔ دنیا کی قدیم اور موجودہ سب نسلیں آریہ نسل سے تھیں۔ اور ہیں۔ پدم پوران وغیرہ پرانی سنسکرت کتب میں سب سے پہلی نسل انسانی کی پیدائش کے متعلق حسب ذیل لکھا ہے:-

برہما

مقام رہائش قطب شمالی (بہشت یا دیولوک)



اس سے ظاہر ہے۔ کہ آریہ اور غیر آریہ کی تمیز ایک غلط فہمی ہے۔ اگر تمیز کرنا ہو۔ تو دیوتا اور غیر دیوتا (دیتہ) کی تمیز کی جا سکتی ہے اور کہا جا سکتا ہے

کہ دیولوک کے سوا باقی دنیا جس میں ہندوستان بھی شامل ہے سب سے پہلے دیتہ لوگ آباد ہوئے لیکن وہ غیر آریہ نہ تھے۔ وہ بھی آریہ ہی تھے۔ ان کے بعد آریہ نسل کا دوسرا خاندان یعنی دیوتا لوگ بھی کسی زمانہ میں دیولوک سے چلے آئے اور پہلے آئے ہوئے دیتہ آریہ لوگوں کو فتح کر کے مختلف ملکوں پر قابض ہو گئے۔ اور ان دیتہ آریہ لوگوں کو درانوڑ یعنی بھگائے ہوئے لوگ۔ دسیو یعنی (Aboriginal) اصلی باشندے وغیرہ نام دے دیئے۔

پرانی سنسکرت کتب میں لکھا ہے۔ کہ اول اول تمام دنیا پر راکشش لوگ قابض اور راجیہ کرتے تھے۔ پھر وشنو یعنی سورج نے راکششوں کو مار کر دیوتاؤں کو قابض کرا دیا۔ اور ان کا راجیہ ہو گیا۔ رفتہ رفتہ دیو اور راکشس ایک ہو گئے۔ چنانچہ راون باپ کی طرف سے راکشس تھا۔ وہ ایک راکشس استری سے دشٹروا رشی کا بیٹا تھا۔

رامائن میں یہ بھی درج ہے۔ کہ رام کے ڈنڈک بن جانے سے پہلے وہاں مختلف آریہ رشی بڑی تعداد میں اپنے آشرم بنا کر آباد تھے اور رام باری باری اُن کے آشرموں میں گئے۔

رامائن میں یہ بھی لکھا ہے۔ کہ اگستیہ رشی جب دکشن بھارت کی طرف جانے لگے اور بندھیاچل پر پہنچے تو بندھیاچل اُن کے سامنے زمین پر لیٹ گیا اور انہوں نے اس کو یہ حکم دیا کہ جب تک میں واپس نہ آؤں تم اسی طرح لیٹے رہنا۔ اگستیہ لوٹ کر آئے نہیں اور بندھیاچل اسی طرح لیٹا پڑا رہا۔ چنانچہ لفظ اگستیہ کے معنی بھی یہی ہیں۔ کہ جو جا کر واپس نہ لوٹے۔ اس کا مطلب صاف طور پر یہ ہے کہ اگستیہ سے پہلے گو آریہ لوگ دکن میں چلے جاتے تھے۔ مگر بہت تکلیف اٹھاتے تھے اور عام طور پر نہ جا سکتے تھے اگستیہ نے اپنے سداچار اور زور بازو سے دکن میں جانے کا راستہ ایسا صاف کر دیا کہ کوئی تکلیف ہی نہ رہی۔

اتنا ہی نہیں بلکہ لکھا ہے کہ اگستیہ نے تین چلو کر کے سمندر کو پی لیا۔ جس کے صاف معنی یہ ہیں۔ کہ اگستیہ رشی نے تین مرتبہ بالی، جاوا، سماٹرا وغیرہ سمندری جزائر کی یاترا کی۔ اور وہاں آریہ تہذیب کو پھیلایا۔ چنانچہ آج تک جاوا وغیرہ میں اگستیہ کو دیوتا مان کر پوجا جاتا ہے۔ دکشن بھارت کی سب سے پرانی زبان تامل ہے۔ اُس کی سب سے پہلی گرامر اگستیہ نے لکھی تھی۔

ان تمام مختصر باتوں نے ثابت کر دیا ہے کہ دیوتا نسل کے آریہ دکن میں رام سے بھی پہلے جا چکے تھے۔ بلکہ لنکا پر راج کر چکے تھے اور اگستیہ کے بعد تو جانے آنے میں کوئی رکاوٹ بھی نہ رہ گئی تھی اور کرپہ بندھیاچل کے راستے گئے تھے۔

اگستیہ سنیاسی

(سابق وہنیت ملٹے بی۔ اے ایل ایل بی وکیل

آنریری پرنسپل رادھا کرشن ہائی سکول جگراؤں

مسٹر اگسنتیہ سنیاسی کی تنقید پر ایک نظر

لاہور کے مشہور رسالہ "ہمایوں" کے سالنامہ بابت ۱۹۳۴ء میں میرا ایک تاریخی مضمون بعنوان "دکن میں آریاؤں کا داخلہ" شائع ہوا ہے۔ اس پر جناب اگسنتیہ سنیاسی صاحب آنریری پرنسپل آر۔کے ہائی اسکول جگراؤں (سابق مسٹر وبینت رائے بی۔اے۔ایل۔ایل بی۔وکیل) نے ایک تنقید لکھی ہے۔ سنیاسی صاحب کی نیک نیتی۔ فراخ نظری۔ بے تعصبی۔ ذوق علمی اور خوشگوار لب ولہجہ قابل ستائش ضرور ہے۔ ان کی تحریر سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اپنے پہلو میں ایک دردمند دل رکھتے ہیں جو ملک کے فرقہ وارانہ منافشات اور جماعتی تنازعات سے کڑھا کرتا ہے۔ وہ مختلف قوموں اور نسلوں کو ایک ہی رشتۂ اخوت میں منسلک کر دینے کے آرزومند ہیں۔ یقیناً ان کا یہ مقدس جذبہ لائق احترام ہے لیکن میرے نزدیک یہ ضروری نہیں ہے کہ اتحاد و اتفاق کے قیام کے لئے اس بات کا پرچار کیا جائے کہ ہندوستان کے تمام باشندے متحد النسل و متحد اللون ہیں جو حقیقت اور واقعیت سے کوسوں دور ہے مختلف النسل اقوام کے درمیان بھی اخوت و مودت کا رشتہ اس تبلیغ کے ذریعے قائم کرنے کی کوشش کی جاسکتی ہے کہ تمام بنی نوع انسان کی آفرینش ایک ہی جوہر سے ہے۔ بلکہ انسانی ہمدردی کا دائرہ اس تصور سے اور بھی وسیع کیا جاسکتا ہے کہ تمام مخلوق ایک ہی صانع کردگار کی آفریدہ ہے چنانچہ "خدا کی ابوّیت اور بنی نوع انسان کی اخوت" حامل انجیل کا مشہور مقولہ ہے۔ بہرحال کسی فرد واحد کے یہ کہہ دینے سے کہ تمام اہل ہند کی رگوں میں ایک ہی قسم کا آریائی خون رواں دواں ہے تاریخی واقعات کی تکذیب نہیں ہوسکتی۔ آریہ اور غیر آریہ کی تفریق کوئی فرضی و بے بنیاد بات نہیں ہے بلکہ وہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے چنانچہ ان دونوں قوموں کے بغض و عداوت اور پیہم معرکہ آرائیوں کے واقعات سے رگ وید کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔ اگر سب کے اندر آریہ خون رواں ہوتا تو آئر اور نائر۔ زنّار بند اور اچھوت۔ آرج اور پاریہ کے درمیان اتنی وسیع خلیج کیونکر حائل ہوتی جس کو پاٹنے کی ہر امکانی سعی آج تک نامشکور رہی ہے۔ انسان کے درمیان رنگ و نسل کی تفریق پہلے بھی قائم تھی اور اب بھی قائم ہے۔ اب اس کو مٹانے کی کوشش کامیاب نہیں ہوسکتی۔ البتہ لوگوں کو یہ سمجھانے کی ضرورت ہے کہ "محض حسب و نسب اور لون و نسل کا امتیاز تفاخر و تفوق کی چیز نہیں ہے۔ فرقے اور قبیلے صرف اس لئے ہوتے ہیں کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ ورنہ تم میں خدا کے نزدیک بڑا وہ ہے جس کے اعمال اچھے ہوں اور جو پرہیزگار ہو"۔ سیاسی نقطۂ نظر سے بھی اتحاد قومی کا ذریعہ توحید مقصد اور اشتراک عمل ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اہل ملک کے آگے ایک اعلیٰ نصب العین پیش کیا جائے اور تمام افراد کو بلا امتیاز مذہب و ملت اس کے حصول کے لئے مشترکہ کوشش کی دعوت دی جائے۔ چند ہی سال پیشتر ملک دکن میں برہمن اور غیر برہمن کی معاشرتی جنگ زوروں پر جاری تھی جس کی وجہ یہی تھی کہ برہمن خود کو آریہ کہہ کر غیر برہمنوں پر اپنا تفوق و برتری جتاتے تھے اور ان کو ذلیل و حقیر خیال کرتے تھے۔ تاریخ ہند

کی پرانی کتابوں میں بھی دراویڑوں کو وحشی قوم بتایا جاتا تھا اور آریہ تمام ہندی تہذیب و تمدن کے واحد اجارہ دار سمجھے جاتے تھے لیکن تحقیق قریبہ نے ثابت کر دیا ہے کہ دراویڑ بھی ایک عظیم الشان تمدن کے حامل تھے اور موجودہ ہندو مذہب کی تشکیل میں آریہ اور دراویڑ دونوں نے برابر کا حصہ لیا ہے۔ ایسی صورت میں کسی فرقہ کو دوسرے فرقہ پر ترجیح و برتری کا حق نہیں ہے۔ آریہ اور غیر آریہ سب کو ملک کی فلاح و بہبود کے لئے دوش بدوش کوشش کرنی چاہیئے۔ یہی میرے مضمون کا ماحصل ہے۔

بہرحال میں نے اپنا مضمون اخلاقی یا مذہبی نقطۂ نگاہ سے نہیں لکھا تھا بلکہ میرے پیشِ نظر خالص مورخانہ مقصد تھا۔ سنیاسی صاحب 'رامائن'، مہابھارت اور پورانوں کے تمام مافوق العادت واقعات اور خلاف قیاس بیانات کو حرف بحرف صحیح باور کرتے ہیں یہ محض ان کی خوش عقیدگی اور زود اعتقادی کا نتیجہ ہے۔ ورنہ نہ صرف پروفیسر جیکوبی۔ میکڈونل میکسملر اور ونسنٹ سمتھ جیسے یوروپی مستشرقین بلکہ مسٹر بھنڈارکر۔ آر۔ سی۔ دت۔ ٹی۔ آر سیش آئنگر اور کرشنا سوامی آئنگر جیسے ہندی مبصرین بھی ان واقعات کو محض افسانوی و صنمیاتی خیال کرتے ہیں، چنانچہ آج تک کسی ہوشمند مورخ نے ہندی رزمیات کے عجیب و غریب واقعات کو تاریخ ہند کا سنگِ بنیاد قرار نہیں دیا ہے۔ البتہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان رزمیہ کتب کے مطالعہ سے قدیم ہندی تہذیب و تمدن پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

سنیاسی صاحب 'رام۔ راون۔ اگستیہ وغیرہ کا ذکر کر کے فرماتے ہیں کہ "ہندو جاتی اور ہندو تہذیب پر۔ اس سے بڑھ کر اور کیا اتیاچار ہو سکتا ہے کہ اس کے بزرگوں کی ہستی ہی سے انکار کیا جا رہا ہے"۔ واضح رہے کہ کسی بزرگ کی ہستی سے انکار کرنا اور بات ہے اور اس بزرگ کے متعلق خوش عقیدہ لوگوں کے گھڑے ہوئے خلاف قیاس واقعات اور محیر العقول کرامات کو تاریخی اہمیت نہ دینا اور بات ہے۔ اگر کوئی شخص قصہ حاتم طائی اور داستان امیر حمزہ کو پایۂ اعتبار سے ساقط سمجھے تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ حاتم طائی اور حضرت امیر حمزہ کی ہستی ہی کا منکر ہے۔ ممکن ہے کہ رام۔ راون۔ اگستیہ وغیرہ انسانی پیکر میں چمنستانِ عالم کی سیر کو آئے ہوں اور ان کے روشن کارناموں نے قلوب انسانی کو مسخر کر لیا ہو لیکن امتدادِ زمانہ نے ان ہستیوں کے گرد عجائب و غرائب کا جو خیرہ کُن ہالہ تیار کر دیا ہے وہ تمامتر شاعرانہ تخیل کی پیداوار ہے جس میں تاریخی عنصر اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ رامائن کے متعلق تحقیق دوست مؤرخین کا خیال ہے کہ اجودھیا میں زمانہ قدیم سے رام نامی ایک ہیرو کے شجاعانہ کارناموں کے متعلق بہت سے گیت اور قصّے زبان زد چلے آ رہے تھے۔ بالآخر والمیکی نامی ایک شاعر کی جودتِ طبع نے ان گیتوں اور قصوں میں دیومالائی اور صنمیاتی عناصر شامل کر کے ان سے ایک عظیم الشان رزمیہ کی عمارت تعمیر کی اور اس کو رامائن سے موسوم کیا۔ زمانہ مابعد میں وقتاً فوقتاً اس پر مختلف شعرا اپنے تخیل کا رنگ و روغن چڑھاتے اور اس میں ترمیم و اضافہ کرتے رہے تاآنکہ دوسری صدی عیسوی میں رامائن نے اپنی موجودہ مستقل و مکمل صورت اختیار کی۔ اسی طرح مہابھارت کا سنگِ بنیاد وہ لڑائی ہے جو بھارت اور پنچالہ کی دو ہمسایہ حکومتوں کے درمیان

ہوئی تھی اور جس میں آس پاس کے راجاؤں نے بھی شرکت کی تھی۔ جس طرح ہومر نے ٹرائے کے کسی حقیقی محاصرہ کی دھندلی یاد کی بنا پر "ایلیڈ" تصنیف کی جو ایک بے نظیر ادبی شاہکار ہے اسی طرح بھارت اور پنچالہ کی مقامی جنگ کے متعلق مروجہ گیتوں کی بنا پر ایک ذہین شاعر کرشنا دوائی پائنا نے مہابھارت تصنیف کی جو آٹھ ہزار اشلوکوں پر مشتمل تھی۔ بمرور زمانہ مذہبی خیالات و اعتقادات میں تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ اس رزمیہ میں بھی ترمیم و اضافہ ہوتا گیا۔ چنانچہ تیسری صدی قبل مسیح میں وشیم پائنا نامی ایک جادو بیان شاعر نے اشلوکوں کی تعداد چوبیس ہزار تک پہنچا دی۔ اس کے بعد مہابھارت میں سرعت کے ساتھ اضافہ ہوتا گیا۔ اور پہلی صدی قبل مسیح کے اواخر میں جبکہ ساآتی شاعر کے بالقول مہابھارت نے اپنی مستقل و معین ہیئت اختیار کی تو اشلوکوں کی تعداد ایک لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ عام طور پر مہابھارت کی تصنیف بیاس رشی سے منسوب کی جاتی ہے لیکن تحقیق جدیدہ سے ثابت ہے کہ بیاس کسی فرد واحد کا نام نہیں ہے بلکہ اس کے معنی "مصنف" کے ہیں اور اس کا اطلاق ہر اس شاعر پر ہوسکتا ہے جس نے مہابھارت کے کسی باب یا کسی جزو کی تصنیف یا ترمیم و اضافہ میں حصہ لیا ہو۔ غرض کہ دکن اور جنوبی ہند کے متعلق علما و شعرا کی جغرافی معلومات میں جوں جوں اضافہ ہوتا گیا رامائن اور مہابھارت کی تفصیلات و جزئیات میں بھی ترقی ہوتی گئی۔ علاوہ بریں ہر دور میں تاریخی صحت و صداقت ہندی اعجوبہ پسندانہ مذاق پر قربان ہوتی رہی۔ چنانچہ بندر۔ لنگور۔ ناگ۔ گرڈ۔ ریچھ۔ بھینسا۔ سور۔ مرگا وغیرہ جنگلی جانوروں کے مہاتی افسانہ کو تاریخ سے کیا واسطہ؟ تاریخی واقعات کی تحقیق میں ایسے افسانے ہماری کیا رہبری کرسکتے ہیں۔

پورانوں کو بھی کوئی مورخ اپنی تکیہ گاہ نہیں بنا سکتا۔ ان میں ہر جگہ انتہائی غلو و مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔ اعجوبہ پسندی کا مذاق قدم قدم پر نمایاں ہے۔ اگرچہ پوران زمانہ مابعد کی پیداوار ہیں چنانچہ مسٹر رومیش چندر دت نے ۵۰۰ء سے ۱۰۰۰ء تک کے زمانہ کو پورانی عہد قرار دیا ہے۔ تاہم پورانوں کے مصنف اظہار قدامت کے لئے ساتویں اور آٹھویں صدی قبل مسیح کے تاریخی واقعات کو بھی پیشین گوئی کی شکل میں ظاہر کرتے ہیں۔ مثلاً مگدھ کے پرادیوتا خاندان کے راجاؤں کے متعلق جنہوں نے ۷۴۵ق م سے ۶۳۷ق م تک حکومت کی وشنو پوران میں مرقوم ہے کہ "بیر ہادرتھ خاندان کے آخری راجہ رپُنجے کو اس کا وزیر سونیکا قتل کرکے اپنے بیٹے پرادیوتن کو تخت پر بٹھائیگا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا پالک۔ پھر پالک کا بیٹا ویساکھا دپا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا جنک پھر جنک کا بیٹا نندی وردھن یکے بعد دیگرے راج کریں گے۔ ان پانچوں راجاؤں کی حکومت ۱۳۸ سال تک قائم رہے گی۔

تاریخ میں زمانہ کا تعین بڑی اہمیت رکھتا ہے لیکن اس معاملہ میں پورانوں کے مصنفوں نے بڑی بے احتیاطی سے کام لیا ہے۔ وہ مختلف خاندان کے معاصر راجاؤں کو بھی متوالی خیال کر لیتے ہیں چنانچہ پورانوں میں موریا سلطنت کے قیام اور کیلاکلایاؤ کے زوال کے درمیان ۲۵۰۰ سال کا فصل بتایا گیا ہے۔ معتبر وثائق سے ثابت ہے کہ چندر گپت موریا کا سنہ جلوس ۳۲۲ق م

تھا اس لئے کیلا کلا یا دنا کے زوال کا سال ۲۱۷۸ء ہونا چاہیئے۔ پورانوں کے مطابق گپتا خاندان کیلا کلایا ونا کے زوال کے بعد قائم ہوگا۔ اگرچہ گپتا خاندان کے عظیم المرتبت فرمانروا ۳۲۰ء سے ۴۵۵ء تک اپنی آن بان دکھا کر سپرد خاک ہوگئے اور اب ان کی ہڈیوں کا بھی پتہ نہیں ہے لیکن پورانوں کے حسابی بیان کے لحاظ سے ہمیں چاہیئے کہ گپتا خاندان کے ظہور کے لئے ابھی ڈھائی صدیوں کا انتظار کریں۔ کیونکہ گپتا سلطنت پورانی ترتیب زمانہ کے مطابق ۲۱۷۸ء میں قائم ہوگی۔

مری خاک بھی لحد میں نہ رہی امیر باقی — انہیں مرنے کا بھی اب تک نہیں اعتبار ہوتا

پورانوں کے برہمن مصنفین کی یہ ذہنیت بھی ملاحظہ کے قابل ہے کہ انہوں نے برہمن نواز راجاؤں کی تعریف میں تو زمین و آسمان کے قلابے ایک کر دیئے ہیں لیکن جین اور بودھ مذہب کے بڑے سے بڑے بادشاہ کے کارناموں پر بھی پانی پھیر دیا ہے۔ وشنو پوران میں چندر گپت کے برہمن مشیر کار کوتلیہ کی دانشمندی۔ تدبر۔ دور اندیشی اور بہادری کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے لیکن ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کی معاشری۔ مذہبی اور اخلاقی فضا میں انقلاب عظیم پیدا کر دینے والے اور تمام ممالک متمدنہ پر اپنی شہرت و عظمت کا سکہ بٹھلانے والے فرمانروا اشوک اعظم کا صرف نام گنا دینا کافی سمجھا گیا ہے۔

الغرض رامائن۔ مہابھارت اور پورانیں مذہبی و اخلاقی لحاظ سے کتنی ہی اہم تصنیفات کیوں نہ ہوں لیکن تاریخی نقطۂ نظر سے ان کے خلاف قیاس بیانات اور خارق عادت واقعات پایۂ اعتبار سے ساقط ہیں۔ تاریخی استناد کے لئے یہ لٹریچر بالکل ناموزوں ہے۔

دکن میں نہ صرف رامچندر جی کے روشن کارناموں سے بلکہ ارجن کی معرکہ آرائیوں اور سہدیو کی فوجی مہموں سے بھی مدرسہ کا بچہ بچہ واقف ہے لیکن تاریخ کی کسوٹی پر یہ واقعات کھرے ثابت نہیں ہوتے۔ اگر بالفرض محال ان فوجی دھاووں کو صحیح مان بھی لیا جائے تو اس سے میرے مضمون پر کوئی اعتراض عاید نہیں ہوتا۔ کیونکہ مضمون کے شروع ہی میں درج ہے کہ بہت قدیم زمانہ سے اکے دکے آریہ رشی گوشۂ عافیت کی تلاش میں بندھیاچل کو عبور کر کے ڈنڈک رن میں آتے تھے اور کسی ندی کے کنارے اپنا آشرم قائم کر کے گیان دھیان میں مشغول رہتے تھے۔ ابتداءً وحشی باشندوں نے انہیں بہت تنگ کیا لیکن بالآخر وہ ان کے اعلیٰ کردار اور تقدس و تجرد کی زندگی سے متاثر ہو کر اُن کی تعظیم کرنے لگے۔ رشیوں کے بعد چند چھتری سورما بھی آئے اور یہاں کی وحشی قوموں سے مصروف پیکار ہوئے۔ لیکن ملک پر ان فوجی دھاووں کا کوئی نمایاں اثر نہیں ہوا اور نہ دراوڑی تہذیب و تمدن میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی۔ لہذا میں نے اپنے مضمون میں اس زمانہ کی تعیین کی کوشش کی ہے جبکہ آریہ جوق کے جوق دکن میں آکر توطن پذیر ہوئے۔

سنیاسی صاحب نے اگستیہ رشی کی شخصیت پر بہت زور دیا ہے۔ میں نے بھی اگستیہ رشی کے وجود سے انکار نہیں کیا ہے

بلکہ میرے مضمون میں ان کا نام خاص طور پر درج ہے۔ اگستیہ رشی کی شخصیت کو مبالغہ آمیز افسانوی وضمنیاتی واقعات کے کہر میں غائب کر دیا گیا ہے۔ لیکن جب تاریخ کی ظلمت شگاف نگاہ اس بزرگ ہستی پر پڑتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ تمام آریہ رشیوں میں جو ریاضت ومجاہدہ کی غرض سے ڈنڈکارن میں وارد ہوئے سب سے ممتاز شخصیت اگستیہ رشی کی تھی۔ زمانۂ قدیم میں شمالی ہند اور دکن کے درمیان چھ زبردست قدرتی موانعات حائل تھے۔ کوہ بندھیاچل۔ کوہ ست پڑا۔ دریائے نربدا۔ دریائے تاپتی۔ دریائے مہاندی اور گونڈوانہ کا گھنا جنگل۔ ان شش گانہ عوائق میں سب سے خطرناک طور پر مزاحم بندھیاچل کا ناقابل عبور پہاڑ تھا۔ روایات میں بیان کیا گیا ہے کہ "اگستیہ منی کے حکم سے بندھیاچل پہاڑ لیٹ گیا"۔ یہ ایک شاعرانہ انداز بیان ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگستیہ منی کی غیر معمولی ہمت۔ جفاکشی۔ دلیری اور مستعدی بندھیاچل کی مزاحمت پر غالب آئی اور وہ اس فلک بوس پہاڑ کو عبور کر کے اس کے جنوبی دامن میں پہنچے "جہاں آفتاب کی کرنوں کا کبھی گذر نہیں ہوتا" کیونکہ یہ حصہ گھنے جنگلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ نپولین اعظم جب اپنے لشکر جرار کے ساتھ ایک مشکل مہم پر روانہ ہوا تو کسی نے اطلاع دی کہ کوہ ایلپس کی برف پوش چوٹیاں راہ میں حائل ہیں جن کو اس شدتِ سرما میں عبور کرنا محال ہے۔ نپولین نے کہا کہ "کوہ ایلپس ہرگز ہمارے راستہ میں حائل نہ ہوگا۔ کیا فی الحقیقت ایلپس کا پہاڑ اپنی برفانی چوٹیوں کے ساتھ نپولین سے ڈر کر اس کی راہ سے ہٹ گیا اور بجائے ایلپس کے ایک ہموار میدان رونما ہو گیا۔ اور اس میں ایک پختہ سڑک بن گئی جس پر سے نپولین کی سپاہ دھڑلے سے گزر گئی اور اس کے بعد ہر کس وناکس اس پر چلنے پھرنے لگا۔ اور ایلپس پہاڑ کبھی اپنی اصلی جگہ پر واپس نہ آیا۔ اگر کوئی شخص ایسا سمجھے تو آپ اُسے دیوانہ تصور کریں گے یا نہیں؟ نپولین کا مطلب یہ تھا کہ ہم برف سے ڈھکے ہوئے ایلپس پہاڑ کی پروا نہیں کرتے۔ ہم اسے ضرور عبور کریں گے۔ چنانچہ نپولین کی ہمت اس مزاحمت پر غالب آئی اور اس نے برفانی چوٹیوں کو عبور کر ہی لیا۔ لیکن ہر شخص نپولین نہیں بن سکتا اور نہ ایسے زبردست قدرتی موانعات پر غالب آسکتا ہے۔ اسی طرح اگستیہ مُنی کے حکم سے کوہ بندھیاچل کی مزاحمت بے حقیقت ثابت ہوئی۔ چنانچہ اگستیہ رشی نے پہاڑ کو عبور کر لیا۔ یہ خیال محض طفلانہ ہے کہ بندھیاچل پہاڑ جو پہلے سیدھا کھڑا تھا اگستیہ رشی کے حکم سے زمین پر منہ کے بل لیٹ گیا اور رشی جی کی واپسی کے انتظار میں صدیوں اسی طرح لیٹا رہا اور شمالی ہند کا ہر کس وناکس بغیر روک ٹوک کے اس کی پیٹھ کو روندتا ہوا دکن میں داخل ہونے اور آریہ تہذیب پھیلانے لگا۔ حقیقت یہ ہے کہ بندھیاچل کو عبور کرنے کی مشکلات تو ہر حال میں قائم رہیں البتہ ان کا سامنا کرنا اور ان پر غالب آنا اگستیہ منی ہی جیسے چند باہمت رشیوں کا کام تھا۔

بہرکیف اگستیہ رشی نے بمقام "اسمبھو وادھی" اپنا آشرم قائم کیا۔ یہ مقام ارکاوتی ندی کے کنارے موجودہ نیلمبا گولہ کے نزدیک واقع تھا۔ یہاں سے نکل کر انہوں نے مغربی گھاٹ کے علاقوں میں برہمنی مذہب کی تبلیغ شروع کی اور بہت سی وحشی قوموں کو تہذیب وتمدن کے دائرہ میں شامل کیا۔ وحشی قوموں کے علاوہ انہوں نے مہذب اور تعلیم یافتہ ڈراویڑوں کے ساتھ بھی راہ ورسم پیدا کر لی تھی اور ان

کی زبان بھی سیکھ لی تھی۔ مغربی گھاٹ کے جس "قلّہ" کوہ پر انہوں نے وفات پائی تھی وہ آج تک "اگستیہ پربت" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ خوش عقیدہ لوگوں کا خیال ہے کہ اگستیہ رشی زندہ آسمان پر صعود کر گئے اور اپنے عقیدتمندوں اور پرستاروں کو درشن دینے کے لئے فلک جنوبی پر بشکل "سہیل" رونما ہوتے ہیں۔

اگستیہ رشی نہ صرف مذہبی مبلغ بلکہ ایک بلند پایہ ادیب اور شاعر بھی تھے۔ انہوں نے تامل زبان میں مہارت تامہ حاصل کر کے صرف ونحو کی ایک مبسوط کتاب "اگاتھیم" تصنیف کی تھی جس میں حروف تہجی۔ الفاظ کی بناوٹ۔ جملہ سازی۔ انشاپردازی۔ نثرنویسی نظم نگاری۔ مضمون آرائی اور عروض وغیرہ پر بڑی قابلیت سے بحث کی تھی۔ یہ نحوی شہ کار تو دستبرد زمانہ سے ضائع ہو گیا لیکن کہا جاتا ہے کہ اس کے بعض حصّے تامل زبان کی سب سے قدیم کتاب "تول کاپیم" میں آج تک محفوظ ہیں۔ مسٹر ٹی۔ آر سیش آئنگر نے اگستیہ منی کا زمانہ آٹھویں صدی قبل مسیح قرار دیا ہے۔

سنیاسی صاحب نے بیان کیا ہے کہ "اگستیہ رشی نے تین چلو کر کے سمندر کو پی لیا" جس کے یہ معنی ہیں کہ انہوں نے جاوا سماترا۔ ملایا وغیرہ جزیروں کی جاترا کی۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ آٹھویں صدی قبل مسیح میں دراویڑ ایک عظیم الشان تہذیب وتمدّن کے حامل تھے۔ تحقیق قریبہ سے ثابت ہے کہ ایک طرف تو ان کے تجارتی تعلقات برما۔ سوماترا۔ جاوا۔ ملایا۔ چین وغیرہ کے ساتھ اور دوسری طرف مصر۔ شام۔ عراق۔ فلسطین۔ بابل۔ نینوا وغیرہ کے ساتھ قائم تھے۔ بہت ممکن ہے کہ کسی دراویڑی تجارتی جہاز میں بیٹھ کر اگستیہ رشی نے سوماترا۔ جاوا۔ ملایا وغیرہ کی سیاحت کی ہو۔

اگستیہ منی کے علاوہ جن رشیوں کے نام قدیم روایات میں پائے جاتے ہیں۔ ان میں گوتم۔ کنوا۔ دی بھنڈگا۔ مارکنڈے دتا تریہ۔ ایدھوواہن۔ سنہر بھنگ۔ جم دگنی۔ گاتو متنگ وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ لیکن ان رشیوں کے زمانہ کا تعین مشکل ہے البتہ اگستیہ منی کا زمانہ آٹھویں صدی قبل مسیح قرار دیا گیا ہے اور دکن میں آریوں کا باضابطہ داخلہ چھٹی صدی قبل مسیح میں روبہ عمل آیا۔ ممکن ہے کہ مذکورہ بالا آریہ رشی دکن میں چھٹی صدی قبل مسیح کے بعد آئے ہوں۔ علاوہ بریں ان رشیوں نے دراویڑی مذہب اور تمدن میں کوئی انقلاب پیدا نہیں کیا۔ کیونکہ وہ سب کے سب مبلّغ وداعی نہ تھے بلکہ محض گوشہ نشیں درویش تھے۔ ہر ایک نے کسی نہ کسی ندی کے کنارے اپنی کٹیا قائم کر لی تھی۔ جوان کے گیان دھیان اور تپ جپ کے لئے کافی تھی۔ البتہ اگستیہ منی کی شخصیت زبردست تھی لیکن ان کی تبلیغی جدوجہد زیادہ تر مغربی گھاٹ کے علاقوں میں محدود تھی۔ جہاں وحشی قومیں آباد تھیں۔ جزیرہ نما کے مشرقی اور جنوبی حصوں میں جہاں مہذب دراویڑوں کی زبردست حکومتیں قائم تھیں اگستیہ رشی کوئی انقلابی تحریک رائج نہ کر سکے۔ اگر ایک طرف اہل دکن کو برہمنی مذہب سے روشناس کیا تو دوسری طرف یہاں مستقل سکونت اختیار کر کے اور تامل زبان سیکھ کر انہوں نے بڑی حد تک دراویڑی رسم ورواج اور تہذیب ومعاشرت اختیار کر لی تھی۔ وہ مرنجاں مرنج اور صلح کل کی پالیسی

پر عامل تھے اور اسی لئے لوگوں میں ان کو وقعت اور ہر دلعزیزی حاصل تھی۔ ورنہ اگستیہ منی سے پیشتر جو اکّے دکّے آریہ رشی ڈنڈک رن میں آتے تھے ان کو بالکل اجنبی اور دخیل کار سمجھ کر یہاں کی وحشی قومیں اور خصوصاً اسورا قوم کے لوگ بہت تنگ کرتے تھے اور ان کے یگ اور ہون کی رسم میں خلل انداز ہوتے تھے۔

سنیاسی صاحب نے انسان کی پیدائش کے متعلق پدم پوران سے جو شجرہ پیش کیا ہے اور آریوں کا ابتدائی وطن قطب شمالی کو قرار دیا ہے۔ یہ بھی کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ تلک مہاراج نے بڑے زور شور سے یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ آریوں کا ابتدائی مرزبوم منطقہ باردہ شمالی تھا۔ تلک مہاراج کی زبردست سیاسی شخصیت سے مرعوب ہو کر بعض زود اعتقاد ذہنیتیں ان کی ہم خیال بن گئی تھیں لیکن ارباب دانش و اہل تحقیق کے زمرہ میں اس نظریہ کو مقبولیت حاصل نہ ہوئی۔ چنانچہ آج تک دنیا کے مشہور مورخین کا یہی خیال ہے کہ آریوں کا اصلی وطن وسط ایشیا تھا۔ وہاں آبادی بڑھنے پر ان کے مختلف گروہ مختلف سمتوں میں روانہ ہوئے بعض گروہ یورپ میں جا پھیلے بعض ایران میں جا کر آباد ہوئے کئی جماعتیں ہندوستان میں آئیں۔ ممکن ہے کہ کوئی شاخ قطب شمالی میں بھی ہجرت کر گئی ہو قطب شمالی کو جہاں زندگی کے تمام سامان آسائش مفقود ہوں۔ دیولوک یا بہشت قرار دینا عجیب بات ہے۔ قدیم اہل ایران اور ہندی آریہ کی آتش پرستی اُن کے کسی سرد ملک سے ہجرت کرنے کی غمازی ضرور کرتی ہے لیکن اگنی دیبی کی پرستش کے لئے قطب شمالی کی سکونت لازمی شرط قرار نہیں دی جاسکتی بلکہ وسط ایشیا کی سرمائی شدت بھی اگنی دیبی کے لئے لاکھوں پرستار پیدا کر سکتی ہے۔

سنیاسی صاحب فرماتے ہیں کہ "پانی نی رشی کی گرامر کوئی تاریخ یا جغرافیہ کی کتاب نہیں ہے کہ اس میں دکن کی ریاستوں کا ذکر ہوتا۔ دکن میں سنسکرت رائج نہ تھی اس لئے سنسکرت کی گرامر میں اس علاقہ کا ذکر کیوں ہوتا" کون نہیں جانتا کہ پانی نی قواعد نویس تھا مورخ نہ تھا لیکن معتبر تاریخی وثائق کی عدم موجودگی میں مورخ کو مجبوراً لسانی شہادتوں پر بھروسا کرنا پڑتا ہے۔ سنیاسی صاحب کے طرز استدلال سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ دکن میں آریاؤں کا داخلہ پانی نی اور کتیاینہ کے درمیانی عہد میں ہوا۔ ہم بھی مانتے ہیں کہ پانی نی کے زمانہ میں دکن کے لوگ سنسکرت سے نا آشنا تھے۔ کیونکہ ابھی آریہ کثیر تعداد میں یہاں وارد نہیں ہوئے تھے اِکّے دکّے آریہ رشی منی جو آئے بھی تھے تو ان کو یہیں کی تامل زبان سیکھنی اور دراوِڑی تہذیب و معاشرت اختیار کرنی پڑی تھی۔ ان رشیوں نے اپنی کوئی چیز برقرار رکھی تو وہ صرف ان کا برہمنی مذہب تھا۔ اسی وجہ سے پانی نی کی گرامر میں دکن کے دریا اور پہاڑ وغیرہ کی مثالیں درج نہیں ہیں۔ لیکن پانی نی کے زمانہ میں آریہ کلنگا تک پہنچ چکے تھے اس لئے باوجود اس کے کہ پانی نی قندھار کا رہنے والا تھا اور اس کا مضمون تاریخ و جغرافیہ نہیں بلکہ قواعد تھا، اس کی تصنیف میں کلنگا کا حوالہ پایا جاتا ہے۔ پانی نی کے کئی صدیوں کے بعد کتیاینہ پیدا ہوا۔ اس نے بھی تاریخ و جغرافیہ کی نہیں بلکہ قواعد ہی کی کتاب لکھی اور پانی نی کے نحوی اصول

کی تنقید کی۔ لیکن اس کی تصنیف میں دکن کی ریاستوں کے حوالے جا بجا پائے جاتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کتیائنہ کے زمانہ میں آریہ بتعداد کثیر دکن میں آکر توطن پذیر ہو چکے تھے اور شمالی اور جنوبی ہند کے باشندوں کے درمیان وہ اجنبیت مغائرت اور ناما نوسیت باقی نہ رہی تھی جو پانی نی کے زمانہ میں موجود تھی۔

سنیاسی صاحب کا یہ استدلال بالکل کمزور ہے کہ "پانی نی نے سنسکرت زبان کی گرامر لکھی تھی اس لئے اس میں دکن جیسے علاقہ کا ذکر کیوں ہوتا جہاں سنسکرت رائج نہ تھی؟" کیا کلنگا کے باشندوں کی زبان سنسکرت تھی؟ پھر پانی نی نے کلنگا کا ذکر کیوں کیا؟ علاوہ بریں کتیائنہ نے بھی تو پانی نی کی گرامر کی تنقید سنسکرت ہی میں لکھی تھی۔ پھر اس کی کتاب میں دکن کی اُن ریاستوں کا ذکر کیوں پایا جاتا ہے جہاں سنسکرت رائج نہ تھی؟

سنیاسی صاحب کی تنقید میں اگر کوئی وزنی بات ہے جو تاریخی نقطۂ نظر سے اہم کہی جاسکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ "کتیائنہ اور کوتلیہ دو مختلف آدمی ہوئے ہیں" حصولِ علم میں میں اپنی حیثیت ایک متعلم سے بڑھ کر نہیں سمجھتا۔ اگر سنیاسی صاحب معتبر و مستند تاریخی وثائق کی بنا پر ثابت کردیں کہ ارتھ شاستر کے مصنف کوتلیہ اور پانی نی کی گرامر پر تنقید لکھنے والے کتیائنہ کی شخصیتیں جدا گانہ تھیں تو میں شکریہ کے ساتھ ان کی رائے قبول کرلوں گا۔ لیکن اس سے میرے مضمون پر کوئی اثر نہیں پڑے گا جس میں دکن میں آریوں کے باقاعدہ داخلہ کا زمانہ چھٹی صدی قبل مسیح قرار دیا گیا ہے کیونکہ ڈاکٹر میکسلر جیسے زبردست ماہر ادبیات سنسکرت نے بڑی تحقیق و تفتیش کے بعد کتیائنہ کا زمانہ چوتھی صدی مسیحی ثابت کیا ہے اور چندر گپت موریا کے برہمن مشیر کار کوتلیہ کے متعلق تو کوئی شک ہی نہیں ہے کہ چوتھی صدی قبل مسیح میں گذرا ہے۔ مسٹر رومیش چندر دت اور دوسرے مشہور مورخین ڈاکٹر میکسلر کے ہمخیال ہیں۔ الغرض اگر یہ فرض بھی کرلیا جائے کہ کتیائنہ اور کوتلیہ دو مختلف آدمی ہوئے ہیں تو اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ دونوں ہمعصر تھے اور دونوں کا زمانہ چوتھی صدی قبل مسیح تھا۔

لیکن میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ کتیائنہ اور کوتلیہ ایک ہی آدمی کے دو نام ہیں جس شخص نے پانی نی کی گرامر پر تنقید لکھی ہے وہی ارتھ شاستر کا بھی مصنف ہے۔ مسٹر ونسنٹ اسمتھ نے اس کے اور دو نام وشنو گپت اور چانکیہ درج کئے ہیں۔ بغرض کہ وشنو گپت۔ چانکیہ۔ کوتلیہ اور کتائنہ ایک ہی شخص کے مختلف نام یا خطاب ہیں۔ میرے خیال کی تصدیق دو ایسے زبردست محققین کے بیان سے ہوسکتی ہے جن کی رائے ہندوستان کے قدیم تاریخی معاملات میں سند کا درجہ رکھتی ہے۔ ایک ڈاکٹر بھنڈارکر ہیں جو سنسکرت میں مہارت تامہ رکھنے کے علاوہ بہت بڑے مورخ بھی گزرے ہیں۔ ان کی کتاب "این ارلی ہسٹری آف دی دکن (دکن کی قدیم تاریخ) نہایت مستند مانی جاتی ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے جس جگہ دکن میں آریوں کے داخلہ و استعمار پر بحث کی ہے وہاں پانی کی گرامر کے ناقد کتیائنہ کو ارتھ شاستر کا بھی مصنف قرار دیا ہے اور ہر شخص جانتا ہے کہ ارتھ شاستر کا مصنف چندر گپت موریا کا وزیر تھا۔

میرے پاس دوسری سند مسٹر رومیش چندر دت کی ہے۔ ان کی کتاب "سویلائزیشن ان اینشنٹ انڈیا" (قدیم تمدن ہند) کو جو شہرت و مقبولیت حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ مسٹر موصوف نے تو صاف لفظوں میں لکھ دیا ہے کہ پانی نی کی گرامر پر تنقید کرنے والا کتیائنہ چندر گپت موریا کا وزیر تھا۔ چنانچہ "کتھا سرت ساگر" پر بحث کرتے ہوئے مسٹر آر سی۔ دت لکھتے ہیں کہ "پیساچی زبان میں دلچسپ قصوں اور کہانیوں کا ایک ضخیم مجموعہ برہت کتھا کے نام سے موسوم ہو کر جنوبی ہند میں مدت سے رائج چلا آرہا تھا۔ بارھویں صدی عیسوی میں سومدیو نامی ایک کشمیری پنڈت نے ان قصوں کو اختصار کے ساتھ سنسکرت زبان میں شائع کیا اور اس کا نام کتھا سرت ساگر رکھا۔ کشمیر کی رانی سوریا وتی اپنے پوتے ہرش دیو کی موت کی وجہ سے بہت مغموم رہا کرتی تھی۔ سومدیو نے اسی رانی کی تسکین و تسلی کے لئے یہ قصے شائع کئے تھے لیکن کتاب کے مقدمہ میں مرقوم ہے کہ ان قصوں کا اصلی مصنف کتیائنہ تھا۔ وہی کتیائنہ جو پانی نی کا ناقد اور مگدھ کے راجہ چندر گپت کا وزیر تھا۔"

(ملاحظہ ہو سیویلیزیشن ان انشنٹ انڈیا جلد دوم باب ۱۴ پارہ ۷)۔

واضح رہے کہ کتیائنہ نام کے دو مشہور مصنف گزرے ہیں۔ کتیائنہ اول جو چوتھی صدی قبل مسیح میں پیدا ہوا تھا۔ پانی نی کی گرامر کا ناقد اور چندر گپت کا شاطر وزیر تھا۔ اور کتیائنہ ثانی کو مسٹر رومیش چندر دت نے عہد پورانی کے مصنفوں کے زمرہ میں شامل کیا ہے ۵۰۰ لغایت ۱۰۰۰ء کو عہد پورانی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہندوؤں کی مذہبی ادبیات میں دھرم شاستروں کو خاص اہمیت حاصل ہے اور تمام قدیم اور جدید دھرم شاستروں کی مجموعی تعداد بیس بتائی جاتی ہے۔ ان بیس دھرم شاستروں میں سے ایک دھرم شاستر کتیائنہ ثانی کی لکھی ہوئی ہے جو انتیس ابواب اور تقریباً پانچ سو ابیات پر مشتمل ہے۔ بہرحال پانی نی کے ناقد اور ارتھ شاستر کے مصنف کتیائنہ اول اور دھرم شاستر کے مصنف کتیائنہ ثانی میں التباس نہیں ہونا چاہیئے۔ دونوں کی شخصیتیں بالکل جداگانہ تھیں اور دونوں کے مابین کئی صدیوں کا فصل پایا ہے۔

الغرض میرا پہلے بھی خیال تھا اور اب بھی ہے کہ کتیائنہ۔ چانکیہ۔ کوتلیہ اور وشنو گپت ایک ہی شخص کے مختلف نام یا خطاب یا لقب ہیں۔ اسی ایک شخص نے پانی نی کی گرامر کی تنقید و تنقیص بھی کی تھی۔ اسی نے ارتھ شاستر بھی لکھی تھی اور وہی چندر گپت موریا کا نہایت شاطر اور چالاک وزیر بھی تھا۔ میرے خیال کی تائید و تصدیق مسٹر بھنڈارکر اور مسٹر رومیش چندر دت کے بیانات سے ہوتی ہے۔ یہ دونوں معمولی درجہ کے مصنف نہیں ہیں بلکہ قدیم تاریخ ہند کے متنازع فیہ مسائل میں ان کی رائے سند مانی جاتی ہے۔ اگر سنیاسی صاحب کو ان مستند مورخین کی رائے سے اختلاف ہو۔ تو وہ اپنی تائید میں معتبر تاریخی وثائق اور قاطع و ساطع براہین پیش فرمائیں۔ سچائی تک پہنچنے کے لئے ہر بات پر وچار کرنے کے لئے سنیاسی صاحب کی طرح میں بھی ہر وقت تیار ہوں۔

محمد حسین ادیب

غزل

مجھے مشکل ہے جینا عشق میں دشمن کو آساں تھا
یہ دل کا چاک ہی اے دوست وہ چاکِ گریباں تھا

سوالِ مدعا کرنے سے پہلے وہ ہوئے برہم
جوابِ دل شکن سننے سے پہلے میں پشیماں تھا

ستمگر ناز سے ٹھکرا چکا دل کو تو دھیان آیا
کہ میرے دل میں کس کی آرزو تھی کس کا ارماں تھا

حجاب آگیں نگاہیں کھہ گئیں مجھ سے سرِ محفل
حیا سے یک بیک کھچنا ہی اُن کا لطفِ پنہاں تھا

جو سچ پوچھو تو بزمِ دوست سی دشمن نہیں نکلا
یہ میرے دل کی حسرت تھی یہ میرے دل کا ارماں تھا

صدق جائسی

مچھلی

گرمی کی ایک سہانی صبح ہے۔ ہوا ساکن ہے۔ گھاس پر رینگنے والے کیڑے کی آواز کے سوا کوئی آواز نہیں آتی۔ صرف فاختہ کی درد آفریں صدا گاہے گاہے سنائی دیتی ہے۔ سفید بادل آسمان پر ساکن وجامد ہیں اور بکھری ہوئی برف کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔

گراسیم دریا کے کنارے ایک پانی میں اُگے ہوئے درخت کے پاس کھڑا ہے۔ اس کے سر کے بال سنہرے اور گھنگھرالے ہیں اور اس کے تمام چہرے پر بھی بال ہی بال اُگ رہے ہیں۔ وہ ہانپ رہا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی چیز کو درخت کی جڑ کے نیچے سے کھینچ رہا ہے۔ اس کا چہرہ پسینے میں شرابور ہے۔ اس سے دو گز کے فاصلے پر لیوبم، ایک لوہار، پانی کی سطح پر گردن جھکائے کھڑا ہے۔ اس کی پیٹھ کبڑی ہے۔ چہرہ لمبوترا اور آنکھیں چینیوں کی طرح گول اور اُبھری ہوئی ہیں۔ ان دونوں کے جسم دو گھنٹے سے زیادہ پانی میں کھڑے رہنے کے باعث نیلے ہو رہے ہیں۔

کبڑے لیوبم نے کانپتے ہوئے، جیسے بخار میں مبتلا ہو کہا "مگر تم اُسے ہاتھ سے کیوں دبا رہے ہو؟ بیوقوف! اسے پکڑو، پکڑو نہیں تو یہ ہاتھ سے نکل جائے گی۔ . . . پکڑو . . . میں تم سے کہہ رہا ہوں"۔

گراسیم نے بھاری بھرکم آواز سے جو شاید اُس کے پیٹ کی گہرائیوں سے نکل رہی تھی، کہا۔ "اب یہ نہیں بھاگ سکتی . . . بھلا یہ جا کہاں سکتی ہے بیچاری درخت کی جڑ کے نیچے چھپی بیٹھی ہے۔ چکنی ہے کہاں سے پکڑوں!"

"گلپھڑوں سے پکڑو . . . . گلپھڑوں سے!"

"مگر اس کے گلپھڑے ہیں کہاں؟ . . . ٹھہرو! میں نے کسی جگہ پر ہاتھ جما لیا ہے . . . میں اس کو ہونٹ سے پکڑ رہا ہوں وہ مجھے کاٹ رہی ہے!"

"اسے ہونٹ سے نہ پکڑو . . . دیکھو ہونٹ سے پکڑ کر نہ نکالنا! نہیں تو یہ ہاتھ سے چھوٹ جائے گی گلپھڑوں سے پکڑو، گلپھڑوں سے! . . . . بے عقل! تم نے پھر ہاتھ سے دبانا شروع کر دیا۔ تم بڑے بے وقوف ہو۔ اچھا پکڑو سہی!"

گراسیم نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ "پکڑو سہی! تم حکم دینے میں تو بڑے ہوشیار ہو . . . . خود کیوں نہیں آ جاتے! کبڑی پیٹھ والے شیطان! کنارے پر کس لئے کھڑے ہو؟"

"اگر ممکن ہوتا تو میں ضرور تمہیں مدد دیتا۔ میرے جیسا پست قد کنارے کے قریب بھی کھڑا نہیں ہو سکتا۔ پانی بہت گہرا ہے"

"کچھ پروا نہیں اگر گہرا ہے تو . . . . . تم تیر سکتے ہو نا؟"

کبڑا اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے، تیرتا ہوا گراسیم کے پاس جا پہنچا۔ ابھی سنبھلنے ہی لگا تھا کہ پانی میں سر کے بل گر پڑا۔ اور غوطے کھانے لگا۔

× × × × × × × × × ×

× × × × × × × × × ×

× × × × × × × × × ×

کبڑے نے اپنی غضب آلود آنکھیں گھماتے ہوئے کہا۔ "میں نے تمہیں کہا نہیں تھا پانی گہرا ہے۔ اب میں تمہارے سر پر بیٹھوں . . . . بتاؤ کہاں پر؟"

"ہاں ہاں درخت کی جڑ پر کھڑے ہو جاؤ۔ دیکھو! کتنی جڑیں سیڑھیوں کی طرح بتدریج اوپر کو جا رہی ہیں۔"

اس پر کبڑے نے اپنی ایڑی سے جڑیں ٹٹولنا شروع کیں اور بہت سی ٹہنیاں مضبوطی سے پکڑ کر اُن پر کھڑا ہو گیا اور بدن کو توازن کر کے اپنی نئی جگہ پر جم گیا۔ وہ جھکا . . . . اب وہ اپنے ہاتھ مچھلی کے گلپھڑوں کے قریب لے جا سکتا تھا۔ آخر کار اس کا ہاتھ گراسیم کے ہاتھ کو لگا اور ایک سرد چکنی سی چیز محسوس ہوئی۔

لیوبم نے مسرت کے لہجے میں کہا۔ "یہ ہے کیسی عمدہ ہے! کتنی بڑی ہے! گراسیم! اپنی انگلیوں کو جنبش دو۔ میں اسے ابھی گلپھڑوں سے پکڑ کر براہِ راست نکال لیتا ہوں . . . . ٹھہرو! مجھے اپنی کہنی سے دھکا مت دو۔ میں ایک منٹ میں باہر نکال لونگا ـــــ ایک منٹ میں، اصل میں یہ جڑوں کے دُور نیچے چلی گئی ہے، جہاں تک پہنچنے کے لئے ہاتھ کو کوئی سہارا نہیں ملتا۔ ادھر ہاتھ اس کے سر تک نہیں پہنچ سکتا، صرف پیٹ ہی سے مَس ہو رہا ہے . . . . اچھا تو میں گلپھڑوں ہی کو پکڑ لیتا ہوں . . . . تم اس طرف کو آ جاؤ۔ اور اُسے اپنی انگلی سے دباتے ہوئے زور سے جھٹکا دو!"

کبڑے نے سانس کھینچتے اور آنکھیں پھاڑتے ہوئے، گلپھڑوں پر گرفت مضبوط کر لی۔ مگر اسی اثنا میں ٹہنیاں جن سے وہ سہارا لئے ہوئے تھا ٹوٹ گئیں اور وہ بے اختیار ہو کر پانی میں گر پڑا مگر جلد ہی اس نے پھر ٹہنیوں کو پکڑ لیا۔

گراسیم نے زور سے سانس لیتے ہوئے کہا۔ "تم تو ڈوب چلے تھے۔ بیوقوف! اور میں اس کا ذمہ دار ٹھہرایا جاتا۔ ہٹ جاؤ شیطان کہیں کے، میں خود اسے نکال لوں گا۔"

(۲)

سورج شدت سے چمک رہا ہے۔ سائے کم ہو رہے ہیں۔ لمبی لمبی گھاس جو دھوپ سے گرم ہو چکی ہے اب خاص قسم کی بو دے رہی ہے۔ دوپہر گزر چکی ہے۔ مگر اسیم اور لیوبم ابھی تک درخت کی جڑ کے قریب نبرد آزمائی کر رہے ہیں۔ کیڑوں مکوڑوں کی سمع خراش آوازیں فضا میں غلغلہ برپا کر رہی ہیں۔

"اسے گلپھڑوں سے پکڑ کر نکالو۔ . . گلپھڑوں سے ٹھہرو، میں نکالتا ہوں۔ تم اپنی بے ڈول مٹھی کے ساتھ کہاں دبا رہے ہو؟ اپنی انگلیوں سے کھینچو۔ اس کو دونوں طرف خوب ہلاؤ۔ . . . ہاں۔ ہاں دائیں طرف ـــــ دائیں طرف! بائیں طرف ایک گہرا گڑھا ہے۔ دیکھنا کہیں اس میں گر کر آبی جانوروں کی خوراک نہ بن جانا"۔

اسی اثنا میں کوڑے کی آواز آئی . . . یفیم مویشیوں کا گلہ ہانکے چلا آرہا ہے وہ ان کو دریا کے کنارے پانی پلانے کے لئے آہستہ آہستہ لا رہا ہے۔ وہ بوڑھا، اور دبلا پتلا آدمی ہے۔ اس کی صرف ایک آنکھ ہے اور چہرے پر جھریاں پڑی ہوئی ہیں۔ سب سے پہلے بھیڑیں گھاٹ پر آرہی ہیں۔ اُن کے بعد گھوڑے اور سب سے پیچھے گائیں۔

"اسے نچلی طرف سے کھینچو" "تم بہرے ہو گئے ہو۔ سنتے نہیں . . کیا کر رہے ہو ـــ؟" یفیم نے لیوبم کے یہ الفاظ سُنے۔

یفیم نے گرج کر کہا "تم کس چیز کے پیچھے پڑے ہو لڑکو؟"

"ایک بڑی مچھلی ہے۔ ہم اسے باہر نکالنے سے عاجز آگئے ہیں۔ دیکھو! وہ جڑ کے نیچے چھپی بیٹھی ہے۔ . . . اس طرف آؤ"۔

چند لمحوں تک یفیم نے شکاریوں کی طرف غور سے دیکھا۔ پھر اس نے چھال کا بنا ہوا جوتا اُتارا، بوری کاندھوں پر سے پھینک دی اور کرتا اُتار لیا۔ وہ اتنا بے صبر ہو رہا تھا کہ پاجامے سمیت ہی ہاتھ پھیلا کر پانی میں کود پڑا۔

"ایک منٹ کے لئے ٹھہرو، لڑکو! ـــ صرف ایک منٹ کے لئے ـــ اسے نکالنے میں جلدی نہ کرو نہیں تو یہ ہاتھ سے چھوٹ جائے گی۔ تمہیں عقل سے کام لینا چاہیئے!"

کنارے پر سے آواز آئی "گلہ بان کہاں ہے؟ یفیم کدھر ہے؟ مویشی باغ میں گھسے ہوئے ہیں۔ انہیں باغ سے جلد نکالو ــــ جلد نکالو۔ باغ سے! جلدی کرو۔ . . . کہاں ہو تم؟"

باغ کا مالک خود گون پہنے، ایرانی شال اوڑھے اور ہاتھ میں اخبار پکڑے باغ سے نمودار ہوا۔ اس نے دریا کے اس حصے کی طرف جہاں شور مچ رہا تھا مستفسرانہ نگاہیں ڈالیں اور جلدی سے گھاٹ پر پہنچ گیا۔

اس نے برچی سی درخت کی ٹہنیوں میں سے تین شکاریوں کو جھانکتے ہوئے پوچھا "کیا ہو رہا ہے؟ کون شور مچا رہا ہے؟ تم یہاں کس کام میں مشغول ہو؟"

یفیم نے بغیر سر اٹھائے جواب دیا "ہم مچھلی پکڑ رہے ہیں"۔

"مویشی باغ کو خراب کر رہے ہیں اور یہ مچھلیاں پکڑ رہا ہے ۔ ۔ ۔ شکار کو ختم بھی کرو گے یا نہیں ؟"
یفیم نے چلا کر کہا۔ "ہم یہ مچھلی پکڑنے سے عاجز آ گئے ہیں۔ جڑ کے نیچے اتنی مضبوطی سے جم گئی ہے کہ ہلنے کا نام نہیں لیتی"۔
باغ کے مالک نے حیرت سے کہا۔ مچھلی ——! اور اس کی آنکھیں غصے سے چمکنے لگیں۔ "اسے جلدی نکالو"۔
"اگر تم اسے دیکھ لو، تو اسی وقت خاصی قیمت دینے پر تل جاؤ۔ اتنی بڑی ہے۔ سوداگر کی بیوی کی طرح موٹی تازی ۔ ۔ ۔
اسے دباؤ نہیں لیوبم! ۔ ۔ ۔ دباؤ نہیں۔ ورنہ کسی کام کی نہ رہے گی۔ نیچے سے کھینچو۔ پہلے جڑوں کو ہٹا لو عقلمند آدمی! تمہارا نام بھول گیا۔ ۔ ۔ اپنی ٹانگوں کو مت ہلاؤ"۔

(۳)

چار بج کر پانچ منٹ ہو چکے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ اب باغ کا مالک زیادہ صبر نہیں کر سکتا۔ اس نے باغ کی طرف منہ موڑتے ہوئے بلند آواز سے کہا۔ "واسی ادھر آؤ"۔
گاڑی بان واسی بھاگا۔
"باغ کے مالک نے اسے حکم دیا۔ "پانی میں کود پڑو"۔ اور انہیں مچھلی نکالنے میں مدد دو۔ وہ نکالنے سے قاصر ہیں"۔
واسی نے کپڑے اتار پھینکے اور پانی میں کود پڑا۔
اس نے کہا۔ "ایک منٹ میں۔ صرف ایک منٹ میں میں نکال لیتا ہوں"۔ مچھلی ہے کہاں ؟ اسے یکدم نکال لوں گا۔ یفیم! تم ایک طرف ہٹ جاؤ۔ تم بوڑھے ہو۔ ۔ ۔ ۔ جاؤ اپنا کام کرو۔ ۔ ۔ ہاں تو کہاں ہے مچھلی ؟ میں ایک منٹ میں نکال لونگا۔ آہا یہ چھپی ہوئی ہے
"ایسی باتوں سے فائدہ۔ تم مچھلی نکالو۔ باتیں تو ہم بھی بنانا جانتے ہیں"۔
"مگر یہ اس طرح نہیں نکلے گی۔ اسے سر سے پکڑو!"
"سر تو جڑ کے نیچے ہے بیوقوف! ہم جانتے ہیں' سر سے پکڑنا چاہیئے"۔
"بس اب خاموش رہو' ورنہ مچھلی ہاتھ سے جاتی رہے گی!"
یفیم نے کبیدہ خاطر ہو کر کہا۔ "ایسی جسارت آمیز گفتگو ہمارے سامنے۔ دیکھتے نہیں وہ کس قدر مضبوطی اور ہوشیاری کے ساتھ چھپی ہوئی ہے"
باغ کے مالک نے کہا۔ "ٹھہرو! میں ایک منٹ میں آتا ہوں۔ یہ کہہ کر اس نے کپڑے اتارنے شروع کر دیئے۔
چہ خوب!
چار بیوقوف ——— اور ——— ایک مچھلی!
لیوبم نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "ہمیں جڑ کاٹ دینی چاہیئے۔ گراسیم! کلہاڑی لاؤ مجھے جلد دو کلہاڑی"۔
باغ کے مالک نے کلہاڑی کی ضربیں سن کر کہا۔ "کہیں اپنی انگلیاں نہ کاٹ لینا۔ یفیم! ایک طرف کو ہٹ جاؤ۔ دیکھو! میں اسی نکالتا ہوں یا نہیں۔ ۔ ۔ تم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے"۔ جڑ کٹ چکی ہے اور اب اسی کا ہاتھ مچھلی کے گلپھڑوں تک پہنچ سکتا ہے"۔
"میں اسے کھینچ رہا ہوں ۔ ۔ ۔ مجھ پر سے جھک جاؤ۔ سنبھلو! میں نکال رہا ہوں" ایک بڑی مچھلی کا سر۔ اس کے پیچھے اس کا سیاہ لمبا جسم ——— شاید گز بھر ہوگا ——— اب پانی کی سطح پر ہے۔ وہ دم کو پھرتی سے ہلا رہی ہے۔ تا کہ رہا ہو جائے"۔
"تم میں سے کوئی بھی اس کو نکالنے میں کامیاب نہ ہو سکا ۔ ۔ ۔ ۔ آہا آخر میں نے ہی نکالی"۔
سب کے چہروں پر فرحت افزا لہر دوڑ گئی اور فرط مسرت سے ایک منٹ تک سکوت طاری رہا۔
یفیم نے مچھلی کو بغل میں لیتے ہوئے کہا۔ "یہ بڑی وزنی ہے' اس کا وزن دس پونڈ سے کم نہ ہوگا"۔
باغ کے مالک نے ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ "اس کے علاوہ اس میں چربی بھی بہت ہے۔ یہ کھڑا ہونا چاہتی ہے ۔ ۔ ۔ دیکھو!"
یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ مچھلی اچانک اوپر کو اچھلی ۔ ۔ ۔ شکاریوں نے پانی کی سطح پر بلبلے اٹھتے دیکھے ۔ ۔ ۔ مگر آہ وقت گذر چکا تھا ۔ ۔ ۔ وہ تمام ہاتھ ملتے رہ گئے!

(چیخوف)

طاہر قریشی

پشیمانی

(۱)

مجھے گمان بھی نہ تھا کہ کُلراج کبھی شرابی ہو سکتا ہے۔ اتنا شریف، اتنا ملنسار اور اتنا شرمیلا نوجوان میں نے دیکھا ہی نہ تھا۔ بات بات پر برف کی طرح گُھلا جاتا تھا اور چہرہ پسینوں سے تر ہو جاتا تھا۔ میرے ذرا دباؤ ڈالنے پر اُس کا دل بیٹھ جاتا تھا۔ میری اطاعت اور خدمت کا اُسے بڑا خیال تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میرے تمام ملازموں پر اُسے فوقیت حاصل تھی۔ مجھے بھی وہ بہت پیارا تھا۔ کام کرنے سے کبھی دریغ نہ کرتا تھا۔

انہی صفتوں کی وجہ سے میں نے اُسے ایک ذمہ دار عہدہ پر لگایا تھا۔ اس کے اعتبار کا یہ عالم تھا کہ اگر اشرفیوں پر لٹا یا جاتا تو کیا مجال تھی کہ ایک پیسہ بھی مار لیتا۔ وِلوز نے جب مجھ سے کہا۔ کہ کلراج شراب پیتا ہے تو میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ "کلراج ——— اور شرابی۔ اتنا شریف ——— اور اتنی کمینہ حرکت"؟ میرے بدن میں آگ سی لگ گئی اور طبیعت میں بے چینی پیدا ہو گئی۔ میں نے سوچا اگر یہی حالت رہی اور میری طرف سے کلراج کو باز پرس نہ ہوئی تو یقیناً وہ ایک دن پیسہ نہ ملنے کی صورت میں میرے سرمایہ پر ہاتھ مارنے کی کوشش کرے گا"۔

(۲)

جوانی میں ——— جب طبیعت میں شوخی تھی ——— میں بھی شراب پی لیتا تھا لیکن کبھی کبھی۔ اپنے پیسے خرچ کر کے نہیں۔ یار دوستوں کے ہاں سے۔ لیکن کاروبار سنبھالنے کے بعد ہی ترک کر دی تھی اور اب ذائقہ بھی بھول گیا ہوں۔ کچھ کچھ یاد ہے۔ کچھ ہوتی تھی۔ بدمزہ سی۔ کڑوی سی ——— اور نفرت خیز۔ اُس زمانے کو میں اب بھول کر بھی یاد نہیں کرتا۔ اس خوف سے کہ کہیں پھر منہ میں پانی نہ بھر آئے۔

"جب میں ——— معمولی کوشش سے۔ تھوڑے ضبط سے۔ اس سے چھٹکارا حاصل کر سکا۔ تو کیا کلراج کے لئے مشکل ہے ایک ڈانٹ بتلانے سے اتنی سی تُھی بھول جائے گا"۔ یہ سوچ کر میں کچھ سویرے دفتر چلا گیا۔ تمام منشی آ گئے تھے۔ میرا معمول تھا کہ آتے ہی کلراج کو بُلا لیتا۔ حساب کتاب کی جانچ پڑتال کرتا۔ لیکن آج میرے تیور بے طرح بگڑے تھے۔ سانس کے ساتھ آگ کی چنگاریاں سی نکلتی محسوس ہو رہی تھیں۔

میں ابھی بیٹھا ہی تھا کہ کلراج آگیا۔ اس کے ہاتھوں میں لیجر بک تھے۔

"آداب عرض"۔

میں خاموش رہا۔ اس کی طرف دیکھا تک نہیں۔

کلراج میں ایک اور صفت تھی۔ میرے دل کا حال میری آنکھوں سے بھانپ لیا کرتا تھا۔ اور اسی موضوع پر گفتگو کرنے لگتا تھا۔

اُس نے کہا۔ "جناب — کی — طبیعت"۔

میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ گرج کر بول اُٹھا "تمہیں اس سے غرض —؟"

یہ سُن کر وہ اس طرح سمٹ گیا جس طرح نازک پھول کی پنکھڑیاں کڑی دھوپ میں۔

جو مجھے اتنا عزیز تھا۔ اُس کی یہ حالت دیکھ کر میرے دل پر کوئی اثر نہ ہُوا۔ اُلٹا سخت ہو رہا تھا۔ وہ میری میز پر کاغذ چھوڑ کر باہر چلا گیا۔ کیونکہ غصہ کی حالت میں وہ میرے سامنے نہ ٹھہر سکتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے آواز دی۔ "کلراج —؟"

وہ اندر آگیا۔ اُس کے پاؤں تھرّا رہے تھے۔ ہاتھ کانپ رہے تھے اور آنکھوں سے وحشت برس رہی تھی۔ میرے پاؤں پر نظر ڈال کر کہا۔ "جناب!"

میں نے کہا "کلراج۔ مجھے خیال تھا کہ تم میری نگرانی میں زندگی کے اعلیٰ معیار پر پہنچ سکو گے۔ لیکن تم نے میرے پیار، میری مہربانی اور میرے برتاؤ کا ناجائز فائدہ اٹھانا شروع کر دیا۔"

یہ سُن کر اس کی حالت ایسی ہو گئی۔ گویا کسی نے اُس کے گھٹنوں پر لاٹھی ماری ہے۔ اُس نے تعجب آمیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ شاید کچھ کہنا چاہتا تھا۔

میں نے پھر کہا "اب بھی موقع ہے۔ سُدھر جاؤ۔ ورنہ کچھ دن بعد ہاتھ ملتے رہو گے"۔

کلراج کی تھوڑی بہت ہمت بندھ گئی۔ نہ معلوم کیوں۔ کہنے لگا "جناب میں نے کونسا قصور کیا ہے"۔

میں نے کہا "اپنے دل سے پوچھو۔ قصور نہیں ہے۔ پاپ کیا ہے۔ ہتیا کی ہے"۔

پسینے کے قطروں کے ساتھ اب اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ وہ خیالات کی خدا جانے کن کن پہاڑیوں پر چڑھ رہا تھا۔ اور کن کن پگ ڈنڈیوں سے اتر رہا تھا۔

اس نے سنجیدگی سے کہا "جناب کیسی ہتیا۔؟ کوئی غبن یا — خیانت؟"

"خیانت کرتے تو مجھے اتنا غم نہ ہوتا"۔

"پھر جناب اور — کیا؟

میں یہ سُن کر از خود رفتہ ہو گیا۔ بلا سوچے سمجھے بول اٹھا "دور ہو جا ——— پاپی ——— شرابی۔ مجھے اس فرم وار عہدہ پر تم جیسے شرابی کی ضرورت نہیں۔ اپنا حساب چکا جاؤ ——— اور چلے جاؤ۔"

اُس نے میری طرف دیکھا۔ شاید میری زبان سے ایسے سخت کلمات سننے کی اُسے توقع نہ تھی۔

اُس کی آنکھوں میں کوئی جذبہ تھا۔ بہت پوشیدہ۔ میں سمجھا جذبہ گناہ ہے۔

لیکن اب معلوم ہوتا ہے کہ وہ پوشیدہ جذبہ بیگناہی کا جذبہ تھا ——— گناہ کا نہیں۔

میرے کورے جواب نے اس کی کیا حالت بنا دی۔ یہ شاید وہی جانتا ہو۔ لیکن میرا قیاس ہے کہ میں اُس کی نظروں سے گر گیا۔

وہ چپکے چپکے کمرے سے باہر چلا گیا۔

کلراج کے چلے جانے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ میرا دل ہلکا ہو رہا ہے اور ادائے فرض پر مجھے کوئی تھپکی دے رہا ہے' لیکن یہ دھوکا تھا۔

(۳)

ایک منٹ کے لئے بھی کلراج کے بغیر میرا جی نہ لگتا تھا لیکن آج پورا مہینہ گزر اتھا میں نے اُسے خواب میں بھی نہ دیکھا تھا۔ آنکھوں کے سامنے ہر وقت اسی کی تصویر پھرا کرتی تھی۔ کاروبار میں بھی دل نہ لگتا تھا۔ دفتر کے کمرے کی چار دیواریں ——— ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ابھی کاٹنے کو آجائیں گی۔

کبھی خلوت میں سوچتا تھا "کیا کلراج واقعی شرابی ہے؟ اگر وہ نہ تھا تو اُس نے اپنا عذر پیش کیوں نہ کیا تھا۔ اُس کی خاموشی کے کیا معنی تھے۔ کیا یہ نہیں کہ شراب پیتا تو ہوں لیکن آئندہ نہیں پیونگا۔ کاش وہ مجھ سے ایک ہی بار معذرت چاہتا اور میں جھٹ کہ دیتا "جاؤ۔ اپنا کام کرو۔ آئندہ محتاط رہنا" لیکن اُس نے ایسا کیوں نہ کہہ دیا اور چپکے چل پڑا۔ کیا اُسے اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع نہ ملا تھا ——— ؟"

یہی سوچتے سوچتے میرے دن اور میری راتیں بیت جاتیں۔

(۴)

ایک دن صبح کا وقت تھا۔ سورج کے چڑھنے میں ابھی کافی دیر تھی۔ میں نہر کے کنارے سیر کر رہا تھا۔ نہر کے کناروں کا سبزہ۔ آس پاس کے پھولوں کی مہک۔ قدرتی مناظر اور طیور کی خوش الحانی ہر چیز دلبستگی کا سامان مہیا کرتی تھی۔ لیکن میں اپنے دل اور ضمیر میں ایک خلش سی' ایک بے چینی سی برابر محسوس کئے جا رہا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کلراج سے میں نے انصاف نہیں کیا۔ وہ نیک۔ اور

محنتی تھا. فرمانبردار اور بے عیب تھا. کلراج کے جانے کے وقت کے چمکتے ہوئے آنسو میری نظروں میں پھر رہے تھے میں ایک جگہ بیٹھ گیا. سوچنے لگا ممکن ہے میں نے غلطی کی ہو اور کلراج شراب نہ پیتا ہو ممکن ہے دلور نے کلراج کی کارکردگی کی آتشِ حسد سے جل کر مجھے اُکسا دیا ہو۔"

میں اُٹھ کھڑا ہوا - ارادہ کیا - کہ جا کر کلراج کو مناؤں اور اس سے صفائی پیش کرنے کو کہوں. لیکن ساتھ ہی یہ بھی سوچتا تھا کیا وہ کچھ کہنے کو تیار ہو گا. کیا اُس کے دل پر میری یک طرفہ اور سخت کاروائی سے چوٹ تو نہ لگی ہو گی۔

(۵)

میں کلراج کے مکان کی طرف چلا گیا. دروازے پر دستک دی. کلراج کی بوڑھی ماں نے دروازہ کھولا. مجھے دیکھ کر حیران ہو گئی کہنے لگی "آج ہمارے آنگن میں سورج چڑھ گیا. جو آپ اِدھر آنکلے. آئیے. اندر آئیے. کلراج بھی آتا ہو گا —"

میں نے کہا "کلراج کہاں ہے. راضی تو ہے ؟"

وہ کہنے لگی۔ "آپ کی دیا سے راضی ہے لیکن ہر وقت اداس رہتا ہے. کل ہی کہتا تھا. اماں اب گنگا جی چلیں گے زندگی کے باقی دن وہاں ہی گزار دیں گے"۔

میرے دل پر یہ سُن کر چوٹ سی لگی "کیا کلراج اب گنگا جی جائے گا — ؟"

میں اندر چلا گیا. یہ کلراج کی بیٹھک تھی. سامان معمولی تھا. ایک میز تھی جس پر کچھ کتابیں کچھ ورق کاغذ کے اور چند لفافے تھے دیواروں پر قدرتی مناظر کی تصویریں لٹک رہی تھیں۔

میز پر ایک چکنے کاغذ پر کچھ باریک لکھا تھا اور تھا بھی کلراج کے ہاتھ کا لکھا ہوا۔

میں نے میز سے کاغذ اٹھایا. آنکھوں پر چشمے چڑھائے اور پڑھنے لگا. کیسی دل میں اُترنے والی عبارت تھی. کتنے بھولے بھالے جذبات تھے اور کتنی معصومیت برس رہی تھی. مجھے اصل عبارت یاد نہیں لیکن خیالات یاد ہیں کچھ اس قسم کی باتیں تھیں۔

"میں شرابی ہوں"۔

"وہ شراب جسے عام لوگ پی کر بدمست ہو جاتے ہیں، میں نہیں پیتا"

"میری شراب. اُس شراب سے نرالی ہے"۔

"خوش ذائقہ. دل پسند اور معطر"۔

"جس کی کیفیت مجھے میلوں آسمان تک اُڑا لے جاتی ہے"۔

"اور جس کے عکس میں شعریت کے نقشے محبت کے مناظر اور فطرت کی دلآویزیاں دیکھتا ہوں"۔

"جو مجھے بیخودی کی عمیق گہرائیوں میں غرق کر دیتی ہے اور جس سے میں کبھی کبھی دریائے محبت کی پرجوش موجوں میں کھو جاتا ہوں"۔
"مجھے معلوم نہیں۔ کہ میں کب پیتا ہوں۔ اور کہاں پر پیتا ہوں"۔
"ہاں۔ اس قدر یاد ہے۔ کہ ——پی جاتا ہوں اور مسرور ہو کر نکل جاتا ہوں"۔
"اس بستی سے بہت دور —— اس دنیا سے پرے"۔
"فطرت کی وادیوں میں۔ سنسان جنگلوں میں۔ تاریک غاروں میں"۔
"جہاں —— ہاں جہاں فطرت اور میں —— دونوں ایک دوسرے کے ساتھ کھیلتے ہیں"۔
"بے غمی کی حالت میں بیفکری کی حالت میں اور بیخودی کی حالت میں"۔
"ایک دوسرے کی محبت میں کھو کر —— ایک دوسرے کی آغوش میں سو کر"۔
"اس دنیا میں ————

—— رنج اور راحت کی دنیا میں
—— یاس اور آس کی دنیا میں
—— غلامی اور سرداری کی دنیا میں
—— تاریکی اور روشنی کی دنیا میں
—— میں نہیں جاؤں گا —— یقیناً نہیں۔

کیونکہ میں شرابی ہوں ————"
"آہا ہا! ———— میں شرابی"۔

(۶)

یہ پڑھ کر میں کھو گیا۔
اب معلوم ہوا۔ کلراج۔ کلراج نہیں تھا۔ ہیرا تھا جو میری زبان کے ایک اشارے سے اس طرح ہاتھ سے نکل گیا جس طرح آنکھ سے حسرت کا آنسو۔
"کیا وہ اس دنیا میں نہیں آئے گا۔ غلامی اور سرداری کی دنیا میں ———— ؟"
اتنے میں دروازہ کھلا۔ ایک ضعیف سا آدمی شکل کا بوڑھا۔ عمر کا جوان۔ داخل ہوا۔ یہ کلراج تھا۔
مجھے دیکھ کر میرے پاس آ گیا اور پیروں پر گر پڑا۔ میں نے کہا۔ "کلراج۔ اٹھو۔ مجھے تمہارے بغیر چین نہیں آتا۔"

اُس نے مسکرا کر کہا۔ "لیکن جناب میں پاپی ہوں —— شرابی" جس نے مجھے شراب پینے دیکھا ہے میں اُس کی برابری کہاں کر سکتا ہوں"۔

میں نے گردن جھکالی اور چند لمحوں کے بعد کہا۔ "کلراج مجھے دفتر میں شرابی ہی کی ضرورت ہے۔ اُٹھو"۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

سُنی سنائی باتوں پر یک بیک باور کر لینے سے مجھ پر پشیمانی کے بادل طاری ہو گئے۔ پچھتانے لگا۔ قریب تھا میں بھی زار زار رو پڑوں کہ اتنے میں کلراج کی ماں کچھ نارنگیاں لے کر آگئی۔ میں نے پشیمانی اور محبت کے امڈے ہوئے جذبات سے وارفتہ ہو کر کلراج کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "کلراج۔ چلو۔ چلو۔ مجھے تمہارے بغیر چین نہیں آتا۔ میرا جی نہیں لگتا۔

پریم ناتھ سادھو رونق کاشمیری

عزمِ حجاز

مکرمی۔ ہندوستان چند ماہ کے لئے چھوڑ رہا ہوں۔ اور جا کہاں رہا ہوں؟ کعبے کو۔ اس بوالعجبی پر چند اشعار میں اظہارِ خیال کیا ہے ؎

اب تو جاتے ہیں تبکدے سے میر — پھر ملیں گے اگر خدا لایا

وحشت کو میری دیکھنا اے ہمد مو ذرا — صحرا کو چل دیا در جانانہ چھوڑ کر

افسوں تخیلات کا مجھ پر رہا مدام — دیکھا نہ اصل کو کبھی افسانہ چھوڑ کر

تھا میں اسیرِ حلقۂ زلفِ بتانِ ہند — لیلے سے منہ کو موڑ کے ریحانہ چھوڑ کر

لیکن ہوا ہوں جب سے کہ میں عازمِ حجاز — احباب کا وہ لطفِ کریمانہ چھوڑ کر

سب عزّو جاہ و راحتِ کاشانہ چھوڑ کر — سب حرصِ زر بہ ہمتِ مردانہ چھوڑ کر

تو سن رہا ہوں چار طرف سے یہی صدا — "دیکھو تو کر رہی بُت د بتخانہ چھوڑ کر

"مومن چلا ہے کعبے کو اک پارسا کے ساتھ"

جہاز رحمانی بمبئی
۳ مارچ ۱۹۳۴ء

سید سجاد حیدر یلدرم

تخیلات

اے نظمو! اے علم کے سمندر کی حسین و نازک پریو! میں تمہیں سمجھنے سے قاصر ہوں معلوم نہیں تم کیا ہو،
لیکن تمہارے مضامین کی خوبصورتی پھر کیوں میری روح کو لرزا دیتی ہے؟
تمہیں نہ سمجھنے کے باوجود میرا دل کیوں روشن ہوا جاتا ہے؟

دنیا کے تمام اندھیرے تیرے تصوّر کی روشنی میں کافور ہو جاتے اور اس ظلمت کدے کا ذرہ ذرہ چمکنے لگتا ہے

غم و حرماں کے انباروں کے نیچے دبا ہوا تیری محبت کا خزانہ ملا جس نے مجھے مالامال کر دیا۔

میری کچھ ہستی ہو نہ ہو۔ یہ مسرت کیا کم ہے کہ تو ہے اور ہمہ کمال ہے، اور ہمیشہ رہے گا، تمام تکمیلوں سمیت؟

گریز پا مضامین دماغ کی سیر کو کبھی کبھی آتے ہیں۔
جب آئیں فوراً ان پر قابو پالو۔ ورنہ وہ آہوئے رم خوردہ کی طرح بھاگ جائیں گے۔
زندگی میں روشن لمحے زندگی کی سیر کو کبھی کبھی آتے ہیں۔
جب آئیں ان سے کامل مسرت اٹھالو۔ ورنہ محروم رہ جاؤ گے۔

خوبصورتی کو جب بقا کی پیاس ستاتی ہے تو وہ شاعر کی روح کی آب جُو پہ آتی ہے۔

جب سے تیری روشنی کو دیکھ لیا۔ ہر طرف روشنی ہی روشنی ہے۔ تاریکیاں ایسی مٹ گئیں گویا کبھی تھیں ہی نہیں۔ اب تو ہر طرف روشنی ہی روشنی ہے۔

ایک دن تو اس سیاہ خانے میں آیا تھا۔
تیری آمد نے گوشے گوشے کو بقعۂ نور بنا دیا تھا۔
تو چلا گیا لیکن تیری آمد کا نور یہیں رہ گیا۔
اب تاریک راتوں میں بھی یہ نور چمکے گا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔
اب کبھی اندھیرا نہ ہوگا۔
ایک دن تو اس سیاہ خانے میں آیا تھا۔

مشاطۂ فطرت ہر صبح کہساروں کی چوٹیاں پھولوں سے گوندھ دیتی ہے اور سورج کی شعاعیں انہیں زرّیں موباف پہناتی ہیں

سحر آفریں صبح!
کہساروں اور لالہ زاروں پر نور کی بارش کرنے والی!
باغوں اور چمنستانوں کو اپنی ہلکی پھلکی خوبصورت چادر میں لپیٹ لینے والی کائنات کو حسین کر دینے والی!
تو کتنی دلکش ہے
کس قدر روح افزا ہے۔
کتنی حیات آفریں ہے۔
تو میرے سامنے ہمیشہ جلوہ بار رہ!
چھلاوے کی طرح چپکے چپکے ہی غائب نہ ہوتی جا!
آہ! تو جس قدر دلفریب ہے۔ اُتنی ہی جلدی رم کر جانے والی ہے۔

سورج سے، چاند سے، ستاروں سے، گلاب کے پھول اور یاسمن کی کلیوں سے ہم لطف اندوز تو ہوتے ہیں لیکن کوئی توقع نہیں رکھتے۔ انسان بھی اگر وفا آشنا نہیں ہیں تو رنج کیسا۔ وہ بھی مخلوق یہ بھی مخلوق۔ اپنے فرائضِ ہمدردی محبّت کو کسی توقع کے بغیر ادا کرو تاکہ تم ابدی مسرت کے وارث بن جاؤ۔

ح۔ب

ایک بہترین شوہر

میں نے اپنی شادی کے ابتدائی دن فلیڈلفیا اور اُس کے قرب جوار میں بسر کئے۔ جن دنوں کا میں ذکر کر رہا ہوں نہیں دنوں کی بات ہے کہ جولائی کے آتشیں موسم میں ایک شب میں اپنی بیوی کی بے خوابی کی شکایت کے خوفناک نتائج سے بہت ڈر رہا تھا کیونکہ اُس شدید خطرے کے گزر جانے کے بعد اڑتالیس گھنٹے سے زائد مدت تک اس کی آنکھ نہ لگی تھی۔ میرا خیال ہے کہ گرم ملکوں کے تمام بڑے بڑے شہروں میں بے شمار کتے ہوتے ہیں اور یہ سخت گرمی کے زمانے میں رات رات بھر بھونکتے، لڑتے اور چیختے رہتے ہیں۔ بالخصوص اس موقع پر جس کا میں ذکر کر رہا ہوں کتوں نے اتنا مسلسل اور بے پناہ شور مچایا کہ اس میں کسی تندرست توانا شخص کا بھی دم بھر کے لئے سو جانا خارج از امکان تھا۔ رات کے تقریبًا نو بجے میں مکان کی بالائی منزل میں اپنی بیوی کے پلنگ کے قریب بیٹھا تھا۔ اس وقت اس نے مجھ سے کہا "میرا خیال ہے اگر کتوں کا شور نہ ہوتا تو شاید اب میں سو سکتی" میں یہ سنتے ہی فورًا نیچے اترا اور صرف قمیص اور پاجامہ پہنے ننگے پاؤں جھپٹ کر باہر نکل گیا۔ سڑک کے کنارے پتھروں کا ایک انبار لگا تھا۔ وہاں سے پتھر لے کر میں نے چاروں طرف پھر پھر کر کتوں کو بھگانے اور مکان سے دو تین سو گز کے فاصلے پر رکھنے کا کام شروع کر دیا۔ تمام رات اسی طرح میں ننگے پاؤں پھرتا رہا کیوں کہ مجھے اندیشہ تھا کہ جوتے کی آواز کہیں میری بیوی کے کانوں تک نہ پہنچ جائے۔ مجھے یاد ہے کہ رات کے وقت بھی سڑک کی اینٹیں اتنی گرم تھیں کہ میرے پاؤں کو ناگوار محسوس ہو رہی تھیں لیکن میری محنت سے حسبِ دلخواہ نتیجہ برآمد ہوا اور وہ کتنے ہی گھنٹے مسلسل سوئی رہی۔ صبح کے آٹھ بجے میں اپنے روزانہ کام کو چلا گیا جہاں سے مجھے شام کے چھ بجے فارغ ہونا تھا۔

ولیم کابٹ

حامد علی خاں

اب تیری باتیں کس سے کروں؟

جو باتیں صرف تجھی سے کہنی ہیں کس سے کہوں؟

دنیا نہیں سمجھتی، دنیا کو سمجھا کر کیا کروں؟

پہلے پہل

(۱)

پہلے پہل جب آنکھوں آنکھوں تم نے اپنا درشن[1] دیا تھا
کیسے کوئی بتا دے سوامی من کو تم نے موہ لیا تھا
نئی مصیبت ڈالی تم نے
ہنس کر آنکھ چھپا لی تم نے
کوئی جئے یا مرے تمہیں کیا
اپنی بات بنا لی تم نے!

(۲)

پہلے پہل جب بات بات میں جادو اپنا تم نے کیا تھا
کیسے کہوں تم سے میں سوامی اپنی سُدھ بُدھ بھول چکا تھا
نُوکھی[2] دُنیا بسائی تم نے
اپنی دھج سکھلائی تم نے
یہ جی مٹے، جلے یا جھڑ سے

---

[1] درشن۔ دیدار [2] نوکھی۔ انوکھی (نرالی)

اب تو آگ لگائی تم نے

(۳)

پہلے پہل جب ان آنکھوں سے مینہ کا دھارا پھوٹ بہا تھا
پریم کا ساگر[1] میرے سوامی، خوب بھرا تھا خوب بھرا تھا
سُکھ کی ندی بہائی تم نے
جیون ناؤ چلائی تم نے
یہ احسان بھلا کیوں بھولوں
کشتی پار لگائی تم نے

(۴)

پہلے پہلے جب تم نے سوامی سر پر میرے ہاتھ رکھا تھا
سُن لو سُن لو، بھاگ ہمارا سوتے سوتے جاگ اٹھا تھا
اپنے پاؤں گرایا تم نے
مُکت[2] کیا اپنایا تم نے
اب کیا چاہوں! سب کچھ پایا،
ایشور روپ[3] دکھایا تم نے!!

مقبول الٰہی

---

[1] تالاب [2] نجات بخشی۔ پاک کیا [3] شکل یعنی دیدار خدا

مندر میں شام

مندر میں جل رہے ہیں چراغ اور جا بجا
لہرا رہا ہے زُہد و تقدس کا نُور سا

دل میں سما رہا ہے بہشت آفریں سماں
زر کار پیرہن میں ہیں ملبوس دیویاں

چہروں پہ دل کے نور کا پرتو لئے ہوئے
محوِ نیاز، بادۂ عرفاں پیئے ہوئے

نازک لبوں کی جنبشِ پیہم سے بار بار
جاری ہے دل نواز ترانوں کی اک پھوار

مندر، چراغ، شام، دلوں کی صداقتیں
اور ذوقِ بندگی کی مقدس لطافتیں

طاری ہی میری روح پہ اِک کیفِ بے خودی
پہنچا ہُوا ہے عرش پہ اور اِک بندگی

محسوس ہو رہا ہے عبادت بھی حُسن ہے،
اُس حُسن سرمدی کی محبت بھی حسن ہے

عدمؔ

لٹّو اور گیند

ایک صندوق میں ایک لٹو ایک چھوٹی سی گیند اور کچھ دوسرے کھلونے پڑے تھے۔ لٹو گیند سے پوچھنے لگا "گیند! گیند! کیا ہماری شادی ہوگی؟ اگر نہیں تو ہم کیوں اکٹھے ایک ہی صندوق میں رہتے ہیں؟" لیکن گیند نے لٹو کی بات کا جواب تک دینے کی زحمت نہ اٹھائی کیونکہ وہ مراکو کے نفیس چمڑے کا لباس پہنے ہوئے تھی اور ایک نوجوان دوشیزہ کی طرح اسے اپنے حسن پر بہت غرور تھا۔

دوسرے دن ننھا لڑکا اپنے کھلونوں کے پاس آیا۔ اس نے لٹو پر سرخ اور زرد رنگ پھیر کر اُسے رنگین بنا دیا اور اس کے مرکز میں ایک پیتل کی کیل لگا دی اور اب لٹو جب اس کے ارد گرد گھومتا تو عجیب شاندار معلوم ہوتا۔

لٹو پھر گیند سے کہنے لگا۔ "اب ذرا میری طرف دیکھو! اب تمہارا کیا خیال ہے اب تو ہماری نسبت ہو جائے نا؟ یہ رشتہ بہت موزوں رہے گا۔ تم اچھلتی ہو اور میں ناچتا ہوں۔ پھر ہم سے زیادہ خوش اور کون رہے گا؟"

گیند کہنے لگی "ہیں! تم کن خیالوں میں ہو؟ شاید تم نہیں جانتے کہ میرے ماں باپ مراکو کے تھے اور میرا جسم سپین کے کارک کا بنا ہے"

"ہاں لیکن مجھے بھی تو مہاگنی ہی کی لکڑی لگی ہے۔ خود کوتوال نے مجھے تراشا تھا اس کے پاس ایک اپنا خراد ہے جو اُس کے لئے بہت بڑی تفریح کا سامان ہے۔

گیند کہنے لگی۔ "میں ان باتوں پر کیسے اعتبار کر لوں؟"

لٹو نے جواب دیا۔ "اگر میں تمہارے سامنے سچ نہیں بول رہا تو خدا کرے مجھ سے ہمیشہ کے لئے میری گردش چھن جائے"۔

"ہاں اپنے منہ میاں مٹھو بننا تو تمہیں خوب آتا ہے لیکن میں تمہاری درخواست قبول نہیں کر سکتی۔ بات یہ ہے کہ ابابیل کے لڑکے سے میری آدھی نسبت ہو چکی ہے۔ میں جب بھی اچھل کر اوپر ہوا میں جاتی ہوں تو وہ اپنا سر گھونسلے سے نکال کر کہتا ہے۔ "کرو گی؟" اور میں نے کئی دفعہ خموشی میں آپ ہی آپ کہا "ہاں"۔ اب تمہیں بتاؤ کہ کیا ہماری آدھی نسبت اس طرح نہیں ہو گئی؟ لیکن میں تم سے بھی وعدہ کرتی ہوں کہ تمہیں کبھی نہیں بھلاؤں گی۔"

لٹو کہنے لگا۔ "میرے لئے یہی بہت ہے"۔ اس کے بعد انہوں نے ایک دوسرے سے کوئی اور بات نہ کہی۔

دوسرے دن گیند کو لڑکا نکال کرلے گیا لٹو نے دیکھا کہ وہ کس طرح ایک پرند کی طرح ہوا میں اوپر تک نظروں سے بھی پرے چلی جاتی ہے اور ہر بار جب واپس آ کر زمین کو چھوتی ہے تو اچھل کر پہلے سے بھی زیادہ دور تک چلی جاتی ہے یا تو وہ خود ہی ہوا میں اڑنا چاہتی تھی اور یا شاید اس لئے کہ اس کا جسم ہی سپین کے کاک کا تھا نویں دفعہ جب یہ ہوا میں اڑی تو وہیں کی ہو رہی اور پھر واپس نہ آئی۔ لڑکے نے اس کی تلاش میں کونا کونا چھان مارا لیکن بے سود۔ وہ ملتی کس طرح وہ تو کہیں چلی گئی تھی۔

لٹو کہنے لگا "آہ میں خوب جانتا ہوں کہ وہ کہاں گئی ہے وہ ابابیل کے گھونسلے میں ہے۔ اس نے ابابیل کے لڑکے سے شادی کر لی ہے"

لٹو جتنا زیادہ اس کے متعلق سوچتا اس کی بیتابی اور بڑھتی چلی جاتی۔ اب اس کی محبت لاانتہا ہو چکی تھی کیونکہ وہ اسے حاصل نہ کر سکا تھا اور غضب یہ کہ وہ ایک دوسرے کے قبضہ میں چلی گئی تھی۔ لٹو سے یہ کسی طرح برداشت نہ ہوتا تھا۔ لٹو اب بھی اسی طرح گردش کیا کرتا اور اس سے بھنبھناہٹ پیدا ہوا کرتی۔ لیکن اس نے گیند کا خیال کبھی نہ چھوڑا۔ جوں جوں وہ اس کا تصور کرتا اس کی شکل پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت بن کر اس کے سامنے آجاتی۔

آخر اسی طرح کئی سال گزر گئے۔ لٹو کی محبت بہت پرانی ہو چکی تھی۔ وہ خود بھی اب جوان نہیں رہا تھا۔ لیکن ایک دن ایسا آیا جب وہ پہلے سب دنوں سے زیادہ خوبصورت معلوم ہونے لگا۔ اب اس پر ملمع کر دیا گیا تھا اور وہ ایک سنہری لٹو بن گیا تھا اور اب وہ ادھر ادھر ناچ کر اس طرح گھوما کرتا کہ اس سے روں روں کی نہایت بلند آواز نکلنے لگتی۔ اب تو وہ ایک دیکھنے کی چیز بن گیا تھا لیکن ایک دن گھومتے وقت وہ بھی بہت اچھلا اور کہیں غائب ہو گیا۔ انہوں نے ہر جگہ یہاں تک کہ تہ خانے میں بھی اس کی تلاش کروائی لیکن اسے نہ ملنا تھا نہ ملا۔ وہ تھا کہاں؟ وہ تو ایک نابدان میں جا گرا تھا جہاں ہر قسم کا ملبہ پڑا تھا کہیں گوبھی کے ڈنٹھل کہیں کیچڑ کہیں بارش کا پانی جو اوپر کے پرنالے سے گرا تھا۔

لٹو کہنے لگا "اب مجھے ذرا عمدہ جگہ ملی ہے یہاں میری ہر سل بھی معلوم ہو جائے گی کیسی پُر رونق جگہ ہے" تھوڑی ہی دیر بعد اس کی نظر ایک عجیب و غریب گول سی چیز پر پڑی جو ایک باسی سیب کی شکل تھی اور ایک لمبے سے گوبھی کے ڈنٹھل کے قریب پڑی تھی لیکن دراصل یہ سیب نہیں تھا بلکہ ایک پرانی گیند تھی جو کئی سال سے پرنالے میں اٹکی پڑی تھی اور جس کے ذرے ذرے میں پانی کی نمی سرایت کر چکی تھی۔

گیند ملمع کئے ہوئے لٹو کو دیکھ کر کہنے لگی "شکر ہے کہ میرے طبقے کا بھی کوئی فرد یہاں آپہنچا جس سے میں بھی بول سکوں گی میں مراکو کی ہوں۔ مجھے ایک نوجوان خاتون نے سیا تھا اور میرا جسم سپین کے کارک کا ہے لیکن اب تو میری طرف کوئی دیکھنا بھی پسند نہ کریگا۔ ایک دفعہ تو میں ابابیل کے لڑکے سے بھی منسوب ہو چکی ہوں لیکن میں پرنالے میں آگری اور پانچ سال سے بھی زیادہ عرصہ یہاں پڑی رہی۔ میرے تمام جسم میں پانی سرایت کر چکا ہے یقین مانئے ایک دوشیزہ کے لئے یہ ایک بہت لمبی مدت تھی"۔

لٹو خاموش رہا اور اپنی پرانی محبت کو یاد کرنے لگا اور جوں جوں گیند باتیں کرتی اسے یاد آتا جاتا کہ یہ وہی گیند ہے۔

اس کے بعد نوکر نابدان صاف کرنے کہیں ادھر آنکلا۔

کہنے لگا "آہا! وہ ملمع کیا ہوا لٹو!" اب لٹو کو پھر عزت اور توجہ حاصل ہو گئی لیکن ننھی گیند کے متعلق کبھی کچھ اور نہ سنا گیا۔ لٹو اپنی پرانی محبت کے متعلق ایک لفظ تک زبان پر نہ لایا کیونکہ وہ تو فوراً مردہ ہو گئی تھی۔ آہ جب کوئی محبوب شے پانچ سال تک پرنالے میں پڑی رہے اور اس کے جسم میں نمی سرایت کر جائے تو پھر کوئی نابدان میں پڑ کر بھی اس سے تجدید محبت کا خیال تک دل میں نہیں لاتا۔

(ترجمہ)

مہدی علی خاں کرم آباد

محفلِ ادب

موجودہ مزاح نگاری کے نقائص

(از مولوی محمد حسین صاحب ادیب)

آج کل ملک میں مزاحیہ نگاروں کی کمی نہیں۔ اکبر جیسے ظرافت نگار شاعر تو مفقود ہیں لیکن نثر نگار موجود ہیں بعض مزاحیہ نگاروں کے انشائے اور مضامین ملک سے خراجِ تحسین بھی وصول کر چکے ہیں مگر ان میں کمی اس بات کی ہے کہ وہ کوئی اعلیٰ مقصد پیشِ نظر نہیں رکھتے بعض وقت تو دوسروں کی پگڑی اچھالنے ہی میں اپنی ظرافت کا پورا زور صرف کر دیتے ہیں ورنہ زیادہ سے زیادہ محض تفریحِ طبع کی چیزیں پیش کرتے ہیں جن کے مطالعہ سے چند منٹ کے لئے خوش ہو کر آدمی ہنس لیتا ہے لیکن ان کا مکرر مطالعہ اپنے اندر کوئی جذب و دلکشی نہیں رکھتا۔ ان کی تفریحی پیشکش میں جدت اور تنوع مفقود ہوتے ہیں۔ عام طور پر رسائل و جرائد کے ذریعہ ہم جس قسم کے مزاحیہ مضامین سے روشناس ہوتے ہیں ان میں "ننھے کی ماں" یا "خانم" کے تمرد و سرکشی اور لڑائی جھگڑے کی باتیں درج رہتی ہیں یا "دادا جان" اور "شیخو چچا" کے اکھڑ پنے یا "مرزا جی" اور "خانصاحب" کی بیوقوفیوں کا تذکرہ ہوتا ہے بس ایک ڈھرہ قائم ہو گیا ہے یا ایک لیکھ بندھ گئی ہے جس پر ہر مدعیِ ظرافت آنکھ موند کر رینگتا چلا جاتا ہے اس قحط الرجال کے زمانہ میں ملک کے لئے وہ ہستیاں قابلِ فخر ہیں جن کو مبدءِ فیاض نے ظرافت نگاری کی قابلیت عطا کی ہے اگر یہ لوگ اپنے مواہبِ ربانی کی قدر کرتے اور اپنی قابلیت کا صحیح مصرف جان لیتے تو وہ واجب الاحترام مصلح ثابت ہوتے۔ مولویوں کے طبقہ کو بدنام کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ بات بات پر کفر و الحاد کا فتویٰ صادر کرتے رہتے ہیں لیکن بعض نئی روشنی والے حضرات بھی جب سود کے جواز، رسمِ پردہ کی مخالفت، مادی و جسمانی حور و قصور سے انکار پر قلم فرسائی کرتے ہیں تو ان کا لب و لہجہ ایسا سخت و درشت بن جاتا ہے کہ پڑھنے والے کی طبیعت منغص ہو جاتی ہے۔ کیا قدیم فقہا و محدثین پر سب و شتم کی بارش خوش اخلاقی کی علامت ہے۔ کافر گر مولوی اور روشن خیال مدعیِ اصلاح کے اخلاق میں پھر کیا فرق باقی رہا جس شخص میں ظرافت کا فطری مادہ موجود ہو وہ اگر اصلاح کی جانب مائل ہو تو اس کے لئے حضرت اکبر الہ آبادی کا نقشِ قدم سراج منہاج کا کام دیگا۔ اگر اسلام کے سیدھے سادے اصول کو فقہا کی موشگافیوں نے معمّا بنا دیا ہے اور اگر علما کی دارو گیر نے اَلدِّیْنُ یُسْرٌ کو اَلدِّیْنُ عُسْرٌ میں تحویل کر دیا ہے تو ان امور کی تنقید کا ظرافت آمیز پیرایۂ بیان یقیناً گالی گلوج یا درشت منطقی تنقید سے کہیں زیادہ موثر و کارگر ثابت ہوگا۔ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ ایک ہی افعوطربیہ اور حزنیہ دونوں کا موضوع بن سکتا ہے۔ فقہ کی کتاب پر ظریفانہ تنقیدیں بھی لکھی جا سکتی ہیں۔

جو مزاحیہ مضامین محض تفننِ طبع اور دل لگی کے لئے لکھے جاتے ہیں وہاں بھی محض کٹکھنی بیوی کی زیادتیوں یا چچا یا ماموں کی حماقتوں کا بیان قارئین پر کوئی اچھا اثر پیدا نہیں کر سکتا۔ اس کے مطالعہ سے اغیار کے سامنے ایک اوسط طبقہ کے مسلمان گھرانے کا نہایت کریہہ اور ذلیل نقشہ پیش ہوتا ہے

اوسط طبقہ اس لئے کہا گیا کہ ادنیٰ گھرانوں میں ابھی مردوں کی عورتوں پر طلق العنان حکومت قائم ہے وہ اسی اصول پر عامل ہیں کہ ڈھول گنوار پشو ناری یہ سب تاڑن کے ادھیکاری اور استری پیٹنے ہی سے درست رہتے ہیں! اعلیٰ طبقہ میں تو شوہر اور زوجہ دونوں مہذب اور شائستہ ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کرتے ہیں۔ البتہ اوسط طبقہ میں بیوی زیادہ پڑھی لکھی نہیں ہوتی اس لئے شوہر کا پورا احترام نہیں کرتی لیکن میاں ضرورت زمانہ کے لحاظ سے تھوڑی بہت انگریزی پڑھ کر یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ زن مریدی مغربی تہذیب کا جزو لازم ہے اور بیوی کے ساتھ خفگی کا اظہار انگریزی فیشن کے خلاف ہے۔ اب بیوی میاں کو کمزور پاکر ہر بات میں ڈانٹ بتانے لگتی ہے۔ ظرافت نگاری کے شائق مصنف صاحب نے "ننھے کی ماں" کے ساتھ اپنی بیزاری کے اظہار میں جو مبالغہ سے کام لیا تو اپنے گھر اور اپنی خانگی زندگی کو دوزخ کا نمونہ بنا کر پبلک کے سامنے پیش کر دیا۔ ایک مزاحیہ نگار صاحب تو جورو کے ساتھ بہن کو بھی لے مرے ہیں۔ لاہور کے ایک رسالہ میں ایک مزاحیہ افسانہ شایع ہوا تھا جس میں مضمون نگار صاحب فرماتے ہیں "ایک روز میں اپنی بیوی اور بہن کو تانگے میں بٹھا کر سینما دکھانے کے لئے چلا میں خود سائیکل پر سوار تھا لیکن آگے آگے چلنے کے بجائے میں پیچھے پیچھے چلتا تھا اور کبھی دائیں اور کبھی بائیں طرف بھی ہو جاتا تھا تاکہ زنانی سواریوں کو پردے کے سوراخ سے جھانکنے اور غیر مردوں کو گھورنے کا موقع نہ ملے" کیا یہ ظرافت کا خون کرنا نہیں ہے۔ غرض کہ "ننھے کی ماں" اور "خانم" کی چیرہ دستیوں اور زبان درازیوں کے قصے سنتے سنتے لوگوں کے کان پک گئے ہیں اب اس چبائے ہوئے لقمہ میں کوئی مزہ باقی نہیں رہا۔ ضرورت ہے کہ ظرافت میں جدت اور تنوع پیدا کیا جائے

طربیہ ڈراموں میں بھی بعض باتیں ایسی مبتذل اور عامیانہ بن گئی ہیں کہ ان میں کوئی لطف و دلکشی باقی نہیں رہی کسی چیز کی تکرار بیزار کن ہوتی ہے۔ اس لئے مذاق کے پرانے طریقوں سے اجتناب کرنے اور پلاٹ اور کردار میں جدت سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ بہت سی نقالیاں مغالطہ پر مبنی ہوتی ہیں دو شخص ایک دوسرے کی بیوی کو غلطی سے اپنی سمجھ لیتے ہیں۔ غالباً یہ مغالطہ ایک ہی قسم کا لباس پہننے سے پیدا ہوتا ہے کبھی لوگ ایک قصاب کو مسجد کا ملا خیال کر لیتے ہیں۔ کیونکہ دونوں لمبی لمبی ڈاڑھیاں رکھتے ہیں کبھی ایک شخص خاص قسم کی وردی پہن کر ایک قصبہ میں جاتا ہے۔ لوگ اسے انسپکٹر جنرل سمجھ کر اس کی آؤ بھگت کرتے ہیں۔ ڈرامہ نویس ایک معمولی ابتدائی مغالطہ کی بنا پر پلاٹ میں بہت سی پیچیدگیاں اور الجھاؤ پیدا کرتا ہے۔ دو ڈھائی گھنٹہ تک مغالطوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور تماشا ختم ہونے کے صرف پانچ منٹ پیشتر لوگوں کو مغالطہ کا علم ہوتا ہے حالانکہ یہ تمام مغالطے اس قدر مہمل ہوتے ہیں کہ ایک بچہ بھی شروع ہی میں جان جاتا ہے کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ بعض وقت ایک معمولی لفظ کی مصنوعی غلط فہمی پر مذاق گھڑا جاتا ہے ایک ایسی صاحب بہادر اپنے بیرا کو "چیز" لانے کا حکم دیتے ہیں۔ وہ کبھی مٹی کا تیل لا کر حاضر کرتا ہے اور کبھی کچھ اور لاتا ہے اس قسم کے مہمل مغالطے اور غلط فہمیاں حقیقی زندگی میں پیدا نہیں ہوتیں اور اگر ہوتی بھی ہیں تو ان کی فوراً اصلاح ہو سکتی ہے۔ ماہرین فن کا خیال ہے کہ ڈراما نویس کو اس بات کا لحاظ رکھنا چاہیئے کہ مغالطہ بالکل مہمل و بے اصل نہ ہو بلکہ حقیقی زندگی سے تھوڑا بہت میل کھاتا ہو۔

نقالی کا دوسرا عامیانہ طریقہ ایک ایسا کردار پیش کرتا ہے۔ جیسے شادی کا خبط ہو ایک سادہ لوح شخص کسی شریر عورت کی زلف گرہ گیر کا شکار ہوتا ہے وہ طرح طرح سے اُسے تنگ کرتی ہے کبھی وہ امتحان محبت کے لئے اسے ایک ٹانگ پر کھڑے رہنے کا کبھی نیم کے درخت پر چڑھ جانے کا کبھی تلا بازیاں

کھانے کا حکم دیتی ہے۔ بیچارہ عاشق اپنی محبوبہ کے تمام مضحکہ خیز احکام کی بلاچون وچرا تعمیل کرتا ہے کبھی اس کی معشوقہ روٹھتی ہے تو یار لوگ اس کو منالانے اور دونوں میں صلح کرا دینے کے حیلے سے سادہ لوح عاشق کو ٹھگتے اور مٹھائی کھانے کے لئے روپیہ طلب کرتے ہیں۔ بہرحال بہت سے واقعات کے اتار چڑھاؤ اور قسمت کے پلٹا کھانے کے بعد تماشے کا آخری پردہ گرنے سے دو چار منٹ قبل دونوں ازدواج کے مقدس رشتہ میں منسلک ہو جاتے ہیں۔

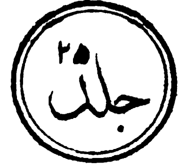
مذاقیہ ڈرامہ کا پلاٹ کبھی کسی نودولت دیہاتی کے گرد تعمیر کر دیا جاتا ہے۔ ایک جاہل اکھڑ دہقانی کی قسمت چمکتی ہے اور وہ حجام سے جرّاح یا موچی سے تاجر چرم یا میاں خیراتی سے مسٹر خیر صلاح بیگ بن جاتا ہے۔ اب اگر وہ اپنے پرانے غریب دوستوں میں مل کر اپنی شان جتاتا ہے تو وہ اس پر "کل ہی بنیا اور آج سیٹھ" کے آوازے کستے ہیں اور اس کا مذاق اڑاتے ہیں اور جب وہ اعلیٰ سوسائٹی میں جاتا ہے تو وہاں کے آداب و مراسم سے ناواقف ہونے کے باعث وہ ایسی ایسی حرکتیں کرتا ہے جو سخت مضحکہ خیز ثابت ہوتی ہیں۔

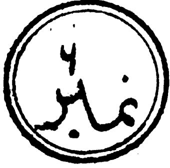
ہمارے ڈرامہ نویسوں نے مغربی تہذیب تمدن کی ہنسی اڑانے کی ایک آسان تدبیر یہ اختیار کر لی ہے کہ وہ کسی مغرب زدہ دیسی صاحب کی شادی کسی آوارہ گشت لیڈی سے کرا دیتے ہیں۔ دن رات لیڈی صاحبہ کے ملنے والوں کا ڈرائنگ روم میں جمگھٹا لگا رہتا ہے۔ وہ کسی کے ساتھ موٹر میں بیٹھ کر پارک کی سیر کو نکل جاتی ہے اور کسی کے ساتھ تھیٹر اور سینما دیکھنے کے لئے چلی جاتی ہے۔ صاحب بہادر بیٹھے بیٹھے منہ تکا کرتے ہیں۔ میاں کی بیماری کی خبر پا کر یہ لیڈی ٹس سے مس نہیں ہوتی اور اس کی کتیا کو کھانسی ہوتی ہے تو لیڈی ڈاکٹر، سول سرجن، مویشی کے ڈاکٹر سب کے سب طلب کئے جاتے ہیں۔ لیڈی کی ضروریات اور مطالبات کو پورا کرتے کرتے کالے صاحب کا ناک میں دم آ گیا ہے۔ جب میاں کی زندگی تلخ ہو جاتی ہے تو وہ لیڈی پر لعنت بھیجتے ہیں اور درد انگیز لہجہ میں گانا گاتے ہیں کہ "ملے جس کو جورو ایسی وہ بہادر دیکھے کیسی" سنسکرت اور ہندی کے ناٹکوں میں مسخرے کا سوانگ (دپارٹ) ہمیشہ کسی پیٹو برہمن کے تفویض ہوتا ہے۔ ہیرو پر کیسی آفت آئے، موقعہ کیسا ہی نازک ہو لیکن اس کو ہر وقت صرف اپنے حلوے مانڈے سے غرض رہتی ہے۔

ظرافت یا مذاق کے یہ تمام لغو اور فرسودہ طریقے ترک کر دینے کے لائق ہیں۔ مذاقیہ ڈرامے لکھنے والے کو تین باتوں کا خاص طور پر لحاظ رکھنا چاہیے۔ اوّل یہ کہ قصہ میں جدت، دلچسپی، پیچیدگی اور ساز باز کے وافر شواہد پائے جائیں۔ دوم یہ کہ ممثلوں (ایکٹروں) کے کام میں چستی، تیزی، پھرتی اور چلت پھرت کے آثار نمایاں ہوں۔ سوم یہ کہ ڈرامائی کردار کے کارنامے حقیقی زندگی سے میل کھاتے ہوں اور ایسے مہمل بے بنیاد اور لغو نہ ہوں کہ کسی انسان کو کبھی پیش ہی نہ آئیں۔ اگر پلاٹ میں جدت، ندرت نہ ہو تو قصہ بالکل بے لطف و بیجان بن جائیگا۔ مکالمہ کتنا ہی پُر مذاق اور مواقع کتنے ہی ظریفانہ کیوں نہ ہوں لیکن ان سے مردہ پلاٹ میں جان نہیں پڑ سکتی جب بنیاد ہی کمزور ہو، تو قصہ کے منتہا (climax) میں اثر آفرینی کی قوت کہاں سے آئیگی؟ ممکن ہو کہ قصہ کے شروع میں تماشائی کچھ ہنس لیں لیکن آگے چل کر پلاٹ کی کمزوری ضرور بے لطفی و بے مزگی پیدا کر دیگی۔ اچھے پلاٹ کی دلچسپی اخیر تک قائم رہتی ہے۔

کردار نگاری میں بھی لکیر کا فقیر بننے کی ضرورت نہیں۔ بہرے، خانساماں، لنگڑے، گھسیارے، بزدل بابو، بڑی توند والے سیٹھ، موٹی عورت اور پیٹو برہمن، افیونی مرزا، بٹیر باز نواب وغیرہ کو اسٹیج پر لا کر بناوٹی مذاق پیدا کرنا کوئی تعریف کی بات نہیں ہے۔ حقیقی زندگی پر توجہ مبذول کر کے نئے نئے کردار پیش کرو۔

(ساقی)





فہرستِ مضامین

"ہمایوں" بابت ماہِ جون ۱۹۳۴ء

تصویر: غروبِ آفتاب اور بادل

چندہ سالانہ ۵ر ششماہی ۳ روپے (مع محصول)

فی پرچہ ۸ر

بزمِ ہمایوں

"ہمایوں" کا مجوزہ "افسانہ نمبر" غالباً یکم اگست کو شائع ہوگا۔ جو اصحاب افسانے کے انعامی مقابلے میں یا "افسانہ نمبر" کے معاونین میں شامل ہونا چاہتے ہیں وہ براہِ کرم اپنے افسانے ۱۳ر جون سے پہلے بھیج دیں اس کے بعد بہ مشکل ہی کسی افسانے کے لئے جگہ نکل سکے گی۔ کیونکہ اس وقت تک ہم موصول شدہ افسانوں ہی میں سے "افسانہ نمبر" کے لئے مضامین منتخب کر چکیں گے۔ اور اس کے بعد ترتیب کا بدلنا دشوار ہوگا ؛

آج سے تقریباً نو سال پہلے خواجہ حسن نظامی صاحب اور علامہ اقبال نے یک زبان ہوکر کہا تھا کہ "ہمایوں" بڑھا ہے، بڑھے گا اور کوئی شیر شاہ اسے زک نہ دے سکے گا"۔ ملک کی اقتصادی بدحالی نے جہاں دوسرے رسائل و جرائد پر اثر ڈالا ہے وہاں اس "بدحال" شیر شاہ نے "ہمایوں" کی ترقی بھی روک دی ہے لیکن خواجہ صاحب اور علامہ اقبال کی محولہ بالا پیشین گوئی کی صداقت میں اب کوئی شبہ نہیں۔ اگر ملک کی اقتصادی پستی فی الحال اہلِ ملک کو "ہمایوں" کی مزید قدر افزائی کا موقع نہیں دیتی تو "ہمایوں" خود اپنی قدر افزائی کرکے اس کمی کو پورا کرے گا چنانچہ مختلف طریقوں سے اس کی دلچسپیوں میں اضافہ کرنے کے علاوہ ہم نے ارادہ کیا ہے کہ "ہمایوں" جو پہلے ہی ظاہری حسن کے اعتبار سے بھی اردو رسائل کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے اور بھی زیادہ خوبصورت ہوجائے ہمیں امید ہے کہ افسانہ نمبر کے علاوہ آئندہ عام پرچوں کی ظاہری و معنوی حیثیت بھی ہمارے اس قول کی تصدیق کرے گی۔

"ہمایوں" کی ترقی کے لئے ہمارے یہ عزائم کیا آپ کی طرف سے حوصلہ افزائی کے مستحق نہیں؟ اگر "ہمایوں" کا ہر خریدار اس کے لئے ایک ایک اور خریدار بھی پیدا کردے تو ہم سمجھیں کہ اہلِ ملک کو اپنی زبان اور اپنے ادب کی ترقی کی اہمیت کا احساس ہوگیا ہے۔

کچھ مدت گزری ہم نے اپنے معاونین سے استدعا کی تھی کہ "ہمایوں" کی ترتیب کے متعلق ہمیں اپنے مشوروں سے مستفید کیا کریں۔ اس طرف بہت کم حضرات نے توجہ کی ہے۔ "بزمِ ہمایوں" صحیح معنی میں "بزمِ ہمایوں" اسی وقت ہوگی جب ناظرین خود اس میں حصہ لینے لگیں ہمیں مسرت ہے کہ ڈیح

ایسٹ انڈیز سے "ہمایوں" کے ایک کرمفرما جناب عبدالسلام صاحب رفیقی نے ہمیں ایک خط بھیجا ہے جس میں انہوں نے "ہمایوں" کے متعلق ہمدردانہ توجہ کا اظہار کیا ہے۔ ان کے مشوروں میں سے اکثر پر عمل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ "ہمایوں" کی اشاعت انگریزی رسائل کی طرح ہو جائے۔ مگر ہم موجودہ صورت میں بھی حتی الامکان مفید اور عملی مشوروں پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کریں گے۔ رفیقی صاحب کا خط ذیل میں درج ہے :-

مارچ کے پرچے میں بزم "ہمایوں" پڑھ کر باسی کڑھی میں پھر ابال آیا ہے۔ اگرچہ ہاتھ میں رعشہ ہے۔ پھر بھی چند سطریں رسالہ کے متعلق لکھنے کو بے اختیار جی چاہتا ہے۔ یہ بالکل سچ ہے کہ "ہمایوں" کے سالنامے اور ماہانہ نمبروں میں سوائے ضخامت کے کوئی فرق نہیں اس لئے نہیں کہ سالنامہ کم درجے کا ہوتا ہے۔ بلکہ اس لئے کہ "ہمایوں" کا ہر نمبر ہی اپنی شان لئے ہوئے ہوتا ہے، بہ حیثیت مجموعی "ہمایوں" اردو کا بہترین رسالہ ہے۔ میرے خیال میں مخزن سے لے کر آج تک جتنے رسالے اردو کے نکلے۔ کوئی بھی ظاہری و باطنی خوبیوں میں "ہمایوں" کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اگر اس سے بہتر کوئی رسالہ تھا یا ہے تو کم از کم میری نظر سے نہیں گزرا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر سوائے حجم کے سالنامہ میں اور دوسرے نمبروں میں کوئی فرق نہیں۔ تو سالنامہ سے فائدہ ہی کیا ہے؟ بجائے اس کے وہی حجم کی زیادتی سال بھر کے پرچوں میں تقسیم کی جائے۔

خاص خاص نمبر توں بھی نکالے جا سکتے ہیں۔ ادب لطیف کے لئے خاص نمبر پر از لطف ہوگا۔ اسی طرح اگر کوئی خاص نمبر "آپ بیتی" کا نکلے تو شاید پسند کیا جائے میری مراد اس سے یہ ہے کہ ہر ایک نامہ نگار اپنا تجربہ سفرنامہ یا دوسرے واقعات جو اس پر خود گزرے ہوں یا اس کے علم میں آئے ہوں مضمون کی صورت میں قلمبند کرے۔ جیسے کہ انگریزی رسالہ "وائیڈ ورلڈ" نکلتا ہے۔ اسی طرح ایک نمبر خاص اہتمام کے ساتھ ہندوستان یا ایشیا کے متعلق تاریخی یا غیر تاریخی واقعات کا باتصویر نکلا کرے جیسا کہ امریکہ کا رسالہ "ایشیا" ہے۔

اگر سیاست کو شجر ممنوعہ نہ سمجھا جائے تو یہ بھی مناسب ہے کہ سال میں ایک آدھ نمبر کلکتہ کے "ماڈرن ریویو" کے طرز پر بھی نکالا کرے۔ نوجوانوں کے لئے اگر کوئی نمبر مسٹر (آج کل مولانا) شوکت علی کے اولڈ بوائے کی طرز کا بھی نکلے تو دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ایک عرض باقی ہے۔ رسالہ کے ہر ایک صفحہ پر اگر مضمون کا نام ہوا کرے۔ تو مطالعہ کے لئے آسانی ہوگی۔

عبدالسلام رفیقی

رفیقی صاحب کی تجاویز کے متعلق ہم فی الحال اپنی تفصیلی رائے محفوظ رکھتے ہیں لیکن ہمیں توقع ہے کہ ناظرین "ہمایوں" اس قابل تقلید مثال کے پیش نظر اپنے مفید مشوروں سے ہماری اعانت فرماتے رہیں گے۔

اس پرچے میں "ہندوستان کی قومی زبان" کے عنوان سے ایک قابلِ توجہ مضمون شائع ہو رہا ہے۔ یہ مسئلہ موجودہ وقت کے اہم ترین مسائل میں سے ہے ہمیں توقع ہے کہ اہلِ قلم حضرات بھی اس طرف توجہ مبذول کریں گے لیکن محض زبان سے اردو کا حق ثابت کرنے سے کچھ نہ بنے گا۔ اہل ملک کو بحیثیت مجموعی عملی طور پر اس مسئلہ سے دلچسپی لینی چاہیئے۔ بلاشبہ یہ زبان فطرت نے پیدا کی فطرت اس کی پرورش کریگی اور کرتی رہی ہے لیکن ہم بھی اگر ذرا سی توجہ کریں تو صدیوں کا کام برسوں میں تکمیل کو پہنچ سکتا ہے۔ ہماری زبان اور ہمارے ادب کی تکمیل ہماری قومیت کی تکمیل ہوگی۔

جہاں نما

عورت کا راج

ڈاکٹر میگنس ہرشفیلڈ ایک فرانسیسی رسالے کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ مرد عورت کے وہ عام مقابلے جن سے ان کے باہم عضوی اختلافات سے مرد کا تفوق ثابت کیا جاتا ہے موجودہ معلومات کی روشنی میں قطعاً غلط اور گمراہ کن ثابت ہو چکے ہیں۔ موجودہ مرد اور عورت اس قابل نہیں کہ نفسیاتی مقابلے کے خیال سے اُن کا مطالعہ کیا جائے کیونکہ ان کے امتیازی خواص سراسر مرد کے عورت پر حاکمانہ اقتدار اور عورت کی معاشری اور سیاسی پستی کا نتیجہ ہیں۔

جہاں عورتوں کی حکومت ہوتی ہے وہاں ان میں تمام وہ خواص پائے جاتے ہیں جو ایسے ہی حالات میں مردوں کا مابہ الامتیاز ہیں، اس کے ساتھ ہی عورتوں کے محکوم مردوں میں بھی تقریباً وہی تمام خواص موجود ہوتے ہیں جو اس حیثیت میں عورتوں کا خاصّہ سمجھے جاتے ہیں۔

ہمیں معلوم ہے کہ مختلف زمانوں میں مختلف اقوام میں عورتوں کا اقتدار رہ چکا ہے بالخصوص قدیم اہلِ مصر اور اہل سپارٹا میں لیکن یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہے کہ بعض ایسے علاقوں میں جو مشرق و مغرب کے درمیان حدِ مشترک کا حکم رکھتے ہیں اب بھی عورتوں کا راج ہے۔

مسٹر ہرشفیلڈ کا قول ہے کہ اپنی سیاحتِ عالم کے دوران میں مجھے بہت سے ایسے مقامات کے حالات کے ذاتی مطالعہ کا موقع ملا جہاں عورتوں کی مقتدرانہ حیثیت مسلم تھی۔

مثال کے طور پر منانگکا کے کاشتکاروں میں جو سماٹرا کے شمال کی طرف سطحِ مرتفع پڈانگ میں رہتے ہیں عورتوں کو حاکمانہ حیثیت حاصل ہے۔ وہاں کنبے پر عورت کی سرداری مسلّم ہے۔ شوہر اور بچوں کو اُسی کا خاندانی نام اختیار کرنا پڑتا ہے۔ عورت مرد کے مصارف کی کفیل ہوتی ہے۔ مرد کو گھر کے باہر رہنے کے لئے جگہ دی جاتی ہے جہاں سے عورت اُسے وقتاً فوقتاً مفوّضہ فرائض انجام دینے کے لئے اندر بلاتی ہے اور اس کے بعد وہ پھر اپنے بیرونی حجرے میں واپس بھیج دیا جاتا ہے۔

اب اس علاقے کے مردوں کو اپنی ادنیٰ حیثیت کا احساس ہو رہا ہے چنانچہ ان میں سے بعض معاش اور بہتر معاشری حالات کی تلاش میں چین کی طرف ہجرت کر گئے ہیں۔

اس کے برخلاف تبت کے لوگ اپنی قسمت پر شاکر نظر آتے ہیں۔ تبت میں عورتوں کا راج وہاں کی عورتوں کی کثیر الازدواجی کا قدرتی نتیجہ ہے۔ تبت میں ایک عورت کے عموماً تین سے لے کر پانچ تک شوہر ہوتے ہیں جو عموماً بھائی بھائی ہوتے ہیں اور جنہیں عورت اپنا غلام سمجھتی ہے۔

مسٹر ہرشفیلڈ لکھتے ہیں کہ بدترین قسم کا نسوانی راج ایک جاپانی جزیرے میں ہے حالانکہ بحیثیت مجموعی جاپان میں باوجود اس کے ادعائے تہذیب مغرب کے ابھی تک مرد کا مستبدانہ اقتدار مسلم ہے۔

لیکن جزیرۂ فارموسا میں جو جاپان کا ایک حصہ ہے ابھی تک عورتوں کے راج کا قدیم رواج جاری ہے۔ اس جزیرے میں تو بڑے بڑے قبائل آباد ہیں ان میں سے ہر قبیلے کی سردار ایک عورت ہے جو اس قبیلے کی مذہبی پیشوا بھی سمجھی جاتی ہے۔ اس کے مقدس پاؤں کبھی زمین پر نہیں پڑنے دیئے جاتے۔ اس کی وفادار رعایا اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ تک اٹھائے اٹھائے لئے پھرتی ہے۔ یہاں عورت کی سرداری وراثتہً قائم ہے۔ چنانچہ یہ نسلاً بعد نسلٍ ماں سے اس کی بیٹی کی طرف منتقل ہوتی رہتی ہے۔ اس عورت کو قبیلے میں قاضی القضات کی حیثیت بھی حاصل ہوتی ہے اور اس کے فیصلے کے خلاف کسی قسم کا مرافعہ نہیں ہو سکتا۔ یہ عورت غیب دان اور دانائے اعظم بھی سمجھی جاتی ہے اور قبیلے کے تمام افراد اہم مسائل میں اسی سے مشورہ لیتے ہیں۔

ہٹلر اور جرمنی

ہٹلر کے طرز حکومت کے متعلق دوسرے ممالک کی رائے کچھ ہی کیوں نہ ہو اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ جرمنی کی اجتماعی زندگی میں ہٹلر کے پیدا کئے ہوئے ذاتی اعتماد کے جذبہ نے ایک زندگی پیدا کر دی ہے۔ "انگلش ریویو" میں مسٹر گورڈن بولیتھو اس مسئلے کے متعلق مضمون لکھتے ہوئے دو امور کی طرف خاص طور پر توجہ دلاتے ہیں ——— عورتوں کی ترقی اور مذہب کا احیا۔

اب تک جرمنی نے بہت کم قومی ہیروئنیں پیدا کی ہیں۔ وہاں کے تمام مجسمے مردوں کے ہیں۔ جرمن ادب عورتوں کی سوانح عمریوں سے تہی مایہ ہے۔ جنگ عظیم نے بھی کوئی جرمن فلارنس نائٹنگیل یا نرس کیول نہیں پیدا کی۔ جرمنی کے تصویر خانوں میں بڑی عورتوں کی تصاویر نظر نہیں آتیں بجز ان عورتوں کے جنہیں شاہی خاندان سے متعلق ہونے کے باعث خود بخود یہ حق مل گیا ہو۔ جرمنی میں کبھی کوئی ملکہ وکٹوریا یا ملکہ الزبتھ نہیں گزری۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس ملک کی تاریخ عورت کے ذکر سے خالی ہے۔ البتہ قیصر کی پہلی بیوی آگسٹ وکٹوریا سے لوگوں کو عقیدت تھی اور وہ اب تک لوگوں کو یاد ہے۔ تعجب تو یہ ہے کہ گرجاؤں میں اب تک اس کے لئے دعا کی جاتی ہے حالانکہ شاہی خاندان کے اور تمام افراد اس حق سے محروم ہو چکے ہیں۔

نوجوان لڑکیوں کی زندگی میں ہٹلر نے جو دلچسپی لینی شروع کی ہے اس سے جرمنی کی مائیں بہت مطمئن نظر آتی ہیں گزشتہ

چھ مہینے کے اندر اندر یہ عجیب انقلاب پیدا ہوا ہے کہ جرمن عورتوں کے افسردہ چہروں پر زندگی کا خون دوڑتا ہوا نظر آنے لگا ہے۔ لڑکیاں اپنے گھروں سے زیادہ دلچسپی لینے لگی ہیں۔

نازی حکومت نے لڑکیوں کے دلوں سے امورِ عامہ کے محکموں میں عہدے حاصل کرنے کا خیال نکال دیا ہے۔ موجودہ حکومت کا منشا محض یہ ہے کہ وہ دوبارہ مائیں اور بیویاں بن جائیں۔

اب بہت کم لڑکیاں ایسی نظر آتی ہیں جو وکیل، ڈاکٹر یا اخبار نویس بننے کی کوشش کر رہی ہوں۔ سال ہی بھر گزرا کمیونسٹ جرمن لڑکیوں کو اخبار نویسی کا جنون ہو رہا تھا۔ اب یہ بات نہیں۔ البتہ جسمانی قوت حاصل کرنے کا شوق ابھی کم نہیں ہوا۔ گزشتہ ہی دنوں جسمانی قوت کے ایک مظاہرے میں اسی ہزار لڑکیوں نے حصّہ لیا۔

اس امر پر غور کرنا دلچسپی کا موجب ہوگا کہ اگر ہٹلر کی شادی ہو چکی ہوتی تو موجودہ سیاسی حالات پر اس کا کیا اثر ہوتا۔ مصطفیٰ کمال اور مسولینی کی بیویوں کو کبھی امورِ حکومت میں دخل دینے کا موقع نہ مل سکا۔ اگرچہ مسولینی کی کامیاب خانگی زندگی اطالویوں کے لئے سبق آموز ثابت ہوئی ہے ہٹلر کی پاکیزہ زندگی نے بھی جرمنی کی ماؤں کے دلوں میں اس کی عزت پیدا کر دی ہے اور مرد بھی اسے وقعت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ لڑکیوں کی غیر مطمئن زندگی کا خاتمہ بھی ہو گیا ہے اور وہ دوبارہ خانہ داری کے معاملات سے دلچسپی لینے لگی ہیں۔ مردوں کی سی زندگی بسر کرنے کا شوق اب جرمنی میں نہیں رہا اور عورتیں دوبارہ عورت بن گئی ہیں۔

صاحبِ مضمون نے مذہب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ صرف جرمن دیہات کے کلیسا ہی آباد نہیں بلکہ اب بڑے شہروں کے گرجاؤں میں بھی عبادت گزاروں کی کثرت ہوتی ہے۔ ہٹلر کے عہد میں یہ انقلاب چند ہی مہینوں میں ایک معجزے کی طرح رونما ہو گیا ہے۔ اس انقلاب نے مہذب دنیا کے سامنے "قومیت" کے احیا کا رنگ جما دیا ہے اور جرمن نوجوانوں کے اس جذبے کا اظہار کر دیا ہے کہ وہ اپنی بہترین خدمات صرف نئی جرمنی کے لئے وقف کر دینا چاہتے ہیں۔

ہندوستان اور بیداریٔ نسواں

ہندوستانی عورتوں پر غیر ملکی لوگ ناقابلیت کا جو الزام لگاتے ہیں وہ پہلے درست ہو تو ہو لیکن موجودہ عہد میں یہاں کی عورتیں جس سرعت سے ترقی کر رہی ہیں اور نہ صرف اپنے فرقے کی ترقی بلکہ ملک کے اہم معاشری معاملات میں جو حصہ لے رہی ہیں وہ اس قسم کے کسی الزام کی گنجائش باقی نہیں رہنے دیتا۔ گزشتہ دنوں بمبئی میں مہارانی صاحب بڑودہ کے زیرِ صدارت ہندوستانی خواتین کی نیشنل کونسل کا دو سالہ اجلاس منعقد ہوا۔ مہارانی صاحبہ کا خطبۂ صدارت اپنے جوش، وسعتِ نظر اور جرأت آموز اندازِ بیان کے لحاظ سے بے نظیر تھا اور یقین ہے کہ یہ ہزاروں ہندوستانی گھرانوں میں تحریکِ عمل کا جذبہ پیدا کر دے گا۔ ہندوؤں کے قانونِ وراثت اور قانونِ تقسیم جائداد

رباعیات

کھلتے ہی گلاب خار ہو جاتا ہے
ہنستے ہی بس اک اشکبار ہو جاتا ہے
اے قیمت انساں
پیدا ہوتے ہی تیرہ
اے موت ترا شکار ہو جاتا ہے

ساغر ہے ازل کے دن سے خالی تیرا
گلشن ہے رہین پائمالی تیرا
افسوس کہ اس دہر میں اے نوع بشر
وارث نظر آتا ہے نہ والی تیرا

اک آگ سی رہ رہ کے بھڑکتی ہے ضرور
سینے میں کلی سی اک چٹکتی ہے ضرور
واقف نہیں میں خدا سے لیکن اکثر
دل میں اک پھانس سی کھٹکتی ہے ضرور

گردن مفقود اور بانہیں لاکھوں
جلوے معدوم اور نگاہیں لاکھوں
مبہوت ہے کاروانِ دنیا
منزل عنقا ہے اور راہیں لاکھوں

جوش ملیح آبادی

خمستان

اک پیکرِ پیچ و تاب ہے ساحل کے لئے بیتاب
دیوانۂ مضطرب ہے سلاسل کے لئے بیتاب
کیا کہیے یہ کائنات کیا ہے، شاید
اک قافلۂ برق رو ہے منزل کے لئے بیتاب

گل چہروں سے واہ واہ کی ہے میں نے
کانٹا چبھے پہ آہ کی ہے میں نے
رو دیا ہنس ہنس کے اور ہنسا رو رو کر
یوں ختم شبِ سیاہ کی ہے میں نے

یارب مجھے رشکِ طور کر دے اے دوست!!
سینے میں فروغِ نور بھر دے اے دوست!!
ہو جاؤں میں سجدہ گاہِ بزمِ امکاں
سجدے کو مجھے تو اپنا در دے اے دوست!!

جب آئینۂ دل کا روبرو ہوتا ہے
جلوہ تیرا سارا ہی ہو بہو ہوتا ہے
یوں غرق ترے جمال ہو جاتا ہوں
میں ہوتا کہاں ہوں تو ہی تو ہوتا ہے

اثر صہبائی

اردو ڈراما

ہر شخص کو معلوم ہے کہ جب ہندوستان میں اسلامی حکومتیں قائم ہوئیں اور مسلمانوں نے اس ملک میں مستقل سکونت اختیار کر لی تو ان کو اہل ہند کے ساتھ تبادلۂ خیالات کی ضرورت پیش آئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربی ۔ فارسی ۔ ترکی اور ہندوستان کی پراکرتوں کی آمیزش سے ایک نئی زبان پیدا ہوئی جو اب اردو کہلاتی ہے کئی صدیوں تک یہ محض بول چال کی زبان بنی رہی لیکن سلطنت مغلیہ کے زوال کے وقت اس میں ادبی شان پیدا ہوئی اور تھوڑے ہی دنوں میں وہ اعلیٰ ترقی یافتہ زبانوں کی ہمسر بن گئی ۔ اگرچہ اردو بولی کی ساخت میں بھاشا کا عنصر غالب تھا لیکن اردو کے ابتدائی ادیبوں اور شاعروں نے فارسی لٹریچر کو اپنا خضرِ راہ بنایا ۔ وجہ یہ تھی کہ ہندوستان کی تمام زندہ زبانوں میں فارسی سب سے مہذب اور شائستہ زبان تھی اور اس کو حاکمانہ اقتدار بھی حاصل تھا ۔ ہندو اور مسلمان دونوں اس کے گرویدہ تھے ۔ جن بزرگوں نے اردو شاعری کی داغ بیل ڈالی وہ فارسی داں تھے اس لئے فارسی کے ادبی نمونوں کی تقلید ان کے لئے ایک لازمی اور فطری بات تھی ۔

فی الحقیقت اردو شاعری کو فارسی شاعری سے نسبت دختری ہے ۔ نیک بخت دختر نے اپنی واجب الاحترام ماں کے عادات و خصائل اختیار کرنے اور ہندی نژاد اناؤں اور کھلائیوں کی چال ڈھال سے محترز رہنے میں ایسی شدت و غلو سے کام لیا کہ آج بجا طور پر اردو شاعری کو فارسی شاعری کا وجود ظلّی قرار دیا جاتا ہے ۔ چونکہ ڈراما عربی یا فارسی ادبیات کی کوئی مسلمہ صنف یا شاخ نہ تھا اس لئے اردو کے مستند شعرا ڈراما نویسی کی طرف متوجہ نہ ہوئے ۔ بعض مغرب زدہ حضرات جن کو اپنی شاعری کے کھوٹے کھرے کی مطلق تمیز نہیں ہے نہایت غیر ذمہ دارانہ طریقہ پر کہہ دیتے ہیں کہ اردو شعرا کو فارسی شاعری کی نقالی کے سوا اور کچھ آتا ہی نہیں ۔ ان میں جدت طرازی کا مادہ ہی مفقود ہے ۔ وہ صرف انہیں اصناف سخن پر طبع آزمائی کر سکتے ہیں جو فارسی میں رائج تھے کسی نئے موضوع پر قلم اٹھانا ان کی قدرت سے باہر ہے ۔ چونکہ ڈرامے کے میدان میں ان کے فارسی آقاؤں نے کبھی اپنے اشہب قلم کی جولانی نہیں دکھائی اس لئے ان کی غلامانہ ذہنیت اس نئے میدان میں قدم رکھنے سے گریز کرتی رہی ہے ۔ غرض کہ اردو شعرا کا ڈراما نویسی کی طرف مائل نہ ہونا ان کی ذہنی افلاس کی دلیل ہے ۔

اس قسم کی غلط بیانی سے نہ صرف ہمارے اساتذۂ سخن کی تحقیر و توہین ہوتی ہے بلکہ اردو شاعری کی اٹھان اور عروج کی تاریخ سے خود معترض کی لاعلمی کا پتہ چلتا ہے ۔ ہمارے مسلم الثبوت شعرا کی جدتِ تلاش ۔ زورِ بیان اور اچھوتے خیال سے کون انکار کر سکتا ہے ؟ یہی وہ خوبیاں ہیں جن کی سرمایہ داری سے بہترین ڈرامے معرض وجود میں آ سکتے ہیں ۔ بقول عزیز مرزا صاحب کے ہمارے سرآمد شعرا

میں اعلیٰ درجہ کی ڈرامائی قابلیت موجود تھی" مثلاً ہنسی مذاق اور ہمت و جرأت کے جذبات کو سودا سے بہتر کون بیان کرسکتا تھا؟ یا مختلف پیشہ وروں کی تصویر اس سے بڑھ کر کون کھینچ سکتا تھا۔ یا عشق و محبت کے آلام و مصائب کا عکس میر سے بہتر کون اتار سکتا تھا؟ یا بزم نشاط کے پرلطف مناظر میر حسن سے اور غم و الم کے زہرہ شگاف مرقعے ان کے پوتے میر انیس سے بہتر کون دکھا سکتا تھا؟ ادنیٰ قسم کے عشق کے جذبات اور عاشق معشوق کی چھیڑ چھاڑ پر نواب مرزا شوق سے زیادہ حاوی کون ہو سکتا تھا؟ ظرافت اور تمسخر کے متعلق مشیر کی چلبلی طبیعت کیا ستم نہ ڈھاتی؟ اگر نظیر اکبرآبادی کی عالمگیر طباعی نے اس طرف توجہ کی ہوتی تو کیا کیا طلسم نہ بنا کر کھڑے کر دیئے ہوتے؟" شاہد بازاری پر لعن طعن کرنے اور اس کو جلی کٹی سنانے میں جرأت اور مرزا داغ سے کون بازی لے جا سکتا تھا۔ الغرض جس قسم کی جذبات نگاری۔ واقعات بیانی اور منظر کشی کی بنیادوں پر ڈرامے کی عالیشان عمارت کھڑی کی جا سکتی ہے ان میں ہمارے اکثر سرآمد شعرا کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ تاہم انہوں نے کبھی ناٹک یا ڈرامے کی طرف توجہ نہ کی۔ اس کا کیا سبب تھا؟ عام طور پر تو یہی کہا جاتا ہے کہ فارسی شاعروں نے جو لکیر قائم کر دی تھی۔ اسی پر اردو شعرا آنکھ بند کر کے ناک کی سیدھ میں چلتے تھے اور مقررہ راستہ سے ایک قدم بھی باہر نکالنا بدعت سیئہ سمجھتے تھے لیکن یہ بالکل غلط خیال ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے قدیم شعرا وضع کے بڑے پابند تھے۔ اور آج کل کے مقلدین یورپ کی طرح نت نئے چولے بدلنے کو چھچھورا پن خیال کرتے تھے۔ ان کی فطری شرافت اقلیم سخن میں بات بات پر علم بغاوت بلند کرنے کی اجازت نہیں دیتی تھی اور نہ ان کی غیرت و خودداری اس بات کو قبول کر سکتی تھی کہ وہ ادنیٰ درجہ کے بھگت بازوں اور تماشا گروں کے ساتھ تعاون کریں۔ البتہ وہ اپنے خاص رنگ میں جدت و ندرت دکھانے کی کوشش کرتے تھے چنانچہ مرثیہ۔ واسوخت۔ وصف نگاری اور سہرے کے میدان میں ان کے روشن کارناموں کی نظیر پیش کرنے سے خود فارسی شاعری قاصر ہے۔ ممکن ہے کہ بعض لوگ اردو شاعروں کو ان اصناف سخن کا موجد قرار دینے میں پس و پیش کریں لیکن اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ اردو شعرا ہی نے ان کو معراج کمال تک پہنچایا ہے۔

اگر ہمارے قدیم شعرا ڈرامے کی ادبی و فنی خوبیوں سے واقف ہوتے تو وہ ضرور ادھر توجہ کرتے اور عجب نہیں کہ ایسے شاہکار چھوڑ جاتے جو کالیداس اور شکسپیئر کے ڈراموں کے پہلو بہ پہلو جگہ پاتے لیکن افسوس ہے کہ ان کو ڈرامے کی ادبی حیثیت سے روشناس کرانے والا کوئی نہ تھا۔ ان کے خواب و خیال میں بھی یہ کبھی نہ گزرا ہوگا کہ ناٹک ادبیات کی کوئی اہم صنعت ہے۔ کیونکہ ڈرامے کی فنی کتابیں مثلاً نٹ شاستر۔ کاری پرکاش۔ ساہت درپن۔ سنگت رتن وغیرہ ناپید ہوگئی تھیں۔ ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقہ کو بھی ان پر دسترس حاصل نہ تھی۔ علاوہ بریں کالیداس اور بھاوبھوتی کے اصل بلند پایہ ناٹک سنسکرت زبان میں تھے جن پر امتداد زمانہ کا دبیز اور تاریک پردہ پڑا ہوا تھا تعلیم یافتہ ہندو بھی سنسکرت کے پوشیدہ علمی و ادبی خزانوں سے ویسے ہی ناواقف تھے جیسے مسلمان۔ دربار میں عزت پانے اور اعلیٰ سوسائٹی میں رسوخ حاصل کرنے کا اہم ذریعہ فارسی میں دستگاہ حاصل کرنا تھا۔ چنانچہ ہندوؤں میں بھی

فارسی اور اردو کے بڑے بڑے شاعر۔ ادیب اور انشا پرداز پیدا ہوئے لیکن سنسکرت زبان سے بے بہرہ رہنے کی وجہ سے وہ بھی اچھا ڈراما نہ پیش کر سکے۔ غرض کہ ہمارے قدیم اردو شعرا کو ڈرامے کی ادبی خوبیوں اور فنی باریکیوں سے واقف ہونے کا موقع ہی نہ ملا۔ البتہ ان کے نزدیک ناٹک نام تھا ان کھیل تماشوں کا جو بازاروں اور گلی کوچوں میں کھائے جاتے تھے! اور سخت حیا سوز اور مخرب اخلاق ہوتے تھے۔ کوئی تک بند بھاٹ کسی من سمجھوتی قصہ میں بد تہذیبی اور عفت سوزی کے واقعات بازاری گانے اور مسخرے پن کی باتیں شامل کر کے چند جاہل اور آوارہ گرد ایکٹروں کو یاد کرا دیتا تھا۔ یہ لوگ گاؤں گاؤں پھر کر عارضی اسٹیج پر انہیں چیزوں کو دہراتے تھے۔ ان کے حرکات و سکنات اوباشوں کے سے ہوتے تھے۔ پراہنس۔ بھان۔ رہس۔ رس لیلا۔ کرشن لیلا وغیرہ کا شمار انہیں مبتذل و فحش ناٹکوں میں ہوتا ہے۔ ہندوستانی بہروپیا اس زمانے کے رذیل ایکٹروں کی یادگار ہے۔ ایکٹروں کو عرف عام میں بھگت باز کہتے تھے۔ شریف لوگ ان کے سایہ سے بچنے کی کوشش کرتے تھے۔ ڈرامے اور ایکٹروں کی یہی وہ پونجی تھی جس سے ہمارے قدیم شعرا روشناس ہوئے۔ ان کے نزدیک ناٹک ایک قسم کا فحش کھیل تماشا تھا جس کا تعلق بھانڈوں۔ نقالوں۔ گویوں کسبیوں اور ڈوم ڈھاڑیوں سے تھا۔ اگر ان سے کہا جاتا کہ ڈراما ایک فن لطیف ہے جس کی ترتیب و تہذیب میں شعرا کو حصہ لینا چاہیئے تو وہ غیرت سے زمین میں گڑ جاتے۔ ایکٹروں یعنی "مقلد پیشیوں" کی حیثیت ان بھانڈوں اور نقالوں سے بھی کمتر درجہ کی تھی جو شرفا و امرا کی محفلوں میں تفریح و تفنن کا سامان بہم پہنچاتے تھے۔ ڈراما لکھنے کے معنی ایسے ہیٹے اور رذیل لوگوں کے لئے تماشا تیار کرنا تھا جن سے کوئی شخص میل جول پسند نہ کرتا تھا۔ بھلا ہمارے شعرا کی خودداری۔ متانت اور ثقاہت اسے کب گوارا کر سکتی تھی؟

مذکورہ بالا بیانات سے واضح ہے کہ ڈرامے کی جانب سے ہمارے قدیم شعرا کی بے توجہی ان کی عدم قابلیت یا فارسی شعرا کی کورانہ پیروی کا نتیجہ نہ تھی بلکہ اس کے ذمہ دار وہ واقعات و حالات ہیں جن کے تحت ہمارے شعرا فن ڈراما کا صحیح تصور قائم کرنے سے معذور رہے۔ البتہ جب ہندوستان میں اسلامی حکومتوں پر زوال آگیا۔ طاقت و شوکت رخصت ہوگئی۔ صولت و شجاعت کے جذبات مردہ ہوگئے۔ وسیع سلطنت کے انتظام و انصرام کا بوجھ ہلکا ہوگیا تو فرمانروا نہایت سہل انگار۔ آرام طلب اور عیش پرست بن گئے۔ ان کے درباروں میں دن رات طرب و نشاط اور رقص و سرود کی محفلیں گرم رہنے لگیں تفنن طبع اور دلبستگی کے نئے نئے سامان فراہم کئے جانے لگے۔ چنانچہ ناٹک کا تماشا بھی ایک اہم تفریحی مشغلہ قرار پایا۔ پہلے تو ایکٹروں یا بھگت بازوں نے امرا کی تفہیم و خوشنودی کے لئے ہندی ناٹکوں میں ٹوٹی پھوٹی فارسی کی آمیزش کردی اور بعدہٗ مذاقیہ قصے اردو میں بیان کئے جانے لگے۔ کہا جاتا ہے کہ فرخ سیر کے زمانہ میں نواز نامی ایک اردو شاعر نے ہندی کے ذریعے سے شکنتلا کے قصہ سے آگاہی حاصل کی اور اس کو اردو میں بطرز ڈراما لکھا۔ اردو کا سب سے پہلا ڈراما یہی تھا لیکن اب تک اس کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہو سکا۔ تاہم اردو

ڈرامے کی تاریخ میں اس کا رسماً ضرور ذکر کیا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ کسی کھوج لگانے والے کی کوشش اس کی تلاش میں کامیاب ہو جائے لیکن سچ پوچھیے تو بے فکری۔ فارغ البالی۔ اور عیش پرستی کا اصل گہوارہ اودھ کے نواب وزیر کا دربار تھا۔ انگریزوں کی دوستی نے لکھنؤ کے نوابوں کو اندرونی و بیرونی خطرات سے محفوظ و مصون بنا رکھا تھا اور نواب سعادت علی خان کا جمع کیا ہوا سترہ کروڑ روپیہ ان کے جانشینوں کی عیش پرستی کے لئے کافی تھا۔ چنانچہ غازی نصیرالدین حیدر اور نواب واجد علی شاہ کی رنگ رلیوں اور زرپاشیوں کے قصے زبان زد خلائق ہیں۔ آخرالذکر کی رنگین مزاجی اور عشرت پسندی نے انہیں عوام سے "جانعالم پیا" کا لقب دلایا تھا۔ تمام درباری اور اہل کار دن رات اسی دھن میں لگے رہتے تھے کہ "رنگیلے پیا" کے لئے تفریح و تفنن کے نئے نئے سامان پیدا کئے جائیں۔ اگرچہ رہس اور کرشن لیلا وغیرہ مبتذل چیزیں تھیں لیکن جانعالم پیا کا ذوق تماشا اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ وہ ان تماشوں میں عملی حصہ لینے سے بھی دریغ نہ کرتے تھے۔ چنانچہ قیصر باغ میں جب رہس کے جلسے منعقد ہوتے تو حسین و جمیل طوائفیں گوپیوں کا پارٹ لیتیں اور خود بادشاہ سلامت کنھیا بنتے۔ لیکن یہ تماشے پرانی وضع کے تھے اور ان میں ابتذال و سوقیت کا عنصر غالب تھا۔

بالآخر بادشاہ سلامت کے عیش پرستانہ مذاق کو دیکھ کر کسی فرنگی نے ایک نئی قسم کے ڈرامے کا ذکر پیش کیا جو رہس اور رس لیلاؤں سے کہیں بالاتر تھا۔ یوں تو ڈرامے کے بہت سے اقسام ہیں جن سے مذہبی و اخلاقی اور سیاسی و معاشرتی اصلاح کا کام لیا جاتا ہے یا جن سے زندگی کے اہم معاملات اور پیچیدہ مسائل کا انکشاف ہوتا ہے لیکن قیصر باغ کی عشرت آگیں فضا اعلیٰ مقصد رکھنے والے سنجیدہ ڈراموں کے لئے موزوں نہ تھی۔ وہاں ایسے کھیل کی ضرورت تھی جس سے زیادہ سے زیادہ لطف و دلچسپی کا سامان بہم پہنچ سکے۔ اس لئے موقع شناس فرنگی نے اعلیٰ درجہ کی ٹریجیڈی یا کامیڈی کے بجائے اوپیرا کا نقشہ پیش کیا جو سر بسر رقص و سرود کے ذریعے سے ادا کیا جاتا ہے۔ چیز نئی تھی۔ بادشاہ سلامت کے مرغوب خاطر ہوئی حضرت امانت سے جن کو اپنی رعایت لفظی اور بےنظیر داسوخت کی وجہ سے خاصی شہرت حاصل ہو چکی تھی فرمائش کی گئی کہ وہ ہندوستانی مذاق کا ایک اوپیرا تیار کریں۔ قدما کو اجنبی چیزوں کے "اپنانے" کا ایسا ڈھنگ معلوم تھا جو دور جدید کے بہت کم ادیبوں کو میسر ہے۔ آج کل اکثر مغربی افسانوں اور ڈراموں کو صرف نام بدل کر ہندوستانی قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن رجال قصہ کے وضع قطع۔ ماحول و فضا کی خصوصیات اور ساز و سامان کی نوعیت سے صاف پتہ چل جاتا ہے کہ یہ دساور کی چیزیں ہیں لیکن قدما کی پیش کردہ چیزوں میں اجنبیت و مغائرت کا سراغ مشکل سے لگ سکتا ہے۔ بہرکیف بادشاہ سلامت کے ایما سے امانت نے "اندر سبھا" لکھی جو اس قدر ہندوستانی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے کہ گہری تنقیدی نظر رکھنے والوں کے سوا اور کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ یہ مغربی اوپیرا کا نہایت کامیاب چربہ ہے جب "اندر سبھا" تیار ہوئی تو قیصر باغ میں اس کی بڑی دھوم دھام سے نمائش کی گئی اور خود اختر پیا نے راجہ اندر کا پارٹ لیا؛

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ نواب واجد علی شاہ نے امانت سے اندر سبھا لکھنے کی فرمائش نہیں کی تھی اور نہ خود انہوں نے اس تماشے کی نمائش میں کوئی عملی حصہ لیا تھا۔ گویا راجہ اندر کا پارٹ لینا ان کی شان کے خلاف تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ امانت اندر سبھا کی تصنیف کے لئے کسی فرنگی کے مشورہ کے دست نگر نہ تھے بلکہ ان کی ایجاد خیز طبیعت نے میر حسن کی مثنوی اور مروجہ رہس سے مال مسالہ لے کر "اندر سبھا" کی انوکھی عمارت تیار کی تھی لیکن اہل بصیرت کے نزدیک یہ رائے کوئی وزن نہیں رکھتی جس شخص کو ذیل قسم کے رہس میں خود کنھیا کا سوانگ بھرنے اور ممنوعات کو گوپیوں کا پارٹ دینے میں عار نہ آتا ہو اس کی شان کو ایک اعلیٰ درجہ کے اوپرا میں راجہ اندر کا بھیس اختیار کرنے سے کیا بٹہ لگ سکتا ہے؟ جو لوگ "اندر سبھا" کو مثنوی سحر البیان اور مروجہ رہس پر مبنی تصور کرتے ہیں وہ خالص ہندوستانی رنگ و مذاق سے دھوکا کھاتے ہیں۔ ورنہ ماہرین فن کا خیال ہے جو شخص اوپرا کی فنی خصوصیات و نکات سے پوری طرح واقف نہ ہو اس کے ہاتھوں کبھی اندر سبھا جیسی بلند پایہ تصنیف تکمیل نہیں پا سکتی۔ اندر سبھا میں ایک اعلیٰ درجہ کے اوپرا کی تمام خصوصیات اور شرائط پائے جاتے ہیں اوپرا کی نوعیت و ماہیت سے آگاہ ہوئے بغیر امانت کے لئے اندر سبھا کی تصنیف ناممکن تھی۔ اور سوائے کسی فرنگی کے اور کون شخص امانت کو اس سات سمندر پار کی بدیسی چیز سے واقف کرا سکتا تھا؟ اس زمانہ میں "صاحب لوگوں" اور ہندوستانیوں کے درمیان ایسی وسیع خلیج حائل نہ تھی جیسی آج ہے۔ اس وقت وہ اپنے سیاسی و تجارتی مصالح کے پیش نظر ہندوستانی زبان سیکھتے تھے۔ بعض اردو میں ذوق سخن بھی رکھتے تھے۔ ہندی شرفا کے ساتھ بڑی ملنساری اور یار باشی کا ثبوت دیتے تھے۔ ان سے میل جول رکھتے تھے اور ان کی خوشی اور غم کی تقریبوں میں شریک ہوتے تھے۔ دیسی ریاستوں میں آج بھی اس کے نظارے دیکھنے میں آتے ہیں۔ ہر ملک اور ہر زمانہ میں "صاحب لوگوں" کی پالیسی جداگانہ ہوتی ہے۔ اس لئے کسی فرنگی سے امانت کا اوپرا کے متعلق معلومات حاصل کرنا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

اوپرا ایک قسم کا منظوم ڈراما ہے جس کی نمائش رقص و سرود اور ساز و رباب کے ذریعہ سے کی جاتی ہے۔ اس کے کردار بالعموم مافوق البشر مخلوق مثلاً دیوتا۔ دیو۔ پری۔ جن وغیرہ ہوتے ہیں۔ اس لئے یہاں ایسے خلاف فطرت و محیر العقول کارناموں کی نمائش جائز ہے جن کے اظہار کی دوسری قسم کے ڈراموں میں اجازت نہیں لیکن موزونیت و مناسبت کا لحاظ رکھنا ضروری امر ہے یعنی روایات نے جس مافوق البشر مخلوق سے جو کام مخصوص کر دیئے ہیں اسٹیج پر اس سے وہی کام لینا چاہیئے مثلاً کنھیا کا کام گوپیوں سے چھیڑ چھاڑ۔ اندر کا کام عیش و عشرت۔ پریوں کا کام ناچنا گانا۔ دیووں کا کام خدمت بجا لانا ہے۔ اگر ایک کا کام دوسرے کو تفویض کر دیا جائے تو قصہ بے لطف و بے اثر بن جائیگا۔ اوپرا میں شاعرانہ متانت۔ زور تخیل اور بلند خیالی کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ یہاں صرف الفاظ کی شیرینی اور اصوات کی خوش آہنگی کا لحاظ رکھنا چاہیئے۔ اوپرا کے اشعار سے اگر عقل و استدلال کی تشفی نہ ہو تو کوئی ہرج نہیں کیونکہ گانوں کا مقصد صرف سامعہ نوازی و لذت بخشی ہے۔ اگر اشعار کی بحریں اور گانوں کی دھنیں مختلف و متنوع

ہوں تو زیادہ لطف و دلچسپی حاصل ہوگی۔ بادی النظر میں معنی و مفہوم کو صوتی آہنگ و ترنم پر قربان کر دینا اور لذت گوش کے آگے تسکین عقل کی پروا نہ کرنا ایک عجیب بات معلوم ہوتی ہے لیکن اس مسئلہ میں الجھنے سے پہلے ہمیں یہ اصول ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ کسی علم یا فن کے اصول و ضوابط مقرر کرنے کا حق ان ابتدائی اماموں کو حاصل ہوتا ہے جنہوں نے نہ صرف اس علم یا فن کو ایجاد کیا ہو بلکہ اسے پایۂ تکمیل کو بھی پہنچا دیا ہو۔ ان اماموں کے شاہکار بعد میں آنے والے فن کاروں اور صناعوں کے لئے نمونہ کا کام دیتے ہیں۔ ائمہ متقدمین کے مقرر کردہ اصول و شرائط کی پیروی متاخرین کا فرض ہے۔ مثلاً رزمیہ شاعری میں ہومر کی سند سب کے لئے واجب التسلیم ہے۔ وہ نہ صرف اس فن کا موجد تھا بلکہ اس نے رزمیہ شاعری کو ایسے منتہائے کمال کو پہنچا دیا کہ اس میں کسی قسم کی اصلاح و ترمیم کی گنجائش باقی نہ رہی۔ چنانچہ ہومر کے بعد ورجل اور دوسرے رزمیہ نگار شعرا نے ترمیم و اضافہ کی کبھی کوشش نہ کی بلکہ ہومر کو استاد مان کر اس کے بنائے ہوئے اصول کی پیروی کرنے اور اسی کی قائم کردہ بنیادوں پر اپنی رزمیہ عمارت کھڑی کرنے میں اپنا پورا زور قلم صرف کیا۔ اسی طرح ہمارے ہاں قدیم اساتذہ نے غزل، قصیدہ، مثنوی وغیرہ کی جو ڈھانچ تیار کر دی تھی متاخرین اس کی پیروی کرتے رہے ہیں۔ اگرچہ خیالات میں زبردست انقلابات پیدا ہوئے ہیں لیکن مذکورہ بالا اصناف سخن کی صورت اور بنیادی اصول میں کوئی فرق نہیں آنے پایا۔

بہر حال مغربی اوپیرا اطالوی شعرا کی ایجاد ہے اور یہ اصول انہیں کا قائم کیا ہوا ہے کہ اوپیرا میں اگر خیالات پست اور جذبات ادنیٰ درجہ کے ہوں تو مضائقہ نہیں لیکن الفاظ کا دروبست اور اصوات کا آہنگ و ترنم ایسا ہونا چاہیئے جو کانوں کو خوشگوار معلوم ہو۔ اوپیرا کی اصلی غرض لطف و دلچسپی کا سامان فراہم کرنا ہے اس لئے اس میں ناچنے تھرکنے اور گانے بجانے کا خاص اہتمام کرنا چاہیئے۔ لباس و پوشاک اور ساز و سامان بھی نہایت بھڑکدار ہونے چاہئیں۔ اطالیہ کے بعد فرانس میں اوپیرا کو خوب فروغ حاصل ہوا۔ ہر دو ممالک میں کسی قومی خوشی کی تقریب یا امرا کے شادی بیاہ کے موقعوں پر اوپیرا کا تماشا بڑی دھوم دھام سے دکھایا جاتا تھا۔ مسٹر ڈرائڈن کا قول ہے کہ اوپیرا میں ایسے انسانی بطلوں کو بھی جگہ دی جاسکتی ہے جن کا دیوتائی مجمع میں بار پانا یا آسمانی مخلوق سے میل جول رکھنا روایات نے تسلیم کر لیا ہو۔ مثلاً ایسے بادشاہوں یا راجاؤں کو جو خود کو کسی دیوتا کی اولاد قرار دیتے تھے یا ایسے یونانی چرواہوں کو جو اپنی معصومانہ زندگی کی بدولت مافوق البشر مخلوق سے صحرا میں ملا جلا کرتے تھے۔ یا ایسے شہزادوں یا امیرزادوں کو جو پریوں کے عشق میں سرگرداں رہتے تھے اوپیرا کا ہیرو بنانا اصول فن کے عین مطابق ہے۔ علاوہ بریں حسن و عشق کی چاشنی اوپیرا میں ضرور پائی جانی چاہیئے۔ اب اس کسوٹی پر اندر سبھا کو کسو اور دیکھو کہ اردو کا یہ سب سے پہلا اوپیرا اپنے مقررہ معیار پر کیسا پورا اترتا ہے کہیں کسی قسم کا نقص جھول یا خامی نظر نہیں آتی۔ اوپیرا کا کوئی مسلمہ اصول ترک نہیں ہوا۔ تاہم بعض سطحی خیال کے لوگ اعتراضاً کہتے ہیں کہ اندر سبھا ایک ادنیٰ ترین ڈرامائی پیداوار ہے۔ دو غیر جنس مخلوق یعنی ایک انسان اور ایک پری

کی عشقیہ کہانی اغلبیت کے نقیض ہے۔ ہندو دیومالائی قصہ میں کوہ قاف کے دیووں اور پریوں کا ادخال اجتماع ضدین ہے۔ اندرسبھا کا پلاٹ نہایت سادہ و کمزور اور اس میں کردار نگاری بالکل معدوم و مفقود ہے۔ لیکن یہ اعتراض اوپرا کی نوعیت و ماہیت سے بےخبری اور اندرسبھا کے ماحول و فضا سے لاعلمی کی دلیل ہے۔ انسان اور پری کے باہمی عشق و محبت کی ہزاروں کہانیاں آج تک زبان زد خلائق ہیں۔ ہر ملک اور قوم کے افسانوی لٹریچر میں اس قسم کے خلاف قیاس اور فوق العادت واقعات کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اندرسبھا بھی کوئی تاریخی کتاب نہیں ہے بلکہ اس کا شمار افسانوی ادبیات میں ہوتا ہے۔ شکسپیئر۔ ملٹن۔ کالیداس اور بھاؤ بھوتی جیسے باکمال ڈراما نویس بھی اسٹیج پر انسانوں کے دوش بدوش بھوت۔ پریت۔ دیو۔ پری اور دیبی دیوتاؤں کو لاکھڑا کرتے ہیں۔ شکنتلا ایک چھتری راجہ اور آسمانی پری کے ازدواجی تعلق کا ثمرہ تھی۔ وکرم اروسی کا ڈراما آدم زاد پروراس اور پریزاد اروسی کی حیات معاشقہ کا آئینہ دار ہے۔ باآنہمہ کے ساتھ ٹائی ٹے نیا کے اظہار محبت میں بھی اغلبیت کا عنصر مفقود ہے۔ الغرض انسانوں اور پریوں کی باہمی محبت کے قصے سنتے سنتے لوگ ان کے عادی بن گئے تھے اور ان میں اجنبیت و مغائرت نام کو بھی باقی نہ رہی تھی۔ اسی طرح کوہ قاف کے دیو پری گرچہ بدیسی چیزیں ہیں لیکن صدیوں سے ملک میں فارسی لٹریچر کے رواج و مقبولیت نے یہاں کے بچہ بچہ کو ان سے مانوس بنا دیا تھا۔ اندراسن۔ گندھرب اور اپسرا کے ثقیل اور کرخت نام سے دو چار سنسکرت دان پنڈت واقف ہوں تو ہوں لیکن کوہ قاف اور وہاں کے دیووں اور پریوں سے ہر شخص گوش آشنا تھا خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان۔ آج بھی گندھرب اور اپسرا کا مفہوم صرف تعلیم یافتہ لوگوں کو معلوم ہے لیکن دیو پری کا ذکر بچہ بچہ کی زبان پر پایا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ الفاظ ایرانی الاصل ہیں لیکن کثرت استعمال سے وہ ہندی زبان میں ایسے رس بس گئے ہیں کہ ان کو جدا کرنا گویا ناخن کو گوشت سے الگ کرنا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اندرسبھا سے کیا ہندو کیا مسلمان سب یکساں طور پر لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اب رہ گیا پلاٹ اور کردار نگاری کا سوال۔ پلاٹ کی خوبی یہ ہے کہ اس میں پیچیدگی۔ الجھاؤ۔ دلچسپی۔ کشمکش۔ حیرت انگیزی۔ کشش و پیچ۔ سنسنی۔ ہیجان خیزی اور بیتابانہ انتظار کے بکثرت شواہد پائے جائیں۔ اور کردار نگاری میں ڈراما نویس کو اختصار سے کام لینا چاہیئے۔ اس کی تمامتر توجہ اشخاص ڈراما کی انہیں دو چار امتیازی خصوصیات پر مرکوز رہنی چاہیئے جن کو وہ نمایاں کرنا چاہتا ہے۔ سیرت کی تفصیلات و جزئیات میں پڑنے کی مطلق ضرورت نہیں۔ ڈراما نویس کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ براہ راست کسی کی سیرت پر رائے زنی کرے بلکہ افراد ڈراما کی کرداری خصوصیات خود انہیں کے عمل فعل گفتگو۔ مکالمے اور ایک دوسرے کی تنقید سے ظاہر ہونی چاہئیں۔ لیکن ان تمام مسائل کا تعلق اعلیٰ درجہ کی کامیڈی وطربیہ یا ٹریجیڈی وحزنیہ سے ہے۔ ماہرین فن نے ڈرامے کی دو قسمیں قرار دی ہیں۔ ایک اعلیٰ جو طربیہ اور حزنیہ پر مشتمل ہے۔ دوسرے ادنیٰ جس میں ٹریجی کامیڈی۔ میلو ڈرامہ۔ فارس۔ برلسک اور اوپرا وغیرہ شامل ہیں۔ پلاٹ اور کردار نگاری کی خوبیاں اعلیٰ و سنجیدہ مقصد رکھنے والے ڈراموں میں تلاش کرنی چاہئیں نہ کہ اوپرا میں جس کا مقصد محض تفریح و تفنن کا سامان بہم پہنچانا ہے۔ پلاٹ کی

پیچیدگیاں اور کردار نگاری کی باریکیاں سنجیدہ ڈراموں کے لئے کتنی ہی ضروری کیوں نہ ہوں لیکن اگر اوپیرا میں ان کا اہتمام کیا جائے تو اس کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ اوپیرا میں پیچیدہ، متین اور وزنی خیالات و جذبات کی ترجمانی سے سامعین کے دماغ پر بار پڑے گا جس سے تماشے کا لطف جاتا رہے گا۔ یہاں تو سیدھے سادے۔ ہلکے پھلکے واقعات پُرلطف زبان میں ہونے چاہئیں غرض کہ اوپیرا ڈرامے کی ایک خاص صنف ہے اور اس فن کے موجدوں اور ماموں نے اس کے لئے علیحدہ اصول و قواعد وضع کئے ہیں۔ اندر سبھا محض تفریح و تفنن کے لئے لکھی گئی تھی۔ اس میں اعلیٰ درجہ کی کامیڈی یا ٹریجڈی کے سنجیدہ اصول تلاش کرنا سخت غلطی ہے۔ یہ ایک میوزیکل اوپیرا ہے اور اس کو اسی معیار پر جانچنا چاہئیے۔

چونکہ اوپیرا کا اہم جز گانا بجانا ہے اور اردو میں گانے کی خاص چیز غزل ہے۔ اس لئے اندر سبھا میں مختلف بحروں کی کئی غزلیں پائی جاتی ہیں اور شاعر نے ان میں اپنا عام تخلص امانت استعمال کیا ہے لیکن غزلوں سے ہٹ کر انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ چونکہ اردو میں ایک جدید صنف سخن تھی جس کے وہ موجد بھی تھے اور استاد بھی اس لئے یہاں انہوں نے اپنا تخلص استاد رکھا ہے۔ فی الحقیقت وہ اس صنف کے استاد تھے۔ دوسرے لوگوں نے بھی اندر سبھا کی غیر معمولی شہرت و مقبولیت دیکھ کر اس کی نقل کرنی چاہی لیکن کوئی شخص استاد کی گرد کو بھی نہ پہنچ سکا۔ البتہ مداری لال کی اندر سبھا نے بھی لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا لیکن مداری اور امانت کی تصنیفات میں وہی فرق ہے جو نقل اور اصل میں ہوا کرتا ہے۔ بہرحال "اندر سبھا" امانت کا ایک زندہ جاوید کارنامہ ہے۔ کسی معلوم ڈگر پر چلنا آسان ہے لیکن ایسے ان دیکھے میدان میں قدم رکھنا جہاں جادہ کا نشان بھی نہ ہو اور نئی راہ نکال کر نہایت شان کے ساتھ آخری منزل تک پہنچ جانا ہر کس و ناکس کا کام نہیں۔ امانت نے اردو اوپیرا کی نہ صرف داغ بیل ڈالی بلکہ اسے معراج کمال کو بھی پہنچا دیا۔

تاریخ ادبیات اردو کے متعلم جانتے ہیں کہ امانت قدیم اساتذۂ سخن کی صف اول میں جگہ پانے کے مستحق نہیں ہیں۔ ان کا شمار دوسرے درجہ کے شعرا میں ہے۔ جب دوم درجہ کے شاعر نے ڈرامے کی ایک خاص صنف کی طرف توجہ کی اور اسے معراج کمال کو پہنچا دیا تو اگر صف اول کے اساتذہ اس جانب توجہ کرتے تو فن ڈراما میں کیا کیا ترقیاں نہ ہوئی ہوتیں لیکن ڈراما ان کے نزدیک ادبیات کی کوئی مسلمہ صنف یا شاخ نہ تھی بلکہ وہ محض کھیل تماشے کی حیثیت رکھتا تھا جسے رذیل لوگ دکھاتے پھرتے تھے۔ ایسی ذلیل چیز کی طرف رجوع کرنا وہ اپنی شرافت۔ ثقاہت اور متانت کے منافی تصور کرتے تھے۔ نتیجہ یہ کہ اب سے کچھ ہی عرصہ پہلے تک اردو کے رسائل و جرائد بھی ڈرامے یا تھیئٹر کے متعلق کوئی مضمون شائع کرنا اپنی شان و وقار کے خلاف سمجھتے تھے۔ خود امانت نے محاسن ادبی کے اظہار کے لئے اندر سبھا نہیں لکھی تھی بلکہ ان کے نزدیک دوسرے تفریحی سامان کی طرح یہ ناٹک محض لطف و دلچسپی کا ایک ذریعہ تھا۔ ابتداً اندر سبھا کی نمائش قیصر باغ کی فصیل تک محدود رہی لیکن جب صرصر حوادث نے قیصر باغ کو تاراج کر دیا تو اندر سبھا کی نمائش عوام میں ہونے لگی اور رفتہ رفتہ یہ تماشا لکھنؤ سے بمبئی پہنچا ؛

اردو ڈرامے کی عجیب قسمت تھی کہ اسے کبھی اپنے دردمند بزرگوں کا سایۂ عاطفت نصیب نہ ہوا بلکہ اغیار کے گود میں پلا اور بڑھا اور ان کی آمدنی کا ذریعہ بنا۔ ہندی۔ مرہٹی اور بنگالی ڈراموں کی یہ حالت نہ تھی۔ ان زبانوں کے بڑے بڑے شاعروں اور ادیبوں نے ڈرامے کو ایک فن لطیف اور ادب و شاعری کی ایک اہم صنف سمجھ کر اس کی اصلاح و ترقی کے لئے کوشش کی۔ اس سے تلقین و تبلیغ کا اعلیٰ کام لیا۔ کبھی انہوں نے اپنے ڈراموں میں کمسنی کی شادی۔ بیواؤں کی شادی۔ تعلیم نسواں۔ مراسم قبیحہ۔ ذات پات کی جکڑ بندی۔ قومی رہنماؤں کی جاہ طلبی وغیرہ پر بحث کی۔ کبھی اس کے ذریعے اپنے قومی ابطال اور تاریخی مشاہیر کے کارناموں کو اجاگر کیا۔ کبھی عوام کو سیاسی تحریکات سے روشناس کرایا اور ان میں بیداری اور حب الوطنی کا جذبہ پیدا کیا۔ اس لئے ان زبانوں میں جو ڈرامے لکھے گئے ان میں ادبی اور اصلاحی دونوں خوبیاں پائی جاتی ہیں۔

لیکن اردو ڈرامے کی بدقسمتی دیکھئے کہ وہ ابتدا ہی سے پارسی قوم کی تجارتی ذہنیت کا شکار بن گیا۔ اردو ڈرامے کی تاریخ فی الحقیقت پارسی تھیٹر کی چند تجارتی کمپنیوں کے بننے اور بگڑنے کی تاریخ ہے جن کا واحد مقصد روپیہ پیدا کرنا تھا۔ یہ کمپنیاں جو کھیل تیار کرا کے دکھاتی تھیں ان کی غرض و غایت نہ ادب و زبان کی خدمت تھی نہ سیاسی یا معاشری اصلاح۔ جب ہندوستان میں انگریزی حکومت مستحکم بنیادوں پر قائم ہوگئی اور دولتمند لوگ یورپ جانے آنے لگے تو بمبئی کے چند جوشیلے پارسی نوجوانوں نے ان کے مشورہ و ہدایت سے انگریزی وضع کے عالیشان تھیٹر تیار کرائے اور ان کو شاندار پردوں۔ بیش قیمت سازوسامان۔ نظر فریب مناظر اور زرق برق لباسوں سے آراستہ کیا اور تماشاگاہ کو جنت عدن کا نمونہ بنا دیا جس میں ہزاروں تماشائی کشاں کشاں آنے لگے۔ بمبئی کو دہلی یا لکھنو کی ٹکسالی اردو سے کیا نسبت؟ وہ ایک تجارتی شہر ہے جہاں مختلف مقام کے لوگ جمع ہیں اور بھانت بھانت کی بولیاں بولتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی تفریح طبع کے لئے جو کھیل تیار کرائے جاتے تھے ان میں ان کے سوقیانہ مذاق اور طرح طرح کی بولی کا لحاظ رکھنا ضروری تھا چنانچہ پارسی تھیٹریکل کمپنیوں کے ابتدائی نام نہاد ڈراموں میں ہندی۔ پوربی گجراتی اور اردو کی آمیزش پائی جاتی ہے۔ پنڈت برجموہن دتا تریا کے بیان کے مطابق ان کے لکھنے کا طریقہ یہ تھا کہ پارسی منیجر پہلے اپنی من سمجھوتی کہانی گھڑتا جس میں گجراتی کا عنصر غالب ہوتا تھا۔ پھر وہ کمپنی کے تنخواہ دار منشی کو دی جاتی جو نہ شاعر تھا نہ ادیب بلکہ یوں ہی سا تھوڑا پڑھا لکھا جانا جاتا تھا اور تک بندی میں کچھ دستگاہ رکھتا تھا۔ منشی اس کہانی میں چند الٹے سیدھے واقعات ملا کر ڈرامے کا ایک کمزور پلاٹ تیار کر دیتا تھا۔ اس کے بعد بازاری گویّوں یا ڈوم ڈھاریوں کی منڈلی اس میں ہندی دھنوں کے گانے بھرتی تھی۔ اس طرح مختلف نااہل اصحاب کی اجتماعی کوششوں سے ناٹک تیار ہوتے تھے۔ ایکٹروں کا اسٹیج پر آکر گرجنا۔ ہاتھ چمکانا اور پینترے بدلنا اداکاری کا کمال سمجھا جاتا تھا۔ لباس کی بھڑک۔ مناظر کی دلفریبی۔ پردوں کی رنگینی اور ڈوم ڈھاریوں کے ناچ گانے پر آمدنی کا انحصار تھا اس لئے ان چیزوں کا خاص طور پر اہتمام کیا جاتا تھا۔ پارسی ایکٹر اگرچہ بازاری اردو بول لیتے تھے

لیکن وہ فارسی طرز تحریر سے ناواقف تھے اس لئے یہ ڈرامے گجراتی حروف میں لکھے گئے تھے۔ زبان کے لحاظ سے تو یہ ڈرامے معجون مرکب تھے ہی اس پر طرہ یہ کہ ان کا تحریری لباس گجراتی تھا۔ پھر ان ڈراموں سے اردو ادب میں کیا خاک اضافہ ہوتا۔ وہ نہ ادبی خدمت کے لئے لکھے گئے تھے اور نہ اخلاقی یا معاشرتی اصلاح کی غرض سے بلکہ وہ محض روپیہ پیدا کرنے کا ذریعہ تھے۔

ڈاکٹر سی۔ جے سسن (Dr. C. J. Sisson) پارسی کمپنیوں کے اردو ڈرامے کے متعلق فرماتے ہیں کہ بمبئی کا عام اردو اسٹیج کئی لحاظ سے انگلستان کے ٹیوڈر اسٹیج سے ملتا جلتا ہے۔ بقیہ تھیٹر کی کمپنیاں محض تجارتی اصول پر قائم ہوتی ہیں اور ان کی نظر ہمیشہ عوام کی جیب پر رہتی ہے۔ ان کو ڈرامے کی ادبی خوبیوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور نہ ان کو کبھی ادبی خدمت کا دعویٰ رہا ہے۔ مہذب شائستہ لوگوں کی انہیں کبھی حمایت حاصل نہیں ہوئی۔ عام تماشائی دلفریب مناظر۔ زرق برق لباس۔ مقفّٰی عبارتوں۔ ہنسی مذاق کی باتوں اور رقص و سرود کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ ان کو نہ فنی اسقام کی اور نہ زبان کی خامیوں کی کچھ پروا ہوتی ہے شرفا کی نظر میں ایکٹروں کی منڈلی ویسی ہی ذلیل سمجھی جاتی ہے جیسی الزبتھ کے عہد میں۔ عورتوں کا پارٹ لڑکے کرتے ہیں یا رنڈیاں۔ ایکٹروں کو محنت شاقہ برداشت کرنی پڑتی ہے اور گوئیے۔ ناچنے والے اور کرتب دکھانے والے ویسے ہی چالاک اور ہوشیار ہوتے ہیں جیسے الزبتھ کے زمانے میں تھے۔

پارسی کمپنیاں بالعموم مشترکہ سرمایہ سے قائم کی جاتی ہیں۔ تمام حصہ دار کاروباری اشخاص ہوتے ہیں جن کا مقصد تمام تر تاجرانہ ہوتا ہے۔ ڈرامے فرمائش دے کر لکھائے جاتے ہیں اور مصنف سے راست خرید لئے جاتے ہیں پھر ان پر لکھنے والے کا کوئی حق باقی نہیں رہتا۔ بعض دولتمند کمپنیاں اپنا خاص تنخواہ دار کوی یا منشی رکھتی ہیں۔ کوی کو منیجر کی ہدایتوں پر عمل کرنا پڑتا ہے۔ ہر چھ مہینہ میں ایک نیا کھیل تیار کرنا اس کے فرائض میں داخل ہے۔ یہ کوی مختلف طریقوں سے اپنا کام انجام دیتا ہے کبھی وہ منیجر کی پیش کردہ ادھوری کہانی کو پورا کرتا اور اس کے کھانچے بھرتا ہے کبھی قدیم قصوں مثلاً گل بکاؤلی۔ چتر ابکاؤلی۔ گل صنوبر الہ الدین اور عجیب و غریب چراغ وغیرہ کو بہ طرز ناٹک بیان کرتا ہے۔ کبھی دوسرے کے ڈراموں کو کتر بیونت یا ترمیم و اضافہ کے ذریعے اپنا لیتا ہے۔ منیجر اور کوی دونوں عوام کے مذاق کی پیروی کرتے۔ جہاں کسی کمپنی کا کوئی کھیل کامیاب ہوا کہ دوسری حریف کمپنی نے اس کی ریس کی اور ایک ہی مہینے کے اندر اسی نمونہ کا کھیل تیار کرایا اور اس میں مبتذل گانے۔ سوقیانہ مسخراپن اور سوال و جواب کی نوک جھونک شامل کر کے اسے عوام کے لئے اور زیادہ دلچسپ و پرلطف بنا دیا۔

واضح رہے کہ منیجر اور کوی کے تعلقات خلوص و اعتماد پر مبنی نہیں ہوتے۔ اگر کسی کمپنی کے کوی کا کھیل عوام میں شہرت و مقبولیت حاصل کرتا ہے تو دوسری حریف کمپنی کا منیجر اس کو زیادہ سے زیادہ رقم کا لالچ دے کر اپنے ہاں ملازم رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی طرح کوی بھی اپنے معاہدہ کو بالائے طاق رکھ کر جہاں زیادہ روپیہ ملے وہاں جانے کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہے کبھی ایک ہی

کھیل مختلف اشخاص کی مشترکہ محنت کا ثمرہ ہوتا ہے۔ مینیجر ایک دھندلا سا کمزور پلاٹ سوچتا ہے۔ اس پر تین ایکٹ کی ٹریجی کامیڈی تیار کرنے کے لئے وہ اسے تین یا تین سے زیادہ اشخاص کے تفویض کرتا ہے۔ ایک شخص مذاقیہ حصہ تیار کرتا ہے سنجیدہ واقعات بیان کرنے کے لئے دوسرا شخص منتخب کیا جاتا ہے اور گانے بھرنے کا کام تیسرے کسی کو دیا جاتا ہے۔ بھلا ایسی ڈرلمائی پیداوار میں فنی اتحاد کہاں؟ ان تینوں عناصر کی مناسب ترتیب سے ایک مکمل فنی نمونہ تیار کرنا اعلےٰ درجے کے صناع کا کام ہے۔

مذکورہ بالا بیان سے ظاہر ہے کہ ادبی نقطۂ نظر سے پارسی تھیٹریکل کمپنیوں کے تیار کرلئے ہوئے اردو ڈرامے کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ مسلمان شرفا اس قسم کے کھیل تماشوں کو ہمیشہ حقارت کی نظر سے دیکھا کئے ہیں۔ وہ اس بات کے روادار نہیں کہ ان کی اولاد کو تھیٹر اور سینما کی چاٹ لگے کیونکہ ان کے نزدیک ناچنا۔ گانا۔ بھاؤ بتانا۔ سوانگ بھرنا حد درجہ کی آوارگی اور بدتہذیبی ہے۔ اسی وجہ سے اردو کے مسلم الثبوت اساتذہ نے کبھی اپنے دامنِ شاعری کو ڈراما نویسی سے ملوث کرنا پسند نہیں کیا لیکن بنگالی اور مرہٹی ڈرامے کی یہ حالت نہ تھی۔ وہاں کے لوگ ڈرامے کی تمثیل کو ہیٹا کام نہیں سمجھتے۔ بڑے بڑے رئیس اور زمیندار اس میں شوق سے حصہ لیتے ہیں۔ اردو ڈرامے نے پارسی تجارتی کمپنیوں کے آغوش میں آنکھ کھولی اور وہیں وہ پل کر جوان ہوا لیکن بنگالی اور مرہٹی ڈرامے کی ابتدا روسا کے طبقہ سے ہوئی اور عوام نے بعد میں ناٹکی منڈل قائم کئے۔ بعض مشہور ڈراما نویس پہلے ایکٹر تھے۔ ایکٹری سے رفتہ رفتہ ترقی کرکے مصنف بنے اور شاہکار ڈرامے لکھ کر شہرت جاوید حاصل کی۔ گرلیش گھوش۔ امرت لال بوس اور کھاڈکری وغیرہ اس زمرہ میں شامل ہیں۔ علاوہ بریں دوی جندر لال رائے۔ کولہاٹکر۔ اور کھاڈیلکر جیسے بلندپایہ مصنف کسی تھیٹریکل کمپنی سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ وہ شاعری کی طرح ڈرامہ کو بھی ایک فن لطیف سمجھ کر اس کے فروغ و ترقی کے لئے کوشش کرتے ہیں۔ ان کے لکھے ہوئے ڈرامے ادبی شاہکار تصور کئے جاتے ہیں۔ وہ اپنے ڈرامے خود طبع کراتے اور اعلیٰ درجہ کی کمپنیوں کو ان کی تمثیل کی اجازت دیتے ہیں لیکن اردو اور گجراتی کی پارسی تھیٹریکل کمپنیاں اپنے ملازم منشیوں سے جو کھیل تیار کراتی ہیں ان کے مخطوطے وہ حفاظت سے رکھتی ہیں اور طبع کرانا اصول تجارت کے منافی خیال کرتی ہیں۔ ان تمام اسباب کی بنا پر اردو ڈراما کوئی ادبی وقعت واہمیت نہیں رکھتا۔

بہرحال تجارتی تھیٹریکل کمپنیوں نے جن بے شمار کویوں اور منشیوں سے اجرت پر ڈرامے یا کھیل تیار کرائے ان میں رونق بنارسی حسینی میاں ظریف و نانک پرشاد طالب۔ سید مہدی حسن احسن۔ بیتاب۔ مرزا نظیر بیگ اور آغا حشر بہت مشہور ہیں لیکن تاریخ ادبیات اردو میں وہ کوئی امتیازی جگہ پانے کے مستحق نہیں سمجھے گئے ہیں۔ عام طور پر لوگ بجز آغا حشر کے اور کسی نام سے بھی واقف نہیں ہیں۔ ان کے لکھے ہوئے بیشمار ڈراموں میں سے ایک بھی اس لائق نہیں ہے کہ وہ اسکول یا کالج کے نصاب میں داخل ہو

یا کم سے کم کسی علمی کتب خانہ یا کسی شائقِ ادب کی میز کی زینت بن سکے۔ جو لوگ تھیٹر جانے کے عادی ہیں وہ البتہ خدا دوست۔ چاند بی بی۔ تحفۂ دلپذیر۔ نیرنگِ عشق۔ لیل و نہار۔ ہریش چندر۔ خون ناحق۔ گلنار فیروز۔ چندراولی قتل نظیر۔ زہری سانپ شہیدِ ناز۔ اسیرِ حرص۔ صیدِ ہوس۔ خوبصورت بلا اور اسی قماش کے بیسیوں ڈراموں کے نام سے گوش آشنا ہیں۔ وہ بھی کتابی شکل میں ان کا کبھی مطالعہ نہیں کرتے بلکہ صرف اسٹیج پر ان کی تمثیل سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ الغرض کوئی شخص ان کو اہم ادبی تصنیف نہیں سمجھتا بلکہ یہ محض کھیل تماشے کی چیز تصور کئے جاتے ہیں۔

دنیا کے تمام قدیم لٹریچر کی ابتدا شاعری سے ہوئی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ نثر کے بہ نسبت نظم کو یاد رکھنا زیادہ آسان ہے۔ جب انسان طریقۂ تحریر سے ناآشنا تھا اس وقت دیوتاؤں کے بھجن۔ مذہبی رسوم۔ ادعیہ و مناجات۔ قومی سورماؤں کے کارنامے صدیوں ایک نسل سے دوسری نسل کو سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے رہے۔ اگر وہ مقفّٰی و موزون عبارت میں قلمبند نہ ہوتے تو ان کا اکثر و بیشتر حصہ قعرِ فراموشی میں گم ہو جاتا۔ اردو اگرچہ ایک بڑی زبان ہے جس کی تکوین تہذیب و تمدن کے منتہائے عروج پر پہنچنے کے بعد ہوئی ہے تاہم اردو ادب کی ابتدا بھی شاعری ہی سے ہوئی۔ اور نثر میں ادا کرنے کی جتنی باتیں تھیں وہ فارسی میں لکھی جاتی تھیں۔ بہر حال اردو نثر اردو نظم کے بہت بعد معرضِ وجود میں آئی۔ یہ عجیب بات ہے کہ اردو میں ڈرامے کی ابتدا بھی نظم ہی سے ہوئی۔ مغربی ممالک میں ارتقا کے کئی مدارج طے کرنے کے بعد ڈرامے نے اوپیرا کی شکل اختیار کی تھی لیکن اردو میں جو ڈراما سب سے پہلے لکھا گیا وہ اوپیرا تھا۔ اور بہت عرصہ تک اسی نمونہ کی پیروی ہوتی رہی چنانچہ اردو کے تمام ابتدائی ڈرامے سر بسر نظم ہی میں لکھے ہوئے ہیں۔ بعد میں اردو ڈرامے نے میوزیکل کامیڈی یعنی غنائی طربیہ کی شکل اختیار کی۔ مکالمہ اور پیچیدہ خیالات کا اظہار نثر میں ہونے لگا جس میں جابجا اشعار کی چاشنی بھی پائی جاتی ہے لیکن عشقیہ اور دوسرے گہرے جذبات کی ترجمانی گانوں اور نغموں کے ذریعے کی جاتی ہے۔ نثر میں بھی اسٹیج کی ضروریات کے لحاظ سے مقفّٰی عبارت کو ترجیح دی جاتی ہے۔

اگرچہ مذکورہ بالا ڈرامے اسٹیج پر بہت کامیاب ثابت ہوئے ہیں اور تیسرے درجے کے تماشائی جو بمبئی کے بھنڈی بازار کی بولی بولتے ہیں ان کھیلوں کی تمثیل کے وقت تالیوں اور نعرہ ہائے تحسین سے منڈوا سر پر اٹھا لیتے ہیں تاہم ان ڈراموں میں نہ کوئی فنی خوبی پائی جاتی ہے اور نہ ان کی زبان ہی مستند ہے۔ البتہ مرزا محمد ہادی رسوا اور احسن لکھنوی کے ہاتھوں زبان کی خامیوں کی بڑی حد تک اصلاح ہوئی ہے چنانچہ پارسی کمپنیوں کے تیار کرائے ہوئے ڈراموں کی ناقص زبان سے بیزار ہو کر مرزا صاحب نے "مرقع لیلیٰ و مجنوں" لکھا جو سر بسر نظم میں ہے۔ زبان تو نہایت شستہ نکھری اور کوثر کی دھلی ہوئی ہے اور بات بات سے قادر الکلامی ٹپکتی ہے لیکن فنی لحاظ سے اس کی حیثیت بمبئی کے بھنڈی بازار والے مال سے بڑھ کر نہیں ہے۔ پلاٹ نہایت کمزور اور کردار نگاری یکسر مفقود ہے۔ کون نہیں جانتا کہ لیلیٰ مجنوں کا قصہ سخت یاس خیز و درد انگیز ہے لیکن ڈراما خواہ المیہ ہو یا طربیہ تیسرے درجے کے تماشائیوں

کو خوش کرنے کے لئے اس میں ظرافت و شوخی کا داخل کرنا ضروری خیال کیا جاتا ہے مرزا صاحب نے بھی "مرقع لیلیٰ و مجنوں" میں کامک (مزاحیہ) منظر دکھانے کے لئے ناشاد و نامراد عاشق و معشوق کے پہلو بہ پہلو لکھنو کے شہدوں اور لچوں کو لا کھڑا کیا ہے۔ جن کی زبان اور اندازِ بیان کے ٹھاٹھ حد درجہ فحش اور سوقیانہ ہیں۔ چنانچہ ایک بے حیا بدمعاش نوجوان اسٹیج پر آتا ہے اور اپنے باپ سے اپنی بازاری آشنا خیلا کے متعلق کہتا ہے

مجھے خیلا سے ملوا دے ابے باوا ابے باوا ، نہیں تو ہاتھ دھو مجھ سے ابے باوا ابے باوا

نہ میں بیٹا ہوں پھر تیرا نہ تو باوا ہے پھر میرا جو کی پہلو تہی تو نے ابے باوا ابے باوا

باپ بھی شہد پن میں طاق تھے۔ ناہنجار بیٹے کی اس بے باکی پر بگڑ کر جناب خونخوار صاحب جواب دیتے ہیں ؎

یہ کیا انداز ہیں تیرے ابے مردک ابے گرگے یہ کیسے سیکھے ہیں شیوے ابے مردک ابے گرگے

ابے باوا ابے باوا یہ کیا بکتا ہے تو مرغے ، ابے یہ گفتگو ہم سے ابے مردک ابے گرگے

اس کے آگے سعادتمند بیٹے اپنی بہادری کے کارنامے یوں اکڑ اکڑ کے بیان کرتے ہیں :۔

. . . . . اڑائے خوب کنکوے ابے باوا ابے باوا

بڑھایا سات تاری پر تو کشمر تیبلی کاٹی دیئے وہ ڈور پر مانجھے ابے باوا ابے باوا

لڑا میدان جب راجہ سے اور نواب دولھا سے نکالے ہم نے بھی تکے ابے باوا ابے باوا

کبوتر کی ہوا آئی تو لے کر ہاتھ میں چھیپی اڑائے خوب ہی پھٹے ابے باوا ابے باوا

ہوا جب راگ کا لہرا ملے ہم تان رس خاں سے بڑھائے خوب یارانے ابے باوا ابے باوا

ہوا یاروں میں جب ہنا چرایا ماں کا سب گہنا اڑائے خوب گلچھرے ابے باوا ابے باوا

اب خونخوار خاں صاحب غصہ میں آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور گرج گرج کر بیٹے کو اس طرح ڈانٹ بتاتے ہیں۔

گھرانے کی مٹائی آبرو کم بخت یوں تو نے ابے تجھ سے خدا سمجھے ابے مردک ابے گرگے

اڑاتا ہے کبوتر تو۔ لڑاتا ہے بٹیریں تو ابے او الو کے پٹھے ابے مردک ابے گرگے

سناتا ہے ہمیں کیوں تو ہمیں کیا کام ہے اس سے ابے او مرغی کے بچے ابے مردک ابے گرگے

ابے کیا کالا پانی پی کے تو آیا ہے بھٹی سے یہ کیسے آتے ہیں بھبکے ابے مردک ابے گرگے

نہیں یاں شوق نشہ سے سوا افیون چنڈو کے چرس پیتا ہے تو چپکے ابے مردک ابے گرگے

ابے بیٹا ہے تو کس کا غلط ہے یہ ترا دعوے ہمارا تو نہ ہم تیرے ابے مردک ابے گرگے

جب مرزا محمد ہادی جیسے سنجیدہ اور ثقہ مصنف کے المیہ ڈراما کا مزاحیہ (کامک) اس قدر پست سوقیانہ ہو تو اوروں کا ذکر ہی کیا۔ آج اردو ڈراما کی مملکت میں آغا حشر کا سکہ رائج ہے۔ ان کے ڈراموں کو ایسی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی کہ دوسرے ڈراما نویس انہیں کے نقش قدم پر چلنے لگے بعضوں کا تو خیال ہے کہ کسی ڈراما کی کامیابی کا مدار ہی حشر کے تتبع پر ہے لیکن آغا حشر نے بھی مزاحیہ کے پردہ میں بھنگڑ خانہ کا فحش مذاق ڈرامائی لٹریچر میں داخل کر دیا ہے

محمد حسین ادیب

(باقی)

وادیٔ پنہاں

وقت کے دریا میں اٹھی تھی ابھی پہلی ہی لہر،
چند انسانوں نے لی ایک وادیٔ پنہاں کی راہ؛
مل گئی آغوشِ راحت میں پناہ،
کرلیا تعمیر اک موسیقی و عشرت کا شہر!
مشرق و مغرب کے پار،
زندگی اور موت کی فرسودہ شہراہوں سے دُور؛
جس جگہ سے آسماں کا قافلہ لیتا ہے نُور،
جس جگہ ہر صبح کو ملتا ہے ایمائے ظہور،
اور بُنے جاتے ہیں راتوں کے لئے خوابوں کے تار!
سیکھتی ہے جس جگہ پرواز حور،
اور فرشتوں کو جہاں ملتا ہے آہنگِ سُرور،
غم نصیب اہرمنوں کو گریہ و آہ و فغاں؛
گم شدہ، آوارہ انسانوں کی بستی ہے کہاں!
کاش بتلا دے کوئی،

مجھ کو بھی اُس وادیٔ پنہاں کی راہ!
مجھ کو ہے ان کی طرح حُسن و مسرت کی تلاش،
زندگی کے تازہ جولاں گاہ کی!
کوئی لے جائے مجھے،
اِس جہاں کے کہنہ، آہنگِ مسلسل کے پرے،
سرزمینِ زیست کی افسردہ محفل سے پرے،
دیکھ لے اک بار کاش،
اُس جہاں کا منظرِ رنگیں نگاہ!
جس جگہ ہے قہقہوں کا اک درخشندہ وفور،
جس جگہ سے آسماں کا قافلہ لیتا ہے نور
جس کی رفعت دیکھ کر خود ہمتِ یزداں ہے چور!
جس جگہ ہے وقت اک پیہم سُرود،
منتشر ہوتا نہیں اِس زندگی کا تار و پود!
اور جہاں اہرمنوں کا بھی نہیں کچھ اختیار،
مشرق و مغرب کے پار!

ن۔م۔ راشد

"نیک بخت" اور "ڈارلنگ"

مسز رحیمہ

(جادو نگار افسانہ نویسوں کے دور دورہ میں اردو پڑھنے والے کہیں یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ شہزادہ جوان بخت کی اولاد میں سے کسی بلند بخت کے چھوٹے بھائی کا نام نیک بخت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ زمانۂ حال کی صنفِ نازک کی اماں، نانی، پرنانی کا یہ ایک گھریلو لقب تھا۔ شوہر کو جب رفیقِ زندگی سے مجبوراً کوئی بات کرنی ہوتی تھی اور اس کی توجہ کو اپنی طرف منعطف کرنے والے معمولی جملے مثلاً "سنو تو"۔ "دیکھو تو"۔ "ہم کیا کہہ رہے ہیں"۔ "تمہاری رام کہانی ختم بھی ہوگی یا چرخہ یونہی چلیگا"۔ ختم ہو جاتے تو کبھی کبھی ازراہِ لطف ہمارے بزرگ گھر والی کو "نیک بخت" کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ یہ تمام وضاحت اس لئے ضروری ہے کہ آج کل لوگ تقریباً بھولے بیٹھے ہیں کہ شرفا کی مائیں، نانیاں، دادیاں، بیاہی ہوئی پھوپھیاں اور اپنے گھر میں آباد خالائیں سب نیک بخت ہوتی تھیں اور خصوصیت یہ تھی کہ صرف شوہر اپنی بیوی کو نیک بخت کہہ سکتا تھا۔ غیر کی کیا مجال کہ کسی کی بیوی کو نیک بخت کہہ ڈالے۔ شوہر کے سوائے باقی سب کے لئے گویا اس لفظ استعمال تقریباً حرام تھا۔ بہت ہوتا تو دوست دوست آپس میں یہ فقرہ استعمال کر لیتے تھے "تمہاری نیک بخت کی ہماری نیک بخت سے چل گئی"۔

یہ جتلا دینا غالباً غیر ضروری ہے کہ جس بیوی کا شوہر نہ ہو یا ہو کر چل دیا ہو وہ "نیک بختی" سے گویا مبرا تھی)

بزرگوں کی نیکیوں کا اور اپنی کوتاہیوں کا جس قدر ذکر کیا جائے کم ہے۔ زندگی، عقل، مذہب، شرافت صرف اسی لئے عطا ہوئے ہیں کہ موجودہ نسل اسلاف کی خوبیاں یاد کر کے اپنے ناخلف ہونے پر زور دے اور بہ اصرار یہ ثابت کرے کہ بزرگ سب کے سب باون گز کے تھے اور ہم سب بالشتیے ہیں۔ یہاں تک کہ ہم سے پہلے بادشاہ اور شہزادے بھی سب انصاف پسند سخاوت کے پتلے تھے۔ عالم بھی بڑے عالم تھے اور بہادروں کا تو کیا کہنا۔ یکہ و تنہا قلعے ڈھاتے تھے، لاکھوں کو محصور کر لیتے تھے اور فتح حاصل کر کے غنیم کے ساتھ اس لطف سے پیش آتے کہ وہ ساری عمر کے لئے بے دام کا غلام بن جاتا۔ یہ بالکل غلط ہے کہ مفتوحین کی کھوپریوں کے مینار بنائے جاتے تھے۔ اپنی چار دیواری کے اندر کی زندگی میں بھی بزرگوں کی شان نرالی تھی شوہر اگر کبھی کبھار زنانخانے میں آرام فرمانے کی عشرت گوارا فرماتے تو نیک بخت وہی ذکر چھیڑتی جو شوہر کے باپ اور دادا اپنے اپنے وقت پر انہی حالات میں سن چکے تھے۔ مثلاً یہ کہ "آپ تو کبھی سنتے نہیں۔ اللہ رکھے میری چھمو اب گیارھویں سال میں ہے۔ کب تک گھر میں بٹھائے رکھو گے؟ میں تو کل ہی بُوا نفیس خانم کا منہ میٹھا کراتی ہوں۔ دو سال سے بیچاری مرادیں مان رہی ہے

کہ چھمو کو دُلھن بنا کر اپنا گھر آباد کرے اور لڑکا بھی بُرا نہیں۔ سولہویں سال میں ہے ایک دو سال منگنی رہے پھر بیاہ ہوجائے۔ جہیز تو تقریباً تیار ہے بس آپ زیور بننے کا حکم دے دیں۔ کچھ کپڑا برتن درکار ہیں۔ یہ فرض اپنے سر سے اتاریں"۔

بزرگوں کی باتیں دہرانے میں جو لطف ہے اس سے آج کل کے جدت پسند بھی انکاری نہیں۔ مثلاً نیک بخت کا یہ ملکہ پیچ کر شوہر صاحب کبھی یہ نہ پوچھتے کہ لڑکا کرتا کیا ہے؟ بہت فرماتے تو یہ" نیک بخت ہم تو ہڈی کو دیکھتے ہیں"۔ نیک بخت یہ سن کر فوراً سمجھ جاتی کہ نفیس خانم کے سوال سے انکار نہیں۔ یہ اتنا سا جملہ دو سال کی خوشیوں کا پیش خیمہ بن جاتا۔ تہواروں پر جوڑے آتے شب برات پر آتشبازی آتی مٹھائیوں کا پھلوں کا اس گھر سے اس گھر اور اس گھر سے اس گھر ایک تانتا بندھ جاتا۔ "اللہ رکھے" "اللہ رکھے" "ماشا اللہ" "نظر نہ لگے" یہ استعمال کرتے کرتے باچھیں پھٹتیں۔ کیا برکت تھی اس زمانے میں!۔ لڑکا چاہے بعد میں بیمار نکلے یا نالائق ثابت ہو مگر مردوں کی بات مردوں کی بات ہے چھمو ضرور نفیس خانم کے ہاں دلھن بن کر رہ جاتی۔ ثابت ہوگیا نا کہ ہم ناخلف ہیں مگر . . . مگر . . . . مگر . . . . . .

ایک بات اکثر مصلحانِ قوم بھول جاتے ہیں اور وہ یہ ہے آخر ہماری نسل منقطع نہیں ہو رہی اور ہم بھی ہونے والے ناخلفوں کے لائق اسلاف ہیں۔ وہ ہمیں کیسے یاد کریں گے؟ لگے ہاتھوں اس کی بھی ایک جھلک دیکھ لیں۔ سنئے ہمارے پوتوں کے پڑپوتے کیا فرماتے ہیں "بیسویں صدی کے آغاز میں بزرگان قوم نے جس ہمت سے کام لیا وہ تاریخ میں ایک بے مثال یادگار ہے۔ بزرگوں کے ایثار کا کیا کہنا اور آج کل کوئی کر کے دکھائے تب جانیں۔ نام تو اب کچھ ٹھیک یاد نہیں مگر سب سے پہلے شمالی ہند میں کسی بزرگ نے اپنی گھر والی کو بجائے نیک بخت کے "ڈارلنگ" کہنا شروع کیا۔ اس لفظ سے وہ سوشل انقلاب ہوا کہ دنیا دنگ رہ گئی۔ کم فہم نقاد جب اول اول بیوی کے لئے اس لفظ کا چرچا ہوا تو کانوں پر ہاتھ دھرتے تھے کہ "بیوی" اور "ڈارلنگ"؟ لاحول ولاقوۃ اِلاّ باللہ۔ مگر بڑوں کی باتیں بڑی ہوتی ہیں۔ اپنی بات کو ایسا نبھایا کہ نیک بخت تو اور کسی کی نیک بخت بنتی نہ تھی۔ "ڈارلنگ" سب کی ڈارلنگ ہوگئی۔ ماں کو ڈارلنگ بنے دیر نہ ہوئی تھی کہ بیٹی sweet بن کر گھومی hearth بن کر ناچی اور home ہو کر اڑی۔ اللہ اللہ! کیا جادو اس ایک لفظ میں بزرگوں نے بھر دیا تھا"۔

"فلک پیما"

بانگِ رحیل

(ایک انگریزی نظم کے تاثرات)

(۱)

رنج و راحت کی داستاں کب تک ؟

نہ رہیں گی یہ خوں فشاں آنکھیں ‏ ‏ نہ رہیں گے یہ لب تبسّم ریز

آخر اک روز موت آئے گی ‏ ‏ کس کو ملتی ہے اس سے راہِ گریز

ٹوٹ جائے گا سب طلسمِ حیات !

زیست کا دردِ جانستاں کب تک ؟

(۲)

زندگانی ہے ایک خوابِ جمیل !

عشرتِ مستعار کے لمحے ‏ ‏ عیشِ ناپائدار کی راتیں !

شاہد و بادہ و گل و نغمہ ‏ ‏ یہ جوانی ، یہ پیار کی راتیں !

سر بسر جزوِ خواب ہیں گویا !

ہم ہیں اور انتظارِ بانگِ رحیل !

حفیظؔ ہوشیارپوری

یہ منزل سخت ہے اے جذبِ دلِ حرم اُس کی حالت پر
کہیں وہ بھی اِسی منزل کو رہ پیمانہ ہو جائے

کبھی اے بوالہوس ہو آشنائے دردِ محرومی
مرا ذمہ اگر اس پر بھی تو شیدانہ ہو جائے

ذرا ہشیار ! او حامد کی حالت پوچھنے والے
کہیں ایسا نہ ہو تو آپ بھی دیوانہ ہو جائے

(۲)

جو مرنا ہی مقدر تھا تو میں پہلے ہی مرلیتا
نہ یوں ناحق عذابِ زندگانی اپنے سر لیتا

اک انگارہ دیا دل لے کے مجھ کو اُس کی اُلفت نے
بھلا کیوں کر نہ میں پتھر کے بدلے یہ گہر لیتا

یہ جینا موت سے بدتر ہے یارب گر خبر ہوتی
نہ یوں کاٹی ہوئی گردن کو میں شانوں پہ دھر لیتا

خبر کیا تھی جدائی اِس طرح محروم کر دے گی
محبت عمر بھر کی ورنہ میں اک پل میں کر لیتا

یہ کاوش کیا! لیا ہے نام کس کا مرنے والے نے؟
ترا ہی نام حامد نزع میں لیتا اگر لیتا

حامد علی خاں

سقراط کی موت

(سقراط کی موت کے متعلق یہ بیان پروفیسر گڈون کے مضمون سے ماخوذ ہے)

کچھ کہہ کر وہ دوسرے کمرے میں نہانے کے لئے چلا گیا، کرائیٹو نے ہم سب کو کہ تعظیماً اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور اُس کے ساتھ چلنے کے خواہشمند تھے، پیچھے ٹھیر جانے کا اشارہ کیا اور خود اس کے پیچھے ہولیا۔ ہم اس کی تقریر پر چہ میگوئیاں کرنے لگے اور آنے والی بدبختی پر کفِ افسوس ملنے اور کڑھنے لگے۔ کیونکہ ہماری مستقبل کی زندگی استاد کی پدرانہ شفقت سے محروم ایک نئے عالمِ یتیمی میں منتقل ہونے والی تھی۔ غسل سے فارغ ہونے کے بعد جب سقراط اپنے کمرے میں آیا تو اس کا ایک کمسن اور دو نوخیز بچے اپنی ماں کے ساتھ اس کے سامنے لائے گئے۔ اس نے کرائٹو کی موجودگی میں اپنے اس مختصر کنبے سے ضروری باتیں کیں، کچھ نصیحتیں کیں اور مطمئن دل کے ساتھ انہیں رخصت کیا۔ پھر ہماری طرف متوجہ ہوا۔ اس وقت سورج اس کی عمر کے آفتاب کی طرح لب بام ہو رہا تھا۔ کیونکہ اس نے اپنے وقت کا بیشتر حصہ اندر ہی صرف کر دیا تھا۔ وہ آکر ہمارے ساتھ نیچے ہی بیٹھ گیا اُس کے بعد اس نے کوئی گفتگو نہ کی۔

اتنے میں عدالتِ[1] یازدہم کا کوتوال آیا اور اُس سے یوں خطاب کیا، "اے سقراط، میں تجھ سے کسی قسم کی ترش روئی یا سرد مہری کا برتاؤ نہیں کرنا چاہتا، کیونکہ میں نے تیرے زمانۂ اسیری میں تجھ کو سب سے زیادہ صحیح الفطرت اور شریف الطبع پایا ہے۔ مجھے ابھی بہت سے لوگوں (قیدیوں) کا ہدفِ ملامت اور تختۂ دشنام بننا ہے جبکہ میں اُن کو مجسٹریٹ کے فیصلے کے مطابق زہر نوش کرنے کا حکم سناؤں گا۔ مجھے تیری شرافت سے امید ہے کہ تو جو حکم کی نوعیت اور حقیقتِ حال سے مجھ سے بھی زیادہ اچھی طرح واقف ہے۔ مجھ سے کسی قسم کی سخت کلامی روا نہ رکھے گا۔ ..... رخصت ..... الوداع ..... اب اس بلائے بے درماں کو طوعاً و کرہاً جس طرح بھی بن پڑے لبیک کہہ۔"

اُس نے آنسوؤں کے سیلاب کو اپنے رومال میں دبایا اور منہ پر دونوں ہاتھ رکھ کر رخصت ہو گیا۔

سقراط نے اس پر تحسر و تاثر میں ڈوبی ہوئی نگاہ ڈالتے ہوئے کہا، "الوداع، الوداع! میں اس حکم کی تعمیل میں تاخیر نہیں کروں گا۔"

پھر ہم سے یوں گویا ہوا "دیکھو، یہ شخص کتنا خلیق اور کس درجہ شریف ہے، میں جب سے یہاں ہوں یہ مجھ سے ہمیشہ شریفانہ برتاؤ کرتا رہا ہے۔ اس کے دل میں کتنی انسانی ہمدردی ہے۔ دیکھو وہ میرے لئے کس درد اور آزردگی سے رو رہا ہے ..... مگر کرائیٹو، اب ہمیں اس کے پہنچائے ہوئے حکم کی تعمیل جلد کرنی چاہیئے۔ اگر تم تیار ہو تو تم ورنہ کسی دوسرے سے جام زہر

[1] اُن دنوں ایتھنز میں گیارہ عدالتیں تھیں، سقراط کے مقدمہ کی سماعت گیارہویں عدالت میں ہوئی اور یہیں سے آخری حکم صادر کیا گیا تھا۔

لانے کو کہو۔"

کرائیٹو نے کہا، "مگر میرا خیال ہے کہ سورج ابھی پہاڑ پر چمک رہا ہے اور نہیں ڈوبا دوسرے مجرموں نے ابھی تک زہر نہیں پیا بلکہ بعض آخری دم کے عیش و عشرت میں، اور بعض مے نوشی میں مصروف ہیں اور بعض اپنے اعزہ و اقربا کی صحبت میں زندگی کی آخری گھڑیاں، کچھ لطف و مسرت میں اور کچھ حسرت و افسوس میں گزار رہے ہیں حالانکہ انہیں زہر نوش کرنے کے احکام ایک مدت سے پہنچ چکے ہیں۔ آپ کیوں عجلت کرتے ہیں۔ ابھی بہت وقت ہے۔" سقراط نے کہا۔ "کرائیٹو۔ لیکن جن لوگوں کا تم ذکر کرتے ہو اُن کو شاید بچ جانے کی امید موہوم ہو۔ اس لئے ان کو قدرتی طور پر ایسا کرنا چاہیئے۔ اسی طرح یہ بھی قدرتی امر ہے کہ میں شدنی اور کردنی میں ناجائز تاخیر سے کام نہ لوں کیونکہ میں زندگی کے چند حقیر لمحات کے عوض اپنے ہی ہاتھوں خندۂ استہزا خریدنا نہیں چاہتا۔ نیز اس سے زیادہ اور کیا فائدہ ہو سکتا ہے کہ میں حریص زلیست گردانا جاؤں۔ پس جاؤ! اور جو میں چاہتا ہوں کرو۔"

اِن الفاظ پر کرائیٹو، جلاد کے پاس گیا اور اس سے زہر لانے کو کہا۔ تھوڑی دیر کے بعد "یہ ساقی" ایک ایسا رطلِ گراں لے کر آ پہنچا جس کے نشے میں گو موت کا خمار تھا مگر حیاتِ ابدی کا راز بھی مضمر تھا۔ سقراط نے اُس "جام بدست ساقی" کو دیکھ کر کہا۔ "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ مجھے اس حکم کی تعمیل میں کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے۔ میں تم سے اس لئے پوچھتا ہوں کہ تمہیں ایک مدت سے اس قسم کے احکام کی تعمیل کرانے کا تجربہ حاصل ہے۔

جلاد۔ "صرف اتنا، کہ اِس جامِ تلخ کو پی کر تھوڑی دیر ٹہلتے رہو یہاں تک کہ تمہارے پاؤں میں گرانی محسوس ہونے لگے۔ اس کے بعد زمین پر لیٹ جاؤ اور پھر۔۔۔ اس کا نشہ تم کو ہمیشہ کے لئے مدہوش کر دے گا۔" یہ کہہ کر پیالہ اُس نے سقراط کے ہاتھ میں دے دیا اُس نے بلا تامل خندہ پیشانی سے پیالہ ہاتھ میں لے لیا اور ابروؤں کے نیچے سے ایک خاص اثر میں ڈوبی ہوئی نگاہ اس پر ڈالتے ہوئے کہا "کیا میں اس پیالہ سے کچھ تھوڑا سا زہر انڈیل کر کسی دیوتا کی نذر کر سکتا ہوں، اس کی اجازت ہے یا نہیں؟"

جلاد۔ "ہم صرف اسی قدر مقدار میں زہر تیار کر کے دیتے ہیں جتنا ہم سمجھتے ہیں کہ ایک آدمی کو ہمیشہ کے لئے گہری نیند سُلا دینے کے لئے کافی ہے۔"

سقراط۔ "ہاں! میں جانتا ہوں لیکن دیوتاؤں کی پرستش اور نذرانہ یقیناً فرض ہے اس لئے یہ نذرانہ ادا کرنا چاہیئے۔ میں اس لئے یہ فرض بجا لانا چاہتا ہوں کہ (تھوڑا سا زہر انڈیلتے ہوئے) میرے سفرِ آخرت کے لئے مفید ہو۔"

یہ کہہ کر متبسم لبوں کے ساتھ جام کو لگایا اور ایک ہی دفعہ غٹ غٹ کر کے چڑھا گیا۔

ابھی تک ہم سب لوگ سکتے کے عالم میں خاموش بیٹھے تھے مگر جب ہم نے دیکھا کہ واقعی زہر ہلاہل کا پیالہ اُس نے ختم کر دیا

؎۲ زمانۂ قدیم میں یونان میں یہ قاعدہ تھا کہ جب عیش و نشاط کی مجالس کا افتتاح کیا جاتا اور جب کوئی شخص شراب پیتا تو وہ اپنے پیالہ میں سے تھوڑی سی شراب زمین پر انڈیل کر دیوتا کے بھینٹ چڑھا دیتا اور اس کو عبادت میں داخل سمجھا جاتا تھا۔۔۔ اسی لئے سقراط نے جلاد سے تھوڑا سا زہر انڈیلنے کی اجازت مانگی تاکہ وہ کچھ اس میں سے بھی دیوتا کے بھینٹ چڑھا دے۔

ہے اور ابھی اُس کا بسمل لاشہ اپنی آنکھوں کے سامنے ہمیں تڑپتا نظر آئے گا تو بے اختیار ہماری آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہنے لگا ۔شدتِ رنج وکرب سے میں نے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا اور زار وقطار رونا شروع کیا۔ مگر اُس کے لئے نہیں بلکہ اپنی بدقسمتی پر کہ اب ہم میں سے سقراط ایسا شخص ہمیشہ کے لئے اُٹھ جانے کو ہے۔

کرائیٹو اس سانحۂ روح فرسا کی تاب نہ لاتے ہوئے باہر چلا گیا۔ ہمارا دوسرا دوست اپپالو، خاموش آنسو بہا رہا تھا۔ مگر جب وہ بیقرار ہو کر زور زور سے سسکیاں لینے اور چیخ چیخ کر رونے لگا تو حاضرین میں سوائے سقراط کے کوئی بھی اُس کے پُر درد آہ وبکا اور غم واندوہ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

سقراط نے ایک شجاعانہ اندازِ تفاخر سے کہا "اے ! نادان انسانو، تم کیا کر رہے ہو"۔ اپنی عورت اور بچوں کو اس وقت سے پہلے لوٹا دینے سے میری غرض یہی تھی کہ وہ میرے آخری وقت میں اپنے جذبات میں ڈوبے ہوئے گریہ وزاری سے مجھے چلتے وقت بیزار نہ کریں۔ کیونکہ بزرگوں کا قول ہے کہ انسان کو اپنی پاکیزہ مذہبی رسوم کے مطابق عالمِ سکون میں مرنا چاہیئے۔ اس لئے گریہ وزاری سے باز آؤ، اپنے دلوں کو ڈھارس دو اور میرے لئے دعائے مغفرت کرو۔

یہ پُر اثر الفاظ سُن کر ہم مجوب سے ہوگئے اور اپنے موسلا دھار برسنے والے آنسوؤں کو اندر ہی اندر کھینچ لیا۔

وہ آہستہ آہستہ ٹہلنے لگا، پھر ذرا بیٹھ گیا، تھوڑی دیر کے بعد وہ زمین پر چت لیٹ گیا۔

جلاد نے اس کے پاؤں کو دبا کر پوچھا، "کیا تم اس کو محسوس کرتے ہو؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ اب وہ آہستہ آہستہ ٹانگوں، رانوں، کمر، بازوؤں تک کو ٹٹولنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس کے لبوں میں ایک کمزور سی جنبش پیدا ہوئی۔ کرائیٹو نے ساتھ کان لگا دیئے۔ اُس نے سنا، "کرائیٹو . . . . ایک مرغ کو دیوتاؤں[1] کے بھینٹ چڑھا دینا . . . . مجھے قرض سے سبکدوش کر دینا"۔

کرائیٹو نے کہا "میں ایسا ہی کروں گا لیکن آپ اور کیا وصیت کرنا چاہتے ہیں؟" اس سوال کا کوئی جواب نہ ملا ——— دیکھا تو سقراط ختم ہو چکا تھا۔

یہ تھا ہمارے اس رفیق کا انجام جس کا نام اور جس کا کام اور جس کا یہ دردناک انجام رہتی دنیا تک لوگوں کے لئے ایک تازیانۂ عبرت بنا رہے گا۔

——— محمد زمان خاں

---

[1] زمانۂ قدیم میں یونانی اصنام پرستوں میں ایک رسم رائج تھی کہ جب کوئی شخص بیمار پڑ جاتا تو صحت کے دیوتا (Aesculapius) کو ایک مرغ بھینٹ چڑھانے کی منت مان لیتا۔ ایسا کرنے سے اُن کے خیال کے مطابق صحتِ عاجل اور کامل تندرستی ہو جاتی تھی چنانچہ بسترِ علالت سے اٹھنے پر اس پر عمل کیا جاتا تھا۔ سقراط زندگی کو ایک مرض سمجھتا ہے اور اسی رسم کے مطابق وصیت کرتا ہے۔ چونکہ میں مرضِ "زندگی" سے چھٹکارا پانے والا ہوں اس لئے اس رسم کو ادا کیا جائے۔

خالی گہوارہ

(عکسی!!)

ایک خوبصورت مگر افسردہ کمرہ۔
ایک طرف ایک خالی گہوارہ رکھا ہے۔
اُس کے پاس ہی ایک بچے کے موزے کا ایک
پاؤں پڑا ہے۔
اور ایک پھٹی ہوئی تصویر اور ایک ٹوٹا ہوا کھلونا۔
قریب ہی چھپرکھٹ میں ایک نوجوان عورت سوتی ہے —
اس کی گود خالی ہوئے ایک ہفتہ ہُوا۔ پہلوٹھی کا بچہ تھا۔
دو برس کا ہنستا کھیلتا گیا۔
صبر! صبر! جس کی چیز تھی اُسی نے لے لی۔
خوابیدہ عورت کے حسین بلوریں چہرے پر ایک دلگیر شگفتگی ہے
اور یاقوتی ہونٹوں پر ایک دلفریب مسکراہٹ کھیل رہی ہے۔
اے ہے دیکھنا! وہ اس کا مرمریں بازو ہلا۔
سوتے میں؟ ہاں! سوتے میں!!
اس نے اپنا حنائی ہاتھ اٹھایا۔
وہ ہاتھ گہوارے تک پہنچا۔
اے لو وہ تو گہوارے کو ہلانے لگی۔

سوتی ہے؟ ہاں ہاں سوتی ہے — مگر —
گہوارے کو برابر ہلائے جاتی ہے
اے ہے وہ تو کچھ گنگنانے بھی لگی۔
سُننا سُننا!! لوری گا رہی ہے مسکراتی جاتی ہے
آہ کیسا اطمینان اور تشکر ہے اس کے ہونٹوں
پر ———
آہستہ بولو ———
دھیرے چلو ———
آہٹ نہ ہو — ذرا سی بھی ———
اچھا نہ ہوگا اگر اس عورت کے فردوسی خواب میں خلل پڑا —
اٹھاؤ نہیں — آہ!
اسے جگاؤ نہیں — سونے دو سونے والی کو —
دم بھر رہنے دو اس متوالی کو خوشی کی اس مملکت میں —
بچہ تو اللہ کا پیارا ہو چکا — اب جاگتے ہیں اسے
گہوارہ ہلانے کی نوبت کہاں آئے گی۔
ہائے!

منظر انصاری

جذبۂ شعر سے خطاب

خیالِ دوزخ و جنت بھلا دیا تو نے
مجھے یہ کونسے رستے لگا دیا تو نے

بنا کے دل کو مرے اصلِ مذہب و ملّت
رواج و رسم کی زد سے بچا دیا تو نے

دلھن کی طرح سجا کر گناہِ الفت کو،
حجاب و شرم کا پردہ اٹھا دیا تو نے

نیازِ عشق میں رکھ کر غرور کا پہلو
امینِ رازِ محبّت بنا دیا تو نے

فریبِ عجز کی کیا کیا حقیقتیں کھولیں
خودی کا مجھ کو پیمبر بنا دیا تو نے

زہے نوازشِ پیہم کہ دل کی دھڑکن میں
امینِ وحی کا نغمہ سنا دیا تو نے

کسی حقیقتِ پنہاں کو بے نقاب کیا
تصوّرات میں جب مسکرا دیا تو نے

تمام عشق کی تاریخ سونپ کر مجھ کو
روایتوں کا خزانہ لٹا دیا تو نے

جمالِ طور فسانہ نہیں حقیقت ہے
مجھی پہ برق گرا کر بتا دیا تو نے

ترے جمال کو میں نے ہمیشگی بخشی
مرے خیال کو رنگیں بنا دیا تو نے

زیبا

پریتم سے

تو جیون ہے میرا

پریتم! تو جیون ہے میرا

تجھ سے چاروں کھونٹ اُجالا

تجھ بن گھور اندھیرا

پریتم! تو جیون ہے میرا

تجھ بن دن ہی رین سے بھیانک

تجھ سے سانجھ، سویرا

پریتم! تو جیون ہے میرا

کال بلادا، تیری دُوری

امرت، درشن تیرا

پریتم! تو جیون ہے میرا

امر چند قیس جالندھری

کسان کا بیٹا

سمندر کے ساحل پر ایک قصبہ آباد تھا۔ اس کے قریب ہی پہاڑی کے دامن میں چھپّر کے دو جھونپڑے تھے۔ جن میں دو کسان اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتے تھے۔ انہیں اپنے بچوں کی پرورش کے لئے بنجر زمین کی کاشت میں سخت محنت کرنی پڑتی تھی۔ دونوں گھروں میں چار چار بچے تھے۔ جھونپڑوں کے سامنے بچوں کا ایک گروہ صبح سے لے کر شام تک کھیلتا تھا۔ کل آٹھ بچے تھے۔ ان میں سے دو بڑے بچے چھ چھ برس کے تھے اور دو چھوٹے پندرہ پندرہ مہینے کے۔ یہ دونوں بڑے اور دونوں چھوٹے بچے تقریباً ایک ہی وقت پیدا ہوئے تھے۔ جب یہ مل جل کر کھیلتے تھے تو ان کی مائیں اپنے اپنے بچوں کو شکل سے پہچان سکتی تھیں مگر ان کے باپ تو ان کی شناخت میں بالکل غلطی کرتے تھے۔ آٹھ نام ہر ایک باپ کے سر میں گھومتے رہتے تھے۔ جب کبھی انہیں بچوں میں سے کسی کو بلانے کی ضرورت پڑتی تھی تو عموماً تین چار کو بلانے کے بعد کہیں مطلوبہ بچہ ملتا ہے۔

ریلوے اسٹیشن کی طرف سے ان دونوں گھروں میں سے جو پہلا تھا اس میں وو داش رہتا تھا۔ اس کے یہاں تین لڑکے تھے اور ایک لڑکی۔ دوسرے میں والین رہتا تھا۔ اس کے یہاں ایک لڑکا تھا اور تین لڑکیاں۔ یہ لوگ بڑی مشکل سے گزارہ کرتے تھے۔ ان کی خوراک صرف آلو۔ شوربا اور کھلی ہوا تھی۔ یہ دونوں گھرانے اپنے اپنے بچوں کو صبح سات بجے ناشتے کے وقت، دوپہر کو اور پھر شام کے چھ بجے کھانا کھلانے کے لئے جمع کر لیتے تھے، جیسے پرند پالنے والے اپنے اپنے پرندوں کو اکٹھا کر لیتے ہیں۔ ان بچوں کو ان کی عمر کے لحاظ سے ترتیب وار ایک لکڑی کی میز کے گرد بٹھایا جاتا تھا جو گزشتہ پچاس سال کے متواتر استعمال سے بالکل صاف اور چمکدار ہو گئی تھی۔ سب سے چھوٹے بچے کا منہ مشکل سے اس میز کی سطح تک پہنچتا تھا۔ ان کے سامنے گہری تشتریوں میں آلو۔ گوبھی اور پیاز کے پتلے شوربے میں بھگوئی ہوئی روٹی ہوتی تھی جسے یہ سب شوق سے بھوکوں کی طرح کھاتے تھے۔ چھوٹے بچے کو ماں خود اپنے ہاتھ سے روٹی توڑ کر اور شوربے میں بھگو کر کھلاتی تھی۔ اتوار کے روز ہر بچے کو گوشت کی ایک بوٹی ملتی تھی۔ جو ان کے لئے گویا بڑی بھاری ضیافت ہوتی تھی۔ اتوار کے کھانے پر اُن کے باپ بہت دیر تک بیٹھے رہتے تھے اور ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ اب ہم ہر روز ایسا ہی کھانا کھائیں گے۔

اگست کے مہینے میں ایک دن دوپہر کے بعد ایک نہایت عمدہ گاڑی ان جھونپڑیوں کے سامنے آٹھہری۔ اس میں ایک نوجوان خاتون جو خود گاڑی چلا رہی تھی اور اس کا خاوند تھے۔ اس خاتون نے اپنے خاوند کو مخاطب کر کے کہا "ان بچوں کو

ذرا دیکھو۔ گرد و غبار میں کھیلتے ہوئے بھی کیسے پیارے لگتے ہیں"۔ اس کے شوہر نے کچھ جواب نہ دیا۔ کیونکہ وہ اپنی بیوی سے اس قسم کی باتیں سننے کا عادی تھا اور یہ اس کے لئے افسوس کا باعث ہوتی تھیں۔ پھر یہ خاتون بولی "میں چاہتی ہوں کہ ان کو گلے سے لگاؤں۔ میری آرزو ہے کہ میرے یہاں بھی ایک ایسا لڑکا ہو جیسا وہ چھوٹا بچہ ہے"۔ پھر گاڑی سے اتر کر وہ پیدل ان بچوں کی طرف تیزی سے گئی۔ وہاں پہنچ کر اس نے دو چھوٹے بچوں میں سے ایک کو جا پکڑا۔ یہ دُوواش کا بچہ تھا۔ اس کے رخساروں۔ بھورے بھورے گرد آلود بالوں اور ننھے ننھے ہاتھوں کو جو آزاد ہونے کی کوشش کر رہے تھے اس نے بڑی محبت سے چوما۔ پھر اُسے چھوڑ کر وہ اپنی گاڑی کی طرف لوٹی اور اس میں سوار ہو کر وہاں سے چلدی۔ دوسرے ہفتہ یہ خاتون پھر وہاں پہنچی اور بچوں کے ساتھ کھیلنے کے لئے زمین پر بیٹھ گئی۔ اس نے ایک چھوٹے بچے کو گود میں لے لیا اور اسے خوب مٹھائی کھلائی دوسرے بچوں کو بھی اس نے مٹھائی دی۔ اور ان کے ساتھ اس طرح کھیلتی رہی گویا وہ خود بھی انہیں میں سے ہے۔ اس دوران میں اس کا شوہر اطمینان سے گاڑی میں اس کا انتظار کرتا رہا۔ پھر ایک دن یہ خاتون وہاں آئی اور ان بچوں کے والدین سے شناسائی پیدا کرنیکی کوشش کی۔ اس کے بعد تو وہ ہر روز وہاں آنے لگی۔ اس کی جیبیں بچوں کے لئے مٹھائی اور روپوں پیسوں سے بھری رہتی تھیں۔ اس خاتون کا نام مادام ہوبیر تھا۔ ایک صبح مادام ہوبیر اور اس کا شوہر وہاں پہنچے۔ اس دفعہ بجائے بچوں کے پاس جانے کے یہ سیدھے ان کسانوں کے گھروں میں سے ایک میں جا داخل ہوئے۔ کسان اور اُس کی بیوی گھر میں موجود تھے اور کھانا پکانے کے لئے لکڑی چیرنے کی فکر میں تھے ان معزز ملاقاتیوں کو دیکھ کر دونوں فوراً کھڑے ہوگئے اور انہیں کرسی پیش کر کے انتظار کرنے لگے کہ نو وارد اپنے مدعا کا اظہار کریں۔ مادام ہوبیر نے آہستہ اور دبی آواز میں سلسلۂ کلام یوں شروع کیا "میرے اچھے دوستو! میں تم سے اس واسطے ملنے آئی ہوں کہ میرا دل بہت چاہتا ہے کہ تمہارے سب سے چھوٹے بچے کو میں اپنے ساتھ لے جاؤں"۔ کسان اور اس کی بیوی یہ سن کر ہکا بکا رہ گئے اور انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ مادام ہوبیر نے تھوڑی دیر کے بعد پھر یوں کہا "بات یہ ہے کہ ہمارے یہاں کوئی بچہ نہیں ہے۔ ہم اکیلے میں صرف میرا شوہر ہے اور میں ہوں۔ ہم تمہارے بچے کو بہت اچھی طرح رکھیں گے۔ تمہارا کیا ارادہ ہے؟" کسان کی بیوی اب سمجھی کہ بات کیا ہے اور پوچھنے لگی "آپ یہ چاہتی ہیں کہ میرے سب سے چھوٹے بچے "شارلو" کو آپ لے لیں۔ ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا"۔ معاملے کو بگڑتے دیکھ کر مادام ہوبیر کا شوہر اس گفتگو میں شریک ہوگیا اور یوں بولا "میری بیوی نے اپنا مدعا ٹھیک طور پر ظاہر نہیں کیا۔ بات یہ ہے کہ ہم تمہارے بچے کو متبنّٰی بنانا چاہتے ہیں لیکن وہ تمہارے پاس ملنے کے لئے آتا رہے گا۔ اگر اس معاملہ کا انجام بخیر ہوا جیسی کہ ہمیں ہر طرح سے امید ہے تو یہ بچہ ہماری میراث کا مالک ہوگا۔ فرض کرو اگر ہمارے یہاں کوئی بال بچہ ہوا تو تمہارا لڑکا ہمارے بچوں کے ساتھ ہماری میراث میں برابر کے حصہ کا حقدار ہوگا۔

اگر یہ ہمارے پاس نہ رہنا چاہے تو جب یہ بالغ ہوگا۔ ہم اسے بیس ہزار روپیہ دیں گے۔ یہ رقم ہم اس وقت سرکاری وکیل کے پاس بطور امانت رکھ دیتے ہیں۔ چونکہ ہمیں تمہارا بھی خیال ہے ہم تمہیں بھی تاحیات ایک سو روپیہ ماہوار دیتے رہیں گے۔ کیا تم اب اس بات کو اچھی طرح سمجھ گئی ہو؟" کسان کی عورت غصے میں اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی "کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں اپنے بچے کو آپ کے پاس بیچ دوں۔ کیا یہ ایسی بات ہے جسے کوئی ماں گوارا کر سکے۔ دیکھو توسہی۔ ہرگز نہیں۔ یہ سخت مکروہ بات ہے؟" کسان سوچ میں خاموش کھڑا تھا۔ لیکن اس کے سر ہلانے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی عورت کی گفتگو کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھ رہا ہے۔ مادام ہوبیر نے جب دیکھا کہ کام بنتا نظر نہیں آتا تو آنکھوں میں آنسو بھر لائی اور اپنے خاوند کی طرف متوجہ ہو کر درد بھرے لہجے سے کہنے لگی "ان کی بالکل مرضی نہیں ہے" پھر دونوں نے ایک آخری استدعا کرنے کی کوشش کی اور کسان اور اس کی بیوی کو مخاطب کر کے بولے۔ "دیکھو ہمارے دوستو! اپنے بچے کے مستقبل اور بہتری پر بھی ذرا غور کرو" اس پر کسان عورت نے جواب غصے میں بھری ہوئی تھی۔ ان کی بات کاٹ کر کہا "ہم نے یہ سب کچھ خوب سوچ لیا ہے۔ آپ یہاں سے چلے جائیے۔ اگر پھر میں نے آپ کو یہاں دیکھا تو آپ کے لئے اچھا نہ ہوگا۔ بھلا یہ کوئی بات ہے کہ آپ میرے بچے کو اس طرح اپنے ساتھ لے جائیں" جب مادام ہوبیر اور اس کا خاوند اس گھر سے باہر نکلنے لگے تو مادام ہوبیر کو خیال آیا کہ چھوٹا بچہ ایک نہیں بلکہ دو ہیں چنانچہ اس نے اشک آلودہ آنکھوں کے ساتھ کسان سے پوچھا "کیا دوسرا چھوٹا بچہ بھی تمہارا ہی ہے" دوواش نے کہا "نہیں۔ وہ ہمارے پڑوسی والین کا ہے۔ اگر آپ ان کے یہاں جانا چاہیں تو آپ کی مرضی ہے۔ اس کے بعد دوواش اپنے جھونپڑے میں واپس چلا گیا جہاں اس کی عورت کی غصہ میں بھری ہوئی آواز گونج رہی تھی۔ مادام ہوبیر اس دوسرے گھر میں جا داخل ہوئی۔ یہ گھر والے کھانا کھا نے ہی کو تھے۔ روٹی کے ٹکڑے جن پر خال خال مکھن لگا ہوا تھا ایک تشتری میں رکھے تھے۔ مادام ہوبیر نے ان سے اپنا مدعا بیان کرنا شروع کیا۔ مگر بڑی ہوشیاری، احتیاط اور خوش بیانی سے۔ یہ سن کر والین اور اس کی بیوی سر ہلانے لگے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ رضامند نہیں ہیں۔ مگر جب ان کو بتایا گیا کہ انہیں بھی ایک سو روپیہ ماہوار ملے گا۔ تو وہ کچھ حیران سے ہو گئے۔ کافی دیر تک وہ حالت اضطراب اور پس و پیش میں رہے۔ آخر والین کی بیوی نے اپنے خاوند سے پوچھا کہ تمہاری کیا رائے ہے۔ والین نے جواب دیا کہ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ یہ سن کر مادام ہوبیر کی جو کہ فکر مند ہو رہی تھی ہمت بڑھی اور وہ ان کے بچے کی آئندہ خوشحالی اور مال و دولت کا ذکر کرنے لگی جس کا وہ مجوزہ صورت میں حقدار ہو سکتا تھا۔ والین نے پوچھا "آپ ہمیں بارہ سو روپیہ سالانہ دینے کا اقرار سرکاری وکیل کے پاس کریں گے" مادام ہوبیر کے خاوند نے جواب دیا "بیشک۔ بالکل صحیح"۔ اب والین کی عورت جو کچھ سوچ رہی تھی کہنے لگی "ایک سو روپیہ ماہوار تو بچے کے عوض میں بالکل

کافی نہیں ہے۔ اتنا روپیہ تو یہ تھوڑے عرصہ ہی میں کمانے لگے گا۔ ہمیں تو ایک سو بیس روپے ماہوار چاہئیں۔" یہ سن کر مادام ہوبیر بے صبری سے پاؤں زمین پر مارنے لگی اور ایک سو بیس روپیہ ماہوار دینا فوراً منظور کر لیا۔ اس کے خاوند نے اس معاملہ کے متعلق ایک دستاویز لکھی جس پر قصبہ کے چودھری اور ایک پڑوسی کی گواہی کرائی گئی۔ بچے کے والدین کو ایک سو روپیہ اسی وقت نذر کیا گیا اور مادام ہوبیر نے جواب بہت خوش تھی چلّاتے ہوئے بچے کو یوں اٹھا لیا۔ جیسے کوئی بچہ کسی دوکان پر سے اپنا کوئی چاہیتا کھلونا اٹھائے۔ جب بچے کو لے کر مادام ہوبیر اور اس کا خاوند وہاں سے چلے اس وقت دُوداش اور اس کی بیوی اپنے دروازے پر کھڑے اِن کو دیکھ رہے تھے اور بالکل خاموش تھے۔ شاید انہیں اپنے انکار سے پشیمانی ہو رہی تھی۔

اس کے بعد وہ اس چھوٹے بچے کا ذکر بالکل نہ کرتے تھے۔ وہ مادام ہوبیر کے وکیل سے ایک سو بیس روپے ہر ماہ لے آتے تھے۔ لیکن اب ان کے پڑوسیوں نے انہیں بہت تنگ کرنا شروع کیا اور ان کی آپس میں سخت ان بن ہو گئی۔ کیونکہ دُوداش کی بیوی انہیں بُرا بھلا کہتی رہتی تھی اور گھر گھر یہ کہتی پھرتی تھی کہ ایسا انسان انسان نہیں جو اپنے بچے کو بیچ ڈالے۔ یہ تو سخت معیوب بات ہے کہ کوئی اپنے بچے کو اس طرح بیچے۔" بعض اوقات وہ اپنے بچے کو گود میں اٹھا کر دوسروں کو دکھا دکھا کر اسے کہا کرتی تھی کہ میں تجھے ہرگز نہ بیچوں گی۔ میں بے شک مالدار نہیں ہوں مگر میں اپنے بچوں کو بیچنے والی نہیں۔" یہ عورت اکثر اس قسم کی طعنہ زنی اور رمز آمیز باتیں اپنے دروازے پر کھڑے ہو کر کیا کرتی خصوصاً جب اور لوگ اپنے گھروں کو آتے جاتے اس طرف سے گزرتے۔ اب وہ اپنے آپ کو گاؤں بھر میں سب سے برتر سمجھنے لگی کیونکہ اس نے اپنے بچے کو نہ بیچا تھا۔ لوگ جو اس کا ذکر کرتے کہا کرتے "یہ بڑا اچھا سودا تھا۔ لیکن اس کی بالکل پروا نہ کرتے ہوئے دُوداش کی بیوی نے بالکل ایک ایسا کام کیا جیسا ایک ماں کو کرنا چاہیئے۔" دوداش کی بیوی تو اب ضرب المثل ہو گئی۔ اس کا بچہ شارلو جو اب تقریباً اٹھارہ برس کا تھا اور جس کی پرورش کے ساتھ ساتھ یہ خیال اس کے ذہن نشین کرایا جاتا تھا کہ اس کی ماں نے اس کو بیچا نہیں تھا۔ اپنے آپ کو اپنے ہم عمروں سے بالاتر سمجھنے لگا۔

والیین اور اس کی بیوی اس ماہوار رقم سے جو انہیں ملتی تھی۔ خوب آرام کی زندگی بسر کرتے تھے۔ دوداش اور اس کی بیوی جن کا گزارا مشکل سے ہوتا تھا والیین کے گھر کی خوشحالی کو نہ دیکھ سکتے تھے اور ان کی دشمنی کی محض یہی ایک وجہ تھی۔ دوداش کا سب سے بڑا لڑکا باہر ملازمت پر چلا گیا۔ مجھلا مر گیا۔ سب سے چھوٹا شارلو اکیلا اپنے بوڑھے والدین اور چھوٹی بہن کے پاس رہتا تھا اور محنت مشقت کر کے کنبے کا پیٹ پالتا تھا۔ اس کی عمر اب اکیس برس کی تھی ایک دن ایک نہایت شاندار گاڑی ان دو جھونپڑیوں کے سامنے آ ٹھہری۔ ایک نوجوان جس کی گھڑی کی طلائی زنجیر دکھائی دے رہی تھی اس گاڑی سے اترا

اور پھر ہاتھ بڑھا کر ایک بوڑھی عورت کو جس کے بال بالکل سفید تھے۔ گاڑی سے اُتارا۔ یہ بڑھیا بولی " میرے بچے۔ یہ وہ گھر نہیں ہے۔ جہاں ہمیں جانا ہے وہ دوسرا ہے" اور وہ دونوں اس دوسرے گھر میں جا داخل ہوئے۔ یہ گھر والین کسان تھا۔ اس کی بیوی اس وقت کچھ کپڑے دھو رہی تھی اور بوڑھا والین جو بہت کمزور تھا چولھے کے سامنے لیٹا تھا۔ اس نوجوان اور بڑھیا کی آمد پر والین اور اس کی بیوی نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ نوجوان بولا " اماں سلام " اس پر دونوں بوڑھا اور بڑھیا اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ کچھ حیران سے تھے۔ کسان کی بیوی کے ہاتھ سے اضطراب میں صابن پانی میں گر گیا۔ اس نے نوجوان کو پہچان کر کہا۔ " آہ! کیا تو ہے میرے بچے " اور یہ کہتے ہوئے " سلام میرے بچے سلام "۔ اس سے بغل گیر ہوئی۔ بوڑھا باپ جس شفقت پدری سے بے تاب تھا وہ متین انداز سے بولا۔ " میرے بچے۔ کیا تو آگیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں بچھڑے ایک مہینہ نہیں گزرا "۔ جب ان میں اچھی طرح ملاقات ہو چکی تو یہ بوڑھے ماں باپ خوشی کے مارے گھر سے نکلے تاکہ اپنے بیٹے کو سارے آس پاس کے لوگوں کو دکھائیں۔ وہ اسے گاؤں کے چودھری، پٹواری اور مُلّا سے ملانے کے لئے لے گئے اور گاؤں کے مدرس سے بھی اس کی ملاقات کرائی۔ دُوداش کا لڑکا شارلو اپنے دروازہ میں کھڑا ان سب کو جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

شام کے کھانے پر اُس نے اپنے بڈھے باپ سے کہا کہ " آپ نے سخت غلطی کی کہ پڑوسیوں کے چھوٹے لڑکے کو لینے دیا "۔ اس کی ماں سختی سے بولی کہ " ہم نہیں چاہتے تھے کہ اپنے بچے کو بیچیں "۔ باپ خاموش رہا۔ لڑکے نے پھر کہنا شروع کیا " ایسا کرنا کیا کوئی مصیبت تھی۔ یہ کوئی بری بات نہ تھی "۔ اس پر بڈھے باپ نے غصہ سے بھری ہوئی آواز میں کہا کہ " کیا تو ہمیں اس لئے ملامت کرتا ہے کہ ہم نے تیری پرورش کی ہے "۔ لڑکے نے گستاخانہ لہجہ میں کہا " ہاں میں تمہیں ملامت کرتا ہوں۔ تم بالکل بیوقوف ہو۔ تمہارے جیسے والدین تو بچوں کے لئے عذاب ہیں۔ تم اس بات کے مستحق ہو کہ میں تمہیں خیرباد کہہ کر یہاں سے چلا جاؤں "۔

بوڑھی ماں کی اب یہ کیفیت تھی کہ پر اشک آنکھوں سے آنسو ٹپک ٹپک کر اس کی تشتری میں گر رہے تھے شوربے کا گھونٹ جو وہ لینی تھی اس میں سے آدھا نیچے گر جاتا تھا اور آہیں بھر بھر کر کہہ رہی تھی کہ کیا تو ہمیں اس لئے مارنا چاہتا ہے کہ ہم نے تجھے اس طرح پالا اور پرورش کیا۔ اس پر یہ بدمزاج لڑکا بولا " کیا ہی اچھا ہوتا اگر میں پیدا ہی نہ ہوتا بہ نسبت اس کے کہ میں اپنی موجودہ حالت میں جیوں۔ جب سے میں نے والین کے لڑکے کو دیکھا ہے میرے جسم میں خون دورہ کرنے سے رُک گیا ہے۔ اسے دیکھ کر مجھے رشک آتا ہے اور میں سوچتا ہوں کہ اگر میرے ماں باپ مجھے دے دیتے تو کیا میں بھی نہ اُس کی طرح اچھی حالت میں ہوتا "۔ اتنا کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا " مجھے یہی بہتر معلوم ہوتا ہے کہ میں یہاں نہ رہوں۔ کیونکہ اگر میں یہاں رہا تو صبح سے لے کر شام تک ہم آپس میں لعنت ملامت کرتے رہا کریں گے اور میں آپ لوگوں کے لئے زندگی عذاب بنا دوں گا۔ میں یہ آپ کا انکار کبھی نہ بھولوں گا اور نہ بخشوں گا "۔ بوڑھا اور بڑھیا دونوں بالکل خاموش تھے گویا ان پر بجلی گر گئی تھی۔ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری

تھے۔ لڑکا پھر بولا "نہیں نہیں یہ رنج میں مشکل سے بھول سکوں گا۔ یہ ہمیشہ میرے دل کو کاٹتا رہے گا۔ میں نے پورا ارادہ کر لیا ہے کہ یہاں سے چل دوں اور کہیں اور جا کر زندگی بسر کروں"۔ اتنا کہہ کر وہ چل کھڑا ہوا۔ جونہی اُس نے اپنے گھر کا دروازہ کھولا اُسے کچھ شور سنائی دیا۔ یہ شور وغل والدین کے گھر میں ہو رہا تھا۔ جہاں ان کے لڑکے کی واپسی پر خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔ اس وقت شارلو نے اپنا پاؤں زور سے دروازہ پر مارا اور ماں باپ کی طرف منہ پھیر کر چلایا۔ "ہل چلانے والو! لو میں جا رہا ہوں" اور اندھیری رات میں کہیں نکل گیا ؂

(ماپسان) عبدالرشید

کامیابی کا راز

اکبر اعظم سے کامیابی کا راز معلوم کرنے کے لئے بہت دور سے ایک شہزادہ آیا

اور التجا کی۔ عالی شان بادشاہ تیرے پاس کونسا طلسم اور طاقت ہے

جس کی برکت سے تو تمام عمر مشکلات پر غالب آتا رہا

کونسی طاقت!

اکبر نے متانت سے کہا:۔

"یہی مشکلات"

(مارکھم) میرزمان خاں

دل کا جلنا

ذوق:۔ تری بزم میں تو جلتا کبھی تجھے بھی بو پہنچتی
جو یونہی تھا دل کو جلنا تو بلا سے عود ہوتا

مومن:۔ آتی ہے بوئے داغ شب تارِ ہجر میں
سینہ بھی چاک ہو نہ گیا ہو قبا کے ساتھ

غالب:۔ داغِ دل گر نظر نہیں آتا
بو بھی اے چارہ گر نہیں آتی

انیس:۔ بھلا باعث یہ اس بے درد کے آنسو نکلنے کا
دھواں لگتا ہے آنکھوں میں کسی کے دل کے جلنے کا

مومن:۔ دھواں اٹھتا ہے دل سے وقت گریہ
بجھا دی تو نے کینا اے چشم تر آگ

محمد عبداللہ خاں خویشگی

غزل

سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں
لیکن اس ترکِ محبت کا بھروسا بھی نہیں

بھول جاتے ہیں کسی کو مگر ایسا بھی نہیں!
یاد کرتے ہیں کسی کو مگر اتنا بھی نہیں

تم نے پوچھا بھی نہیں میں نے بتایا بھی نہیں
کیا مگر راز وہ ایسا تھا کہ جانا بھی نہیں

مدتیں گزریں تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست
ہائے اب مجھ سے تجھے رنجشِ بیجا بھی نہیں

فطرتِ حسن تو معلوم ہے تجھ کو ہمدم
چارہ ہی کیا ہے بجز صبر سو ہوتا بھی نہیں

دل کی گنتی نہ یگانوں میں نہ بیگانوں میں
مگر اس جلوہ گہِ ناز سے اٹھتا بھی نہیں

وعدہ کیا یاد دلائے کوئی اُس شوخ کو جو
صاف قائل بھی نہیں صاف مکرتا بھی نہیں

یوں تو ہنگامے اٹھاتے نہیں دیوانۂ عشق
مگر اے دوست کچھ ایسوں کا ٹھکانا بھی نہیں

دل نوازی کی ادائیں بھی دکھا دے دل کو
نگہِ ناز سے ہوتا کبھی اتنا بھی نہیں

نگہِ ناز کی نیت بھی نہیں کھلتی اور — دلِ بیمار کا معلوم ارادہ بھی نہیں

ہائے وہ عشق جسے صبر طلب کہتے ہیں — ہائے وہ دل جو سنبھالے سے سنبھلتا بھی نہیں

کتنے بے صبر ہیں ہم دل اُسے دینے کے لئے — نگہِ ناز کا کچھ ایسا تقاضا بھی نہیں

تجھ سے سنبھلیں تو سنبھال اپنے حجابِ بیباک — میں اٹھا تا حدِ آدابِ تماشا بھی نہیں

وہ طلسمِ چمن آرائیِ دل بھی لوٹ لے — وہ فریبِ خلشِ خارِ تمنا بھی نہیں

بیخودی ہوش نما ہوش تغافل آثار — ان نگاہوں نے کہیں کا مجھے رکھا بھی نہیں

عالم ایسا ہے خزاں میں بھی کہ جس سے بڑھ کر — شانِ رنگینیٔ حسنِ چمن آرا بھی نہیں

آج غفلت بھی اُن آنکھوں میں ہے پہلے سے سوا — اور دلِ ہجر نصیب آج شکیبا بھی نہیں

تو ہی ہستیٔ جہاں اور تو ہی یکتائے جہاں — یوں تو سب تجھ سے ہیں لیکن کوئی تجھ سا بھی نہیں

ارے صیاد ہمیں گل ہیں ہمیں بلبل ہیں — تو نے کچھ آہ سنا بھی نہیں دیکھا بھی نہیں

خیر انکار نہ ممکن ہو تو اقرار سہی — میں تو کچھ ذکرِ ستم اس لئے کرتا بھی نہیں

منہ سے ہم اُس کو بُرا تو نہیں کہتے کہ فراقؔ — ہے ترا دوست مگر آدمی اچھا بھی نہیں

فراقؔ (گورکھپوری)

سپاہی اور موت

پچیس سال کی خدمت کے دوران میں سپاہی کے خلاف اس کے افسروں کو کبھی شکایت کا موقع نہ ملا تھا اس نے اپنی خدمات بڑی تن دہی اور جانفشانی سے سرانجام دیں لیکن جب اس نے چاہا کہ ملازمت سے مستعفی ہو کر زندگی کے بقیہ ایام آرام سے گزارے تو افسرانِ بالا نے اس کی درخواست منظور نہ کی "میں خدا اور زار کی پورے پچاس سال خدمت بجا لایا ہوں اور اس دوران میں انہیں میرے متعلق کبھی شکایت کا موقع نہیں ملا مگر اب جب کہ میں چاہتا ہوں کہ چند دن آرام سے گزاروں تو انہوں نے میری درخواست مسترد کر دی ہے۔ اس سے یہی بہتر ہے کہ جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے بھاگ نکلوں"۔ یہ فیصلہ سپاہی نے بڑے سوچ بچار کے بعد کیا۔

چنانچہ وہ ایک دن بھاگ نکلا ـــــ تین دن کی بھاگم بھاگ کے بعد اُسے راستے میں خدا ملا۔

"کیوں میاں سپاہی؟ کہاں جا رہے ہو تم؟"

"میرے مالک! میں پورے پچاس سال ایمانداری سے اپنی خدمات بجا لایا ہوں۔ مگر اب وہ میرا استعفیٰ قبول نہیں کرتے اس لئے میں اُن سے بھاگ رہا ہوں"۔

جب تم نے پچیس سال تک اپنی خدمات نہایت ایمانداری سے سرانجام دی ہیں تو آؤ! تمہیں اجازت ہے کہ میری بادشاہت میں داخل ہو جاؤ ـــــ بہشت کے دروازے تم پر کھلے ہیں"۔

چنانچہ بہشت کے دروازے کھل گئے، سپاہی اندر داخل ہو گیا ـــــ بہشت کی لطیف فضا اور پرکیف منظر دیکھ کر دل میں کہنے لگا "زندگی اسی کا نام ہے"۔

باغوں میں ٹہلتا ٹہلتا فرشتوں کے پاس گیا اور کہنے لگا "کیا آپ مجھے تمباکو بیچنے والے کی دکان بتا سکتے ہیں؟"

"تمباکو؟ ـــــ میاں! تم اس وقت فوج میں نہیں ہو۔ یہ بہشت ہے۔ اس جگہ تمباکو کہاں؟"

سپاہی چپ ہو گیا۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد پھر اُن فرشتوں کے پاس گیا اور کہنے لگا "تو پھر یہی بتا دیجئے کہ شراب کہاں ملتی ہے؟"

"او خاکی پتلے! تیرا ابھی تک یہی خیال ہے کہ تو فوج میں ہے۔ بہشت میں شراب کہاں؟"

"یہ بہشت کس طرح ہو سکتا ہے جب یہاں شراب اور تمباکو ہی نہیں ملتے"۔

یہ کہہ کر وہ بہشت سے باہر چلا گیا۔ وہ ایسی جگہ رہنے کو تیار نہ تھا جہاں شراب اور تمباکو نہ ملے۔
زمین پر وہ بہت عرصے تک چلتا رہا۔ حتےٰ کہ اس کی خدا سے پھر ملاقات ہوگئی۔
"یہ بہشت کیسی جگہ ہے میرے خدا؟ جہاں تو نے مجھے بھیجا تھا وہاں تو تمباکو اور شراب ہی نہیں ملتی"۔
"بہت اچھا! ــــ تم اپنے داہنے ہاتھ کو چلے جاؤ تمہیں وہاں ہر ایک چیز مل جائے گی"۔
سپاہی اپنے داہنے ہاتھ کی طرف چل پڑا۔ راستہ میں اسے ایک بدروح ملی۔
"میاں سپاہی! کسے ڈھونڈ رہے ہو"؟
"پہلے مجھے کسی آرام کی جگہ لے چلو تاکہ اطمینان سے گفتگو ہو سکے"۔
چنانچہ سپاہی کو وہ ناپاک روح ایک گرم جگہ لے گئی۔
"سپاہی نے ناپاک روح سے دریافت کیا" آپ کے ہاں تمباکو ہے کیا؟
"ہے! میرے اچھے سپاہی"۔
"اور شراب بھی"
"شراب بھی"۔
"تو لاؤ! دونوں چیزیں لاؤ"۔
چشم زدن میں اس ناپاک روح نے دونوں چیزیں حاضر کر دیں۔
جب سپاہی کو دونوں چیزیں مل گئیں تو وہ بہت مسرور ہوا اور کہنے لگا "بہشت یہی ہے"۔ لیکن وہ گھومنے کے لئے باہر نکلا تو اُسے بہت سی ناپاک روحیں نظر پڑیں جن کی شکلیں دیکھ کر وہ بہت گھبرا گیا اور چند دنوں کے بعد اس قدر اداس ہوا کہ سوچنے لگا کیا کروں۔ اچانک ایک روز اس کے دماغ میں ایک عجیب خیال آیا ــــ لکڑی کا ایک گز بنا کر زمین ماپنے لگا۔ ایک شیطان دوڑتا ہوا آیا۔
"کیا کر رہے ہو؟ میاں سپاہی"!
"کیا اندھے ہو؟ دیکھ نہیں رہے کہ میں یہاں معبد بنانے لگا ہوں"۔
اس پر شیطان دوڑتا ہوا اپنے بوڑھے دادا کے پاس گیا اور چلا کر کہنے لگا "محترم دادا ہم تباہ ہو گئے۔ یہ انسان ہماری جگہ معبد بنانے لگا ہے"۔
بوڑھا شیطان غصہ سے تھر تھر کانپتا ہوا خدا کے حضور میں گیا اور کہنے لگا "خداوند! آپ نے ہمارے پاس کس قسم کا انسان بھیجا ہے جو ہماری بستی میں معبد بنانا چاہتا ہے"۔

"اس میں میرا کیا قصور ہے۔ تم نے ایسے انسان کو اپنی بستی میں داخل ہی کیوں کیا؟"

"خداوندا اس سپاہی کو کسی نہ کسی طرح بلا لیجئے۔"

"میں اُسے کس طرح بلالوں؟ وہ تو خود چاہتا تھا کہ تمہارے پاس جائے۔"

بوڑھے شیطان نے روتے ہوئے کہا "آہ! اب ہم ناچیز کیا تدبیر عمل میں لائیں"۔

خدا نے بارعب انداز میں کہا "جاؤ کسی نوجوان شیطان کی کھال اتار کر اس کا ڈھول بناؤ۔۔۔ اس ڈھول کی آواز ہی سے سپاہی یہاں سے دور ہوسکتا ہے۔"

بوڑھے شیطان نے آتے ہی ایک نوجوان شیطان کو پکڑا اور اس کی کھال اتار کر ایک ڈھول پر منڈھ لی۔ سب کچھ تیار کرکے اس نے تمام شیطانوں کو جمع کیا اور کہا "دیکھو! جونہی یہ سپاہی اس جگہ سے بھاگے تم تمام دروازے بند کرلو تاکہ پھر یہاں نہ آسکے"۔

یہ کہہ کر اس نے ڈھول پر ضربیں لگانی شروع کیں۔ ڈھول کی آواز سنتے ہی سپاہی اس جگہ سے یوں اٹھ بھاگا۔ گویا پاگل ہوگیا ہے۔ جونہی وہ دروازہ سے باہر نکلا۔ شیطانوں نے تمام دروازے بند کرلئے سپاہی نے جب دیکھا کہ دروازہ بند ہے تو اس نے دستک دینی شروع کی اور چلا چلا کر کہنا شروع کیا "دروازہ کھول دو ورنہ دیوار پھوڑ کر اندر آجاؤں گا"

شیطانوں نے جواب دیا "تم ایسا نہیں کرسکتے میرے بھائی! ہم تم سے کہیں زیادہ طاقتور ہیں"۔

جب سپاہی نے دیکھا کہ اب اس کا بس نہیں چلتا تو سر لٹکا کر پھر زمین پر چلنا شروع کردیا۔ دو تین روز کی آوارہ گردی کے بعد اسے پھر خدا ملا۔

"میاں سپاہی! کہاں جا رہے ہو"۔

"مجھے خود علم نہیں"۔

"تو بتاؤ کہاں جانا چاہتے ہو۔۔۔ بہشت میں بھیجا تو وہ جگہ تمہیں پسند نہ آئی۔ دوزخ میں گئے تو وہاں تم رہ نہ سکے۔ اب کہاں جانے کی خواہش ہے؟"

"میرے خدا۔۔۔ مجھے اپنے دربار کا محافظ بنالو۔"

"بہت اچھا"۔

چنانچہ خدا نے اُسے اپنے محل کے دروازے پر کھڑا کردیا اور حکم دیا "خیال رہے کوئی شخص اندر نہ آنے پائے"۔

"بوڑھے سپاہی کو آپ کیا سکھاتے ہیں؟ میں آپ کا حکم بجالاؤں گا"۔

سپاہی بہت عرصے تک دروازہ پر پہرہ دیتا رہا اور کسی کو اندر نہ جانے دیا۔ تھوڑی دیر گزرنے پر موت آئی۔

"کون گزر رہا ہے؟" سپاہی نے کڑک کر پوچھا"۔

"موت"۔
"کس کے پاس جا رہی ہو؟"
"خدا کے پاس"۔
"کس لئے؟"
"حکم لینے کے لئے کہ اب کس کس کی جان قبض کروں"۔
"تھوڑی دیر کے لئے ٹھہرو ــ میں خدا سے اجازت لے آؤں"۔
"خداوندا موت دروازے پر کھڑی آپ کے احکام کی منتظر ہے"۔
"جاؤ اس سے کہہ دو کہ آئندہ تین سال تک وہ بوڑھے انسانوں کو ہلاک کرتی رہے"۔

سپاہی نے خیال کیا اس طرح تو میرے بوڑھے والدین بھی مرجائیں گے۔ اس لئے موت کے پاس آ کر کہنے لگا۔ خدا نے تمہیں حکم دیا ہے کہ جنگلوں میں جاکر تین سال تک پرانے اور بوڑھے درختوں کو اکھیڑتی رہو"۔

موت یہ حکم سن کر بہت پریشان ہوئی اور کہنے لگی "خداوند مجھ سے ناراض ہیں جو مجھے ایسی سزا دے رہے ہیں"۔

یہ کہہ کر "موت" جنگلوں میں چلی گئی اور تین سال تک سالخوردہ درختوں کو ہلاک کرتی رہی۔ تین سال کے بعد تھکی ہوئی پھر خدا کے حضور میں نئے احکام لینے کے لئے آئی۔

سپاہی نے موت سے دریافت کیا "تم پھر کیوں آگئی ہو؟"
"خداوند سے احکام لینے کے لئے"۔
"تو تھوڑی دیر انتظار کرو میں خدا سے دریافت کر کے ابھی آتا ہوں"۔

چنانچہ سپاہی خدا کے حضور میں گیا اور مودبانہ پوچھا "حضور موت نئے احکام لینے کی خاطر دروازے پر کھڑی ہے"۔

"جاؤ اس سے کہہ دو کہ تین سال تک وہ نوجوانوں کو ہلاک کرے"۔

سپاہی نے سوچا کہ اس طرح تو میرے تین بھائی بھی مرجائیں گے۔ اس لئے موت کے پاس آیا اور کہنے لگا "خدا نے تمہیں حکم دیا ہے کہ جنگلوں میں جاکر تین سال تک جوان درختوں کو ہلاک کرتی رہو"۔

یہ سن کر "موت" رو پڑی اور کہنے لگی "میں نے کونسا ایسا گناہ کیا ہے جو خدا مجھے ایسی سزا دے رہا ہے"۔

یہ کہہ کر وہ پھر جنگلوں میں چلی گئی اور تین سال تک جوان اور سرسبز درختوں کو اکھیڑتی رہی۔ تین سال کے بعد اپنے آپ کو بمشکل گھسیٹتی ہوئی خدا کے حضور میں نئے احکام لینے کی خاطر آئی۔

سپاہی نے اس سے دریافت کیا "کہاں جا رہی ہو تم؟"

"خدا کے پاس — دریافت کرنے کہ اب کن اشخاص کو ہلاک کروں۔"

"تھوڑی دیر ٹھہرو مجھے اجازت لے آنے دو۔"

چنانچہ وہ ایک دفعہ پھر خدا کے پاس گیا اور کہنے لگا "خداوند موت پھر نئے احکام لینے کی خاطر حاضرِ خدمت ہوئی ہے۔"

"جاؤ اس سے کہہ دو کہ وہ تین سال تک خرد سال بچوں کو ہلاک کرتی رہے۔"

سپاہی نے دل میں سوچا کہ میرے بھائی کے تین بچے ہیں۔ اس طرح تو وہ بھی ہلاک ہو جائیں گے اس لئے موت کے پاس آیا اور کہا "خدا نے تمہیں حکم دیا ہے کہ جنگلوں میں پھر واپس جاؤ اور تین سال تک چھوٹے پودوں کو ہلاک کرتی رہو۔"

موت رو پڑی اور کہنے لگی "میں نے کونسا ایسا گناہ کیا ہے جس کی سزا بھگت رہی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ جنگلوں میں چلی گئی اور تین سال تک چھوٹے پودوں کو ہلاک کرتی رہی۔ تین سال کے بعد لنگڑاتی ہوئی خدا کے حضور میں آئی اور دل میں عہد کر لیا کہ خواہ کچھ بھی ہو میں اس دفعہ خود خدا کے پاس جاؤں گی اور دریافت کروں گی کہ مجھے کیوں نو سال تک اتنی سزا دی گئی؟

سپاہی نے موت کو سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے دیکھا تو کہنے لگا "کہاں جا رہی ہو"؟

موت نے کچھ جواب نہ دیا اور سیڑھیوں پر چڑھتی گئی۔ جب سپاہی نے دیکھا کہ موت کچھ جواب نہیں دیتی تو اس نے موت کو گردن سے پکڑ لیا اور خدا کے دربار میں نہ جانے دیا۔ اس پر موت بہت چیخی چلائی — اُدھر سپاہی نے بھی خوب شور مچایا۔ خدا نے جب یہ شور سنا تو باہر آگیا اور پوچھنے لگا "یہ کیا شور مچا رکھا ہے"؟

خداوند! آپ مجھ سے اس قدر ناراض کیوں ہیں؟ میں پورے نو سال تک جنگلوں میں سر ٹپکتی رہی ہوں۔ تین سال تک سالخوردہ درختوں کو اکھیڑتی رہی۔ تین سال تک جوان اور سرسبز درختوں کو ہلاک کرتی رہی اور تین سال تک پودوں کو ضائع کرتی رہی۔ آخر یہ کس گناہ کی پاداش میں؟"

یہ سن کر خدا نے سپاہی کی طرف غضبناک نگاہوں سے دیکھا اور کہا "یہ سب شرارت تمہاری معلوم ہوتی ہے۔"

سپاہی نے تھرتھراتے ہوئے جواب دیا "میں معافی چاہتا ہوں۔"

"تمہیں سزا دی جاتی ہے کہ موت کو نو سال تک اپنے کندھوں پر اٹھائے پھرو۔"

حکم ملنا تھا کہ موت سپاہی کے کندھوں پر چڑھ بیٹھی اور سپاہی اسے اٹھائے ہوئے چل پڑا۔ وہ بہت عرصہ تک موت کو اسی طرح اٹھائے چلتا رہا مگر آخر کار تھک کر چور ہو گیا اور جیب سے تماکو کی ڈبیا نکال کر سونگھنے لگا۔

جب موت نے دیکھا کہ سپاہی کچھ سونگھ رہا ہے تو حیران ہو کر کہنے لگی "میاں سپاہی! یہ کیا سونگھ رہے ہو — مجھے بھی دو!"

"کندھوں سے نیچے اتر آؤ اور ڈبیا میں بیٹھ کر جتنا عرصہ چاہو سوتھو۔"

"اچھا! ڈبیا کا ڈھکنا کھول دو۔"

سپاہی نے ڈبیا کا ڈھکنا کھول دیا اور جونہی موت ڈبیا میں آئی جھٹ سے ڈبیا بند کر اُسے اپنے بوٹ میں رکھ لیا۔ اس کے بعد وہ پھر خدا کے دربار میں گیا اور اپنی پرانی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔

جب خدا نے اسے دیکھا تو حیران ہو کر پوچھا "ارے! موت کہاں رکھی تم نے؟"

"میرے پاس ہے۔ میرے مالک!"

"تمہارے پاس؟"

"جی ہاں۔ اس وقت میرے بوٹ میں ہے۔"

"دکھاؤ تو؟"

"نہیں جی! میں نہیں دکھانے کا۔ اُسے نو سال تک وہیں نیند رہنا چاہیئے۔ نو سال تک موت کو اپنے کندھوں پر اٹھائے رکھنا کوئی مذاق نہیں ـــ وہیں رہنے دیجئے اسے۔"

"تم اسے باہر نکالو ـــ میں نے تمہیں معاف کر دیا۔"

چنانچہ سپاہی نے اپنے بوٹ کے تسمے کھولے اور نسوار کی ڈبیا نکال کر اس کا ڈھکنا کھول دیا۔ ڈھکنے کا کھلنا تھا کہ موت ایک کر اس کے کندھوں پر چڑھ بیٹھی۔

"خدا نے موت سے مخاطب ہو کر کہا" تم میں اتنی عقل نہ تھی کہ میرا حکم بجا لاسکو۔ اس لئے اب کندھوں سے اتر آؤ۔"

موت کندھوں سے اتر آئی

"اب تمہیں حکم دیا جاتا ہے کہ اس سپاہی کی روح قبض کر لو۔"

"لومیاں سپاہی! اب مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔"

"جلدی کاہے کی ہے۔ مرنا تو آخر ہے ہی لیکن پہلے مجھے اس وقت کے لئے تیار تو ہو لینے دیجئے۔"

"اچھا!"

چنانچہ سپاہی ایک سفید کفن اوڑھ کر تابوت میں لیٹ گیا۔

موت نے سپاہی سے دریافت کیا "اب تیار ہو گیا؟"

"بالکل۔"

"اب اچھی طرح تابوت میں لیٹ جاؤ"۔

سپاہی پیٹ کے بل تابوت میں لیٹ گیا۔

"یہ کس طرح لیٹ رہے ہو تم؟"

"تو پھر کس طرح؟"

"یہ بھی بھلا کوئی لیٹنے کا طریقہ ہے۔ اس حالت میں مرنا تمہارے لئے درست نہ ہوگا۔" سپاہی پہلو کے بل لیٹ گیا۔

"آہ میرے خدا! کیسے بے وقوف انسان سے پالا پڑا ہے! کیا تم نے کبھی مردوں کو تابوت میں لیٹے ہوئے نہیں دیکھا؟ نکلو باہر میں تمہیں طریقہ بتاؤں"۔

سپاہی تابوت سے باہر نکل آیا اور موت اس کو طریقہ بتانے کے لئے تابوت میں لیٹ گئی اس کا لیٹنا تھا کہ سپاہی نے تابوت کا ڈھکنا بند کر دیا اور اس پر مضبوطی سے کیلیں جڑ دیں۔ اس طرح موت کو تابوت میں قید کر کے سپاہی نے تابوت کو اٹھایا اور دریا برد کر دیا۔ دریا برد کرنے کے بعد اس نے پھر خدا کے دربار پر پہرہ دینا شروع کر دیا۔ جب خدا نے اُسے دیکھا تو حیران ہو کر پوچھا۔ "موت کہاں ہے؟"

"میں نے اُسے دریا کے سپرد کر دیا ہے۔ میرے مالک!"

خدا نے نظر دوڑائی تو موت کو دریا میں بہتے ہوئے دیکھا۔ اُسے دریا سے نکال کر غضبناک لہجہ میں پوچھا "میں نے جو تمہیں حکم دیا تھا کہ اس سپاہی کو ہلاک کر دو"۔

"میرے مالک! یہ سپاہی بہت مکار ہے۔ میرا اس کے آگے کچھ بس نہیں چلتا"۔

"دیکھو اب اس کے جھانسے میں نہ آنا۔ تمہیں حکم دیا جاتا ہے کہ اب اس کو فوراً ہلاک کر دو"۔

بعض کہتے ہیں کہ موت نے سپاہی کو ہلاک کر دیا۔ لیکن بعض خیال کرتے ہیں کہ سپاہی نے موت کو پھر دھوکا دے دیا معلوم نہیں اب وہ زندہ ہے یا مر چکا ہے۔

سعادت حسن

تخیلات

......سے!

آہ! پھر یہ دبی ہوئی چنگاری کیوں بھڑک رہی ہے؟
زخم بھرتے بھرتے کیوں ہرا ہو رہا ہے؟
پھر کسی کی تصویر آنکھوں میں آ کر دماغ پر کیوں چھائی جا رہی ہے؟
درد' کسک ہو کر پھر کروٹ لینا کیوں چاہ رہا ہے؟
دن پھر وقفِ اضطراب ہونا کیوں چاہتے ہیں؟
راتیں نیند سے پھر کیوں بے نیاز ہونے کی خواہش مند ہیں؟
دل پھر کیوں دھڑکنا چاہتا ہے؟
اس ویرانہ میں پھر شوریدہ سروں کی مجلس کیوں قائم ہونے والی ہے؟
اب جبکہ تمنائیں خون ہو چکیں' آرزوؤں کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا' مرادیں ناکام ہو چکیں' پھر یہ سب ایک دم کیوں بیدار ہو جانا چاہتے ہیں؟

آہ! جب تمہیں مجھ سے اس قدر نفرت ہے! احتراز ہے! جب تمہاری بزمِ خیال تک میری یاد سے خالی ہو چکی' اور تم نے میری ہستی کو اپنی زندگی کے راستے سے بالکل علیحدہ کر دیا! تو پھر...میں کیوں... تمہیں بھول جانے کی کوشش میں ناکام ہو رہا ہوں؟

کیا اس لئے کہ باوجود ترکِ محبت کے عہد کے...میں نے ——میری آنکھوں نے—— آج پھر تمہیں نظر بھر کے اسی طرح ڈرتے ڈرتے دیکھ لیا جیسے گزشتہ سال کے "ایک دن" کو! ——"ہاں" اس دن "جو میری زندگی میں ایک انقلاب لانے والا دن تھا!؟

آہ! میرے معبود' تو کیا وہی سب کچھ دوبارہ ہونے والا ہے جو ایک مرتبہ ہو چکا ہے—نیند سے بے نیاز راتیں! آنسوؤں میں بھیگے ہوئے تکیے!!...اُف! میرے مالک!!!

میں تمہیں جانے نہ دوں گا

میں تمہیں جانے نہ دوں گا!
کیا ہماری اتنے دنوں کی محبت اس طرح ختم ہو جائیگی؟
اس طرح صرف ایک بوسے میں!

اگر آفتاب نے ہمیں اس طرح نہ دیکھا ہوتا!
اگر اس نے ہماری شکایتیں رات کو اتنا جلد ختم کر دینے کی
—ہماری آرزوئیں وقت کے اتنا جلد نہ ختم ہونے کی نہ سنی ہوتیں!
تو میں تمہیں جانے دیتا!

اب میں تمہیں جانے نہ دوں گا!
کیونکہ ستاروں نے اپنی لاتعداد آنکھوں سے،
نیلے آسمان کے نیچے!
ہمیں دیکھا ہے!

میں تمہیں جانے نہ دونگا!
کیونکہ مجھے یاد ہیں وہ شکائتیں!
جو ہم چاند سے کیا کرتے تھے!
اس کے کبھی دیر سے طلوع ہونے،
اور کبھی جلد ہی غروب ہو جانے پر!

میں تمہیں جانے نہ دوں گا!
کیونکہ باغ میں بہت سی کلیاں ابھی منتظر ہیں۔
کہ پھول ہونے سے قبل ہی انہیں توڑ کر
میں ہار بنا کر تمہارے گلے میں ڈالوں!

میں تمہیں ہیں جانے نہ دوں گا!
تمہیں روکنے کے بہت سے طریقے مجھے یاد ہیں!
تم خدا حافظ کہنے آؤ!
میں تمہارے ہاتھ پکڑ لوں گا!
اور تمہیں جانے نہ دوں گا!

(ماخوذ)

رخصت

یہ جان کر بھی کہ تمہیں مجھ سے نفرت ہے میرے دل میں تمہاری محبت کی آگ ابھی تک کیوں سلگ رہی ہے۔ مجھے جلا رہی ہے۔ اس یکجائی کے بعد جس سے جدائی بھی شرمندہ ہے' ایسی زندگی کے بعد جس میں تم مجھ سے بالکل الگ تھلگ تھیں' تمہاری دنیا میری دنیا سے یکسر علیحدہ' سلسلۂ گفتگو منقطع! آہ ایسی زندگی کے بعد جس میں ہم تم اس قدر نزدیک ہو کر بھی اتنے دور تھے! یہ سن کر کہ تم جا رہی ہو میں کیوں اس قدر پریشان ہُوا جا رہا ہوں؟ دل کیوں بے اختیار بھرا آ رہا ہے؟ آنکھیں کیوں رونے کو بیتاب ہو رہی ہیں؟ اس وقت جبکہ تم جانے کی طیاریوں میں خوش خوش مصروف ہو' میں اپنے کمرے میں چپ چاپ بیٹھا رو رہا ہوں! تم اس جدائی پر مسرور ہو۔ پر آہ' میں بیچارہ آنسو نہ بہاؤں تو کیا کروں؟ کہ

بہر تو صد بجائے من' بگیت مرا بجائے تو؟

شمیم کے نام!

شمیم پیاری! جانتی ہو تمہارا "دیوانہ بھائی" کہاں ہے؟ مجھے ڈر ہے کہیں تم گھبرا کر چیخ نہ پڑو! ہاں شمیم سچ کہتا ہوں بالکل ایسی ہی جگہ ہے! نہ تو خوشبودار نازک نازک پھول یہاں ہیں جنہیں تم اپنے "بھائی جان" کو چڑانے کے لئے توڑ سکو! جن کی پنکھڑی پنکھڑی جدا کر کے پھینک سکو! آہ! بیچارے پھول!! اور ننھی ننھی حسین تتلیاں ہیں جنہیں میری آرزومند التجاؤں کے باوجود تم پکڑ کر مسل سکو! جن کے رنگین پروں سے اپنے پیارے ہاتھ خوشنما بنا سکو! آہ! بیچاری تتلیاں!! اور اچھے اچھے گانے والے پرندے بھی نہیں جنہیں تم کنکر مار مار کر اڑا سکو۔

کہ مجھے اپنے کمبخت فردوسی نغموں سے بیخود نہ بنا دیں! ہاں میری شمیم! یہاں کچھ بھی نہیں! بالکل ویرانہ، ایک دم سنسان! لیکن ہم شاعروں کے لئے شمیم، یہ ویرانی یہ سناٹا، یہ خاموشی بھی اپنے اندر بہت کچھ رکھتی ہے اتنا کہ تمہارے بھائی نے تمہارا دماغ خراب کرنے کو بہت سے خرافات جمع کر لئے ہیں! شام کے وقت رخصت ہوتے ہوئے آفتاب کی مضمحل مسکراہٹ سے سارے آسمان پر ایک مایوس سرخی کا پھیل جانا ـــــ مجھے بے اختیار اپنا وہ تبسم یاد آجاتا ہے جس کے ساتھ رخصت ہوتے وقت میرے ہونٹوں نے تمہاری پیشانی کو چوما تھا! رات کو چمکیلے تاروں کا، ان لاتعداد منور دنیاؤں کا اپنی مقررہ راہ پر چپ چاپ گامزن ہونا!! ـــــ قوت خیال کو کس قدر ابھار دیتا ہے!! ماہتاب کا "ساحر شب" کا نیلے آسمان پر چمکنا، اس کی خنک سفید کرنوں کا گھاس کی پتیوں اور شاخوں پر ناچنا! ـــــ دل کی دھڑکن کس قدر تیز کر دیتا ہے!!! صبح کی مدھم بڑھتی ہوئی روشنی میں مکڑی کے جالوں پر شبنم کے قطروں کا طرح طرح کے رنگوں میں عکس ریز ہونا! ـــــ لیکن ان سب کے باوجود بھی کیا میری شمیم میرے دماغ سے محو ہے؟ کیا تم ایسا خیال کر سکتی ہو؟ تم جو شاعر کی خیالی دنیا میں بھی موجود ہو بھلائی جا سکتی ہو؟ آہ! تم کیا جانو پیاری بہن کہ تمہارا دیوانہ شاعر بھائی تمہاری "شرارتوں" کے باوجود بھی تمہیں کتنا چاہتا ہے! کس قدر پیار کرتا ہے! تمہاری محبت میں چمکنے والی آنکھوں کو کتنا یاد کرتا ہے!

تمہارا بھائی

تمنائی

دوست سے خطاب

تو اگر میرے ان محبت بھرے جذبات کو سن لے تو سمجھ جا کہ یہ سچے جذبات، یا سے پاک اور حقیقت سے لبریز ہیں!

اب جبکہ تو مجھ سے دور ہے تو کیا تو یہ سمجھ رہا ہے کہ میں اُن خوشگوار ایام کو بھول گیا جو ہماری محبت بھری داستانوں کو اپنی آغوش میں چھپا لیتے تھے!! کل ہی کی بات ہے جب میں غروب آفتاب کا نظارہ کر رہا تھا تو مجھے ایسا معلوم ہوا گویا کہ تو شفق کی سرخیوں میں کھڑا ہوا مجھے اشاروں ہی اشاروں میں بلا رہا ہے۔

آہ! اُن خوشگوار ایام میں جب ماہتاب کی روپہلی روشنی مرغزاروں پر رقص کرتی تھی اور جب کھجور کے درخت بے ساختہ کھلکھلا اٹھتے تھے تو کیا ہمارے سچے دوستانہ تعلقات کی مقناطیسی کشش ایک دوسرے کو ابدی ملاپ کا پیغام نہ دیتی تھی؟

دوست! آہ! زمانہ کبھی یکساں نہیں رہتا جب تجھ سے دوستی کی ابتدا ہوئی اور جب وہ ابتدا انتہا کو پہنچی تو ہم نے قسم کھائی تھی ـــــ چاند، تاروں اور آسمانوں کی کہ کبھی جدا نہ ہوں گے۔ گو تو مجھ سے بچھڑ گیا لیکن میں اب بھی اسی عہد پر قائم ہوں اور . . . . . . رہوں گا۔

منیر الدین حیدرآبادی

التجائے محبت

تجھے صبر و قرار جیسی بیش بہا نعمت حاصل ہے لیکن مجھ بدنصیب کے ضبط کا پیمانہ اب لبریز ہو چکا ہے۔

میں ڈرتا ہوں کہ وہ راز جو ہر سوالی کے بعد بھی راز ہی ہا (؟) افشا نہ ہو جائے کیونکہ اخفا کی طاقت اب مجھے جواب دے رہی ہے۔

تجھے صبر و قرار کی نعمت حاصل ہے، اے میرے پیارے دوست ہیں لیکن میں ان دنیا میں ایک غریب الوطن جیسا ہوں میں بیکس وہ حوصلہ کہاں سے لاؤں۔

میری قسمت کے مالک! کیا میری تمنائیں حسرتوں ہی میں تبدیل ہوتی رہیں گی۔

اس دنیا میں میرے سوال کا جواب تیرے سوا کوئی نہیں دے سکتا۔

آہ! تو بھی نہیں دے سکتا۔

محمد یعقوب

راز

(لیفکاڈیو ہرن کی ایک جاپانی کہانی)

مدت گزری جاپان کے کسی صوبے میں ایک امیر سوداگر رہتا تھا۔ اس سوداگر کی اکلوتی بیٹی اوسونو بہت ذہین اور خوبصورت تھی۔ سوداگر نے سوچا اگر اس کو صرف گھر ہی پر پڑھایا گیا اور یہ اعلیٰ تعلیم سے محروم رہ گئی تو اس پر بڑا ظلم ہوگا۔ چنانچہ اس نے کچھ قابلِ اعتبار ملازم ساتھ دے کر لڑکی کو کیوٹو بھیج دیا تاکہ وہ دارالسلطنت کی پڑھی لکھی اور شائستہ خواتین کے سے آداب سیکھ سکے۔ جب وہ تعلیم سے فارغ ہوگئی تو اُس کے باپ نے اسے اپنے ایک دوست کے بیٹے سے بیاہ دیا اور شادی کے بعد چار سال تک وہ اپنے شوہر کے ساتھ ہنسی خوشی رہی۔ اُن کا ایک بیٹا بھی تھا لیکن افسوس کہ آخر وہ بیمار ہو کر مرگئی۔ ابھی شادی کو چوتھا سال بھی پورا نہ ہوا تھا۔

اوسونو کا جنازہ اٹھنے کے بعد کی رات اُس کے بیٹے نے کہا "میں نے اماں کو دیکھا ہے۔ وہ پھر آگئی ہیں۔ اوپر کمرے میں ہیں۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی تھیں لیکن مجھ سے بولتی نہ تھیں۔ اس لئے میں ڈر گیا اور نیچے بھاگ آیا۔" پھر گھر کے کچھ لوگ اوپر اوسونو کے کمرے میں گئے اور یہ دیکھ کر ہکا بکا سے رہ گئے کہ دیوی کی مورتی کے پاس جہاں ایک چھوٹا سا دیا جل رہا تھا اوسونو کی صورت نظر آ رہی ہے۔ وہ ایک الماری کے سامنے جس میں ابھی تک اس کے کپڑے اور زیور پڑے تھے کھڑی معلوم ہوتی تھی۔ اس کا سر اور شانے صاف دکھائی دیتے تھے لیکن کمر سے نیچے کا دھڑ مدھم ہوتا ہوا نظر سے غائب ہو گیا تھا۔ یوں معلوم ہوتا کہ یہ اُس کا ایک نامکمل سا عکس ہے۔ ایسا شفاف جیسے پانی پر سایہ۔

لوگوں نے یہ دیکھا تو ڈر کر کمرے سے نکل گئے۔ نیچے جا کر انہوں نے آپس میں مشورہ کیا۔ اوسونو کی ساس بولی "عورتوں کو اپنی چھوٹی چھوٹی چیزوں سے بڑا پیار ہوتا ہے اور اوسونو تو اپنی چیزوں پر جان دیتی تھی۔ میں تو کہتی ہوں وہ انہیں چیزوں کو دیکھنے کے لئے آتی ہے۔ ہمیں نے سنا ہے جب تک چیزیں مندر کو نہ بھیج دی جائیں بہت سے مُردے اسی طرح آتے رہتے ہیں۔ اگر ہم اوسونو کے کپڑے اور زیور مندر پر چڑھا دیں تو میں سمجھتی ہوں اس کی روح کو اطمینان مل جائے گا۔"

آخر یہی طے ہوا کہ جہاں تک جلد ہو سکے اس مشورے پر عمل کرنا چاہیئے۔ دوسرے دن صبح ہی صبح الماری خالی کر دی گئی اور زیور اور کپڑے تمام مندر میں پہنچا دیئے گئے لیکن رات کو وہ پھر آئی اور پہلے کی طرح الماری کی طرف دیکھنے لگی۔ اسی طرح دوسری رات کو آئی اور پھر تیسری رات کو اور ہر رات لگاتار آتی ہی رہی اور مکان ایک آسیبی مکان بن گیا۔

اب اوسونو کی ساس مندر میں گئی اور پروہت کو ساری بات بتا کر اُس سے مذہبی مشورے کی طالب ہوئی۔ پروہت بولا۔

"الماری کے بھیتر باہر، ادھر اُدھر کہیں کوئی ایسی وستو پڑی ہوگی جس کے لئے اس کی آتما بیاکل ہے"۔
بڑھیا نے کہا "مگر ہم تو الماری پوری کی پوری خالی کر چکے ہیں۔ اُس میں تو اب کچھ بھی نہیں"۔
پروہت نے دوبارہ کچھ سوچ کر کہا "اچھا تم سنتوکھ سے بیٹھو اور کچھ سنکلپ کرو۔ میں آج رات تمہارے گھر آکر سب سنکٹ میٹ دوں گا۔

سورج کے ڈوبتے ہی پروہت اس مکان پر پہنچ گیا۔ کمرہ بالکل خالی تھا۔ پروہت وہاں اکیلا بیٹھ کر کچھ دھرم منتر پڑھتا رہا۔ آدھی رات گئے تک اُسے کچھ نظر نہ آیا۔ اس کے بعد یکایک الماری کے سامنے ادسونوکی مورت دکھائی دی۔ اس کی نظر الماری پر جمی ہوئی تھی اور چہرے سے کچھ تشویش سی ٹپکتی تھی۔ پروہت نے فوراً وہ پوتر منتر پڑھنا شروع کیا، جو ایسے موقعوں پر پڑھا جاتا ہے اور پھر ادسونو کی روح سے مخاطب ہو کر بولا "میں یہاں تمہاری سہائتا کو آیا ہوں۔ میں تو جانوں اس الماری میں کوئی وستو ہے جس کے لئے تمہیں چنتا ہے۔ کہو تو میں اسے تمہارے لئے ڈھونڈ نکالوں"۔ یوں معلوم ہوا کہ روح نے سر ایک ہلکے اشارے سے اِس پر اپنی رضامندی ظاہر کی ہے۔ پروہت نے اٹھ کر اوپر کی دراز کھولی لیکن یہ بالکل خالی پڑی تھی۔ پھر اس کے بعد دیگرے دوسری تیسری اور چوتھی دراز کھولی اور درازوں کے نیچے اور ان کے پیچھے اچھی طرح دیکھا بھالا۔ اس نے الماری کے اندرونی حصے کا بھی بغور معائنہ کیا لیکن اسے کچھ نہ ملا۔ لڑکی کی روح اب بھی پہلے ہی کی طرح دلگیر کھڑی نظر آتی تھی۔ پروہت حیران تھا کہ یہ چاہتی کیا ہے؟ یک بیک اُسے خیال آیا کہ درازوں کے اندر استر کے طور پر جو کاغذ لگا ہے اس کے نیچے کوئی چیز چھپی پڑی نہ ہو۔ چنانچہ اُس نے پہلے ایک دراز کا استر نکال کر دیکھا۔ لیکن اسے کچھ نہ ملا۔ اس کے بعد اس نے دوسری اور تیسری دراز کا استر نکال کر دیکھا لیکن اب بھی اُسے کچھ نہ ملا۔ آخر کار سب سے نچلی دراز کے استر کے نیچے سے اُسے معطاوبہ چیز مل گئی ——
ایک خط۔ اس پر پروہت نے روح سے مخاطب ہو کر کہا "کیا اسی کے لئے اتنے دنوں سے تم دکھ بھوگ رہی تھیں؟" لڑکی کے عکس کا رخ اُس کی طرف پھر گیا اور اس کی کمزور نظر خط پر جم گئی۔ پروہت بولا "کہو تو میں اسے آگ دکھا دوں"۔ لڑکی نے سر جھکا کر اپنی مرضی ظاہر کی۔ پروہت نے کہا "میں تمہیں بچن دیتا ہوں کہ مندر جا کر آج ہی گجر کو میں یہ پتر آگ میں جھونک دوں گا۔ میں تو اسے پڑھ لوں گا مگر میری یہ پرتگیا ہے کہ دوسری کوئی آنکھ اس پر نہ پڑے گی"۔ روح مسکرا کر غائب ہو گئی۔

جب پروہت نیچے اترا پَو پھٹنے کے قریب تھی، چونکہ اس نے گھر والوں کو کمرے میں آنے کی ممانعت کر رکھی تھی، اس لئے سب بے صبری سے نیچے منتظر کھڑے تھے۔ پروہت نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا "اب نچنت رہو۔ آتما پھر پرگھٹ نہ ہوگی"

اور واقعی روح دوبارہ نمودار نہ ہوئی۔

خط جلا دیا گیا۔ یہ ایک نامۂ الفت تھا جو اوسونو کے نام اُن دنوں لکھا گیا تھا جب وہ کیوٹو میں تعلیم پا رہی تھی۔ خط کے مضمون سے پرد ہت کے سوا اور کوئی فردِ بشر واقف نہ ہُوا اور اُس کے مرنے پر یہ راز بھی اس کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔

حامد علی خاں

ہر شخص دوسروں کے لئے ایک سربستہ راز ہے

کتنے ہی راز کھل جانے پر بھی راز ہی رہتے ہیں۔

محبت سے ماورئی بھی ایک محبت ہے۔

ظاہری تعلقات باطنی تعلق کی ایک ہلکی سی جھلک بھی نہیں دکھا سکتے۔

میں چپ ہوں تاکہ تم میری باتیں سنو۔ میں چھپا ہوں تاکہ تم مجھے ڈھونڈو۔ میں گم ہوں تاکہ تم مجھے پالو۔

غیر معروف شاعر کی دعا

کل رات ایک ایسے جذبے سے متاثر ہو کر جس کو میں خود سمجھنے سے قاصر ہوں میں نے اپنے کمرے کے سب دروازے کھول دیئے حالانکہ سردی معمول سے زیادہ تھی اور یخ بستہ ہوا کا طوفان زوروں پر تھا۔

باہر سب چیزوں کو جنہیں میں بے جان سمجھتا تھا حد درجہ جوش میں دیکھ کر میں اپنے جمود پر بہت نادم ہُوا میں نے مستعار روشنی سے اپنا طاق ٹٹولا اور مدتوں کی گرد جھاڑ کر ساز کے تاروں کو چھیڑنا شروع کیا:۔

"سڑک کے کنارے ایک غریب کمہار مٹی کے معمولی پیالے لئے بیٹھا تھا۔ شاید چاہتا تھا کہ ان کو فروخت کرے

"ایک پری وش نازنین خرید و فروخت میں مشغول اُدھر سے گزری۔ اس نے کمہار اور اس کی چیزوں پر ایک مختصر سی نگاہ ڈالی۔

"حقارت آمیز مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیلی اور وہ چلی گئی۔

"صدیاں بیت گئیں۔ انہیں نہ بکنے والے پیالوں میں سے ایک پیالہ زمین کی نامعلوم گہرائیوں میں چھپا رہا۔ وقت نے اُس کی وقعت بڑھا دی۔ آج وہی مٹی کا پیالہ ایک بادشاہ کے طاق کی زینت ہے۔

"جب کبھی وہ لوگ جو عالم کہلاتے ہیں میرے سادہ گیت دیکھ پاتے ہیں تو بے اختیار مجھ پر ہنس دیتے ہیں۔ تو ان گیتوں کو اپنی خاکِ پا سے چھو کر شرفِ قبولیت بخش کہ یہ بھی انمول بن جائیں۔"

محمود علی شاہ

محفلِ ادب

شاعر کا عزم

محبت سے تجھے میں زندۂ جاوید کر دوں گا — میں خود ذرّہ سہی لیکن تجھے خورشید کر دوں گا

تری ہر شام کو عشرت کی رنگینی سے بھر دوں گا — تری ہر صبح کو میں عیش کی تمہید کر دوں گا

مرا ناکام دل ہر چند ہے حسرت کا گہوارہ — ترے دل کو حریفِ لذّتِ امید کر دوں گا

میں خود مٹ جاؤں گا لیکن تری دنیا بساؤں گا — ستاروں اور پھولوں سے نئی جنت بناؤں گا

"نخلستان"

آزاد محبّت

محبت کی راہ میں سب کچھ دے دو

دل جو کچھ کہتا ہے وہ مانو

دوست، احباب، ایام

دنیا کی قیمتی چیزیں، اپنا نیک نام، ارادے اور دنیوی اعتبار

سب کو محبت کی راہ میں لٹا دو

کچھ باقی نہ رکھو

محبت بڑی جوان ہمت اور دلیر ہے

سب اختیار اسی کے ہاتھ میں دے دو

پورا پورا اسی کے کہنے پر چلو

ناامید ہو کر بھی امید کو ہاتھ سے نہ جانے دو

محبت پرواز کرتے کرتے آخر

اپنے نصف النہار کو پہنچ ہی جاتی ہے

عزمِ راسخ کے ساتھ اور ان تھک پروں کے ساتھ

کیونکہ یہ وہ دیوی ہے جو اپنے راستے سے واقف ہے۔

اور پہنائے عالم کو خوب جانتی ہے۔

محبت بزدلوں کے لئے نہیں

اس کے لئے وہ ہمت چاہیئے جو شکست نہ مانے

وہ روح جو شک و شبہ کو قبول نہ کرے

اور وہ ارادہ جس کو کوئی بدل نہ سکے

اور جو ان اوصاف کے مالک ہوں محبت بھی ان کو مالا مال کر دیتی ہے

اور انہیں وہ کچھ بنا دیتی ہے جو وہ کبھی نہ تھے

اور ہر وقت ان کا مرتبہ بلند کرتی رہتی ہے۔

محبت کے لئے سب کچھ چھوڑ دو
لیکن ہاں میری ایک اور بات بھی سن لو
ایک اور بات جو تمہیں ضرور سننی چاہیئے
ارادے کی ایک اور نبض بھی تم کو معلوم ہونی چاہیئے جو
چھوٹنے نہ پائے۔
محبت کی شانِ بےتغنا کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دو
اور ہر زمانے میں اپنے آپ کو اپنے محبوب سے اسی طرح
آزاد رکھو جیسے کہ عرب آزاد ہوتے ہیں۔

محبوب سے تمہارا تعلق جسم و جان کا سا تعلق ہو
لیکن جب اس کے نوجوان سینے میں
تم سے علیحدہ خوشی کی آرزو تمہیں جھلکتی دکھائی دے
تو اس کو آزاد کر دو
اس کا دامن پکڑ کر اسے مت روکو
اور اس گلاب کے پھول کی ایک پتی بھی اپنے
پاس نہ رکھو۔
جیسے اس نے اپنے گلہائے بہار کے ہار سے نکال کر پھینکا تھا

"ادبی دنیا"

سنیئے کہ آفتاب سے شبنم نے کیا کہا؟

(جناب سید فراق دہلوی)

جب صبح کے وقت شبنم آفتاب کے سلام کے لئے حاضر ہوئی تو آفتاب نے کہا کیوں ری ہرجائی ہری چگ تو رات بھر عالمِ سفلی کی سیر کرتی ہے اور نت نئے تماشے دیکھتی ہے۔ مگر کبھی اپنے چھوٹے منہ سے ہمیں کوئی قصہ نہیں سناتی۔

شبنم۔ ہاتھی پھرے گاؤں گاؤں جس کا ہاتھی اسی کا ناؤں۔ کہیں جاؤں کہیں آؤں۔ کہلاتی آپ کی لونڈی ہوں۔ بھلا مجھے تاب وطاقت ہے کہ حضور پیچھے کی دنیا کا حال پوچھیں اور میں اس کے بیان کرنے میں اغماض کروں؟ سنیئے جہاں پناہ! رات یہ آپ کی کنیز سیر کرتے کرتے آگرہ جانکلی اور نواب داراجنگ آسمان کلاہ کے زنانہ محل میں داخل ہوگئی۔ یہ نواب جلال الدین اکبر شہنشاہ کے درباری امیر ہیں۔ نواب صاحب کی محل سرا میں ایک چمن لگا ہوا ہے۔ چمن میں قسم قسم کے چھوٹے بڑے درخت ہیں مگر مجھے کیلے کی انوکھی ہوئی سوزنی پسند آئی۔ میں اس پر چپکے سے جالیٹی۔ رات کے گیارہ بجے اس چمن کے پاس چار پانچ لونڈیاں اپنے اپنے پلنگ بچھا اُن پر لیٹ گئیں۔ انسان کا قاعدہ ہے کہ بے بولے اس سے رہا نہیں جاتا۔ ان لونڈیوں میں جو بات چیت ہوئی وہ بہت دلچسپ تھی۔

چنپا۔ سچ کہنا بو، شام بران اس بچی کو کیا ہوا تھا۔ اے میرے اللہ گھڑی بھر میں کلی کی طرح مکس کر رہ گئی۔ کمبخت کھیلتی مالتی آغا

مینا کی طرح باتیں ملکاتی اُڑ گئی۔

شام برن۔ بہن نیک قدم ذرا بوا چینا کی باتیں سن رہی ہو۔ کیا کہہ رہی ہیں؟ آنے کے ساتھ گھن لپوانا چاہتی ہیں۔ کہیں کسی نے جو جا لگایا کہ بڑی بیگم آپ کی صاحبزادی گل آرا بیگم کے مرنے کا حال شام برن چھوکری اس طرح کہہ رہی تھی تو بھلا بڑی بیگم میرا جونڈا بے مونڈے چھوڑیں گی؟

انجم۔ اجی چونڈا مونڈا کر چھٹکارا ہو جائے تو سستے چھٹے۔ نواب صاحب کے کان میں پڑ گئی تو ناک چوٹی کترا کر تھوتنے بتروں سے اڑا دیں گے۔ بس اس ذکر کو چھوڑو۔ بڑوں نے کہا ہے کہ دیوار بھی کان رکھتی ہے۔

چینا۔ اس وقت تو ہمارے چاروں طرف کوئی دیوار نہیں ہے۔ ہم تو محل کے بیچوں بیچ میں چمن کے پاس اپنے اپنے پلنگ پر لیٹے ہیں۔ بیگم صاحب اور نواب صاحب کوٹھے پر آرام کر رہے ہیں۔ نوکریں۔ چاکریں۔ ماما۔ اصیلیں ادھر ادھر ہیں۔ سننے والے ہوں نہ ہوں ہمارے تمہارے فرشتے ہوں۔ مگر فرشتوں کا یہ دستور نہیں کہ ہماری تمہاری طرح آدمیوں سے لگائی بجھائی کریں۔ اگر تم گل آرا بیگم کے مرنے کی حقیقت کہ دو گی تو ہرج کیا ہے؟

شام برن۔ چینا تو تو جھاڑ کا کانٹا بن کر لپٹ گئی۔ اری نادان اس بچی کا نام لینے سے میرا دل دھڑکتا ہے۔ سات برس کی ہو کے آٹھویں میں پڑی تھی۔ جو موت نے اس کی ہنڈیا مرڑلی۔ ہائے اس ناشاد نامراد کا اس طرح جان دینا سارے شہر کو برا لگا۔ سنا ہے جس وقت بادشاہ سلامت نے یہ خبر سنی تو بے اختیار رونے لگے اور فرمایا افسوس کن ارمانوں اور منتوں سے دارا جنگ کے گھر میں یہ لڑکی پیدا ہوئی تھی۔ مگر کیا خبر تھی کہ وہ آناً فاناً چٹ پٹ ہو جائے گی۔ خیر تم کان لگا کر سنو۔ بیچ بیچ کر یہ قصہ میں نہیں کہوں گی۔ بات یہ تھی کہ ایک دن نواب صاحب ہوادار میں سوار قلعہ سے گھر کو آ رہے تھے۔ بازار میں انہیں ایک پندرہ سولہ برس کا لڑکا ملا۔ اس نے سلام کر کے ترکی زبان میں کہا میں طالب علم ہوں اور توران سے آپ کے ملک میں پڑھنے آیا ہوں۔ مگر میرے کھانے کا بندوبست نہیں ہے اگر آپ خدا کی راہ پر میرے کھانے کا انتظام کر دیں تو میری انتڑیاں آپ کو دعا دیں گی اور آپ کو بڑا ثواب ملے گا۔ نواب صاحب خود تورانی ہیں اس لئے نواب صاحب کو اس لڑکے کی بات چیت بہت پسند آئی۔ اشارہ سے کہا تم ہماری سواری کے ساتھ چلے آؤ۔ جب زنانہ ڈیوڑھی کے پاس آئے تو فرمایا لڑکے میاں تم ڈیوڑھی پر حاضر رہو اور اندر آ کر بڑی بیگم سے فرمایا ایک تورانی طالب علم بہت کم عمر اور بڑا گیگلا ہے۔ میں اسے ساتھ لایا ہوں۔ اسے خاصہ کا کھانا بھجوا دو اور میں نے اس سے کہہ دیا ہے وہ روز ڈیوڑھی پر آ کر لے جایا کرے گا۔ تم خود اس مسافر کے کھانے کا خیال رکھنا۔ ان لونڈیوں اور پیر بخش دربان کے بھروسے پر نہ چھوڑنا۔ بیگم نے کہا بہت اچھا لڑکا آنے جانے اور کھانا لے جانے لگا اور اس معاملہ کو کوئی چھ مہینے گزر گئے۔ گل آرا بیگم کی عمر ہی کیا تھی۔ وہ کھیلتے کھیلتے ڈیوڑھی میں پیر بخش دربان کے پاس چلی جایا کرتی تھی۔ دو چار مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ

گل آرا بیگم نے اس تورانی کو اور اس نے گل آرا بیگم کو دیکھا۔ آج آٹھ دن ہوئے گل آرا بیگم نے ڈیوڑھی میں سے آکر بڑی بیگم سے کہا۔ اماں جان تورانی لڑکا کھڑا ہے اس کا کھانا بھجوا دیجئے۔ بڑی بیگم کو صاحبزادی کا یہ کہنا اچھا نہ لگا۔ انہوں نے میرے ہاتھ لڑکے کے لئے کھانا بھجوایا۔ اور مجھ سے کہا اس لڑکے سے کہہ دینا کہ تمہارا زنانی ڈیوڑھی پر آنا مناسب نہیں ہے گھر بیٹھے تمہیں کھانا پہنچ جایا کرے گا۔ اب تم محل کے دروازہ پر نہ آنا میں تورانی بچے کو کھانا دے کر اور بیگم کی کہن اس سے کہہ کر چلی آئی اور اس کا کھانا پیر بخش اس کے پاس مسجد میں پہنچانے لگا۔ پرسوں گل آرا بیگم نے بڑی بیگم سے کہا "اماں جان لڑکا جو کھانا لینے آیا کرتا تھا۔ کیا بات ہے کئی دن سے نہیں آیا۔ بڑی بیگم نے سیدھے سبھاؤ فرمایا۔ بیٹی وہ لڑکا مر گیا۔ گل آرا نے کہا اماں جان آپ یونہی فرماتی ہیں۔ کیا وہ لڑکا سچ مچ مر گیا۔ بڑی بیگم نے کہا نہیں بیٹی میں غلط نہیں کہتی ہوں وہ لڑکا در اصل مر گیا۔ گل آرا بیگم نے پھر کوئی بات نہ دیکھی اور سیدھی اندر کے دالان میں جا اپنی چاندی کی پلنگڑی پر لیٹ گئی اور دوشالہ اوڑھ لیا۔ بڑی بیگم نے فرمایا خیر تو ہے بیگی تم اس وقت پلنگڑی پر جا کر کیوں لیٹی ہو؟ گل آرا بیگم نے کہا اماں جان میں پلنگڑی پر مرنے کے لئے لیٹی ہوں۔

بڑی بیگم نے کہا:۔ دُئی نوج دشمنوں بیری سات قرآن درمیان تم کیا کہہ رہی ہو؟

گل آرا بیگم۔ اماں جان میں سچ کہتی ہوں۔ جب وہ لڑکا مر گیا تو میں جی کر کیا کروں گی۔ اس بات کے ساتھ ہی گل آرا نے ایک ہچکی لی اور اس کا دم آخر ہو گیا۔ بڑی بیگم نے ایک چیخ ماری اور ان کی چیخ کے ساتھ سارا محل اکٹھا ہو گیا۔ نواب صاحب دوڑے آئے۔ بادشاہی حکیم بلائے گئے اور انہوں نے اس کو دیکھ بھال کر کہا کہ معصومہ کے دل کو کوئی صدمہ پہنچا جس نے اس کی روح کو تحلیل کر دیا نہ اسے سکتہ ہے نہ جمود ہے۔ یہ تو میّت ہے۔ گورستان میں لے جائیے۔ محل میں کہرام مچ گیا۔ قیامت برپا ہو گئی۔ اس محبت کو خدا دنیا سے غارت کرے۔ بھلا کوئی سمجھدار ہو۔ ہوشیار ہو۔ تو اس پر الزام بھی لگایا جائے۔ یہ تو منہ بند کلیوں کے گلے گھونٹتی ہے۔ اٹھتے پودوں کو تلووں سے مل ڈالتی ہے۔ نرم نرم کونپلوں کو توڑ مروڑ کر پھینک دیتی ہے۔

"سفیر سخن"

آساں نہیں ہے رشتۂ الفت کو توڑنا
مشکل ہے باہمی کی محبت کو چھوڑنا

نظر حیدرآبادی

مطبوعات

نرگس جمال۔ بیلجیم کے مشہور ڈرامانویس مارس میٹرلنک کے ڈرامے جائزل کا اردو ترجمہ ہے جو جناب شاہد احمد صاحب بی اے آنرز ایڈیٹر رسالہ "ساقی" کے قلم کا رہینِ منت ہے۔ شاہد صاحب کا ماہوار رسالہ "ساقی" ان کے حسنِ مذاق کا شاہد ہے۔ اس نفیس ڈرامے کے انتخاب اور اس کے کامیاب ترجمے سے انہوں نے بلاشبہ اردو میں ایک قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔ ڈرامے کے دلآویز موضوع اور شاہد صاحب کے حسنِ بیان نے اسے ایک حسین خواب بنادیا ہے۔ نرگس جمال کو پڑھتے ہوئے شیکسپیر کا ڈراما ٹمپسٹ یاد آجاتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ شاہد صاحب ایسے ترجم سے اردو ادب کی مزید خدمت انجام دیتے رہیں گے۔ حجم ۱۶۹ صفحات۔ کاغذ بہت اچھا لگایا گیا ہے۔ جلد پر خوبصورت نقش و نگار ہیں۔ قیمت عہ/ر
پتہ:۔ ساقی بک ڈپو۔ دہلی۔

قرآن کریم کا عالمگیر پیغام حریت۔ یہ ۴۸ صفحات کی ایک مختصر لیکن جامع کتاب ہے جس میں اس کے قابل مصنف علامہ ڈاکٹر البشارت احمد صاحب مفسر قرآن مجید نے ثابت کیا ہے کہ اسلام ہی نے سب سے پہلے قطعی طور پر ہر قسم کی غلامی کا سد باب کیا اور انسان کو معبودانِ باطلہ کی غلامی سے آزاد کرنے کے علاوہ نسلی و قومی غلامی۔ سیاسی و تمدنی غلامی انتصادی و معاشرتی غلامی شیطان کی غلامی اور ظلم و جہالت وغیرہ کی غلامی سے بھی آزاد کردیا۔ علامۂ موصوف نے اپنے دعوے کے ثبوت میں آیاتِ قرآنی کے علاوہ تاریخی شواہد بھی پیش کئے ہیں اور اپنے موضوع کو سلیس اور سادہ اندازِ بیان میں بہت قابلیت سے نبھایا ہے۔ قیمت ۳/ر۔ مینیجر دارالکتب اسلامیہ احمدیہ بلڈنگس لاہور۔

خمستان۔ خواجہ عبدالسمیع پال اثر صہبائی۔ ایم اے ایل ایل۔ بی وکیل سیالکوٹ کے کیف آور اور بصیرت افروز کلام کا مجموعہ ہے جو تقریباً تین سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اثر صہبائی کے کلام کا بیشتر حصہ ہمایوں میں شائع ہوتا رہا ہے۔ دنیائے ادب میں حضرت اثر اس قدر مقبول و معروف ہو چکے ہیں کہ کسی مزید تعارف کے محتاج نہیں۔ خمستان خالص شاعری کا علمبردار ہے۔ قومی مذہبی سیاسی یا معاشرتی شاعری سے اسے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ خدا روح اور تقدیر کے مسائل پر خالص شاعرانہ نقطۂ نگاہ سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ حسن و عشق کے بلند اور پاکیزہ جذبات کی نقاشی کی گئی ہے۔ زندگی کے مختلف پہلوؤں پر ایک ماہرِ نفسیات اور لطیف الطبع شاعر کی طرح روشنی ڈالی ہے۔ اس مجموعے میں اثر کی تمام نظمیں غزلیں اور رباعیاں جمع ہیں۔

راحتکدہ کا باب بجائے خود مختلف اصنافِ سخن پر مشتمل ہے۔ شاعر نے یہ اشعار اپنی جواں مرگ رفیقۂ حیات "راحت" کے غم میں لکھے ہیں اور جذباتی شاعری کے اعتبار سے یہ حصہ اس کا شاہکار ہے۔ جذبات محبت کی خصوصیت، تزکیۂ نفس اور سوز و گداز اس حصہ کی روحِ رواں ہے۔

خمستان کے شروع میں سید سلیمان ندوی اور علامہ کیفی دہلوی نے نہایت مختصر مگر پرمغز دیباچے سپردِ قلم فرمائے ہیں جن میں حضرتِ اثر کے شاعرانہ کمالات پر نہایت عالمانہ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ مصنف کی عکسی تصویر بھی شامل ہے۔ کتابت اور طباعت نہایت عمدہ ہے۔ مصنف سے مندرجہ بالا پتہ پر مل سکتی ہے۔

جنسی امراض اور ان علاج مصنفہ ڈاکٹر بھولا ناتھ صاحب آئی ایم ایس ریٹائرڈ سی ۔ آئی ۔ ای یہ کتاب ڈاکٹر صاحب کی قابلیت اور تجربے کی شاہد ہے ۔ انہوں نے اس موضوع کو اپنی عالمی تشریحات کے ذریعہ سے بہت اچھی طرح نبھایا ہے ۔ طب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے یہ کتاب نہایت مفید ہے اور اردو کی طبی تصنیفات میں ایک اہم اضافہ حجم ۲۰۴ صفحات قیمت مجلد ۳ روپے ۔

پتہ :۔ لطف زندگانی بک ڈپو ۔ اعوان منزل موچی دروازہ لاہور ۔

اردو کمپوزیشن ۔ مولوی محمد اظہر علی صاحب فاروقی ایم ۔ اے ۔ ایس مولوی فاضل پنجاب دبیر کامل لکھنو فاضل ادب الٰہ آباد پروفیسر اردو و فارسی انٹرمیڈیٹ کالج بنارس ۔ یہ کتاب طلبہ اور اردو زبان سیکھنے والوں کے لئے مفید ہے خطوط اور مضامین کے نمونے دیئے گئے ہیں ۔ قیمت ۱۰ آنے

پتہ :۔ نند کشور اینڈ برادرز بنارس ۔ مولوی محمد اظہر علی صاحب فاروقی ایم ۔ اے ۔ ایل

مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی کی کتابیں ۔ اس مکتبہ نے تھوڑی ہی مدت میں اردو ادب کی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں اور اچھی کتابیں اچھی صورت میں چھاپ کر اردو مطبوعات میں حسن ذوق پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے ہمیں مکتبہ کی طرف سے ذیل کی کتابیں موصول ہوئی ہیں جو سب قابل قدر ہیں :۔

شعرستان ۔ سید محمود اعظم فہمی کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ۔ فہمی صاحب نئے رنگ کے اچھے شاعر ہیں کتاب خوبصورت چھپی ہے حجم ایک سو بیس صفحات قیمت ایک روپیہ ۔

جگر کے سو شعر ۔ حضرت جگر کے سو بہترین اشعار کا انتخاب مکتبہ جامعہ ملیہ نے یہ سلسلہ بہت اچھا شروع کیا ہے ۔ اس سے شاعر کی خصوصیات اور اس کے کلام کے متعلق بہت آسانی سے خاصا اندازہ ہو جاتا ہے حضرت جگر یو ۔ پی کے بہترین شعرا میں سے ہیں کتاب جیبی تقطیع پر چھپی ہے قیمت ۴ ر

اصغر کے سو شعر ۔ حضرت اصغر کی غزلیں بارہا "ہمایوں" میں چھپ چکی ہیں ۔ ناظرین اُن سے خوب روشناس ہیں ۔ ان کے سو شعروں کا انتخاب بھی جگر کے اشعار کی تقطیع پر شائع ہوا ہے ۔ قیمت ۴ ر

ارکان اسلام ۔ بچوں کے لئے دینیات کی چوتھی کتاب قیمت ۲ ر ۔ بچوں کی نظمیں قیمت ۵ ر ۔ اسلامی تاریخ کی سچی کہانیاں قیمت ۴ ر حصہ دوم قیمت ۵ ر ۔ بچوں کی کتاب (تصویردار کہانیاں و نظمیں) قیمت ۴ ر

تعلیمی کھیل ۔ یہ چھوٹے بچوں کے ذہن کو جلا دینے کے لئے بہت دلچسپ اور مفید کتاب ہے ۔ قیمت ۶ ر

گلبانگ ۔ یہ فہمی صاحب کی سیاسی نظموں کا مختصر مجموعہ ہے قیمت ۶ ر

یہ سب کتابیں مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی سے منگوائیے ۔ یہ کتابیں قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور سے بھی مل سکتی ہیں ۔

ییتھارتھ پرکاش ۔ اس کتاب میں ادھا سوامی مت کی تعلیم کا بیان اور معترضین کے سوالوں کے جوابات درج ہیں ۔ حجم ۲۶۸ صفحات بڑی تقطیع قیمت مجلد عہ ۔ پتہ :۔ ادھا سوامی ست سنگ سبھا دیال باغ آگرہ ۔
